شادؔ شناسی

انجینئر فیروز مظفر

www.urduchannel.in

یہ کتاب فخرالدین علی احمد میموریل کمیٹی حکومتِ اتر پردیش لکھنؤ
کے مالی تعاون سے شائع ہوئی

شاؔدشناسی

مرتبہ

انجینئر فیروؔز مظفر

www.urduchannel.in

© فیروؔز مظفر

D-40 بٹلہ ہاؤس، نئی دہلی۔۲۵

نام کتاب	:	شاؔد شناسی
ایڈیشن	:	2018ء پہلا
مرتب وناشر	:	فیروز مظفر
تعداد	:	چارسو
قیمت	:	چھ سو روپے (Rs.600/-)
کمپوزنگ	:	محمد ذکیرالدین ذکی (8750017083)
مطبع	:	

ایمن، زمن، فیضی اور عدنان

کے نام

ستارے ہیں نیزے سنبھالے ہوئے
اندھیرے زبانیں نکالے ہوئے
(مظفرؔ حنفی)

www.urduchannel.in

برتے جا خود داری شادؔ
پاؤں برہنہ سر پر تاج

اس کتاب میں

مقدمہ	انجینئر فیروز مظفر	9
ایک خودشناس شاعر	پروفیسر ضیا احمد بدایونی	51
شادعارفی کے بارے میں	پروفیسر سیدہ جعفر	59
شآدعارفی: ایک منفرد فن کار	پروفیسر مظفر حنفی	63
شآدعارفی کی غزل کی انفرادیت	پروفیسر محمد زماں آزردہ	84
شادعارفی کی نظمیں	ماجد الباقری	92
شخصیت اور فن کا آئینہ: شادعارفی	پروفیسر سلیم اختر	100
صاحبِ طرز طنز نگار: شآدعارفی	پروفیسر محمد نعمان خاں	134
شآدعارفی کا آخری سفر	عروج زیدی	140
شآد کی ایک نظم کے حوالے سے	پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی	150
شآدعارفی کا اندازِ فکر	شان بھارتی	156
کارزارِ تنقید میں شآدعارفی کی معرکہ آرائیاں	ڈاکٹر محبوب راہی	163
شآدعارفی کی بازیافت	ڈاکٹر محبوب راہی	172
شآدعارفی کی شاعری میں سماجی مقصدیت	ڈاکٹر محبوب راہی	187
ایک بے نظیر سلسلہ	ڈاکٹر محبوب راہی	198
شآد کی شعری معنویت	پروفیسر زینت اللہ جاوید	209
زبر استاد: شادعارفی کی نظم نگاری	ڈاکٹر سید صفدر	220
نئی غزل کے پیش رو	ڈاکٹر ممتاز الحق	227

www.urduchannel.in

شآدعارفی	ڈاکٹر نصرت جہاں	244
شآدعارفی کی غزل گوئی	پروفیسر محفوظ الحسن	266
شآدعارفی کا رنگِ غزل	ڈاکٹر فراز حامدی	273
شآدعارفی: غزل اور تغزل	فاروق جائسی	278
شآدعارفی کی غزل گوئی	ڈاکٹر افضل مصباحی	284
ایک ناشاد شاعر شآدعارفی	ڈاکٹر شریف احمد قریشی	294
شآدعارفی کی شاعری میں طنز	ڈاکٹر اسد اللہ	312
شادعارفی کی رباعیاں	ڈاکٹر یحییٰ نشیط	319
شآدعارفی کی غزل کا طنزیہ واحتجاجی آہنگ	خضر حیات ناگپوری	327
شآدعارفی کے غزل گاؤں سے	نذیر فتحپوری	336
نئی غزل کا معمار: شآدعارفی	ڈاکٹر امام اعظم	341
شآدعارفی کی غزل گوئی: ایک اجمالی جائزہ	سعدیہ پروین	347
شآدعارفی: ایک عہد ساز شخصیت	امتیاز احمد راشد	352
شآدعارفی کی غزلیہ شاعری	معراج احمد معراج	357
شآدعارفی اپنی شاعری کے آئینے میں	ڈاکٹر فوزیہ خانم	361
شآدعارفی	ڈاکٹر ضیاء فاطمہ	380
لڈّن ماموں	طاہرہ اختر	384
بازگشت	(مشاہیرِ ادب کے تأثرات)	392
ناشاد: شآدعارفی	ڈاکٹر رؤف خیر	410
طنازِ وقت (سوانحی ناولٹ)	ڈاکٹر ساجد امجد	417

...........☆............

مقدّمہ

شاد عارفی (احمد علی خاں) 1900ء میں ریاست لوہارو پیدا ہوئے تھے جہاں اُن کے والد عارف اللہ خاں تھانے دار تھے جن کے تین بیٹوں میں شاؔد سب سے چھوٹے تھے۔ اُن کی ابتدائی تعلیم لوہارو میں ہی شروع ہوئی۔ قاعدہ بغدادی، قرآن مجید اور عربی صرف ونحو کی کتابیں انھوں نے اپنے والد کی رہنمائی میں ہی پڑھیں۔ ابھی اُن کی عمر نو برس کی ہی تھی کہ اُن کے والد ملازمت سے رٹائر ہوگئے اور رام پور منتقل ہوگئے جہاں شاد عارفی کا ننھیال تھا۔ رام پور کا محلّہ گھیر عثمان خان اُن کے نانا سے منسوب ہے۔ رام پور میں شاد عارفی کو غلام حیدر عرف عمّی میاں کے دبستانِ حیدری میں داخل کر دیا گیا جس میں موصوف نے اردو اور فارسی کی تعلیم حاصل کی اُن کے اساتذہ میں حکیم یوسف علی خاں اور حافظ ریل وغیرہ لائق ذکر ہیں بعد ازاں شاد نے حامد ہائی اسکول میں انگریزی پڑھی لیکن ابھی وہ میٹرک تک ہی پہنچے تھے کہ عارف اللہ خاں کا انتقال ہوگیا اور خاندان کی کفالت کا بار شاد عارفی کے کندھے پر آپڑا اور اُن کی باقاعدہ تعلیم کا سلسلہ منقطع ہوگیا۔ بہ ایں ہمہ علم حاصل کرنے کی بے پناہ خواہش کے تحت شاد عارفی پرائیویٹ امیدوار کی حیثیت سے ادیب، منشی وغیرہ کے امتحانات میں کامیاب ہوئے اور ہندی زبان میں بھی سرٹیفکیٹ حاصل کیے۔

باپ کا سایہ سر سے اُٹھ جانے کے بعد نوعمری میں ہی شاد عارفی کو ملازمتیں کرنی پڑیں پہلے مقامی شکر فیکٹری میں اکاؤنٹنٹ رہے پھر مٹّا مل میں سپروائزر ہوئے۔ مختلف اوقات میں انھوں نے کبھی کنسٹرکشن کمپنی میں سائٹ انچارج تو کبھی سی او ڈی (C.O.D.)

www.urduchannel.in

میں لیجر چیکر کی خدمات انجام دیں پھر رامپور میونسپل بورڈ میں ٹیکس کلرک ہوگئے۔ آخر میں انھوں نے ریاست رام پور کے نیم سرکاری اخبار 'اقبال' کی ادارت سنبھالی پھر رام پور اسٹیٹ پریس میں انگلش پروف ریڈر کی اسامی پر تقرر ہوا اور وہیں بجٹ اکاؤنٹنٹ ہوگئے۔ ریاست رام پور کے حکومت ہند میں الحاق کے نتیجے میں انھیں دور افتادہ تحصیل سوار میں ناظر کے عہدے پر متعین کیا گیا جہاں وہ ملیریا کا شکار ہوگئے اور بہت پریشانی کے عالم میں ملازمت سے مستعفی ہوگئے۔ اس مرض نے زندگی بھر اُن کا پیچھا نہیں چھوڑا۔ آخری عمر میں شاد نے گزر بسر کے لیے شاگردوں سے حق اصلاح کے طور پر حاصل کردہ فیس، چھوٹی موٹی ٹیوشنوں اور رسالوں سے اپنی نگارشات کے معاوضوں کو گزر بسر کا وسیلہ بنایا۔ یہ اُن کی بے پناہ تنگدستی اور افلاس کا زمانہ تھا۔ اکثر اُنھیں دو وقت کی روٹی فراہم کرنے کے لیے اپنی کتابیں اور رسالے اونے پونے داموں فروخت کرنی پڑتی تھیں۔ بے سہارا بھتیجی بھتیجے اور ان کے کنبوں کی کفالت شاد نے اسی بے سروسامانی کے عالم میں کی، ان کی تعلیم کا بندوبست کیا، شادیاں کیں اور پھر اُن کی اولادوں کے سرپرست بن گئے۔ معذور بھائی اور سن رسیدہ والدہ کی انھوں نے آخری سانس تک خدمت کی حتّٰی کہ ماں کے انتقال پر انھیں اپنا آبائی مکان بیچ کر تکفین و تدفین کا بندوبست کرنا پڑا جس کے بعد انھیں بقیہ زندگی کرائے کے خستہ حال مکانوں میں بسر کرنی پڑی۔

شاد عارفی کی زندگی میں سرد ہوا کے چند جھونکے بھی آئے۔ سولہ سترہ برس کی عمر میں انھیں اپنے دُور کی ایک رشتہ دار لڑکی سے عشق ہوگیا جو تین چار برسوں تک چلا۔ ان کا عشق اس اعتبار سے کامیاب تھا کہ محبوبہ کا بھرپور التفات انھیں حاصل تھا اور اس اعتبار سے ناکام تھا کہ ماں نے انھیں غیر کفو میں شادی کی اجازت نہیں دی اور وہ بی بی کسی دوسرے سے بیاہ دی گئی۔ اس جانکاہ حادثے کے زیر اثر شاد عارفی تقریباً تین سال تک مجنونی کیفیت میں رہے پھر اُنھیں تارا نام کی ایک لڑکی سے عشق ہوا جو اس خاندان کے پڑوس میں رہتی تھی جہاں شاد ٹیوشن پڑھانے جاتے تھے۔ یہ سلسلۂ محبت بھی چار پانچ برسوں تک جاری رہا پھر محبوبہ کے والد کا کہیں اور تبادلہ ہوگیا۔ اس محبت میں بھی شاد کا عشق دوطرفہ تھا

بلکہ محبوبہ شاید ان کے عشق میں زیادہ پُر جوش تھی۔ کوئی چالیس برس کی عمر میں والدہ نے ان کی شادی پری بیگم سے کر دی جو ڈیڑھ برس اُن کی خدمت کر کے ایام حمل میں مناسب علاج معالجہ نہ ہونے کے باعث اللہ کو پیاری ہو گئیں۔ ان تمام واقعات سے متعلق شاد کی کئی نظمیں اور عشقیہ غزلوں کے اشعار ان کے مجموعہ کلام میں دیکھے جا سکتے ہیں۔

اس زمانے کے حالات بیان کرتے ہوئے مسعود اشعر نے لکھا ہے:

''1955ء میں ....رام پور گیا تو دیکھا کہ شاد عارفی اب وہ پہلے جیسا شاد ہی نہیں ہے...... بیماری نے یہ حال کر دیا ہے کہ چارپائی پر ہر وقت پڑے رہتے ہیں۔ منہ سے حقّے کی نے لگی ہے اور نیچے فرش پر بیٹھے پچیسی (غالباً چوسر) کھیلنے والے شاگردوں کو مشورے دے رہے ہیں۔ کبوتر بازی اور پتنگ بازی طاقت کے ساتھ ہی ختم ہو چکی ہے۔ اب وہ خود ایک کٹی ہوئی پتنگ تھے جس نے چاہا پکڑ لیا اور جب چاہا چھوڑ دیا۔''(1)

اردو ادب میں میر تقی میر، یگانہ چنگیزی وغیرہ کی خودداری کے بڑے شہرے ہیں لیکن اس ضمن میں شاد عارفی اپنی مثال آپ تھے مرتے مر گئے لیکن کسی سے امداد کے خواہاں نہیں ہوئے۔ حتیٰ کہ آل احمد سرور نے حکومت سے وظیفہ جاری کرانے کے لیے درخواست فارم پر دستخط لینے چاہے تو شاد نے انکار کر دیا کہ طلبیدہ وظیفہ وہ قبول نہیں کریں گے۔ کوئی معاونت کرنا چاہتا تو ناراض ہو جاتے تھے۔

طویل علالت میں معقول علاج کی کمی، اچھی غذا سے محرومی اور ناسازگار حالت میں کئی برس گزرانے کے بعد رام پور میں مزار شاہ ولی اللہ کے نزدیک ایک شکستہ مکان میں انھوں نے داعیِ اجل کو لبیک کہا۔ یہ واقعہ 8 فروری 1964ء میں پیش آیا۔ انھیں مزار شاہ ولی اللہ کے احاطے میں ہی سپرد خاک کیا گیا۔

مزاجاً شاد عارفی ایک انتہا پسند انسان تھے بقول مظفر حنفی:

''شاد عارفی کی شخصیت کا مطالعہ ان کی نثری تخلیقات، تنقیدی مضامین اور خطوط کی روشنی میں کیا جائے تو وہ تنگ نظر، احساسِ کمتری کا شکار اور

چڑچڑے بھی نظر آتے ہیں اور ساتھ ہی ان میں انتہائی سخاوت، ذہنی اور قلبی فراخدلی اور فیاضی، جرأتمندی، اخلاص، اعلا ذہانت و جودت طبع جیسی خصوصیات پائی جاتی ہیں۔ وہ واقعی ایک زندہ اور حرارت سے بھرپور شخصیت کے مالک تھے۔''(2)

شاد عارفی سچ مچ مجموعۂ اضداد تھے جیسے ایک خوبصورت، رنگارنگ اور عطر بیز پھولوں کے گلدستے میں خشک اور خاردار ٹہنیاں اور زرد پتّے بھی پرو دیے گئے ہوں۔ بے حد حساس اور زود رنج تھے مخاطب کے لہجے سے اُس کی نیت کو بھانپ لیتے تھے۔ مصلحت پسندی، نمائش، بناوٹ اور زمانہ سازی سے سخت نفرت کرتے تھے۔ مقامی معاصرین کی سازشوں اور فریبی رشتہ داروں کی کارستانیوں کی وجہ سے کوئی بھی ملازمت دلجمعی کے ساتھ نہیں کر سکے۔ بڑے سے بڑے افسر کی کوتاہی پر کھلے عام اعتراض کرنے کی عادت بھی ان کے لیے بہت سے مصیبتوں کا سبب ہوئی۔ اکثر کسی افسر کی معمولی سی گرفت پر فی الفور ملازمت چھوڑ دیتے تھے اور غیر ضروری احساس کمتری کا شکار ہو جاتے تھے۔ ایسی ہی بیشتر وجوہ سے ان کے مزاج میں جو شدید انا پسندی پیدا ہو گئی تھی وہ زندگی بھر ان کے حق کانٹے بوتی رہی، پریشانیاں کھڑی کرتی رہی۔ رام پور سے باہر ادبی حلقوں میں اپنی منفرد شاعری کے نتیجے میں جو شہرت اور ناموری ان کے حصّے میں آئی اس نے مقامی شاعروں اور ادیبوں میں شاد عارفی سے حسد اور رقابت کو بڑھاوا دیا چنانچہ اس میدان میں بھی ان کے مخالفین اور منافقین نے اس نازک مزاج شاعر کا جینا دوبھر کر دیا۔ ان حالات میں شاد عارفی کے مزاج میں چڑچڑے پن، بہت جلد سیخ پا ہو جانا، خود ترحمی، تشکک مزاجی اور انانیت نے گھر کر لیا۔ ذرا سی بات کا بتنگڑ بنا لینا، عام سے واقعہ کا گہرا اثر قبول کرنا اور اتنی ہی شدّت کے ساتھ React کرنا ان کی فطرت میں شامل ہو گیا۔ کسی سے ذرا سی بات پر خفا ہو جاتے تو سلام دعا تک ترک کر دیتے تھے۔ معاشرے سے اتنے چرکے کھانے کے بعد اب وہ اپنے سچے مخلصین پر بھی مشکل سے بھروسہ کرتے تھے۔

شاد عارفی کو بچپن میں والد نے تلوار بازی سکھائی تھی۔ ڈیل ڈول ایسا پایا کہ سپاہی

www.urduchannel.in

تو نہ بن سکے لیکن زود حسی، غیر تمندی، افلاس زدگی اور حالت کی ستم ظریفی نے شاد کو قلم سے تلوار کا کام لینا سکھا دیا۔ مظفر حنفی رقم طراز ہیں:

''جہاں بھی انھیں اپنی یا کسی دوسرے کی حق تلفی کا احساس ہوتا تھا وہ مخالف کے لیے شمشیر برہنہ بن جاتے تھے۔ معاشرے نے ان کی حق تلفی کی تو انھوں نے اپنی دھار دار غزلوں اور آتشیں نظموں سے اس کے ناسور کریدے۔ دوستوں، عزیزوں اور ہم وطنوں نے انھیں تکلیف پہنچائی تو ان کی بھی نظموں، غزلوں، رباعیوں، قطعوں اور خطوط کے ذریعے خبر لی گئی۔'' (3)

اپنی ان نفسیاتی کمزوریوں کے ساتھ، جو کہ حالات کی دین تھیں، فطرتاً شاد عارفی بے حد غیور، غیرت مند، وسیع القلب، انصاف پسند، اقربا پرور، انسانیت نواز، سادہ مزاج، خوش خلق، ایثار پیشہ، قانع، حق گو، بے باک اور خوش مزاج آدمی تھے۔ جلدی روٹھتے تھے تو بہت آسانی سے صلح پر مائل بھی ہو جاتے تھے۔ سیر دلی کا یہ حال تھا کہ ملازمت کے زمانے میں مشاعروں میں شرکت کے لیے معاوضہ بھی قبول نہیں کرتے تھے۔ ایک جگہ خلیل الرحمان اعظمی نے اُن کی شخصیت کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

''شاد عارفی ایک انوکھی اور نرالی شخصیت کے مالک تھے اور ان کے اندر بعض ایسی ادائیں تھیں جو انھیں سے مخصوص تھیں۔ طبعاً بہت معصوم اور بھولے بھالے تھے، ان کا روٹھنا اور من جانا بالکل بچوں کا سا ہوتا تھا۔ عزیزوں اور دوستوں سے بے حد محبت کرتے تھے اور ان کے لیے ہر ممکن قربانی دینے کے لیے تیار رہتے تھے۔ خلوت پسند اور بند بند سے آدمی بھی نہیں تھے اور نہ اپنے بارے میں زیادہ باتیں کرتے تھے۔ میں نے انھیں اپنی شاعری کے بارے میں عام لوگوں سے گفتگو کرتے کبھی نہیں دیکھا اور نہ وہ اپنا دکھڑا ہر ایک سے رونا پسند کرتے تھے۔ جس زمانے میں وہ فاقہ مستی کی زندگی گزار رہے تھے اور ان کو پے بہ پے کئی صدموں سے

www.urduchannel.in

دو چار ہونا پڑا تھا، اس وقت بھی میں نے انھیں شگفتہ پایا۔'' (4)

ان کے بارے میں اظہار خیال کرنے والے اکثر اہلِ قلم کا بیان ہے کہ موصوف کی باتیں بڑی دلچسپ ہوتی تھیں ان کو ایسے ایسے واقعات، لطیفے، ادبی چٹکلے اور زندگی کے مختلف شعبوں کے بارے میں تجربات حاصل تھے کہ ہم صحبت لوگوں کو ان کے پاس بیٹھنے میں بہت مزا آتا تھا اور وہ اپنے ملاقاتی کو کبھی بیزار نہیں ہونے دیتے تھے۔ بچوں کے ساتھ بچہ بن جاتے، نوجوانوں کے ساتھ ان کے برتاؤ کا اندازہ اکبر علی خاں (عرشی زادہ) کے اس بیان سے بخوبی کیا جا سکتا ہے:

''ایک دن دل پکّا کر کے پہنچ گیا اور ان سے شاگردی کی درخواست کی۔ چھوٹتے ہی پوچھنے لگے کہ 'عشق وشق کیا ہے؟' یہ کسے توقع تھی کہ ایسا بے تکلف سوال کریں گے۔ میں نے کہا 'نہیں' تو بولے پھر شاعری تمھارے بس کی نہیں۔ انھوں نے وہ قصّے چھیڑ دیے جب آتش جوان تھا۔ اور پہلی بار مجھے معلوم ہوا کہ وہ تو بڑے ہی دلچسپ آدمی ہیں۔'' (5)

شاد عارفی کے فن پر گفتگو کرنے سے قبل اُن کے حالات زندگی اور شخصیت کے متعلق یہ امور اس لیے واضح کرنا ضروری تھے کہ ادب کو معاشرے کا آئینہ دار کہا جاتا ہے اور اس آئینہ خانے میں اس کے تخلیق کار کی شخصیت بھی صاف جھلکتی ہے۔ مظفر حنفی نے اس نکتے پر روشنی ڈالتے کیا خوب شعر کہا ہے:

ادب آئینہ ہے اور ایسا عجیب آئینہ
جس میں سیرت بھی نظر آتی ہے صورت ہی نہیں

بچپن میں شمشیر زنی کی تربیت حاصل کرنے والے شاد عارفی نے نو برس کی عمر میں پہلا شعر کہا تھا جو درج ذیل ہے:

ہو چکا ہے خیر سے ہُشیار تُو
اپنے دشمن پر اُٹھا تلوار تُو

(آخری شعری تخلیق وصی اقبال کا سہرا ہے جو نومبر 1963ء میں لکھا گیا تھا۔)

شاد عارفی نے پانچ چھ برسوں کی مبتدیانہ کاوشوں کے بعد محمود خاں شفق رام پوری کی شاگردی اختیار کرلی۔ ان سے مشورۂ سخن کا یہ سلسلہ کوئی دس برس جاری رہا۔ چند سالوں کے وقفے کے بعد شاد، فصاحت جنگ جلیل مانکپوری کے حلقۂ تلامذہ میں شامل ہو گئے جنھوں نے دو تین برسوں تک ان کی غزلوں پر اصلاح دینے کے بعد انھیں فارغ الاصلاح قرار دے دیا۔ رواج کے بعد شاد نے شعر گوئی کی ابتداء غزل سے کی۔ 1930ء کے آس پاس نظمیں کہنی شروع کیں اور آخر عمر تک نظم وغزل دونوں اصناف میں خامہ فرسائی کرتے رہے۔ درمیان میں قطعات اور رباعیات بھی ہوتی رہیں۔ کچھ افسانے اور تنقیدی مضامین بھی ان کے قلم سے نکلے۔ زندگی میں ان کا کوئی مجموعۂ کلام سلیقے سے شائع نہیں ہوا۔ 1946ء میں ان کے شاگرد رشید احمد خان مخمور نے موصوف کی نظموں کا مجموعہ 'سماج' چھاپا لیکن بوجوہ اس کی باقاعدہ اشاعت نہیں ہوئی البتہ انجمن ترقی اردو (ہند) نے ان کے کلام کا مختصر سا انتخاب 1956ء میں شائع کیا تھا۔

مقام شکر ہے کہ وفات کے بعد شاد کی شعری اور نثری نگارشات (بیشتر ان کے آخری شاگرد مظفر حنفی کی کاوشوں کے زیر اثر) کتابی شکل میں محفوظ ہو گئی ہیں جن کی تفصیل مندرجہ ذیل ہے:

1۔ سفینہ چاہیے (مرتبہ سلطان اشرف) مجموعہ غزلیات 1965ء
2۔ نثر و غزل دستہ (مرتبہ مظفر حنفی) مضامین، نظمیں، غزلیں 1968ء
3۔ اندھیر نگری (نیا ادارہ، لاہور) نظمیں۔ 1968ء
4۔ شوخیِ تحریر (مرتبہ مظفر حنفی) نظمیں۔ 1971ء
5۔ شاد عارفی کی غزلیں (مرتبہ مظفر حنفی) 1974ء
6۔ کلیات شاد عارفی (مرتبہ مظفر حنفی) نامکمل 1975ء
7۔ دکھتی رگیں (مرتبہ سلطان اشرف) منتخب کلام 1982ء

شاد عارفی کے فن اور شخصیت پر مظفر حنفی کا تحقیقی مقالہ بھی 1978ء میں شائع ہو گیا تھا مزید برآں ان کے بارے میں 'ایک تھا شاعر'، 'شاد عارفی: ایک مطالعہ'، 'شاد عارفی: فن

www.urduchannel.in

اور فنکار' اور 'مضامین و مکاتیب شاد عارفی' بھی مظفر حنفی کی مرتبہ اور شائع کردہ کتابیں ہیں۔ راقم الحروف کی مرتب کردہ کتاب 'شاد عارفی: حیات و جہات' اور عثمان انجم کی مرتبہ کتاب 'شاد عارفی کی شاعرانہ عظمت' بھی اس سلسلے کی اہم کڑیاں ہیں۔

شاد عارفی کے شاگردوں کی تعداد پچاس سے کچھ زیادہ ہی ہے۔ ان کے مقامی شاگردوں میں ہادی مصطفیٰ آبادی، جاوید کمال، مسعود اشعر، خلیل رام پوری، اکبر علی خان (عرشی زادہ) کے نام لائق ذکر ہیں۔ بیرون رام پور کے شاگردوں میں خلیل الرحمان اعظمی، محبّ عارفی، مظفر حنفی، عبدالباری شبنم سبحانی جیسے معروف شاعر، نقاد اور صحافی شامل ہیں۔

دورانِ حیات تو اردو کے ناقدین اور اکابرین ادب نے کچھ تو شاد عارفی کی تلخ و ترش تحریروں کے ردِ عمل میں اور کچھ کسی بھی گروپ سے ناوابستگی کے باعث ان کے تئیں بے اعتنائی بلکہ بے رُخی کا رویہ روا رکھا لیکن انتقال کے بعد شاد عارفی کی اہمیت، انفرادیت اور خدمات کا بھرپور اعتراف کیا گیا۔ مسعود حسین نے فرمایا:

''اہل نقد ونظر دیکھیں گے کہ ہمارے درمیان سے جو سخنور خاموشی سے اٹھ گیا ہے اس کی شخصیت اور فن دونوں کس قدر تہہ دار تھے..... جسے ناقد (رے) پاسنگ سمجھ بیٹھے تھے (اس نے ہمیں) شعر وادب کے ایسے اسلوب سے روشناس کرایا ہے جو اس صدی کے تیسرے اور چوتھے دہے کا سب سے چونکا دینے والا اسلوب ہے۔'' (6)

سجاد ظہیر نے لکھا:

''یقیناً شاد عارفی موجودہ دور کے اہم ترین ادیبوں میں سے تھے۔'' (7)

فیض احمد فیض نے اعتراف کیا:

''میں شاد عارفی مرحوم کے کلام کا معترف ہوں۔'' (8)

ڈاکٹر محمد حسن نے قلمبند فرمایا:

''اس میں شک نہیں کہ شاد عارفی کا طنز گہرا اور مزاح صاف ستھرا ہے جس کی تلخی اور ترشی بھی پڑھنے والے کے دل کو چھوتی ہے اور فکر و احساس کے

نئے زاویے بناتی گزر جاتی ہے۔'' (9)

ظ۔انصاری رقمطراز ہوئے:

''طنزیہ ادب کی کوئی تاریخ جوش اور شاد عارفی کے نام اور کلام کا جائزہ لیے بغیر پوری نہیں ہوسکتی۔'' (10)

نیاز فتح پوری نے کہا:

''میں شاد عارفی کی شاعرانہ اہلیت کا دیرینہ معترف ہوں۔ شاد عارفی زمانہ حال کے شاعروں میں ایک خاص رنگ کے نقاد و طنز نگار ہیں۔'' (11)

گیان چند کے الفاظ ہیں:

''ان کے تیور یاس یگانہ کی یاد دلاتے ہیں لیکن ان کا دامن یگانہ سے زیادہ وسیع ہے۔'' (12)

اور ناصر کاظمی نے بے تکلفی سے کام لیا:

''مجھے شاد عارفی کی گالیاں بھی ان کی شاعری سے زیادہ عزیز ہیں کہ یہ گالیاں ہمارے بدلتے ہوئے معاشرے کی دردناک کتھا سناتی ہیں۔'' (13)

الغرض سردار جعفری، حفیظ جالندھری، اختر انصاری، آل احمد سرور، میرا جی، احمد ندیم قاسمی، وزیر آغا، فرمان فتح پوری، احتشام حسین وغیرہ تقریباً سبھی اہم نقادوں اور فنکاروں نے شاد عارفی کی موت پر دلی رنج والم کا اظہار کیا اور ان کی شاعرانہ عظمت کو خراجِ تحسین پیش کیا؛

شاد عارفی کا قلم کم وبیش پچاس برسوں تک گہر افشانیوں میں مصروف رہا۔ انھوں نے اردو نثر وشاعری کی تقریباً تمام اصناف میں جولانیِ طبع کے جوہر دکھائے ہیں، افسانے لکھے، اداریے قلمبند کیے، احباب اور شاگردوں کے نام خطوط میں ادبی امور پر اظہار خیال کیا لیکن ان پر مفصل گفتگو کا یہ محل نہیں ہے۔ شاعری میں اُن کی دلچسپی نثر کے مقابلے میں زیادہ رہی۔ انھوں نے تقریباً چار سو غزلیں، دو سو نظمیں، ڈھائی سو رباعیات وقطعات، کئی

چہار بیت، بیس سے زیادہ گیت اور درجنوں سہرے اور مبارک بادیاں تخلیق کیں۔ ان کے ادبی سرمائے میں درجنوں ہندی کویتائیں اور اپدیش بھی شامل ہیں۔

شاعری میں ایک مخصوص رنگ شاد عارفی سے منسوب ہے جس کے وہ موجد بھی تھے اور خاتم بھی۔ خاص طور پر غزلوں میں ان کی انفرادیت اتنی واضح ہے کہ ان کے اشعار اپنے لہجے اور طرزِ بیان کے باعث دور سے پہچان میں آجاتے ہیں۔ شاد کا ایک مقطع ہے:

دس پانچ برس حضرت حالی کی طرح شاد
مجھ کو بھی جنونِ لب و رخسار رہا ہے

ابتداء میں جب موصوف 'ص' بیگم اور بعد ازاں تارا کے عشق میں مبتلا ہوئے تو اُن کے کلام کا رنگ عاشقانہ تھا۔ اس دور کی غزلوں کا نمونہ مندرجہ ذیل اشعار میں ملاحظہ کیجیے:

سانولا رنگ، کشیدہ قامت
نہ پری ہے نہ کوئی حور ہے وہ

....

لائے ہیں تشریف تکیوں پر دُلائی ڈال کر
حسن اور اس درجہ بے خوف وخطر میرے لیے

....

کیا لکھ رہے ہیں آپ مجھے دیکھ دیکھ کر
میں نے دیا جواب غزل کہہ رہا ہوں میں

....

پاؤں سونے کی اذیت کا بہانہ بے سود
تیرے زانو پہ وہ سر ہے جو اُٹھائے نہ بنے

....

کام کی شے ہیں کروٹن کے یہ گملے اے شاد
وہ نہ دیکھے مجھے میں اس کا نظارہ کر لوں

....

کہتے ہیں پوچھا گیا جب چھپ کے رونے کا سبب

www.urduchannel.in

دردِ دل کا کام اس نے دردِ سر سے لے لیا
لکھ کر میرا نام اے شاد
اس نے بھیجا ہے رومال

....

چارہ گر الفت کی نفسیات سے واقف نہیں
لے کے نام اس کا کوئی دیکھے مرے چہرے کا رنگ

....

اس اسلوب کی حامل غزلیات کے بارے مین اختر انصاری دہلوی نے کہا تھا:

''شاد صاحب کی آواز اس وقت کے منار بابل کی آوازوں میں اپنا ایک مخصوص آہنگ ضرور رکھتی تھی۔ یہ آہنگ اس وقت کے عام اور معتاد آہنگ سے کسی قدر جداگانہ ضرور تھا۔ ایک خوشگوار سا کھرا پن، ایک گوارا قسم کا اکھڑ پن، ایک بے تکلف اور بے جھجک اسلوبِ گفتار، ایک خفیف سا تحیر پیدا کرنے والی تازگی، ابلاغ و ترسیل کا ایک براہِ راست انداز اور ایک واشگاف قسم کا طرزِ تخاطب۔ یہ اس نئی آواز کے اوصاف تھے۔''(14)

شاد عارفی کی عشقیہ غزلوں میں غزل کے قدیم اور روایتی علائم و رموز سے روگردانی پائی جاتی ہے۔ اس نوع کی غزلوں میں انھوں نے مطالب کی بلا واسطہ اور براہِ راست ترجمانی کو اپنا مطمحِ نظر بنایا تھا۔ انھوں نے اپنی غزل کو اہم ترین اجزا یعنی مخصوص علامات، کنایات، تمثیلات و مجازات کے ساتھ اس کی معنوی دلالتوں، اور تعمیم و تعدیل سے تو ضرور محروم کر لیا لیکن ان کی جگہ تازگی، شگفتگی اور منفرد اسلوب برت کر اُسے عام غزلیہ روایت سے بالکل مختلف بنا دیا اور اس طرح خود کو صاحب طرز غزل گو تسلیم کرا لیا۔

اپنی مخصوص لَے اور منفرد طرز ادا کے باوصف شاد عارفی کے یہاں محاکات معاملہ بندی کے بہت سے اشعار ملتے ہیں لیکن ان میں فرسودگی اور ابتذال کا کہیں گزر نہیں ہے

کچھ مثالیں دیکھیے:

وہ زبانِ بے زبانی سے ابھی واقف نہیں
ہاتھ رکھنا پڑ رہا ہے بارہا دل پر مجھے
ابھی انگڑائیاں لی جا رہی ہیں
سمجھتے ہیں ابھی دیکھا نہیں ہے

....

مسکرا دیں گے مرا نام کوئی لے دیکھے
وہ کس فکر میں بیٹھے ہوں کسی کام میں ہوں

....

کھنچے رہیے تو سو سو طرح نظارے لُٹائیں گے
بتوں سے آپ کو بھی واسطہ اکثر رہا ہوگا

....

حسیں ہو تم، آپ کی بلا سے، پری ہو تم، آپ کی دعا سے
جواب ملتا ہے سخت لہجے میں اس سے جو بات پوچھتا ہوں

....

شاد عارفی کی عشقیہ غزلوں میں متوسط ہندوستانی طبقے کے 'گھریلو حسن، کی جلوہ گری نظر آتی ہے جو غزل کی نئی روایت قائم کرتی ہے۔ شاد کی عشقیہ غزل حسرت کی طرح سچ بولتی ہے ان غزلوں میں ہمیں حسن و عشق کی پیچیدہ کیفیات کے نقوش نظر آتے ہیں۔ شاد نے ایک جگہ کہا ہے:

دوسروں کے واقعات عشق اپناتے ہیں وہ
جن سخن سازوں کی اپنی داستاں کوئی نہیں

انھیں دو معاشقوں کے گوناگوں تجربات حاصل تھے جنھیں شاد نے عشقیہ غزلوں کے سیکڑوں اشعار میں پرو کر ان کی دلکشی میں اضافہ کیا ہے۔ ان غزلوں میں جیتے جاگتے محبوب کے جسم کی آنچ محسوس کی جا سکتی ہے حسن کی چلتی پھرتی تصاویر اور عشق کی حقیقی

www.urduchannel.in

کیفیات نے ان کی تاثیر اور انفرادیت مستحکم کی ہے۔ اکثر شاد عارفی اپنی عشقیہ غزل میں محبوب کے سامنے سپاہیانہ بانکپن کے ساتھ نمودار ہوتے ہیں۔ کسی نے خوب کہا ہے ؎

’’غزل میں رام پور کے پٹھان ہیں تو آپ ہیں‘‘

وہ ایک خوددار عاشق ہیں۔ ان کی آن بان اور بانکپن ان شعروں میں ملاحظہ کیجیے:

محبت میں خودی کی موت بھی دیکھی نہ جائے گی
اگر میں بارِ خاطر ہوں تو اٹھ جاؤں ترے در سے

....

یہ تو مت محسوس ہونے دیجیے
اجنبی ہیں آپ کی محفل میں ہم

....

جھٹک کے ہاتھ سے دامن کو جانے والے بس
ترے خیال کا دامن بھی چھوڑتا ہوں میں

....

حق ہے کہ ستاؤ مگر اتنا نہ ستاؤ
پڑ جائے مری آنکھ کسی اور حسیں پر

....

بقول مظفر حنفی:

’’شاد کی غزلوں میں نہ قدم قدم پر گراں بار تشبیہوں کے ڈھیر لگائے گئے ہیں اور نہ مرعوب کن صنائع بدائع اور تراکیب کا غیر متوازن استعمال ان کے ہاں ملتا ہے۔ لیکن جہاں کوئی تشبیہ یا استعارہ شاد نے استعمال کیا ہے وہاں ان کے تخیل کی نادرہ کاری اور طرفگی لطف دے گئی ہے اور یہ صنعتیں شعر کی بالائی سطح پر واقع نہ ہوکر گہرائی میں اُتری ہوئی ہیں۔ صناعی کی کوشش کے بجائے ایسے اشعار جذبے کی تپش اور فکر کی تابناکی سے لبریز ہیں۔‘‘(15)

اس خیال کی تصدیق میں چند شعر پیش کرتا ہوں:

www.urduchannel.in

مقابل قدِ آدم آئینہ ہے
بڑا دلچسپ مطلع لڑ رہا ہے

....

دل جونہی بیٹھنے لگا منزل آرزوے دل
محملِ گردباد سے جھانک کے مسکرا گئی

....

اسے نسیمِ چمن کہہ رہا ہوں میں لیکن
کہیں نسیمِ چمن مڑ کے دیکھتی بھی ہے

....

بے شک اُن کی غزلوں میں بات سے بات پیدا کرنے کا ہنر ہے اور وہ اپنے شعروں میں جو مخصوص لہجہ اختیار کرتے ہیں اس نے ان کی غزلوں کو ایسی انفرادیت عطا کردی ہے کہ آنے والی نسلوں نے انھیں اپنا آئیڈیل قرار دیا اور ان کے گہرے اثرات قبول کیے۔

عاشقانہ مزاج رکھنے والی غزلوں میں شاد مکالماتی انداز اختیار کر کے شعر کو دلچسپ بنا دیتے ہیں اور اس طرح غزل کو صرف عاشق ہی کا ترجمان نہیں رہنے دیتے بلکہ اس میں معشوق کی مساویانہ شمولیت کو بھی ممکن کر دکھاتے ہیں، مندرجہ ذیل شعروں میں شاد کی اس ہنرمندی کو واضح طور پر دیکھا جاسکتا ہے:

کیوں ہمیں بدنام کرتا ہے زمانہ پوچھیے
کوئی خط پکڑا گیا تحریر پہچانی گئی

....

میری الفت سے اُسے انکار بے حد تھا مگر
جب کہا لوگوں نے یہ تحریر؟ اب خاموش تھا

....

القصہ مختصر صرف عشقیہ اشعار کی روشنی میں ہی دیکھا جائے تب بھی شاد عارفی ماضی کو مستقبل سے جوڑنے والے شاعر دکھائی پڑیں گے۔

لگ بھگ پندرہ بیس سال تک عاشقانہ رنگ میں غزلیں کہنے کے بعد شاد عارفی

کی شاعری میں ایک نیا موڑ آیا۔

وہ رنگیں نوائی یہ شعلہ بیانی
کئی موڑ آئے مری شاعری میں

اُن تلخیوں اور شدید پریشانیوں کے ردِ عمل میں جن کا مختصر سا ذکر شاد عارفی کی شخصیت کے ضمن میں کیا جا چکا ہے موصوف نے اپنی شاعری میں طنز نگاری کو اختیار کر کے زمانے کا مقابلہ کرنا شروع کر دیا چنانچہ ان کا مطلع ہے:

بیکسوں پر ظلم ڈھا کر ناز فرمایا گیا
طنز کی جانب میں خود آیا نہیں لایا گیا

شاد کی غزلوں کا تقریباً دو تہائی حصہ طنزیہ اسلوب میں ہے۔ زمانے اور حالات نے ان پر ظلم وستم کی اینٹیں برسائیں تو اس بانکے شاعر نے بھی طنزیہ اشعار کے پتھروں سے اس کا کرارا جواب تھا۔ کیا خوب کہا ہے:

اس نے جب سو تیر چلائے
میں نے ایک غزل چپکا دی
زمین اس کے ارادوں سے کانپ اُٹھتی ہے
جو سوچ لے کہ غمِ بیکسی اگر ہے یہی

....

اپنے فن کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے شاد عارفی نے ایک جگہ لکھا ہے:

''مزاج کے خلاف کسی واقعے سے متاثر ہو کر میں جو منہ میں آئے کہنے سے نہیں چُوکتا مگر ادب کا دامن تھامے رہتا ہوں۔ یعنی دل کے ساتھ پاسبان عقل کا قائل ہوں اور کسی طرح بھی تنہا چھوڑنے کے موقع پر اسے تنہا نہیں چھوڑتا۔ ابتدا میں میں نے رنگین غزلیں نظمیں بھی کہی ہیں جو میرے دو عشقوں کی یادگار ہیں لیکن اس دَور کے بعد عزیزوں کی لوٹ کھسوٹ، دوستوں کی بے وفائی اور در پردہ دشمنی، ملازمت کے سلسلے میں

www.urduchannel.in

خوشامدیوں کی ترقی اور بدنیتوں کی گردنوں میں طوقِ زرّیں دیکھ دیکھ کر 'رنگین شاعری' سے طنز کی طرف آتا چلا گیا۔'' (16)

شاد عارفی کی 1942ء کے بعد کی تقریباً تمام تر شعری نگارشات طنز کی بنیاد پر استوار ہیں ان ذاتی پریشانیوں اور مصیبتوں کے ساتھ جن کا تذکرہ گزشتہ صفحات میں آچکا ہے، شاد کو زمانہ بھی نہایت پُر آشوب ملا جو کہ طنز کی کشت زار کو بے انتہا زرخیز بنا دیتا ہے۔ شاد نے تقریباً نصف صدی تک دیسی ریاستوں میں رہ کر جاگیردارانہ نظام کی خامیوں، دربار داریوں کے سازشی ماحول، شخصی حکمرانوں کی آمریت، خوشامد پرستی اور عیاشیوں کو بہت نزدیک سے دیکھا اور ریاست کے مرکز سے الحاق کے بعد سیاسی جوڑ توڑ، زمانہ ساز رہنماؤں کی کودغرضی، رشوت خوری، اقربا پروری، اعلا اور ادنیٰ کی تفریق، تنگ نظری، بے انصافی، فرقہ پرستی، مذہبی ریاکاری، بے انصافی، گرانی اور معاشرے میں جاری وساری کمزوریوں اور خامیوں کا عمیق مشاہدہ کیا اور ان پر اپنی طنزیہ ابیات کے تیر چلائے:

جب چلی اپنوں کی گردن پر چلی
چوم لوں منہ آپ کی تلوار کا

....

ہمارے ہاں کی سیاست کا حال مت پوچھو
گھری ہوئی ہے طوائف تماش بینوں میں

....

انصاف بیچتے ہیں بآوازۂ دہل
ایسے بھی منسلک ہیں عدالت سے آپ کی

....

صرف اپنوں کے تقرر کا ارادہ ہوگا
اور اخبار میں اعلانِ ضرورت دیں گے

....

آئی نا، مغرب کے قدموں میں سیاست گھوم

ہو گئے آخر کو دو ٹکڑے وطنِ مرحوم کے

....

دل میں لہو کہاں تھا کہ اک تیر آلگا
فاقے سے تھا غریب کہ مہمان آگیا

....

کہے جو ساقیِ جشنِ جمہوریہ کہ مانگو جو مانگنا ہے
تو سو میں نوّے غریب پھیلا کے ہاتھ دونوں اناج مانگیں

....

سو گریباں پھاڑ ڈالے دو گریباں سی دیے
اور تو سب ٹھیک ہے لیکن تناسب سیکھیے

....

گویا اے اربابِ طریقت اس نے جب انسان بنائے
تم جیسوں کو عقل عطا کی، ہم جیسے نادان بنائے

....

غریب وبیکس ہر اک ستم پر نہ کیوں دعائیں ہزار دیں گے
اگر وہ ایسا نہیں کریں گے تو آپ گردن نہ مار دیں گے

....

یہ ہرے قمقمے یہ آدھی رات
اب نہ جھانکو نگار خانے میں

....

سلجھانے کی بات بنا کر
ڈاڑھی چوٹی سے الجھا دی

....

جناب شیخ ہی اب رہ گئے ہیں لے دے کر
وہ دن گئے کہ کسی برہمن پہ چوٹ کروں

....

مشتے از خروارے یہ شاد عارفی کے طنزیہ اہداف کی چند مثالیں ہیں۔ معاشرے

www.urduchannel.in

میں رائج کون سی خرابی ایسی ہے، شخصیتوں میں پائی جانے والی کون سی خامیاں ایسی ہیں جن پر شاد نے اپنی غزلوں سے طنز کے ارجن بان نہیں چلائے ہوں۔ انھوں نے یہ دعویٰ غلط نہیں کیا:

نقد ماحول کہ فن ہے میرا
ہر طرف رُوئے سخن ہے میرا

اہم بات یہ ہے کہ شاد عارفی نے اپنے ساتھ روا رکھی گئی زیادتیوں اور بے انصافیوں کے بارے میں شعر کہتے ہوئے ایسی ندرتِ ادا اور رمزیہ اسلوب سے کام لیا ہے کہ ان کی آپ بیتی جگ بیتی میں تبدیل ہوگئی ہے۔ اور یہی طنز نگار کی سب سے بڑی کامیابی سمجھی جاتی ہے۔

اردو شاعری میں خالص طنز کی مثالیں متقدمین کے زمانے سے ہی ملتی آئی ہیں۔ واسوخت، شہر آشوب، ہجو، ریختی وغیرہ طنزیہ اسالیب میں ہی جلوہ گر ہوئے آگے چل کر مثنوی، قطعہ اور نظم وغیرہ بھی طنز کے اثر میں آگئے۔ غزل کے اکثر شعروں میں بھی شاعروں نے طنز سے بھرپور کام لیا ہے۔ مثلاً:

شکوۂ آبلہ ابھی سے میر
ہے پیارے ہنوز دلّی پر
(میر)

سن تو سہی جہاں میں ہے تیرا فسانہ کیا
کہتی ہے تجھ کو خلقِ خدا غائبانہ کیا
(آتش)

عمامہ کو اتار کے پڑھیو نماز شیخ
سجدے سے ورنہ سر کو اٹھایا نہ جائے گا
(سودا)

پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر ناحق
آدمی کوئی ہمارا دمِ تحریر بھی تھا
(غالب)

جو بھی آوے ہے ترے پاس ہی آ بیٹھے ہے
ہم کہاں تک ترے پہلو سے سرکتے جائیں
(میر حسن)

بہ ایں ہمہ غزل کے گرد حسن وعشق کے معاملات اور متصوفانہ خیالات کا دائرہ اتنا سخت تھا کہ عام طور پر غزل گویوں نے طنزیہ اسالیب سے اس میدان میں خاطر خواہ فائدہ نہیں اٹھایا اور سنجیدہ طنز نگاری کی اچھی مثالیں قدیم غزلوں میں خال خال ہی نظر آتی ہیں البتہ غالب کی غزلیات اس کلیے سے مستثنیٰ ہیں چنانچہ دیکھیے کہ کلام غالب میں طنز نے کیسے کیسے گل کھلا رکھے ہیں:

ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن
دل کے بہلانے کو غالب یہ خیال اچھا ہے

....

ہم نے مانا کہ کچھ نہیں غالب
مفت ہاتھ آئے تو بُرا کیا ہے

....

میں نے کہا کہ بزم ناز غیر سے چاہیے تہی
سن کے ستم ظریف نے مجھ کو اُٹھا دیا کہ یوں

....

پانی سے سگ گزیدہ ڈرے جس طرح اسد
ڈرتا ہوں آئینے سے کہ مردم گزیدہ ہوں

....

اپنے گرد و پیش کے ناساز گار حالات سے نا آسودہ فنکار کے لیے طنز جی کی بھڑاس نکالنے کا حربہ ہے اور وہ اندر کے لاوے کو معتدل کرنے کے لیے طنز کا سہارا لیتا ہے۔ شاد عارفی نے اپنے دوسرے دور کی غزلوں میں خالص طنز ہی کو اپنا فن قرار دیا جب کہ غالب کے یہاں طنز مختلف اسالیب میں سے محض ایک اسلوب تھا۔ ایسا بھی نہیں کہ جدّت طرازی اور انفرادی

www.urduchannel.in

حیثیت حاصل کرنے کے لیے شاد عارفی نے روایت کو یکسر مسترد کر دیا ہو۔ البتہ موصوف نے روایت کو جدّت سے آمیز کر کے اپنا نیا رنگ نکالا اور اپنی غزل کے ذائقے کو نیا چٹخارہ عطا کیا۔ دیکھیے کہ شاد کی غزلوں میں رہنما، راہ زن، باغباں، صیاد، چمن، آشیاں، پھول، بہار، ساقی، شراب، پیمانہ، خزاں، رند، زاہد وغیرہ قدیم الفاظ استعاروں، تشبیہوں اور علامتوں کی صورت میں کس انوکھے طریقے سے سانپ کی طرح پُرانی کینچلی اُتار کر بالکل نئے اور کھرے ہو گئے ہیں:

میں اپنے لفظ واپس لے رہا ہوں
یہ رہزن تھا، میں سمجھا رہنما ہے

....

وہاں بہاروں کی باغبانوں سے سازشیں بارور نہ ہوں گی
جہاں خزاں نے اٹھا دیا ہو سوال کانٹوں کی آبرو کا

....

اگر ہمارا یقیں نہیں ہے تو آیئے آپ کو گِنا دیں
بہار میں جن کے آشیانے لٹے ہیں وہ اپنے ہاتھ اٹھا دیں

....

کبھی سوچا کہ پر کھولے ہوئے کیوں
شگوفے شاخ پر بیٹھے ہیں یارو

....

حضرتِ زاہد قضا پڑھتے رہے
رند نے پابندیِ اوقات کی

....

اکثر مری محرومی ساقی پہ نہیں کھلتی
اکثر مرے حصّے کی پی جاتا ہے پیمانہ

....

چاپ سن کر جو ہٹا دی تھی اُٹھا لا ساقی
شیخ صاحب ہیں میں سمجھا تھا مسلماں ہے کوئی

مظفرؔ حنفی نے شاد عارفی کی اس خصوصیت کی جانب اشارہ کرتے ہوئے ایک مرثیے میں کیا خوب کہا ہے:

اس نے بہار و گُل کے معانی بدل دیے
مشکوک باغباں سے رہا خار کے لیے

جیسا کہ عرض کر چکا ہوں انھوں نے اپنے عہد اور اپنے ماحول کی تمام کمزوریوں اور ناہمواریوں کو، معاشرے میں رائج بدنظمیوں اور بے اعتدالیوں، ناانصافیوں اور خود غرضیوں کو اپنے طنز کا نشانہ بنایا ہے خواہ وہ معاشرتی ہوں، سیاسی نوعیت کی ہوں یا مذہب سے متعلق ہوں:

زندگی پر دلیر ہیں وہ لوگ
مقبروں سے جو لے رہے ہیں خراج

....

ہے تو احمق، چونکہ عالی شان کاشانے میں ہے
اس لیے جھک مارنا بھی اس کا فرمانے میں ہے

....

جشنِ آزادیِ جمہوریہ لاتا ہے دلیل
کو بکو شہر میں چندے سے چراغاں ہونا

....

فکر ہر کس بقدر ہمتِ اوست
بھینس کے آگے بین مجھ سے نہ بجی
مگر یہاں تو جل رہا ہے آدمی سے آدمی
سنا یہ تھا چراغ سے چراغ جلتے آئے ہیں

....

تو شاد کیا بانجھ ہوگئی مادرِ علوم و فنونِ حکمت
تجوریوں کے شکم سے ہونے لگے جو عزت مآب پیدا

....

ناجائز پیسے کی اُجلی تعمیروں کے ماتھے پر
تم نے لکھا دیکھا ہوگا یہ سب فضلِ باری ہے

....

شاد نے اپنی طنزیہ غزلوں میں دبے کچلے پسماندہ عوام اور مظلوم انسانوں کو مایوسی کے غلبے سے محفوظ رکھنے اور ان کا حوصلہ بڑھانے کے لیے طرح طرح کے طنزیہ حربوں سے کام لیا ہے اور اس طرح کے سیکڑوں اشعار کہے ہیں:

تارے جو آسماں سے گرے خاک ہو گئے
ذرّے اُٹھے تو برقِ غضبناک ہو گئے

....

جھپٹ پڑیں نہ کبھی دن میں مشعلیں لے کر
عوام کو نہ سجھاؤ کہ روشنی کم ہے

....

لاکھوں ہیں ہم سب بیچارے
اے شہزادو! تم سب گَے ہو

....

عظمتِ فن کی روایات کو مرنے نہ دیا
شعر سے بچ کے کوئی ظلم گزرنے نہ دیا

....

کبھی کبھی تو ان کے احتجاج کی لَے اتنی بلند ہوجاتی ہے کہ وہ چیخ اُٹھتے ہیں:

بے کسی جب فروغ پا لے گی
ظلم کی بوٹیاں چبا لے گی

....

اُن کے مدّاح اس زمانے میں
جیسے کتّے قصائی خانے میں

اُن کے طنزیہ اشعار کا مزا اس وقت دوبالا ہوجاتا ہے جب انھیں مناسب و

www.urduchannel.in

موافق لہجے میں پڑھا جائے۔ لہجے کے شاعروں میں اُن کا مرتبہ اس اعتبار سے بلند ترین ہے کہ اُن کے شعر بغیر تخلّص کے بھی پہچانے جاتے ہیں کہ ان کا خالق شاد عارفی ہے:

عمر بکر کی شرارتوں پر جو زید کو بزم سے اُٹھا دیں
بتایئے اُن کی اس حماقت پہ سر نہ پیٹیں تو مسکرا دیں

....

آپ کے دوست اگر آپ اجازت دیں گے
پاس بیٹھے ہوئے ترغیب حماقت دیں گے

....

یہ چھچھورا شخص پہچانے اسے
خون ہے اس میں کسی سرکار کا

....

اب ارباب طریقت جانیں
میں نے میخانے سے لا دی

....

شاد نے غزل میں لفظیات کی حصار بندی کے خلاف علمِ بغاوت بلند کرتے ہوئے اپنے کلام میں ایسے الفاظ کو بھی جگہ دی جنھیں غزل گویوں نے ٹاٹ باہر کر دیا تھا اور شہرِ غزل سے تڑی پار کر دیا تھا۔ اسی طرح اونچی ذات اور ہریجن جیسی تفریق سے لفظوں کو نجات دلانا بھی موصوف کے کارناموں میں درج ہے مثالیں دیکھیں:

جیسے بھرلی ہوں گھنگھیاں منہ میں
یہ نمائندگی نہیں۔ شرماؤ

....

گلستاں میری جنم بھومی ہے
باغبانوں کے ستم بھول بھی جاؤں

....

www.urduchannel.in

کل تھا لیکن آج نہیں ہے
طاقت ور کا ٹھینگا سر پر

....

جس کی لاٹھی اسی کی بھینس ہے آج
کیا اسی کو کہیں گے جنتا راج

....

سینک سکتے ہیں آپ بھی آنکھیں
جل رہے ہیں نشیمنوں کے الاؤ

....

علاوہ ازیں شاد عارفی نے غزل میں مقامی اعتبار سے رائج ایسے الفاظ کو برتنے سے بھی گریز نہیں کیا جنھیں بیرونی لوگوں کو سمجھانے کے لیے فٹ نوٹ کی ضرورت پڑتی ہے دیکھیے:

یہ پڑاؤں پہ گھومنے والے
ہم سے کرتے ہیں دعوۂ معراج

....

دھنگنا دے کر چھوڑ دیا ہے
اس کو کہتے ہیں آزادی

....

ناصح جو غلط بین و غلط کار رہا ہے
آنکھوں سے تُرپ ذہن سے نادار رہا ہے

....

باغباں آگ دینے کے حق میں نہ تھا
خار کے اول میں آشیاں آ گیا

....

اُن مصائب کے صلے میں جن سے ہیں دو چار ہم
داستانوں کے لیے مضمون کا توڑا نہیں

....

آپ بھی غالباً تائید کریں گے کہ شاد نے غزل کے اشعار میں پڑاؤں (اینٹ کے بھٹے) دھنگنا (مویشیوں کے لٹکن) ٹُرپ (عاری) اول (آڑ) توڑا (کمی) جیسے مقامی الفاظ کو بہت فنکارانہ انداز میں برت کر شعروں کا لطف دوبالا کر دیا ہے۔

یہ تو ہوا عام اشعار کا احوال، شاد عارفی نے اپنی غزلوں کے مطلعوں اور مقطعوں کو بھی عام روش سے ہٹ کر استعمال کیا ہے کہیں اپنے خانگی حالات کا اظہار تو کہیں تعلّی، کہیں ادبی نکات کی وضاحت تو کہیں معاصرانہ چشمک اور مقابلہ آرائیاں۔ کچھ مثالیں پیش خدمت ہیں:

میں تو چٹنی سے کھا رہا ہوں شاد
دال بنتی ہے جیل خانے میں

....

اے وہ اردوئے معلّیٰ نہ سہی
شاد کی بات سنو استادو!

....

وہ جو نکی ناچتی رہتی ہے بزم عیش میں
اس غزل کا شاد کیا ماحول بھی قائل نہیں

....

شاد مغموم و مسرور نظر پڑتا ہے
سچ کہا ہے کہ تخلص کا اثر پڑتا ہے

....

شاد ضعیف العمر ہے لیکن اس کے شعر جواں ہوتے ہیں
ایسے لوگ کہاں ملتے ہیں ایسے لوگ کہاں ہوتے ہیں

....

تائیدِ غزل کے بارے میں دو چار اشارے کیا کم ہیں
نو لمبی لمبی نظموں سے نو شعر ہمارے کیا کم ہیں

....

www.urduchannel.in

فن پر قدرت رکھنے والا جب محوِ شعریت ہوگا
جو رجحان تأثر دے گا مطلع اس کی بابت ہوگا

....

غزل میں شاد عارفی نے نئی تراکیب کا بہت بڑا سرمایہ داخل کیا ہے۔ کنگرۂ آرزو، وقعت سنگِ در، مکر طینت، امارتِ بدسرشت، جنونِ لب ورخسار، سوختہ ساماں، نامرادانِ وفا اور ایسی ہزاروں نادر اور نئی ترکیبیں شاد کے کلام میں پروئی ہوئی ہیں۔

اُن کی غزلوں میں اکثر قارئین کو حب الوطنی کی تلقین کی گئی ہے لیکن ایسے شعروں میں بھی ان کا مخصوص لہجہ صاف محسوس کیا جا سکتا ہے:

اگر چمن سے گزار دو گے چمن سے باہر گزار لیں گے
چمن کہا یہ نہیں کہا ہے وطن سے باہر گزار لیں گے

....

واعظ کہتا ہے جنت میں بے ایمان نہیں جائے گا
لیکن شاد مسلماں ہو کر پاکستان نہیں جائے گا

....

ان کی غزل میں وسیع المشربی اور مذہبی رواداری کی بھرپور نمائندگی نظر آتی ہے اور فرقہ پرستی کے خلاف شاد نے جم کر طنز کیے گئے ہیں۔ مثلاً:

صدائے ناقوس بتکدہ پر گرفت کا مشورہ نہ دیجے
عبادت و بندگی کے مانع نہیں ہے جب برہمن ہمارا

....

مگر تقدسِ زمزم پہ آئیں گے چھینٹے
اگر تصورِ گنگ و جمن پہ چوٹ کروں

....

کم سے کم یہ تو قیامت نہیں میخانوں میں
آپ ہندو تو نہیں آپ مسلماں تو نہیں

....

کلامِ شاد میں متصوفانہ شعروں کی کمی بھی نہیں ہے لیکن ایسے نازک مواقع پر بھی شاد کے لہجے کی کاٹ اور آواز کی کھنک موجود ہے۔ دو ایک شعر بطور نمونہ:

اگر تصور کی وادیوں میں نہ کی گئی میری رہنمائی
کسی کا دامن بھی تھام سکتا ہوں میں سمجھ کر تمھارا دامن

....

صرف کعبہ ہی نہ دورانِ سفر پڑتا ہے
ہم جدھر جائیں ادھر آپ کا گھر پڑتا ہے

....

ایک پردہ ہے جہاں تک بھی اٹھایا جائے
حدِّ منظر ہے جہاں تک بھی نظارہ کرلوں

....

اُسے جس حال میں سجدہ کیا ہے
اسے اللہ بہتر جانتا ہے

....

آل احمد سرور نے غلط نہیں کہا:

''شاد عارفی بڑے البیلے شاعر تھے۔ نہایت غیرت مند، خود دار، بڑے پکے، محبّ وطن، آزادی و جمہوریت کے دلدادہ، ترقی پسند خیالات رکھنے والے، بول چال کی زبان کے امکانات کو اور واضح کرنے والے، سماج کے فاسد مادے پر نشترزنی کرنے والے، اپنے رنگ کے منفرد اور اپنی طرز کے انوکھے!'' (17)

اور فرمان فتحپوری نے اُن کی غزلیات کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

''مجھے اردو غزل کی پوری تاریخ میں صرف دو ہی ایسے نام نظر آتے ہیں جن کے متعلق کہا جا سکتا ہے کہ انھوں نے غزل سے بامقصد اور سنجیدہ طنز نگاری کا بھرپور کام لیا ہے۔ میری مراد مرزا نوشہ اسداللہ خاں غالب اور

www.urduchannel.in

شاد عارفی سے ہے۔ دونوں نسلاً پٹھان ہیں اور دونوں کو شاعری سے زیادہ آباء و اجداد کے پیشۂ سپہ گری پر ناز ہے۔'' (18)

شاد عارفی کی دو سو نظموں مین سے تقریباً آدھی نظمیں عاشقانہ اور منظریہ موضوعات سے تعلق رکھتی ہیں اور لگ بھگ سو نظمیں طنزیہ ہیں۔ منظر نگاری اور عشقیہ مضامین پر مشتمل نظموں میں ''گنگا اشنان''، ''شہر اور دیہات''، ''بسنت''، ''دیوالی''، ''حیوان ناطق''، ''گوالن''، ''دسہرا اشنان''، مال روڈ''، ''فاروق اعظم''، ''مالن''، ''ہولی''، ''مغرب زدگی''، ''گاؤں'' وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

اردو شاعری میں میر حسن، نظیر اکبر آبادی، میر انیس، چکبست وغیرہ نے منظر نگاری کی جس روایت کو مستحکم کیا تھا ماضی قریب میں جوش اور شاد عارفی نے اس کی توسیع کا فریضہ انجام دیا لیکن جوش اکثر الفاظ کے بہاؤ میں آ کر نظم کی وحدت کو نقصان پہنچاتے اور ایک بات کو بار بار بیان کرتے ہیں جب کہ شاد عارفی کی نظم ایک اکائی کے طور پر سامنے آتی ہے جس کا ہر مصرع مرکزی خیال کو آگے بڑھاتا اور تقویت پہنچاتا ہے چنانچہ موصوف کی نظم میں بھرتی کا کوئی مصرع جگہ نہیں پا سکتا۔ شاد عارفی نظم میں مرقع کشی کرتے ہوئے جزویات کی بھرپور عکاسی کرتے ہیں اور ساتھ ہی منظر میں احساسات کا ترشح اور ارتعاش بھی پیدا کرتے ہیں لیکن نظم یا اس کے کسی عضو کو غیر ضروری طوالت یا عدم توازن کا شکار نہیں بننے دیتے۔

شاد کی منظر نگاری میں تنوع اور رنگا رنگی پائی جاتی ہے کہیں وہ داستان کا پس منظر بنتی ہے تو کہیں اظہار وابستگی کا کام کرتی ہے۔ بعض جگہ فطرت کی بے اعتنائی کا اظہار کرتی ہے تو بعض جگہ فطرت کی ہمدردی کا استعارہ بن جاتی ہے۔ اپنی ندرت ادا کے وسیلے سے شاد عارفی ان نظموں میں جزئیات کی باریک بینی سے عکاسی کرتے ہوئے ایسی ہنرمندی سے کام لیتے ہیں کہ ہر نظم کا مرکزی خیال بتدریج ارتقائی منزلیں طے کرتا رہتا ہے۔ ایک منظر ملاحظہ فرمائیں:

ابھرے بن کر کڑھائی پر ہوا لہکی ہوئی
ہر گلی پکوان کی بُو باس سے مہکی ہوئی

گھی تڑخ کر پاس والوں کی خبر لیتا ہوا
چَر سے شعلوں پر ٹپک جانے سے بو دیتا ہوا
ادھ جلے ایندھن کا آنکھوں میں دھواں بھرتا ہوا
نرگس شہلا میں تیزاب خزاں بھرتا ہوا

یہ نظم 'دیوالی' کا ایک منظر نامہ ہے، گرہستن تہوار پر پکوان تیار کر رہی ہے۔ جزئیات نگاری کا کمال دیکھیے کہ بصری، سمعی، شامی اور لامسی حسیات کے پیکر چند مصرعوں میں سمو دیے گئے ہیں۔ ہوا کڑھائی پر ابخرے بن کر لہک رہی ہے (بصری) گلی میں پکوان کی مہک بس گئی ہے اور شعلے پر ٹپکنے والے گھی سے بو آرہی ہے (شامہ) گھی تڑخ کر شعلے پر پڑتا ہے اور چَر کی آواز آتی ہے (سامعہ) ادھ جلے ایندھن کے دھوئیں سے آنکھ میں جلن پیدا کرنے والے آنسو آگئے ہیں۔ واقعی منظر نہ صرف نظر آرہا ہے بلکہ مہک بھی رہا ہے، بول بھی رہا ہے اور محسوس بھی ہو رہا ہے۔

خوبصورت لڑکیوں کی ''گنگا اشنان'' کے دوران چہلیں اور شوخیاں دیکھیے:

وہ دوڑ رہی ہے کوئی رنگین شرارت
چنچل ہے کہ میدان میں بھرتی ہے طرارے
وہ پاٹ میں موجوں سے کوئی پاؤں پسارے
ڈھلتے ہوئے آنچل سے کوئی محوِ تغافل
لپٹی ہوئی چادر میں کوئی شرم کے مارے
آنکھوں میں لیے ندرتِ معنائے سن و سال
نظروں کو جھکائے کوئی سینے کو اُبھارے
پانی میں اُترتی ہے کوئی جسم سمیٹے
چڑھتی ہے کنارے پہ کوئی ہاتھ پسارے
گن گن کے لگاتی ہے کوئی ڈبکی پہ ڈبکی
دم بھر کوئی ٹھہری ہے کہ بالوں کو سنوارے

www.urduchannel.in

گنگا کنارے غسل کرتی ہوئی بے شمار خوبرو لڑکیوں کی عکاسی کرنے والے انگنت شعروں میں سے چند نمونے مندرجہ بالا اشعار میں پیش کیے گئے ہیں آپ دیکھیں کہ اتنی لڑکیاں جمع ہیں اور شاد نے ایک ایک مصرعے میں سب کی انفرادیت کو واضح کر دیا ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے کسی فلم کا چلتا پھرتا، ہنستا گاتا منظر نامہ ہو۔ اس نظم میں زندگی سے بھرپور بصری پیکروں کی کارفرمائی پڑھنے اور تصور کی آنکھوں سے دید کے لائق ہے۔

پیکر تراشی کا ایک اور خوبصورت منظر ان کی نظم 'مغرب زدگی' سے پیش کرنا چاہتا ہوں:

بوندوں سے بہر آن ترنّم سا ہویدا
مدھم کے سلیقے ہیں تو پنچم کے قرینے
رگ رگ میں نمی بن کے نمو دوڑ رہا ہے
بُجھتے ہوئے پودوں کو ابھارا ہے تری نے
بگلوں کی قطاریں طرفِ ابرِ سیہ مست
بہتے ہوئے جاتے ہیں سمندر پہ سفینے
پیپل کی جھکی شاخ سے پُروا کا الجھنا
کھڑتال سی چھیڑی ہے نسیم سحری نے
کیلوں کو شمیمِ چمن آرا کے جھکولے
سمٹے ہوئے پر کھول دیے سبز پری نے

بارش کے موسم میں بوندوں سے ترنم کا سماں بندھنا، پودوں کا تروتازہ ہو جانا، سیاہ بادلوں کے تلے سپید بگلوں کی قطار سے سمندر میں سفینے رواں ہونا، پیپل کے پتوں سے پُروا کے گزرنے پر کھڑتال چھڑ جانا اور شمیم چمن آرا کے جھکولوں سے کیلے کے پودے کا سبز پری کی طرح پر کھول دینا، کتنا سہانا منظر ہے اور ہمارے حواسِ خمسہ کو آسودہ کرنے میں کتنا کامیاب ہے، قارئین خود فیصلہ کر لیں۔

اس نوع کی پیکر تراشیاں شاد کی منظریہ نظموں میں بے شمار ہیں۔ موصوف کی

عشقیہ نظموں کی صورت حال بھی کچھ ایسی ہی ہے۔ عاشقانہ معاملات سے تعلق رکھنے والی ان نظموں میں ''واپسی''، ''نوروز''، ''مندر جانے والی''، ''مفارقت''، ''واپسی''، ''خط کی چوری''، ''غمازہ''، سماج''، ''وہ کافرہ''، ''گلکاریِ تصور''، ''ایک تصویر دیکھ کر''، ''فسانۂ ناتمام''، ''پھول کی پتی سے'' وغیرہ شامل ہیں۔ ان نظموں کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ شاد رومانی محبت اور جنسی محبت دونوں ہی کو پسند کرتے تھے وہ نہ تو مجسم پیروِ اخلاق تھے نہ ہی سراسر فحش نگار اور نہ ہی مصلحِ قوم۔ اپنی نظموں میں وہ سچے اور کھرے شاعر نظر آتے ہیں۔ وہ ان نظموں میں موسموں سے لذت یاب ہوتے ہیں، دوستوں کی محبتوں سے کسبِ سکون کرتے ہیں اور معاملاتِ حسن و عشق میں ایک جیتے جاگتے حساس آدمی نظر آتے ہیں فرشتہ یا پیغمبر نہیں۔

معاملہ بندی اور محاکات شاد کی عشقیہ نظموں میں اس طرح پروئے ہوئے ہیں جیسے موم کے چھتے میں شہد۔ نظم ''واپسی'' سے اس کی ایک مثال درج ذیل ہے:

والد کی جانب یہ اشارہ تاڑ نہ جائیں دور رہو
مجھ سے مخاطب، چھوٹے بھائی کو یہ ایماء، سنبھلو ٹھہرو
میری طرف نظریں لیکن نوکر کو حکم، سہارا دو
ماما کی خدمت پہ کِنایہ خط لانے لے جانے کو
آ کے برابر، کچھ یونہی سا یہ فقرہ، آج آنا تو
شاد بس اب خاموش کہ دنیا نظر لگانے والی ہے

نوخیز عاشق و محبوب کا ذہانت و معصومیت آمیز رویہ لائق دید بھی ہے اور لائقِ شنید بھی۔ محبوبہ کے ساتھ پکنک منانے کا ایک منظر بھی نظم ''نوروز'' سے پیش کیا جاتا ہے:

پھڑ پھڑاتی ہیں بطیں تالاب میں
بہتے ہیں ساغر شراب ناب میں
رحمتیں ہیں عام سب کے باب میں

پھونس کے چھپر میں ہم ہیں اور آم
کر رہے ہیں تیز چاقو اپنے کام
ذائقہ کھینچے ہے تیغِ بے نیام

ملاحظہ فرمایا آپ نے، شاد عارفی عشقیہ نظموں میں کیسی ہنرمندی کے ساتھ کسب مسرت کرتے ہیں۔ ان نظموں میں طنز کی جگہ بذلہ سنجی، بردباری، دردمندی، معصومیت، شگفتگی، شوخ گفتاری اور مسرت انگیزی نے لے رکھی ہے۔ شاد کی نظم 'سماج' ایک محبت کی ناکام داستان ہے۔ تو نظم 'گلکاریِ تصور' ایک کامیاب عشق کی ترجمان ہے۔ عموماً عشقیہ شاعری میں عاشق کے جذبات کی عکاسی کی جاتی ہے لیکن شاد کی عشقیہ نظمیں محبوب کے احساسات اور نفسیاتی کیفیتوں کو بھی اجاگر کرتی ہیں۔

شاد کو زبان پر ایسی قدرت حاصل ہے جس کی مثالیں کم یاب ہیں وہ اتنا اچھا روزمرہ اور ایسی خوبصورت بامحاورہ زبان استعمال کرتے ہیں کہ پڑھنے والا بیساختہ داد دینے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ برمحل اور برجستہ ضرب الامثال اور کہاوتوں کا استعمال ان کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے وہ ایسے الفاظ کو بھی جو شاعری کی ٹکسال سے باہر سمجھے جاتے ہیں، بے حد مہارت کے ساتھ یوں استعمال کر لیتے ہیں کہ ان کی خلاقی اور ہنرمندی مستحکم ہو جاتی ہے۔ یہ زندہ اسلوب اور جیتی جاگتی زبان انھوں نے اساتذہ کے دواوین سے نہیں عوام کے ربط و ضبط سے سیکھی ہے۔ عورتوں کی گھریلو زبان شاد کی نظموں میں بھرپور انداز میں برتی گئی ہے۔

تقریباً سو نظمیں شاد عارفی نے طنزیہ اسلوب میں تخلیق کی ہیں۔ ان نظموں کی ایک بڑی خصوصیت ان کی ہیئت ہے بیسویں صدی کی چوتھی دہائی میں ترقی پسند تحریک کے زیر اثر اردو شاعری میں آزاد نظم کو فروغ دیا گیا تا کہ قافیے اور ردیف کی پابندی سے مجبور ہو کر شاعر اپنی نظموں میں بھرتی کے مصرعے استعمال نہ کرے۔ شاد عارفی نے ہر چند کہ تکمیل حجت کے طور پر ایک طویل آزاد نظم 'یہ عبادت یہ رسوم' کہہ رکھی ہے لیکن انھوں نے پابندی میں آزاد

www.urduchannel.in

رہنے کا کمال اپنی نظموں میں کر دکھایا ہے۔ شاید دو تین نظمیں انھوں نے مثنوی کے فارم میں کہی ہیں ورنہ ان کی تمام نظمیں پابند ہونے کے باوصف بہ اعتبار ہیئت ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ ثلاثی، مربع، مخمس، مسدس، مستزاد جیسی ہیئتوں کے علاوہ غزل کی ہیئت بھی ان میں شامل ہے۔ الغرض شاد نے اپنی نظموں سے اس قول کی صداقت پر مہر لگا رکھی ہے کہ صنوبر باغ میں آزاد بھی ہے پابہ گل بھی ہے۔ ان نظموں کی بحریں بھی متنوع ہیں اور بندشیں بھی۔

شاد عارفی کی طبیعت میں تنوع پسندی اور ہمہ گیری ابتداء ہی سے شامل تھی۔ اپنی طنزیہ نظموں میں بھی موصوف نے اس کے شواہد فراہم کیے ہیں۔ ان نظموں میں ہم عصر سماج اور افراد کی خامکاریوں اور کمزوریوں کو چن چن کر نشترِ طنز کا نشانہ بنایا گیا ہے۔ مظفر حنفی نے ان نظموں کے موضوعات پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے:

"انھوں نے ہماری سماج کے ہر جھول، ہر رخنے، ہر ناہمواری اور ہر خامی پر طنز کے وار کیے ہیں خواہ وہ گھر میں ہو، دربار میں ہو، بازار میں ہو یا خانقاہ میں"۔ (19)

آگے چل کر انھوں نے واضح کیا ہے کہ نظم 'سماج' میں شاعر نے ان فرسودہ اقدار کو ہدف ملامت بنایا ہے جو نوجوان لڑکے لڑکیوں کو اپنی پسند کی شادی کرنے سے روکتی ہیں "روٹی" میں غریب و سرمایہ دار کے مابین تفریق کے خلاف آواز بلند کی گئی ہے۔ "اختلافات" میں یکجہتی پر زور دیا گیا ہے۔ نظم "اندھیر نگری" ظلمت پرست حکمرانوں پر یلغار کرتی ہے۔ "حیوانِ ناطق" اُن اشرف المخلوقات کو مطعون کرتی ہے جن کی فطرت میں شیطنت شامل ہے۔ "شطرنج" غلام ہند کے بے حس شہریوں کو جھنجھوڑنے کا فریضہ انجام دیتی ہے۔ "جبر و قدر" ظالم و مظلوم کے کرداروں پر روشنی ڈالتی ہے الغرض شاد کی طنزیہ نظموں میں ہمیں ان کے عہد کی تاریک و قبیح تصویریں بھی نظر آتی ہیں اور ان پر چوٹیں بھی پڑتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں۔ طنزیہ نظموں میں "رسمی قید خانے"، "ہمارے نوجوان"، "دخت کش"، "گاؤں"، "ہولی"، "بیٹے کی شادی"، "جہیز"، "رت جگا"، "گوالن"، "دیہاتی لاری"، "شوفر"، "پرانا قلعہ"، "ان اونچے محلوں میں"، "رنگیلے راجا کی موت"، "شوفر"، "ملازمہ"، "گویم مشکل"، "ٹکر گدے" "نمائش" (چار نظمیں)، "زن مرید

www.urduchannel.in

شوہر"، "مگر عورت کا دل کتنا"، "مرے پڑوس میں..." وغیرہ ہر لحاظ سے اردو شاعری کے عمدہ انتخابات میں جگہ پانے کی مستحق ہیں۔ ہر چند کہ ان نظموں کے بعض حصوں میں مزاح کی کارفرمائی بھی نظر آ جاتی ہے مثلاً:

لگ چکا ہے ان کی داڑھی کو کلف

یہ غلامانِ سیاست اقتدر   قوم کے کاندھوں پر رہتے ہیں سوار
دیکھنے میں ہستیِ معقول   پردہ دارِ عیب زریں جھول بھی
چغلیاں کھاتے ہیں کردار و عمل   عقل کو لاحق ہے کرسی کا خلال

دیکھنا تالی پٹے گی ہر طرف
لگ چکا ہے ان کی داڑھی کو کلف

(آپ کی تعریف)

ایک دوسری نظم کا دلچسپ اقتباس.....

لدے پھندے پنجرے کے اندر گھس آیا اخلاقی کال
ہندو مسلم جھگڑے نے دی موقع پا کر ہڈی ڈال
بربر شامی جوش میں آئے اکڑی اینٹھی بھاجی دال
عمّامے نے گھونسہ تانا، پگڑی نے کی گالی سر
عضویاتی ورد و وظائف، جنسیاتی نقد و نظر
ثالث سعیِ صلح میں حیراں، یہ اسٹالن وہ ہٹلر
دونوں کے دونوں دیوانے دونوں کے دونوں حق پر

(دیہاتی لاری)

لیکن حق یہ ہے کہ شاد عارفی مزاح نگار نہیں طنز نگار ہیں۔ بقول قمر رئیس:

"شاد عارفی مزاجاً ظریف نہیں، طنز نگار ہیں۔ اُن کی تیکھی غزلوں اور نظموں میں سماج اور سیاست کے مریضانہ حقائق پر بڑی نازک اور لطیف چوٹیں ملتی ہیں۔ گرد و پیش کی عفونت، عیاری اور کھوکھلے پن سے ان کی برہمی اور بے زاری کا اظہار کبھی عوامی محاورے اور پھکڑ پن میں ہوتا

ہے اور کبھی ان کی شدت احساس، خیال انگیز ایمائیت کی قبا پہن لیتی ہے۔''(20)

اس خیال سے کوئی بھی سلیم الطبع شخص انکار نہیں کرسکتا کہ طنز نگار شاعر کو معاشرے اور افراد میں پائی جانے والی قبیح رسموں اور کج روی کی اصلاح مقصود و مطلوب ہوتی ہے۔ در پردہ تو شاد کی تمام نظموں کا مطمحِ نظر یہی ہے لیکن بعض نظموں میں انھوں نے بڑی وضاحت اور کھلے ڈلے انداز میں اصلاح کی تلقین کی ہے مثلاً نظم ''ہولی'' میں بعض ناسمجھ جس طرح گالی گلوچ کرتے ہیں لوگوں پر کیچڑ، تارکول اور گوبر اُچھالتے ہیں، اس کی تصویر کشی کرنے کے بعد نظم کا اختتام ان مصرعوں میں کیا گیا ہے:

یہ سیاہی ہند کے چہرے سے دھونی چاہیے
اس مقدس رسم کی اصلاح ہونی چاہیے

حدِّ اعتدال سے بڑھی ہوئی آزادیِ نسواں پر اظہار خیال کرتے ہوئے نظم ''ابھی اس راہ سے کوئی گیا ہے'' میں مشورہ دیتے ہیں:

کسی عورت کو آزادی کا حیلہ
سزاوارِ یقیں ہوتا نہیں ہے
کہ نازک جنس اور پھر بے وسیلہ
روش مغرب کی مارِ آستیں ہے

''سبق'' میں کہتے ہیں:

منزل کی جانب جاری رہ
جو پیش آئیں وہ صدمے سہہ
پستی میں بہتا پانی بن
رفعت میں برق ہمالہ بن

''جہیز'' میں فرماتے ہیں:

www.urduchannel.in

گزرنے والی برات پر جائزے کا اقدام کر رہا ہوں
وطن کی تقلیدِ صرفِ بیجا پہ نقد کا کام کر رہا ہوں

''رسمی قید خانے''، ''مرید کی بیوی''، ''بیٹے کی شادی''، ''ہمارے نوجوان''، ''ادبار''، ''حیوانِ ناطق'' وغیرہ اسی قبیلے کی نگارشیں ہیں۔

منظومات شاد میں کئی نظموں کا تعلق متوسط مسلم گھرانوں میں رواج پانے والی بدعتوں اور قبیح رسموں سے ہے ان میں ''بیٹے کی شادی''، ''رت جگا''، ''ساس اور بہو''، ''سالی''، ''چڑھاوا''، ''دادی اور پوتی'' وغیرہ اس روش کی نمائندہ نظمیں ہیں۔ وزیر آغا نے اس نکتے پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے:

''ہمارے شعراء مغرب کے مسموم اثرات کو نشانۂ طنز بناتے آئے تھے تاہم اس طنز کا دائرہ کچھ زیادہ وسیع نہ ہو سکا اور اسی لیے جب دورِ جدید کے شعراء نے زندگی اور سماج کے چھپے ہوئے ناسوروں پر نشتر چلانے کا آغاز کیا تو ان کے طنز کی چبھن کو بڑی سختی سے محسوس کیا گیا۔ اس ضمن میں شاد عارفی کی طنزیہ نظمیں قابلِ ذکر ہیں کہ ان میں زندگی اور سماج کی بیشتر مریضانہ کیفیتوں اور پنہاں ناہمواریوں کو ہدفِ طنز بنایا گیا ہے۔ شاد عارفی کی بیشتر نظمیں سماج کے مرکز 'گھر' کی ناہمواریوں کو اجاگر کرتی ہیں۔''(21)

اس خیال کی وضاحت کے لیے شاد کی نظموں کے چند اقتباسات پیش کرنا چاہوں گا:

دیسی چھ بچوں کا باوا پاتا ہے پندرہ ہر ماہ
مغرب زادے بانجھ بنجھوٹوں کو بارہ سو کی تنخواہ
(شادی کے بعد)

'' بٹھالیا ہے کرم خاں نے اپنی بیٹی کو'
'' کرے بھی کیا وہ بچاری جنم کی ہیٹی کو'
'' نہیں ہے موت پر اس بوریے سمیٹی کو'

'' یہ کس نے ہاتھ لگایا تھا میری پٹی کو'
'' بُری للک ہے یہ بندو کی سر چپیٹی کو'

(رت جگا)

مانتی ہوں سہرے کے پھول آپ کھلتے ہیں
اور بَر زمانے میں بِن تلاش ملتے ہیں
کاہلی کی مسند سے باپ بھی تو ہلتے ہیں
گھر پہ آ کے قسمت کیوں دے صدا کہ حاضر ہوں

(مشورہ)

چھ ہزار تخمینہ کم سے کم چڑھاوے کا
رنگ اور کیا لاتا زیر و بم چڑھاوے کا
اے شعیب کی امّی کون غم چڑھاوے کا
باغ و قطعہ آراضی جا کے رہن رکھتا ہوں

(بیٹے کی شادی)

پیش کردہ مثالوں سے شاد کی نظموں کے گھریلو پن کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے۔ اس کے علاوہ ان اقتباسوں سے اُس بیگماتی (رام پوری) طرزِ گفتگو سے بھی واقفیت ہو جاتی ہے جو شاد کے زمانے میں اس دیسی ریاست کے گھروں میں رائج تھی اور پٹھنولی کرارے پن اور ٹر کی نمائندگی بھی ہوگئی ہے جس کے لیے رامپوری پٹھان مشہور ہیں۔ ان نظموں کا ڈرامائی انداز اور مکالماتی اسلوب بھی شاد عارفی سے مخصوص ہے۔ چنانچہ خلیل الرحمان اعظمی کے اس خیال سے اختلاف کی گنجائش نہیں رہ جاتی کہ:

''شاد عارفی کا مخصوص آرٹ اُن کی شاعری کا ڈرامائی اسلوب تھا۔ انھوں نے شاعری کو بیانیہ اور ناتراشیدہ پیرائے سے نکال کر ایک ایسی شکل دے دی ہے جہاں حقیقت پر اظہارِ خیال نہیں ہوتا بلکہ ٹھوس اور چلتی پھرتی تصویر دکھائی جاتی ہے اور اسے ایسے زاویے سے پیش کیا جاتا ہے کہ شاعر

www.urduchannel.in

کا نقطۂ نظر واضح ہو جائے۔ ان کی نظموں میں زیادہ تر کردار نگاری ہے ان کی نظمیں زیادہ تر مکالموں کا مجموعہ ہوتی ہیں۔ ان مکالموں میں روز مرّہ کی زبان استعمال ہوتی ہے اور خالص گھریلو فضا، مجلسی رنگ یا گلی کوچے اور بازار کا ماحول ہوتا ہے اس فضا اور ماحول کو پیش کرنے اور ان کرداروں کو جیتا جاگتا بنانے کے لیے شاد صاحب نے جو جو الفاظ استعمال کیے ہیں اور جس جس ڈھنگ سے کیے ہیں ان کی مثال بہت مشکل سے ملے گی۔''(22)

ان نظموں میں بے شمار ایسی خوبیاں ہیں جن کی تفصیل میں جائیں تو دفتر کے دفتر سیاہ کرنے پڑیں گے ان کا معاملہ قارئین کی ذہانت اور سخن سنجی پر چھوڑتے ہوئے اس نکتے کی طرف پڑھنے والوں کی توجہ ضرور مرکوز کرنا چاہوں گا کہ جزئیات نگاری پر بھرپور قدرت رکھنے کے باوجود شاد لفظوں کے برتاؤ میں بے حد محتاط ہیں اور کسی بھی مضمون یا مسئلے کی وضاحت کے لیے صرف اتنے ہی الفاظ خرچ کرتے ہیں جتنے ضروری ہوں۔ نظموں کو غیر ضروری طوالت سے محفوظ رکھنے کے لیے وہ تمہید میں ایک دو مصرعوں سے زیادہ استعمال کرنا کفر سمجھتے ہیں اور ان کی نظموں کا اختتام بھی او۔ ہنری افسانوں کی طرح بیساختہ اور چونکا دینے والا ہوتا ہے۔

زبان و بیان، تشبیہات و استعارات، ترکیب سازی اور صنائع و بدائع سے متعلق جن خوبیوں کی نشان دہی غزلیات شاد کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے کی جا چکی ہے وہ سب شاد عارفی کی نظموں میں بھی بدرجۂ اتم موجود ہیں اس لیے ان کا اعادہ غیر ضروری سمجھتا ہوں۔ مندرجہ ذیل اقتباس میں آل احمد سرور نے بالکل سچ کہا ہے:

''شاد اپنے ماحول سے باغی تھے، انھیں اس نفرت کی قیمت چکانی پڑی یہی ہوتا آیا ہے اور یہی ہوتا رہے گا۔ شاد کی عظمت یہ ہے کہ انھوں نے اس بغاوت کو ایک تیکھے اور منفرد اسلوب کا روپ دیا۔ انھوں نے بول چال کی زبان کے امکانات کو بڑی خوبی سے واضح کر دیا......کئی نظموں میں انھوں نے ہماری معاشرت کی بعض خامیوں پر اس طرح طنز کی ہے

کہ یہ مرقع غیر فانی ہو گئے ہیں۔ جو لوگ شاعری کی زبان اور بول چال کی زبان کو ایک دوسرے سے الگ کر کے دیکھتے ہیں انھیں شاد کے کلام کا مطالعہ کرنا چاہیے۔ شاد نے بول چال کی زبان کی طاقت اور شعریت کو جس طرح اُجاگر کیا اور جس طرح بقول ایذرا پاؤنڈ حقیقی نفسیات کو زبان دی ہے اسے ہماری اردو شاعری ہمیشہ یاد رکھے گی۔ (23)

شاد عارفی نے رباعیاں اور قطعات بھی معتد بہ تعداد میں تخلیق کیے جن میں فلسفیانہ مضامین کی حامل نگارشات بھی ہیں اور حسن و عشق کے موضوعات پر مشتمل تخلیقات بھی۔ طنز تو ان کی اساسی خصوصیت ہے سو طنزیہ قطعات اور رباعیوں کا یہاں بھی غلبہ ہے۔ ان تحریروں میں پیشہ ورانہ سیاست دانوں کی گھما پھرا کر اچھی خبر لی گئی ہے اور ان کی خود غرضیوں کو بڑے انوکھے پیرائے میں اُجاگر کیا گیا ہے۔ مثلاً:

فکر شادابیِ وطن ہے در پیش
افراطِ خرد بھی ہے بڑی نادانی
کھیت سوکھے پڑے ہوئے ہیں لیکن
ہم سمندر کو دے رہے ہیں پانی

ان قطعات میں فنکاروں کے ساتھ روا رکھی جانے والی زیادتیوں پر بھی بڑی گہری چوٹیں کی گئی ہیں:

کسی شہکار کی تخلیق کے بعد
کاٹ لیتے تھے جو معمار کے ہاتھ
اب وہ سفّاک نہیں ہیں پھر بھی
غیر محفوظ ہیں فنکار کے ہاتھ

عمومی تجربے کی باتیں کہنے کے لیے شاد نے اپنی رباعی سے کام لیا ہے جیسے:

جنگل میں جو ذکر شہر دہراتا ہے
وہ سیر کے واسطے ہی کیوں آتا ہے

www.urduchannel.in

سبزے پہ کسی فکر میں ٹہلنے والا
سبزے کی طراوتوں کو جھٹلاتا ہے

قطعات میں بڑی مہارت کے ساتھ نفسیاتی کمزوریوں اور معاشرے کے مضحک پہلوؤں کو نشانہ ملامت بنایا گیا ہے۔ فرماتے ہیں:

بلند و پست میں نسبت ہے غیر قانونی
غرور و عجز میں رشتہ۔ سماج بکتی ہے
کسی امیر کی لڑکی کسی غریب کے ساتھ
نکاح عیب سمجھتی ہے، بھاگ سکتی ہے

ایک اور قطعے میں انسانی نفسیات کی بڑی نزاکت کے ساتھ ترجمانی کی ہے اور کیسی برمحل تشبیہہ کے ساتھ:

کنکری جوتے میں پڑ جائے اگر
آدمی دو گام چل سکتا نہیں
روح زندہ ہو تو حق تلفی کا بوجھ
آدمی کے جی سے ٹل سکتا نہیں

قصہ مختصر بقول سید احتشام حسین:

''شاد عارفی ایک طنز نگار نغز گو شاعر تھے اور گو کہ ان کی غزلوں میں جان دار اور تہہ دار اشعار کی کمی نہیں ہے لیکن ان کا اصل جوہر طنزیہ کلام میں جھلکتا ہے طنز نگاری کے امکانات کچھ محدود ہوتے ہیں تاہم اس کے اندرونی سماجی مقصد کی وجہ سے ان کا دائرہ کبھی کبھی پھیل بھی سکتا ہے۔ شاد عارفی نے اس حیثیت سے اپنی شاعری کا معیار بلند رکھا۔'' (24)

انھیں اوصاف کے پیشِ نظر حنیف فوق، شمس الرحمٰن فاروقی، عمیق حنفی، راہی معصوم رضا، ندا فاضلی وغیرہ نے شاد کو جدیدیت کا پیش رو اور عہد ساز شاعر قرار دیا ہے۔

مظفر حنفی (پاپا) نے اپنی غزلوں پر شاد عارفی سے بذریعہ خط و کتابت کل چودہ

مہینوں تک اصلاح لی اور 1964ء سے لے کر آج تک مرحوم کی خدمت میں مصروف ہیں۔ شاد عارفی کے ہم وطنوں نے انھیں مرحوم کی بیاضوں سے استفادے کا موقع نہیں دیا تو پایا نے برصغیر کے رسالوں اور جریدوں کے ہزاروں صفحات کھنگال کر کلام شاد کو ریزہ ریزہ جمع کیا، برسوں کی کاوش کے بعد اُن کے مکاتیب و مضامین یکجا کیے، اُن کے مزار کو پختہ کرنے کے لیے رقم فراہم کی، اُن پر تحقیقی مقالہ لکھا، ان کی نگارشات کو سات آٹھ ضخیم کتابوں کی شکل میں ترتیب دے کر شائع کیا۔ اردو کے مختلف مکاتیب فکر سے تعلق رکھنے والے قدیم و جدید نقادوں سے سلسلۂ شادیات کے لیے مضامین لکھوائے اور مجموعوں میں ان کی اشاعت کا بندوبست کیا نیز شاد عارفی کی پچاسویں برسی کے موقع پر 2014ء میں اس عظیم شاعر کے متعلق نہ صرف دو مقتدر رسائل کو خاص نمبر شائع کرنے پر آمادہ کیا بلکہ ان کی ترغیب پر ہندو پاک کے تقریباً اٹھارہ رسالوں اور اخباروں نے شاد عارفی کی شخصیت اور فن پر گوشے نکالے نیز دو تین دانش گاہوں نے اُن کی رہنمائی میں 'شاد عارفی: فن اور شخصیت' پر ہندوستان گیر پیمانے کے سیمینار منعقد کیے۔ انھوں نے کئی ریسرچ اسکالروں کو اس موضوع پر پی ایچ ڈی کے لیے تحقیقی کام کرنے پر مائل کیا۔ موصوف کا مشن اب بھی جاری ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ میں بھی اس کار خیر میں اپنی محدود استعداد کے ساتھ کچھ حصہ لے رہا ہوں۔ یہ کتاب مکمل ہو ہی نہیں سکتی تھی اگر اس کے لیے وہ اپنی مرتبہ و مؤلفہ کتب سے شاد عارفی سے متعلق مواد منتخب کرنے کی اجازت نہیں دیتے اور قدم قدم پر میری دستگیری اور معاونت نہیں فرماتے۔ مجھے شکریہ ادا کرنے کی اجازت نہیں ہے لیکن اظہار تشکر تو بہر حال میں کر ہی سکتا ہوں۔ اللہ ان کا سایہ ہم لوگوں کے سروں پر سالہا سال قائم رکھے۔ آمین۔

فیروز مظفر

یکم جنوری 2018ء

فرسٹ فلور D-40، بٹلہ ہاؤس، نئی دہلی۔ 25

حواشی

(1) 'فنون' (لاہور) اشاعت خاص نمبر ۵ 1964ء ص ۳۳۵/۳۶

(2) شاد عارفی: فن اور انکار ص ۳۴

(3) شاد عارفی: فن اور فنکار ص ۴۱

(4) 'ایک تھا شاعر' (مرتبہ مظفر حنفی) ص ۱۴۷

(5) 'ایک اور گنجا فرشتہ' مشمولہ نقوش لاہور خاص نمبر 1965ء

(6) شاد عارفی: ایک مطالعہ (مرتبہ مظفر حنفی) ص ۲۴۵/۲۴۶

(7) شاد عارفی: ایک مطالعہ (مرتبہ مظفر حنفی) ص ۲۴۷

(8) شاد عارفی: ایک مطالعہ (مرتبہ مظفر حنفی) ص ۲۴۷

(9) شاد عارفی: ایک مطالعہ (مرتبہ مظفر حنفی) ص ۲۴۸

(10) شاد عارفی: ایک مطالعہ (مرتبہ مظفر حنفی) ص ۲۴۹

(11) شاد عارفی: ایک مطالعہ (مرتبہ مظفر حنفی) ص ۲۵۴

(12) شاد عارفی: ایک مطالعہ (مرتبہ مظفر حنفی) ص ۲۵۴

(13) شاد عارفی: ایک مطالعہ (مرتبہ مظفر حنفی) ص ۲۵۷

(14) شاد عارفی: ایک مطالعہ (مرتبہ مظفر حنفی) ص ۵۵

(15) شاد عارفی: فن اور فنکار ص ۷۵

(16) سفینہ چاہیے (مرتبہ: سلطان اشرف) ص ۱۶، ۱۷

(17) ایک تھا شاعر، ص ۲۸

(18) شاد عارفی: ایک مطالعہ، ص ۴۵/ ۴۴

(19) شاد عارفی: فن اور فنکار، ص ۱۷۱

(20) شاد عارفی: ایک مطالعہ، ص ۲۴۹

(21) شاد عارفی: ایک مطالعہ، ص ۲۴۸

(22) ایک تھا شاعر، ص ۴۸۷

(23) شاد عارفی: ایک مطالعہ، ص ۲۱۷

(24) شاد عارفی: ایک مطالعہ، ص ۲۱۸/۱۹

www.urduchannel.in

پروفیسر ضیا احمد بدایونی

ایک خود شناس شاعر

کسی نے سچ کہا ہے کہ غزل بڑی کافر صنف ہے جو مشکل سے قابو میں آتی ہے۔ یوں تو ہماری زبان میں غزل لکھنے والوں کی کمی نہیں۔ قطب شاہی عہد سے لے کر اب تک ہزاروں غزل نگار پیدا ہوئے اور حجابِ عدم میں پنہاں ہو گئے مگر ایسے شعرا بہت تھوڑے تھے جن کو سن کر انسان چونک جائے، جنھوں نے اپنے من میں ڈوب کر زندگی کی ترجمانی کا فرض ادا کیا ہو اور جن کی تخلیق، فکر اور جذبے پر ان کی اَنا کی چھاپ ہو۔ شاد عارفی کا شمار بھی اسی آخری گروہ میں ہے۔ ان کی غزل بڑی حد تک ان کی وارداتِ دل کی ترجمانی ہے۔ پڑھنے والا جب ان کا کلام پڑھتا ہے تو محسوس کرتا ہے کہ وہ جگ بیتی نہیں بلکہ آپ بیتی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ آپ بیتی میں آفاقیت کا وہ انداز آ جائے کہ اس پر جگ بیتی کا دھوکا ہونے لگے۔ بقول سیمابؔ:

مری روداد، رودادِ جہاں معلوم ہوتی ہے
جو سنتا ہے اسی کی داستاں معلوم ہوتی ہے

چند شعر ملاحظہ کیجیے جن سے ہمارے بیان کی تصدیق ہوگی۔ لکھتے ہیں:

میں دنیا پر طنز کروں گا   دنیا میرے کیوں درپے ہو
ہم اس کے پابند نہیں ہیں   ساغر ہو مینا ہو مَے ہو
شادؔ مجھے یہ دھن رہتی ہے   اپنا نغمہ اپنے لَے ہو

www.urduchannel.in

وہ زبان بے زبانی سے ابھی واقف نہیں
ہاتھ رکھنا پڑ رہا ہے بار ہا دل پر مجھے

....

غضب ہے پاسِ احساسِ جوانی
نگہبانوں سے گھبرانے کے دن ہیں

یہ صحیح ہے کہ شادؔ کے یہاں معاملہ بندی کے اشعار کافی ملتے ہیں مگر ان کی معاملہ بندی میں فرسودگی اور ابتذال کا نام نہیں یا نہ ہونے کے برابر ہے۔ ذیل کے اشعار پڑھیے:

جو انجمن میں سامنا ہوا تو اشکِ بے کسی
اُدھر مژہ پہ تھم رہے اِدھر مژہ سے ڈھل پڑے

اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ''کسی'' سے کوئی قصور ہوا بعد کو اس کا احساس ہوتا ہے۔ اب تلافی کی کوئی صورت تو بن نہیں پڑتی بجز اس کے کہ مقابل کو الٹا الزام دیا جائے جس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ قصور کی نوعیت ذرا ہلکی ہو جائے۔ شادؔ کہتے ہیں:

الزام دے کے سعیِ تلافی نہ کیجیے
ہم خود جو کہہ رہے ہیں قصور آپ کا نہیں

....

انصاف کی تو یہ ہے کہ منہ چاہیے اُسے
جتنے دنوں فریبِ وفا ہم نے کھا لیا

شادؔ فطرتاً خود دار، کم آمیز، قناعت پسند، خوشامد سے دور اور جوڑ توڑ سے نفور تھے۔ زمانے نے اس کا بدلہ ناقدری اور بے اعتنائی کی صورت میں دیا، مگر وہ ابنائے زمانہ کی ناقدری اور بے اعتنائی کو عزیز جان کر سینے سے لگائے رہے۔ وہ جانتے تھے کہ مجھے قدرت کی طرف سے متاعِ سخن ملی ہے اور اگر بازار میں اس کی قیمت نہیں تو ایسا نہیں ہے کہ متاعِ کاسد اور بازاری ہے بلکہ خود گاہک چشمِ بصیرت سے عاری ہے۔ یہی جذبہ کبھی خود شناسی اور تعلّی کی صورت میں اور کبھی طنز و تعریض کی شکل میں ان کی شاعری میں ہر ہر قدم پر نمایاں ہے۔ مثلاً:

حقیقتوں کی تلخیوں کے ساتھ شاد عارفی
لطافتِ بیانِ واقعہ غزل کی جان ہے

....

یہی ہے شاد میں سب سے بڑا عیب
وہی لکھتا ہے جو کچھ دیکھتا ہے

....

پوچھے جو کوئی شاد ترا طرزِ تغزل
نشتر ہے کہ خنجر ہے تو کیا عرض کیا جائے

....

یہ بھیگی ہوئی رات یہ کیفیتِ عرفاں
چاہوں تو ستارے بھی اُتر آئیں زمیں پر

....

عظمتِ تغزل میں اُن سے کام لیتا ہوں
زندگی گزرتی ہے شاد جن ملالوں سے

....

جدّتِ طرز ادا اے شاد حصہ ہے مرا
ایک مطلب عرض کرنا باربار آساں نہیں

....

مرے افکار کی دنیا مرے احباب کیا جانیں
وہاں اکثر نہیں ہوتا سمجھتے ہیں جہاں مجھ کو

....

تبدیلیِ حالات کا پاتے ہی اشارہ
ڈھل جاتے ہیں شعروں میں سخنداں کے اشارے

....

کہاں ہیں شاد غزلوں میں تسلسل ڈھونڈنے والے
غزل کا ہر تنوع حاملِ شیوہ بیانی ہے

....

www.urduchannel.in

غلط بیانیوں کے عہدِ نو میں شاد عارفی
مرا کمالِ فن یہ ہے کہ صرفِ ماجرا ہوا

مذکورہ بالا اشعار کو محض خودستائی نہ سمجھیے بلکہ دراصل شاعر نے اپنی شاعری کا منشور Manifesto شائع کیا ہے۔طنز کا رنگ دیکھنا ہو تو اشعار ذیل حاضر ہیں:

یہ شاعرانِ غلط بیں کہیں گے اک دن شاد
ہمیں چراغ دکھاؤ کہ روشنی کم ہے

....

ابھی تک فن برائے فن پہ حجت
جو کاٹا تھا وہی بوتے ہو یارو

....

ان ماہرانِ شعر و ادب نے جنابِ شاد
عریانیِ غزل کا کبھی جائزہ لیا

....

مجھے اے شاد ان رجعت پرستوں سے تو کیا لینا
کرے گی یاد مستقبل کی تہذیب جواں مجھ کو

....

جس کی تخلیق کو تلوار نہیں کہہ سکتے
ہم اسے شاعرِ معیار نہیں کہہ سکتے

....

کرکری محسوس کی خود رجعتی لوگوں نے شاد
گردِ صحرائے تغزل اس قدر چھانی گئی

لیکن جیسا کہ خود شاد کو اعتراف ہے:

یہ فنِ طنز مرے حق میں درحقیقت شاد
بہت بڑا المیہ ہے اختصار کے ساتھ

....

یہ درست ہے کہ ان کی طنز کا انداز بعض جگہ سپاٹ اور واشگاف ہو گیا ہے مگر طنز کی

شوخی اور نشتریت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

جس طرح علم و ادب ایک دوسرے پر اثر انداز ہوتے ہیں یہی حال داخلیت و خارجیت کا ہے یعنی جس طریقے سے خارجیت پر داخلیت کی چھاپ ہوتی ہے، اسی طور سے داخلیت بھی خارجیت سے اپنی غذا حاصل کرتی ہے۔ شادؔ کی شاعری داخلی ضرور ہے لیکن یہ کیونکر ممکن تھا کہ وہ خارج کی دنیا سے بالکل آنکھیں بند کر لیتے۔ ملک کی سیاست میں جو انقلاب آ رہا تھا وہ اس کو بغور دیکھ رہے تھے۔ آخر وہ وقت آیا کہ اجنبی تسلط ختم ہوا اور ہمارا دیس آزاد ہوا۔ اس میں شبہ نہیں کہ آزادی ایک بڑی نعمت ہے، مگر جہاں اس نے بہت سے حقوق بخشے وہاں بہت سے فرائض بھی اپنے ساتھ لائی۔ افسوس کہ ہمارے اہلِ ملک نے حقوق کے مطالبے میں تو بڑی سرگرمی دکھائی، لیکن فرائض کو پس پشت ڈال دیا۔ مفاد پرستی، اقربا پروری، خودغرضی، رشوت خوری، چور بازاری، دھوکا فریب، چھوت چھات، جرائم کی کثرت، تعصب کی شدت نے ملک کو جس حال پر پہنچا دیا وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔ حاکم ہوں یا رعایا، اساتذہ ہوں یا طلبہ، خواص ہوں یا عوام، کانگریس ہو یا دوسری سیاسی جماعتیں۔ سب اپنی حدود میں اس صورتِ حال کے ذمہ دار ہیں۔ ظاہر ہے کہ جب نیتا ہی غلط کار اور رہبر ہی رہزن ہوں تو کس سے امید کی جائے۔ شادؔ نے ان حقائق پر اکثر اپنے کلام میں روشنی ڈالی ہے۔ جیسے:

شریکِ بزمِ سیاست ہیں کچھ "بڑے چہرے"
ذرا قریب تو آؤ کہ روشنی کم ہے

....

جواب یہ کہ کوئی رہنمائے قوم ہیں آپ
اگر کسی کو بتاؤ کہ روشنی کم ہے

....

ذہنی طور پہ اترے شخو!
تم اب تک بھی جم ہو، گے ہو

....

چور کی داڑھی میں تنکے کا منظر اکثر دیکھا
میرے 'رہزن' کے فقرے پر 'راہنما' نے مڑ کر دیکھا

....

ہاں ہم نے ہی کھائے ہیں دل زار پہ چڑ کے
ہم قتل بھی ہو جائیں تو الزام ہمیں پر

....

ساتھ آنا ہے تو لہروں کی تھپیڑے من گن
موج سے لطف اٹھانا ہے تو ساحل سے اٹھا

....

ان پہ حیرت ہے کہ تمئیزِ حق و باطل بھی ہے
اور سمجھتے ہیں جو پتے باز ہے قابل بھی ہے

....

جیسے کونین کی گولی پر شکر کا چکمہ
اب یہ سوچا ہے انھیں دادِ حکومت دیں گے

....

آشیاں پھول نہیں تھے کہ خزاں لے اڑتی
آپ اس بحث میں جانے کی اجازت دیں گے

....

سکھاؤ اپنی بندگی سجاؤ قشقۂ جبیں
بتانِ خود نما تمھیں کسی طرح تو کل پڑے

....

یہ جو الجھے ہوئے حالات سدھرتے ہی نہیں
ہائے گیسوئے سیاست کہ سنورتے ہی نہیں

....

مطلع کہا ہے، نظمِ وطن کا گِلہ نہیں
پھرتے ہیں میرؔ خوار کوئی پوچھتا نہیں

....

www.urduchannel.in

جس باغباں کے ساتھ لڑے تھے خزاں سے ہم
حیرت یہ ہے وہ آج ہمیں جانتا نہیں

مختصر سے مجموعے میں سیاسی رنگ کے اشعار بکثرت ہیں۔ کہاں تک نقل کیے جائیں۔ رہنما اور رہزن کا موضوع شآد کا محبوب موضوع ہے، مگر بیشتر خشک اور مکرر ہونے کی وجہ سے بے مزہ ہوگیا ہے۔ مثلاً:

رہنماؤں سے تمیزِ نور و ظلمت مٹ گیا
دھوپ کی عینک لگائے پھر رہے ہیں رات کو

....

میں اپنے لفظ واپس لے رہا ہوں
یہ رہزن تھا میں سمجھا رہنما ہے

....

راہزن راہ کے سایوں پہ نظر رکھتے ہیں
اس لیے ہم کسی سائے میں ٹھہرتے ہی نہیں

....

پاؤں نہیں ہوتے چوروں کے اگلوں نے یہ بات کہی ہے
یعنی ہر حالت میں رہزن راہی سے کم ہمت ہوگا

....

سادہ دلوں نے راہنمایانِ قوم سے
اتنے فریب کھائے کہ چالاک ہو گئے

....

منافق اور خودغرض لیڈر اس سے زیادہ ملامت کے مستحق ہیں لیکن غزل ایسی کھلی ڈلی تعریض کی متحمل نہیں ہوتی۔ اوپر جو اشعار گزرے ان سے ظاہر ہوا ہوگا کہ شآد ایک خوددار اور خودشناس شاعر تھے۔ اسی کا اثر ہے کہ انھوں نے اپنے لیے ایک الگ راہ نکالی ہے۔ وہ محض برائے گفتن شعر نہیں کہتے۔ بلکہ جب کوئی خیال یا جذبہ ان کو اکساتا ہے تب کچھ کہتے ہیں۔

www.urduchannel.in

شآد عارفی کے اشعار میں کہیں کہیں فنی کمزوریاں بھی نظر پڑیں۔ مثلاً غمِ تقاضۂ ماحول (نثر و غزلدستہ صفحہ ۳۵۷)، عدم توجہی (نثر و غزلدستہ صفحہ ۴۴۱)، یا میراث اور پاس وغیرہ کا قافیہ (نثر و غزلدستہ ۴۱۸) یا بعض بحروں میں شکستِ ناروا کا عیب۔ لیکن کمزوریاں کس میں نہیں ہوتیں۔ اور پھر معدودے چند لغزشوں سے پورے کلام کی خوبی پر حرف نہیں آتا۔ یہ کیا کم ہے کہ غزل گوئی کے موجودہ ہنگامے میں وہ اپنی ایک آواز رکھتے ہیں جو نہ صرف توجہ سے سنی جاتی ہے بلکہ پہچانی جاتی ہے۔ جیسا کہ خود وہ لکھتے ہیں:

اور پھر کہتے ہیں کس کو ندرتِ طرزِ ادا
میرے شعروں میں مری آواز پہچانی گئی

......☆......

پروفیسر سیّدہ جعفر

شادؔ عارفی کے بارے میں

شادؔ عارفی کا اصل نام احمد علی خان تھا۔ انٹرنس کا شش ماہی امتحان دینے بھی نہ پائے تھے کہ والد خان عارف اللہ خاں نے داعی اجل کو لبیک کہا اور گھر کی تمام ذمہ داریاں شادؔ عارفی کو سنبھالنی پڑیں۔ وہ اپنے متعلقین کی تعلیم، والدہ کی خدمت اور بھتیجا بھتیجی کو پڑھانے لکھانے میں اتنے مصروف تھے کہ اپنی شادی کو ٹالتے رہے۔ پچانوے برس کی عمر میں والدہ بینائی سے محروم ہوگئیں، ان کی خدمت کو شاد عارفیؔ اپنا اولین فرض تصور کرتے تھے۔ چالیس سال کی عمر میں شاد عارفی نے شادی کی لیکن ڈیڑھ سال بعد رفیقہ حیات داغ مفارقت دے گئیں۔ شادؔ عارفی کے نانا مولوی سید ولی کا تذکرہ ''کاملان رامپور'' میں موجود ہے وہ معلم مقرر ہو کر لوہارو چلے گئے تھے اور ان کے ساتھ ان کے داماد محمد عارف اللہ خان یعنی شادؔ کے والد بھی لوہارو آگئے یہاں تھانیداری کے عہدے پر فائز ہوئے۔ شاد عارفیؔ ۱۹۰۰ء میں لوہارو میں پیدا ہوئے نو سال کی عمر میں اپنے وطن رام پور واپس آگئے۔ عربی اور فارسی کی تعلیم گھر پر حاصل کی شادؔ عارفی نے زندگی میں حوصلہ شکن حالات کا مردانہ وار مقابلہ کیا۔ معمولی گھر میں رہے اور سادہ زندگی بسر کی۔ ''جو کی روٹی کھا مگر آزادرہ'' ان کی زندگی کا اصول تھا۔ تمام عمر عسرت کا شکار رہے......

میں تو چٹنی سے کھا رہا ہوں شادؔ
دال بٹتی ہے جیل خانے میں

www.urduchannel.in

پتنگ بازی، کبوتر بازی، پچیسی اور شطرنج کا بڑا شوق تھا وہ بے انصافی کو برداشت نہیں کرسکتے تھے ''ان کی نظمیں، ''دسہرہ، ''گنگا اشنان''، ''مہترانی'' اور ''نمائش''، وغیرہ اس کی آئینہ دار ہیں۔ شادؔ عارفی کے لیے شاعری زندگی کی تنقید اور اس کا آئینہ تھا۔ انھوں نے گرد و پیش کے واقعات سے اپنی شاعری کے موضوعات منتخب کیے ہیں۔ شادؔ عارفی نے غزل کے سانچے کو اپنی شاعری کے لیے منتخب کیا......

تائید غزل کے بارے میں دو چار اشارے کیا کم ہیں
نو لمبی لمبی نظموں سے نو شعر ہمارے کیا کم ہیں

بقول گیان چند جین'' شاد عارفی عہد حاصر کے نقاد شاعر ہیں (تجزیے۔ صفحہ ۲۲) مجروحؔ کی طرح شاد عارفیؔ ے غزل کے علائم اور اس کی ایمایت سے اچھا کام لیا ہے اور اس میں مختلف مضامین سمو دیے ہیں، سیاسی مسائل پر بھی انھوں نے غزل میں تبصرہ کیا ہے:

برابر ہیں فغان درد و نغمہ
یہ آزادی نہیں تو اور کیا ہے

آزادیوں کے بعد وطن کی ترقیاں
آنسو جلا کے دیکھ ستارے بجھا کے دیکھ

اپنے عہد کے سیاسی تناظر پر اس طرح غزل میں روشنی ڈالی ہے کہ غزل کی تہہ داری، نرمی اور وسعت مجروح نہیں ہونے پاتی:

آپ کے دل کو اذیت ہوگی
میں اگر آپ کی باتوں میں نہ آؤں

ہم نے نزدیک سے دیکھا ہے اسے
وہ نہیں ہے کہ جو مشہور ہے وہ

ان اشعار میں محبوب نہیں وہ سیاسی رہنما مراد ہے جو عوام کو گمراہ کرتا اور ذاتی منفعت کے لیے دوسروں کو نقصان پہنچاتا ہے:

اصطلاحاً برے کو بھلا کہہ دیا
یعنی گالی نہ دی رہ نما کہہ دیا

تقسیم ملک کے فسادات پر اردو میں متعدد نظمیں لکھی گئی ہیں۔شاؔد عارفی نے اپنی غزل میں فسادات میں لٹنے والے گھروں کی پر اثر نشان دہی کی ہے:

اگر ہمارا یقیں نہیں ہے تو آیئے آپ کو گنا دیں
بہار میں جن کے آشیانے لٹے ہیں وہ اپنا ہاتھ اٹھائیں

سینک سکتے ہیں آپ بھی آنکھیں
آشیانوں کے جل رہے ہیں الاؤ

سیاست میں جو افراتفری پھیلی ہوئی تھی اور جو نراج کی سی کیفیت پیدا ہوگئی تھی اس کے بارے میں شاد عارفی کہتے ہیں:

ہمارے ہاں کی سیاست کا حال مت پوچھو
گھری ہوئی ہے طوائف تماش بینوں میں

شاؔد عارفی کی غزل غمِ دوراں اور غمِ جاناں کا اچھا امتزاج ہے۔ذاتی تجربات کے بیان میں بھی عارفی کی انفرادیت نمایاں ہے:

جب نظر بچی اس کی میں نے اس کو دیکھا ہے
میرے اس طریقے سے وہ بھی لطف لیتا ہے

ابھی ہیں امتحان شوق کے دن
ابھی جھوٹی قسم کھانے کے دن ہیں

ڈاک سے بھینی خوشبو والے خط پر خط آئے تو اک دن
پوچھے گا خط لانے والا بابو جی یہ کس کا خط ہے

www.urduchannel.in

آپ کو ہر الفت راس آئی، آئی ہوگی لیکن سنیے
میں نے جب جب پھول چنے ہیں کانٹوں میں دامن الجھا ہے

شاؔد عارفی کا لب ولہجہ یگاؔنہ چنگیزی کی یاد دلاتا ہے اس میں وہی ہلکا طنز، تیکھا پن، بیساختگی، صاف گوئی اور لطف موجود ہے جو یگاؔنہ کی غزلوں کی خصوصیت ہے۔شاؔد عارفی کا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے غزل پر یہ اعتراض کرنے والوں کا جواب دیا ہے کہ اس کے موضوعات میں تنوع نہیں ہے۔شاؔد عارفی نے غزل کی رمزیت اس کی علامتوں کی ایمائیت اور لچک داری سے کام لے کر مجروؔح سلطان پوری کی طرح غزل کے بارے میں پھیلی ہوئی غلط فہمی دور کرنے کی کوشش کی ہے اور نئے موضوعات سے غزل کے سرمائے میں اضافہ کیا ہے۔

......☆......

پروفیسر مظفر حنفی

شادؔ عارفی: ایک منفرد فنکار

اُردو غزل کی صدیوں پر محیط ، بے کراں روایت میں یہ سعادت گنتی کے تین چار شاعروں کو نصیب ہوئی ہے کہ ان کا ہر شعر اپنے لہجے کی بنا پر دور سے پہچانا جاتا ہے۔ شاد عارفی نے غلط نہیں کہا:

اور پھر کہتے ہیں کہ کس کو ندرتِ طرز ادا
میرے شعروں میں مری آواز پہچانی گئی

عام طور پر شادؔ عارفی کو ایک عظیم طنز نگار غزل گو کی حیثیت سے یاد کیا جاتا ہے، لیکن وہ عشقیہ غزل کے بھی اتنے ہی اہم شاعر ہیں۔ انھوں نے منظریہ، طنزیہ اور رومانی نظمیں اتنی اچھی اور ایسی کثیر تعداد میں کہی ہیں کہ تاحال تنقید یہ فیصلہ نہیں کر سکی کہ شادؔ کی غزل اور نظم میں سے کس کا پلّہ بھاری ہے۔ نثر میں بھی شادؔ عارفی نے تنقیدی مضامین اور مکتوبات کی شکل میں قابلِ لحاظ ادبی سرمائے کا اضافہ کیا ہے۔

شادؔ عارفی رام پور میں پیدا ہوئے وہیں عمر بسر کی اور وہیں وفات پائی۔ ان کا سالِ پیدائش ۱۹۰۰ء ہے اور سنہ وفات ۱۹۶۴ء۔ شاعری وہ نوعمری میں ہی کرنے لگے تھے۔ ان کی تخلیقی کاوشیں کم و بیش پچاس برسوں کا احاطہ کرتی ہیں۔ اس دوران ان کی شاعری میں کئی موڑ آئے۔ ایک جگہ خود کہا ہے:

www.urduchannel.in

وہ رنگیں نوائی ، یہ شعلہ بیانی
کئی موڑ آئے مری شاعری میں

بڑی بات یہ ہے کہ اُس دور میں بھی جسے شادؔ عارفی رنگیں نوائی سے تعبیر کرتے ہیں انھوں نے لب و رخسار والی روایتی شاعری نہیں کی بلکہ اپنے سچّے اور پُر جوش واقعاتِ عشق کو ایسے نادر لہجے میں اس ندرتِ ادا کے ساتھ پیش کیا کہ ان کی عشقیہ غزل کا ذائقہ اُردو کی عام عاشقانہ اور روایتی غزل سے منفرد ہو گیا۔ بقولِ شادؔ:

دوسروں کے واقعاتِ عشق اپناتے ہیں وہ
جن سخن سازوں کی اپنی داستاں کوئی نہیں

انھوں نے دو بار محبت کی اور جواب میں انھیں دوسری طرف سے بھی محبت ملی۔ ان کی عشقیہ غزلوں میں اس دوطرفہ محبت کے جیتے جاگتے، سچے اور تابناک مناظر دیکھے جا سکتے ہیں:

کام کی شے ہیں کروٹن کے یہ گملے اے شادؔ
وہ نہ دیکھے مجھے، میں اس کا نظارہ کر لوں

....

لائے ہیں تشریف تکیوں پر دُلائی ڈال کر
حُسن اور اس درجہ بے خوف و خطر میرے لیے

....

چھپائی ہیں جس نے میری آنکھیں میں انگلیاں اس کی جانتا ہوں
مگر غلط نام لے کے دانستہ لطف اندوز ہو رہا ہوں

....

اس سے جب پوچھا گیا چھُپ چھپ کے رونے کا سبب
دردِ دل کا کام اس نے دردِ سر سے لے لیا

....

دل نوازی جو بھرے گھر میں نہیں بن پڑتی
رُخِ محبوب پہ گیسو ہی بکھر پڑتا ہے

....

لکھ کر میرا نام اے شاؔد
اس نے بھیجا ہے رومال

....

بھولی سی ہم مکتب کوئی، کوئی سہیلی خالہ زاد
اُن کے ہاتھوں خط بھجواتے میں ڈرتا ہوں لیکن وہ

....

مسکرا دیں گے مرا نام کوئی لے دیکھے
وہ کسی فکر میں بیٹھے ہوں، کسی کام میں ہوں

....

ابھی انگڑائیاں لی جا رہی ہیں
سمجھتے ہیں ابھی دیکھا نہیں ہے

....

اُسے نسیمِ چمن کہہ رہا ہوں میں لیکن
کہیں نسیمِ چمن مُڑ کے دیکھتی بھی ہے

....

کیا لکھ رہے ہیں آپ مجھے دیکھ دیکھ کر
میں نے دیا جواب، غزل کہہ رہا ہوں میں

....

گیسو بدوش محوِ تماشائے آئینہ
اس کی نگاہ روزنِ دیوار نہیں

آج ہم نئی غزل کے عہدِ شباب میں غالباً اس نئے پن، نادرہ کاری اور غیر روایتی آہنگ کو اتنا محسوس نہ کر سکیں جتنا کہ آج سے ایک صدی پیشتر کے نقادوں نے شاؔد کی غزلوں میں محسوس کیا ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ یگاؔنہ اور فراؔق سے زیادہ شاؔد عارفی کو نئی غزل

www.urduchannel.in

کے بنیاد کاروں میں شمار کیا جاتا ہے۔ اس دور میں شاؔد کی عشقیہ نظمیں ''سماج''، ''ایک تصویر'' ''فسانۂ نا تمام''، ''بسنت''، پھول کی پتی سے''، ''وفائے وعدہ''، ''دسہرہ اشنان'' وغیرہ بھی بے حد مقبول ہوئی تھیں۔ شاؔد عارفی کی رنگیں نوائی کے بارے میں ڈاکٹر معصوم رضا راہؔی نے سچ کہا ہے:

''شاؔد کی عشقیہ شاعری کا پلڑا زمین کی طرف جھکتا ہے۔ غالباً ایسی ہندوستانی فضا اور گھریلو محبت، حسرؔت کی غزل اور فراؔق کی رباعی کے علاوہ اُردو شاعری میں صرف شاؔد کی عشقیہ نظم و غزل ہی پیش کر سکی ہے۔ ان کی محبت کے یہ گیت اتنے مقدس اور گھریلو ہیں کہ حسرت موہانی کے علاوہ کوئی اور شاعر عشق کی اس سادگی اور پاکیزگی کی منزل پر نظر نہیں آتا۔''

ہمارے عظیم اور قابلِ ذکر شاعروں میں میرؔ، فاؔنی اور یگاؔنہ کی تنگدستی اور پریشاں حالی کے تذکرے عام ہیں لیکن شاؔد عارفی کے حالاتِ زندگی ان سب سے زیادہ تلخ ہیں۔ کچھ ابتدائی برسوں کو چھوڑ کر انھوں نے تمام عمر انتہائی مفلسی، بے روزگاری اور پریشانی میں بسر کی۔ چالیس برس کی عمر میں شادی کی تو اہلیہ ڈیڑھ برس میں ہی انتقال کر گئیں۔ اعزّا و اقارب نے انھیں فریب دیے اور صحت بھی جواب دے گئی۔ طُرّہ یہ کہ طبعاً بیحد غیور اور خوددار تھے اس لیے کسی کی مدد قبول کرنا اپنی توہین سمجھتے تھے ان سب باتوں کے زیر اثر ان کا مزاجِ شعر، طنز کی طرف مائل ہو گیا اور انھوں نے زمانے کی نا انصافیوں اور خام کاریوں کے خلاف جہاد کرنے کے لیے اپنے قلم کو تلوار بنالیا:

میں دنیا پر طنز کروں گا
دنیا میرے کیوں درپے ہو

اور

اس نے جب سو تیر چلائے
میں نے ایک غزل چپکا دی

علامہ نیاؔز فتح پوری نے ان کی بابت لکھا ہے۔

"شاؔد عارفی زمانۂ حال کے شاعروں میں ایک خاص رنگ کے نقّاد و طنز نگار ہیں جن کی غزلیں اور نظمیں جارحانہ انتقاد سے تعلق رکھتی ہیں، ان میں کہیں کہیں مزاحی رنگ بھی آ جاتا ہے۔ اس رنگ کی شاعری میں ایک خاص لب و لہجہ کی ضرورت ہوتی ہے جس میں قطعیت بہت زیادہ ہو۔ اس کوشش میں بہت سے حضرات آرٹ سے ہٹ کر خشک واعظ بن کر رہ جاتے ہیں لیکن شاؔد عارفی شاعرانہ زہر خند، تبسم زیرِ لب کو کبھی ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔"

حق تو یہ ہے کہ اردو شاعری میں خالص طنز کی روایت جو انگریزی کے زیرِ اثر اور مزاح کے غلبے کی وجہ سے ادب میں دوسرے درجے کی چیز بن گئی تھی، شاؔد عارفی کی تخلیقات میں دوبارہ زندہ ہوگئی اور اس رنگ میں شاؔد عارفی نے وہ خاص طرز اختیار کی جس کے موجد بھی وہی تھے اور خاتم بھی وہی ٹھہرے، ملاحظہ ہوں یہ اشعار:

آشیاں پھول نہیں تھے کہ خزاں لے اڑتی
آپ اس بحث میں جانے کی اجازت دیں گے

....

مگر یہاں تو جل رہا ہے آدمی سے آدمی
سُنا یہ تھا چراغ سے چراغ جلتے آئے ہیں

....

دل میں لہو کہاں تھا کہ اک تیر آ لگا
فاقے سے تھا غریب کہ مہمان آ گیا

....

اُسے جس حال میں سجدہ کیا ہے
اسے اللہ بہتر جانتا ہے

....

کہنے والوں نے کہا ظلِّ الٰہی جن کو
ہم انھیں سایۂ دیوار نہیں کہہ سکتے

www.urduchannel.in

لاکھوں ہیں ہم سب بے چارے
اے شہزادو! تم سب کے ہو

....

جب چلی اپنوں کی گردن پر چلی
چوم لوں منہ آپ کی تلوار کا

....

کاروبارِ قفس اب یہاں آ گیا
یہ فلاں چل بسا، وہ فلاں آ گیا

....

ہمارے ہاں کی سیاست کا حال مت پوچھو
گھری ہوئی ہے طوائف تماش بینوں میں

....

کہیں رہ نہ جائے مشینوں کی دنیا
کہیں آدمی آ نہ جائے کمی میں

....

ناجائز پیسے کی اُجلی تعمیروں کے ماتھے پر
آپ نے لکھا دیکھا ہوگا یہ سب فضلِ باری ہے

....

جہاں تک ہماری غزل جائے گی
تغزّل کے معنٰی بدل جائے گی

بلا شبہ شاد عارفی نے تغزل کے معنی تبدیل کر دیے، غزل میں ایسی کاٹ پیدا کر دی، اس میں وہ معنویت اور مقصدیت شامل کی جس نے اُسے زمانۂ حال کی چیز بنا دیا اور اپنے معاشرے کی تمام خامیوں پر نشتر زنی کرنا سکھا دیا۔

نقدِ ماحول کہ فن ہے میرا
ہر طرف رُوئے سخن ہے میرا

بقول حفیظؔ جالندھری:

’’شادؔ عارفی اپنے اردگرد کے سیاسی اور ادبی دور سے مکمل باخبر ہی نہیں بلکہ مجاہدانہ اور سخت گیرانہ طریق پر اُس پُرآشوبی کے نقاد صادق ہیں۔ شادؔ نے اپنے دَور کے حالات سے جو احساسات اخذ کیے ان کا اظہار مثبت اور واضح طور پر قُدرتِ ادا کے ساتھ کیا ہے۔‘‘

شادؔ نے طویل و مختصر سو طنزیہ نظمیں بھی کہی ہیں جن میں اپنے عہد کی برائیوں اور کمزوریوں کی نشاندہی کرتے ہوئے سماج کی دُکھتی رگوں پر نشتر چلائے گئے ہیں۔ یہ نظمیں ایسی نئی نئی اور دلچسپ ہیئتوں میں ہیں کہ شادؔ عارفی کی فنکاری پر ایمان لانا پڑتا ہے۔ ان کی نظم نگاری پر اظہار خیال کرتے ہوئے خلیل الرحمٰن اعظمی رقمطراز ہیں:

’’شادؔ عارفی نے اپنے نظموں میں بیانیہ پیرایہ اختیار کرنے کے بجائے ڈرامائی، مکالماتی اور تمثیلی انداز اختیار کیا ہے۔ انھوں نے یہ کمال کیا ہے کہ ایک ہی مصرع کے اندر دو دو اور تین تین کرداروں کے مکالمے ادا کرنے کی کوشش کی ہے.....ٹی ایس ایلیٹ نے شاعری کی تین آوازوں کا ذکر کیا ہے۔ ان تینوں آوازوں کا ایک ہی نظم میں اجتماع بہت ہی مشکل کام ہے۔ شادؔ نے اُردو نظم میں یہ کام بھی کر دکھایا ہے۔‘‘

ان کی نظموں میں ’’شوفر‘‘، ’’پرانا قلعہ‘‘ ’’ان اونچے اونچے محلوں میں‘‘، ’’رنگیلے راجا کی موت‘‘، ’’نمائش‘‘، ’’ان سے ملیے‘‘ ’’ٹکڑ گدے‘‘ اور ’’ابھی جبلپور جل رہا ہے‘‘ وغیرہ اُردو نظم کے سخت سے سخت انتخاب میں جگہ پانے کی صلاحیت رکھتی ہیں۔

پروفیسر احتشام حسین نے لکھا ہے:

’’مجھے ذاتی طور پر شادؔ عارفی کی شاعری نے متاثر کیا۔ وہ جو تھے وہی ان کی شاعری ہے، زندگی نے انھیں جو دیا وہ اُن کے کلام میں کبھی غصّہ بن کر، کبھی طنز اور زہر خند بن کر اور کبھی دکھے دل کی پُکار بن کر محفوظ ہو گیا۔‘‘

اپنی عشقیہ اور طنزیہ غزل نیز منظریہ عاشقانہ اور طنزیہ نظموں میں شادؔ عارفی نے

www.urduchannel.in

جس مجتہدانہ شان کے ساتھ زبان کا تخلیقی استعمال کیا ہے جس طرح عام بول چال کے غریب اور ٹاٹ باہر الفاظ کو اپنے جادونگار قلم کے لمس سے ادبی شان عطا کر دی ہے اس کی مثال اُردو شاعری میں نایاب ہے اور یہ صفت انھیں سچے معنوں میں ایک عوامی شاعر بناتی ہے۔ پروفیسر آل احمد سرورؔ نے غلط نہیں کہا:

’’جو لوگ شاعری کی زبان اور بول چال کی زبان کو ایک دوسرے سے الگ کر کے دیکھتے ہیں، انھیں شادؔ کے کلام کا مطالعہ کرنا چاہیے۔ شادؔ نے بول چال کی زبان کی طاقت اور شعریت کو جس طرح اجاگر کیا اور جس طرح بقول ایذرا پاؤنڈ، حقیقی نفسیات کو زبان دی ہے اُسے جدید اُردو شاعری ہمیشہ یاد رکھے گی۔‘‘

کچھ اپنے کھرے مزاج کی وجہ سے اور کچھ اپنی شاعری کے بالکل ہی نئے رنگ کی وجہ سے اردو تنقید نے ان کی زندگی میں اس عظیم فنکار کو وہ اہمیت نہ دی جس کے وہ بجا طور پر مستحق تھے لیکن ان کی وفات کے تین سال کے اندر ہی ایک مجموعہ مضامین ’’ایک تھا شاعر‘‘ منظرِ عام پر آیا جس میں ہر اہم تخلیق کار اور ہر مکتبِ فکر سے تعلق رکھنے والے نقادوں نے شادؔ عارفی پر مضامین لکھ کر ان کی اہمیت اور عظمت کا اعتراف کیا۔ اس کے چند برس بعد ہی ان کی شخصیت اور فن پر ایک تحقیقی مقالہ بھی شائع ہو گیا۔ اسی طرح ان کی حیات میں انجمن ترقی اردو کے ایک مختصر سے انتخاب کے علاوہ کوئی ڈھنگ کا شعری مجموعہ تک نہیں شائع ہو سکا تھا لیکن انتقال کے بعد مرحوم کا تمام کلام ’’شادؔ عارفی کی غزلیں‘‘، ’’سفینہ چاہیے‘‘، ’’اندھیر نگری‘‘، ’’شوخیِ تحریر‘‘، ’’دکھتی رگیں‘‘، ’’کلیاتِ شادؔ عارفی‘‘ میں محفوظ ہو گیا ہے۔ ان کے مکاتیب اور مضامین ’’ایک تھا شاعر‘‘، ’’نثر و غزلدستہ شاد عارفی‘‘ اور ’’شادؔ عارفی ایک مطالعہ‘‘ میں شائع کیے جا چکے ہیں۔

شادؔ عارفی کی نثر بھی ان کی شاعری کی مانند انفرادی رنگ و آہنگ اور مخصوص لہجہ رکھتی ہے۔ مختلف لوگوں کے نام ان کے خطوط اور ادبی موضوعات پر ان کے مضامین سے کچھ مختصر مختصر اقتباسات پیش کیے جاتے ہیں جو برجستگی اور کاٹ میں شعروں کی طرح

پُرتاثیر اور پُرکیف ہیں۔فرماتے ہیں:

''کوئی بھی ادب کھجور یا ناریل کا درخت نہیں ہوتا کہ اس سے شاخیں نہ پھوٹیں۔''

''جوش ملیح آبادی کی آج کل کی شاعری پر اتنا تبصرہ کافی ہوگا کہ وہ اپنے قطعات میں لغت کمپوز کررہے ہیں۔''

''میرے نزدیک اچھے شعر کی تعریف اس میں نہیں کہ وہ صحیح ہو۔اپنے معنی پر دلالت کرتا ہو بلکہ میں کسی بھی شعر میں سب سے پہلے تخیل کی انفرادیت اور پھر ندرتِ ادا پر نظر ڈالتا ہوں۔''

''خطائے بزرگاں گرفتن خطا است، کے معنی یہ سمجھائے جاتے ہیں کہ اپنے بزرگوں کو ان کی غلطی پر ٹوکنا غلطی ہے حالانکہ وہاں گرفتن کے معنی ہیں تقلید۔مطلب یہ کہ بزرگوں کی غلطیوں کی پیروی نہ کرو۔''

''بلا مبالغہ ہر روز پچاس ساٹھ نادر تخیلات ذہن میں آتے ہیں لیکن مشکل سے پانچ چھ فنی گرفت میں آتے ہیں، باقی کو ترک کردینا پڑتا ہے اور صرف اس لیے کہ ان کو ادا کرنے کے لیے موزوں الفاظ دستیاب نہیں ہوتے۔''

''جلی ہوئی رسّی کے بل اور گھڑے کی چکناہٹ میں دنیا کو کیا پسند ہے۔ آپ جانتے ہیں اور مجھے کیا پسند ہے، دنیا جانتی ہے۔''

''سب سے اچھی کتاب وہ ہے جس میں بیان کی ہوئی باتیں کسی دوسری کتاب میں نہ پائی جائیں۔''

''ڈومنی ڈومنی کے ہاں بغیر معاوضہ لیے ناچتی ہے۔اس لیے میں شاعر ہو کر ایسے شاعر سے جو مدیر بھی ہو، ہزار مجبوریوں کے بعد بھی کچھ نہیں کہہ سکتا ہاں اس حکومت سے التماس کرسکتا ہوں جس کے ہاتھ جھوٹا موتی سچے موتی پر مسکراتا ہے۔''

www.urduchannel.in

''لوگ ادب نوازی کا ڈھونگ رچاتے ہیں مگر شاعر سے اپنے پیسے پیسے کے عوض قصیدہ چاہتے ہیں۔''

''کس قدر مہمل بات ہے کہ عیسائی، یہودی، سکھ، ہندو ہونے کی وجہ سے آپ اس کے یا وہ آپ کا دوست نہ بن سکے صرف اس لیے کہ آپ نماز پڑھتے ہیں وہ گنگا کو جاتا ہے یا واہ گرو خالصہ کا نعرہ لگاتا ہے۔''

''صرف لفظوں کو جمع کردینے سے تکملۂ شعر تو ممکن ہے مگر تاثیر دینا ممکن نہیں۔''

''غزلوں میں اشعار کی ترتیب موڈ کے تحت ہونی چاہیے۔مطلع سیاسی ہے تو پوری غزل سیاسی ہو، عاشقانہ ہے تو سب شعر عاشقانہ ہوں۔ایک قافیہ دوسرے کو کاٹتا ہوا نہ ہو، نفی اور اثبات کا اجتماع ٹھیک نہیں۔''

''میرا ایک مخصوص زاویۂ فکر ہے جو طنز و سیاست کے امتزاج سے پیدا ہوتا ہے۔ندرتِ ادا میرے نزدیک شعر کی جان ہے۔''

''ہمارے شعرا ایران و مصر پر اس طرح نظمیں لکھ رہے ہیں جیسے گھر پر سب خیریت ہے۔''

بحیثیت مجموعی شاؔد عارفی کی اہمیت اور عظمت سے کسی بھی دبستانِ ادب کو انکار نہیں ہوسکتا۔شمس الرحمٰن فاروقی کا یہ قول صد فیصد صداقت کا حامل ہے:

''شاؔد کی طنزیہ غزل ہی نے جدید غزل کی راہ ہموار کی..شاؔد عارفی بہر حال ایک عہد ساز شاعر تھے، ان کے بعد آنے والے ہر شاعر، بالخصوص نئی غزل کے ہر شاعر نے ان سے اکتسابِ فیض کیا ہے۔''

شاؔد عارفی کی متفرق شعری تخلیقات نظم وغزل کے علاوہ

رباعیات

رباعیوں میں بھی شاؔد عارفی نے اپنے مخصوص اسلوب اور نُدرتِ ادا سے کام لیا

ہے۔ ان کے اپنے خیال کے مطابق: ''آپ رباعی اور قطعے کے بارے میں غور فرمائیے چار مصرعوں کے اندر سمندر سمو دینا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ اس احاطے کے لیے کافی مشق کی ضرورت ہے۔ میرا خیال اور تجربہ تو یہ ہے کہ جب تک فن پر درو بست عبور نہ ہو، رباعی اور قطعہ کہنا (عمدہ قسم کا) ممکن ہی نہیں۔''

شادؔ عارفی کی قادر الکلامی، کہنہ مشقی اور فن پر درو بست عبور کے سلسلے میں کسی شک کی گنجائش نہیں ہے۔ اپنی رباعیوں میں ان صلاحیتوں کا انھوں نے پورا پورا استعمال کیا ہے۔ رباعی کی کم سخن اور مرد افگن صنفِ سخن موضوع کی وسعت اور لفظوں پر قدرت سے زیادہ خیال کی گہرائی اور چوتھے مصرعے کی قوت پر بات کو سمیٹ کر کہنے کا مطالبہ کرتی ہے۔ شادؔ عارفی اپنی رباعیوں کے اولین تین مصرعوں کے چلّے پر تاثر اور طنز کو مرتکز کر کے پوری شدت کے ساتھ چوتھے مصرعے کا تیر چلاتے ہیں اور یہ تیر ٹھیک نشانے کے دل میں جا کر بیٹھتا ہے۔ اپنی نظموں کے مقابلے میں شادؔ عارفی ان رباعیوں میں زیادہ گہرائیوں میں اترتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ نظم میں وہ اکثر و بیشتر معروضی انداز اختیار کرتے ہیں لیکن رباعی میں ان کی فکر کا اظہار براہ راست ہوتا ہے۔ اس صنف میں بھی روایت سے سرکشی کرتے ہوئے وہ ایسے عام موضوعات پر قلم اٹھاتے ہیں جن پر عام رباعی گویوں نے توجہ صرف نہیں کی۔ اچھوتے خیالات اور بانکا لہجہ ان رباعیوں کا خصوصی وصف ہے۔ اردو شاعری کی فلسفیانہ رباعیات کے انبوہ میں شاد کی رباعیاں اپنی کج کلاہی کے باعث صاف پہچان میں آتی ہیں۔ چند مثالیں ملاحظہ فرمائیے:

اے شخص نمائش کو اگر جائے گا — انجام بتا دوں گا تو ڈر جائے گا
منزل پہ پہنچنا تو یقینی ہے، مگر — دھڑ بیچ میں رہ جائے گا، سر جائے گا

....

افراطِ خرد بھی ہے بڑی نادانی — فکرِ شادابی وطن ہے در پیش
ہم سمندر کو دے رہے ہیں پانی — کھیت سوکھے پڑے ہوئے ہیں لیکن

....

www.urduchannel.in

جھوٹوں میں پتے کی بات کہنے والے — کہلاتے ہیں 'واہیات کہنے والے'
مسکراتے تھے حضرتِ موسیٰ پر — فرعون کو ربِّ کائنات کہنے والے

....

جنگل میں جو ذکرِ شہر دہراتا ہے — وہ سیر کے واسطے ہی کیوں آتا ہے
سبزے پہ کسی فکر میں ٹہلنے والا — سبزے کی طراوٹوں کو جھٹلاتا ہے

یہ رباعیاں جس نادر اسلوب میں کہی گئی ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔ وطن کو ترقی کی راہ پر گامزن کرنے کے نام پر ہم نے جو بڑی بڑی یوجنائیں تیار کی ہیں اور اربوں روپیہ صرف ہو جانے کے باوجود عوام کی پریشانیاں کم ہونے کی جگہ جس حد تک بڑھ گئی ہیں اس کے بارے میں شادؔ کی دوسری رباعی طنز کا شاہکار ہے، خصوصاً کھیتوں کے سوکھے پڑے رہنے اور سمندروں کو پانی دینے والی بات شاد عارفی ہی کہہ سکتے ہیں۔ مصلحت پسندی کے دور دورے میں حق گوئی و بیباکی جس طرح مطعون و معتوب ہوتی ہے اس کی مثال میں فرعون کو ربِّ کائنات کہنے والوں کا حضرتِ موسیٰ پر مسکرانے کا ذکر بھی شادؔ کے تیکھے اور منفرد انداز میں ہے۔ یہی عالم چوتھی رباعی کا ہے جس میں شادؔ نے اپنے مخصوص لہجے میں سبزے کی طراوٹوں کو جھٹلانے والے فکر مند شہریوں پر طنز کیا ہے۔ یہ بات میں بات پیدا کرنے کی تکنیک شاد کی سبھی رباعیوں میں ملتی ہے۔ لیکن دوسری اصنافِ سخن میں شاد عارفی نے جو کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں، انھیں مدِ نظر رکھتے ہوئے ان رباعیوں سے شادؔ کی عظمت میں کوئی خاص اضافہ نہیں ہوتا۔ یہاں یہ بھی ملحوظ ہوگا کہ اچھی رباعیات کا وافر ذخیرہ شادؔ سے قبل بھی اردو میں موجود تھا۔ سوداؔ، میرؔ، انیسؔ، حالیؔ اور اکبرؔ جیسے مشاہیر شعرا کی رباعیاں کم نہ تھیں ان میں شاد کے معاصرین جوشؔ، امجدؔ حیدر آبادی، یگانہؔ اور فراقؔ وغیرہ نے جو گراں قدر اضافے کیے ہیں ان کے مقابلے میں شادؔ کی یہ رباعیاں سمندر کو پانی دینے کے مترادف ہیں لیکن اس سے یہ مطلب اخذ کرنا بھی مناسب نہ ہوگا کہ ان رباعیات کی تخلیق سے شادؔ کے مرتبے میں کوئی فرق آتا ہے حق یہ ہے کہ انھوں نے ان میں کہیں اپنی

بلند سطح سے نیچے اُتر کر بات نہیں کی اور اپنے وقار و معیار کو بہر حال برقرار رکھا ہے۔ان رباعیوں کی تعداد بھی نسبتاً کم ہے اس لیے انھیں بہت زیادہ اہمیت نہ دے کے شاؔد کے تبرکات میں جگہ دینی چاہیے۔

قطعات

شاؔد عارفی کے یہ قطعات اردو شاعری کے اس قدیم روایتی قطعہ سے مختلف ہیں، جس کے لیے تعدادِ اشعار متعین نہ تھی۔ روایتی قطعہ موضوع کے لحاظ سے بھی مسلسل واقعہ نگاری کے لیے مخصوص تھا اور اس میں داخلی یا خارجی کوائف کا مسلسل اور مربوط بیان ہوتا تھا۔ شاؔد کے جن قطعات پر گفتگو کی جا رہی ہے وہ دو دو اشعار پر مشتمل اس قسم کے جدید الاسلوب قطعات ہیں جن کے لیے پروفیسر اختر انصاری (دہلوی) اور نریش کمار شاؔد مشہور ہیں۔ عام طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ ایسے قطعات اپنی فطرت میں مخصوص بحروں کی پابندی سے آزاد رہ کر صنف رباعی سے متعلق ہوتے ہیں اور یہ کہ رباعی میں پہلے دوسرے اور چوتھے مصرعوں کا آپس میں ہم قافیہ اور مردّف ہونے کی صورت میں ہم ردیف ہونا بھی لازمی ہے لیکن جدید قطعہ میں شاعر جب چاہے تو یہ التزام برتے یعنی ایک مطلع اور ایک شعر سے قطعہ مکمل کرے اور اس کا جی چاہے تو محض دوسرے اور چوتھے مصرعوں کو آپس میں ہم قافیہ (اور مردّف ہونے کی صورت میں ہم ردیف) رکھ کر قطعہ پورا کر سکتا ہے۔ یعنی دو عام اشعار میں قطعہ کہنے کے لیے آزاد ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ جدید قطعات اور رباعیوں میں ایک بڑا فرق ہے وہ یہ کہ رباعی میں بطور خاص چوتھا مصرع اہم ترین حیثیت رکھتا ہے اور اوّلین تین مصرعے اس کی قوت میں اضافہ کرنے کی غرض سے کہے جاتے ہیں جب کہ جدید قطعہ میں اس کے چاروں مصرعے یکساں اہمیت کے حامل ہوتے ہیں۔ اس طرح یہ قطعہ دراصل ایک مختصر نظم ہوتا ہے جس میں خیال کا تسلسل بھی ہوتا ہے اور ارتقا بھی۔ شاؔد عارفی کے زیرِ بحث قطعات بھی اسی ذیل میں آتے ہیں ان قطعوں میں ندرت اختراعیت اور بانکپن کے ساتھ شاؔد کا مخصوص تیکھا پن نظر آتا ہے۔ مثلاً:

www.urduchannel.in

ان کی محفل میں شکووں کا عادی کوئی کان نہیں
ہر فریادی چھوڑ رہا ہے تیر غلط اندازے پر
اس بت سے ماحول کی الجھن کہنے سے کیا حاصل شاد
احمق ہی آوازیں دے گا قفل پڑے دروازے پر

....

کنکری جوتے میں پڑ جائے اگر
راہرو دو گام چل سکتا نہیں
روح زندہ ہو تو حق تلفی کا بوجھ
آدمی کے جی سے ٹل سکتا نہیں

....

خون کا جن سے تعلق ہے اگر دشمن ہیں آج
ان کے اس طرزِ عمل کا کس لیے شاکی ہے تو
تجربہ شاہد کہ ہر گولی غلط پڑنے کے بعد
رہبری کرتا ہے زخمی شیر تک اُس کا لہو

....

کسی شہکار کی تخلیق کے بعد
کاٹ لیتے تھے جو معمار یے ہاتھ
اب وہ سفاک نہیں ہیں، پھر بھی
غیر محفوظ ہیں فن کار کے ہاتھ

بے حس اشخاص سے جی کی الجھن کہنے کو قفل پڑے ہوئے دروازے پر آوازیں دینے کی حماقت سے تعبیر کرنا، حق تلفی کی خلش کو جوتے میں پڑی ہوئی، مستقل تکلیف دینے والی کنکری کہنا، خون کا رشتہ رکھنے والوں کی دشمنی پر زخمی شیر کے لہو سے اس کی نشاندہی کا تعلق پیدا کر دینا، فن کار کے ہاتھوں کا ہنوز غیر محفوظ ہونا ہر چند کہ شاہکار کی

تکمیل کے بعد معمار کے ہاتھ کٹوا دینے والے رُسوائے زمانہ سفاک نہیں رہے، ہر قطعہ خود بول رہا ہے کہ وہ شاؔد عارفی کا ہے، لیکن اپنی ندرت اور جدت کے باوجود شاد کی غزلوں اور نظموں کے مقابلے میں ان کے ہاں قطعات اتنی قلیل تعداد میں ملتے ہیں کہ ابھی ان کے سلسلے میں آخری رائے قائم کرنا قبل از وقت ہوگا البتہ اگر اردو شاعری میں اچھے جدید قطعات کی کمیابی کو مدِّ نظر رکھتے ہوئے محض ان قطعوں کے بل بوتے پر ہی دوسرے قطعہ گویوں کی صف میں شاد عارفی کے مقام کے تعین کا سوال ہو تو انھیں بلا خوفِ تردید نریش کمار شاؔد سے بلند مقام دے کر اختر انصاری (دہلوی) کے برابر بٹھانا مناسب ہوگا۔ جہاں تک خود شاد کی غزلوں اور نظموں کے مقابلے میں ان کے قطعات کی اہمیت کا سوال ہے، انھیں ان کے بھرے پُرے ترکش کے ایک تیر سے زیادہ وقعت نہ دینی چاہیے کیونکہ میرا خیال ہے کہ شاؔد خود بھی اس طرف زیادہ سنجیدگی کے ساتھ متوجہ نہیں ہوئے، محض کبھی کبھار منہ کا ذائقہ بدلنے کے لیے قطعہ بھی کہہ لیا کرتے تھے یوں شاؔد کا مندرجہ ذیل قطعہ کچھ اور ہی کہتا ہے:

بِندی ہو کہ خال ہو کہ مصنوعی تِل
مصرف تیرگی اگر آتا ہے
روئے شاداب و مہ جبیں پر اے دوست
ایک نقطہ بھی لطف دے جاتا ہے

نعت، منقبت، سلام وغیرہ

شاؔد کے ہاں نعتیں، منقبت، سلام اور کچھ مذہبی نوعیت کی نظمیں بھی ملتی ہیں۔ رسائل میں ان کی ایسی چیزیں بہت کم شائع ہوئیں، اس لیے اس قسم کی نظموں کی صحیح تعداد کا تعین فی الحال ممکن نہیں ہے۔ چونکہ انھیں مذہب سے خاصا لگاؤ تھا اس لیے ان چیزوں میں بھی خلوص اور جذبے کی کارفرمائی نظر آتی ہے اور جگہ جگہ ان کا مخصوص اسلوب جھلک مارتا ہے۔ اس نہج کی نظموں میں ان کی طویل نظم ''فاروقِ اعظم'' ایک ادبی شاہکار کا درجہ رکھتی ہے۔ اس کی پہلی چار قسطیں 'خطہ ہائے عرب کی حالت طوفانِ نوح کے بعد' 'حضرت

www.urduchannel.in

ابراہیمؑ کا مع حضرتِ ہاجرہ و حضرتِ اسمٰعیلؑ عرب کی طرف جانا، وادی صفا مروہ میں حضرت ہاجرہ کی گھبراہٹ اور قبیلہ بنی جرہم کو چشمے کی اطلاع، شائع ہو چکی ہیں۔ افسوس کہ باقی ماندہ حصوں کا تا حال کہیں سراغ نہیں ملتا۔ اگر یہ مکمل نظم دستیاب ہو سکی تو غالبًا ہمارے ادب میں ایک اچھی اور صحیح معنوں میں مذہبی تاریخی نظم کا اضافہ ہوگا۔ اس نظم کے چند اشعار بطور نمونہ حاضر ہیں۔ وادیٔ صفا مروہ میں حضرت اسمٰعیلؑ کی پیاس اور جناب ہاجرہؓ کی پریشانی کے باب میں لکھتے ہیں:

زبان و کام و لب مرجھا گئے جب پیاس کے مارے
نگاہِ عافیت بیں کو نظر آنے لگے تارے

مصیبت میں کہیں ذوقِ عمل بنتا ہے فریادی
جنابِ ہاجرہ کے پاؤں تھے اور وسعتِ وادی
ہٹا کر پھول کو آغوش سے کچھ دور ہٹ جاتیں
مگر جب لختِ دل کا دھیان آجاتا پلٹ آتیں

بہ فیضِ خالقِ باری، بہ رمزِ رازِ دلداری
جو تڑپی فطرتِ معصوم، زمزم ہو گیا جاری

اس نوعیت کی کچھ دوسری نظموں کے اقتباسات بھی ملاحظہ فرمایئے:

ضریحِ شاہِ شہیداں کا احترام کرو
مزارِ پاک کا نقشہ سہی، سلام کرو
معاویہؓ کا وہ بیٹا، یہ فاطمہؓ کا لال
جو تم پہ ہو تم بتاؤ کسے امام کرو
علم اٹھا کے بڑھو ظلمتوں کے لشکر پر
حصولِ مقصدِ کرب و بلا میں کام کرو
(سلام)

مل چکے اشکوں کے موتی خاک میں
آبرو ہے پردۂ صد چاک میں
آ گیا حالات سے دم ناک میں
آسماں کا ساتھ دیتی ہے زمیں
السلام علیک، ختم المرسلیں
ڈگمگاتے ہیں قدم، شاہا مدد
ہیں کڑی منزل میں ہم شاہا مدد
غیر کے در پر نہ جھک جائے جبیں
السلام علیک، ختم المرسلیں

(سلام بحضور سلطانِ مدینہ ﷺ)

پیار کی نظروں سے دیکھے رحمتِ باری ہمیں
لازم آتا ہے یہاں نازِ گنہگاری ہمیں
ہم کو احساسِ سفر کی داد ملنی چاہیے
روکتی ہے منزلِ یثرب سے ناداری ہمیں

(نعت)

اے بدمستو، اے بے باکو کہتے ہیں ایمان حیا کو
ٹھکراتے تھے شاہِ مدینہؐ ہم اپناتے ہیں دُنیا کو
زاہد پر اظہارِ حقیقت آئینہ ہے نابینا کو
کوئی پیٹ تھپک دیتا ہے اٹھتے ہیں جب ہاتھ دعا کو

(نعت)

عرفان اللہ شاہ نوراللہ مرقدہٗ کی تاریخ وفات پر ایک اردو قطعہ اور فارسی میں ایک منقبت حضرت سید عرفان شاہؒ کی شان میں ملتی ہے جس میں مندرجہ ذیل شعر سے موصوف کی تاریخِ وفات بھی برآمد ہوتی ہے:

چوں زہاتف بہ وضع ''بین'' شنید سید عرفان شاہ رحلت کرد

سہرے اور مبارکبادیاں

شاعر ہونا بھی اچھی خاصی مصیبت ہے۔ یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ لوگوں نے شاؔد جیسے فنکار سے بھی سہرے اور مبارکبادیاں لکھوا چھوڑیں۔ جن مجبوریوں کے تحت اس نوعیت کی چیزیں لکھنی ہوتی ہیں ان کا بالتفصیل اور دلچسپ بیان انھیں کی ایک طنزیہ نظم ''گویم مشکل، وگرنہ گویم مشکل'' میں ملتا ہے۔ ایسی چیزوں کی حیثیت وقتی اور رسمی ہوتی ہے لیکن ان میں بھی شاؔد نے اپنی انفرادیت کی مہریں ثبت کر رکھی ہیں۔ مثلاً:

اگر شادی کا منشا وسعتِ تخلیقِ عالم ہے
تو پھر تائید استقبال ہے فی الحال سہرا

(سہرا وصؔی اقبال)

پھر اس کے بعد یہ سہرے قبول ہوں گے شاؔد
رواج و رسم کے ذہنوں میں انقلاب تو لاؤ

(سہرا ریاض)

حیا و عفت و عصمت پہ احتیاط کے ساتھ
'حجاب' رنگ، ہے دُلہن کی لاج کا سہرا

(سہرا کرتار سنگھ تاؔج عارفی)

زہے جرأت کہ قریبِ رُخِ شہزادہ ہے
زہے قسمت کہ قدم چوم رہا ہے سہرا

(سہرا مرتضیٰ علی خاں)

راہی نے منزل پا لی ہے سہرا پھولوں کی ڈالی ہے
پھول چمن میں، بچے گھر میں یہ نوبت آنے والی ہے

(نظم بطرزِ سہرا)

ہاتھ آئی ہے دولہا کے وہی میناسی بھاگن

www.urduchannel.in

جو رات کے گھونگھٹ کو اُلٹ دے تو بنے دِن
جو کام کٹھن ہم کو ہیں وہ ہیں اسے ممکن
(نظم مبارکبادی)

بچوں کے گیت

شاؔد عارفی کے یہاں بچوں کے گیت بھی ملتے ہیں لیکن ان کی تعداد بہت ہی کم ہے۔ مثلاً 'سبق'، 'پیارے بچو' اور 'رخصت ہوئی سہیلی' وغیرہ ۔نمونے کے طور پر کچھ اقتباسات دیکھیے:

گیندے پہ ہے اُداسی
جوہی پڑی ہے پیاسی
حسرت سے دیکھتی ہے، چپکی کھڑی چنبیلی
رخصت ہوئی سہیلی
(رخصت ہوئی سہیلی)

ضعیفوں کو سہارا دو سنبھالو غریبوں کی مصیبت سر سے ٹالو
کوئی فرقہ ہو سینے سے لگا لو لب جو ایک جا سرو وسمن ہے

اعلیٰ قسم کی ایک نظم تثلیث ہے جس میں شاؔد نے محمد اسحٰق گجراتی کی نظم 'پیغام عمل' کے ہر شعر پر صرف ایک ایک مصرع بڑھا کر اسے مثلث کی شکل دے دی ہے:

میری مانو تو ایک کام کرو
جب ملاقات ہو سلام کرو
سب بزرگوں کا احترام کرو
(تثلیث)

یوں تو ان گیتوں میں شاؔد نے اپنے لہجے کی انفرادیت کے علاوہ اور کسی خاص ندرت کا مظاہرہ نہیں کیا، دوسرے ان کی تعداد اتنی کم ہے کہ انھیں شاؔد کے کلیات میں محض تکمیل کی غرض سے شامل کرنا ہوگا اور مقالے میں ان کا ذکر بھی اسی وجہ سے کیا گیا۔

www.urduchannel.in

ہندی شاعری

اس کے باوجود کہ شاؔد ایک مولوی خاندان میں پیدا ہوئے، مذہبی رُجحان رکھتے تھے، رام پور جیسی مسلم ریاست اور متشرع بستی میں عمر گزاری، انھیں ہندی سے خاصا لگاؤ تھا چنانچہ نہ صرف یہ کہ انھوں نے ہندی امتحانات پاس کیے بلکہ اس زبان میں کئی گیت اور اپدیش بھی لکھے۔ مسیحا نظامی لکھتے ہیں:

''۱۹۳۸ء میں میرا ہفت روزہ اور بعد ازاں سہ روزہ اخبار 'اقبال' شائع ہوتا تھا۔ اس میں شاؔد نے 'اُپدیش' کے مستقل عنوان سے ہندی زبان میں قطعات کا سلسلہ شروع کیا تھا۔ ان مفید عام اُپدیشوں کا سلسلہ عرصے تک جاری رہا تھا۔ میرا اخبار ان اُپدیشوں کی وجہ سے ہندو عوام میں بے حد مقبول ہو گیا تھا اس کی اشاعت بڑھ گئی تھی اور ہاکروں کے پاس زیادہ پرچے نکلتے تھے۔'' چند اپدیش آپ بھی ملاحظہ فرمایئے:

ورنوں کا وشواس ہے مُورکھ من کی بھول
پھلواری کا روپ ہیں رنگ رنگ کے پھول
شودر، ویشیہ اور چھتری رکھتے ہیں کیوں بیر
بن میں تو لڑتے نہیں، پیپل، سرس، ببول
....
ہٹ دھرمی کا پھل کڑوا ہے کر لے گیانی سوچ بچار
ہم، تم، تو کے بھنور میں پھنس کر کبھی نہ ہوگا بیڑا پار
سیدھا رستہ چھوڑ کے پگڈنڈی پر چلنا ٹھیک نہیں
گنگا کی شاخیں اچھی ہوتی ہیں یا گنگا کی دھار
....
ایکے سے کترانے والا ایشور شکتی کیسے پائے
تھم تھم کر آکاش سے برسی بوند بوند دھرتی پی جائے
بکھرے اور بن بیدھے موتی، موتی ہوتے ہیں، کنتو

موتی بدھ کر دھاگے میں پوجائے سو مالا کہلائے

....

زبان کا لوچ، روانی، سلاست اور تمثیلوں کا ٹھوس اور حقیقت آمیز انداز کس درجہ موثر اور دل نشیں ہے۔ افادیت کا پہلو ان اُپدیشوں کا نمایاں وصف ہے۔ فرقہ وارانہ اختلاف کو دور کرنے کی کاوش، قومی یکجہتی اور پیامِ عمل ایسی سیدھی سادہ آسان ہندی میں نظم کر دیے گئے ہیں جنھیں معمولی اردو اور ہندی جاننے والے اصحاب بھی بہ آسانی سمجھ سکتے ہیں۔ ان اُپدیشوں کا انداز بے حد مؤثر اور دل میں اتر جانے والا ہے۔

اُپدیشوں کے علاوہ ان کی کچھ ہندی نظمیں بھی ملتی ہیں جن میں سے بہ اعتبار موضوع 'نظم مبارک بادی بتقریب شادی سریش چند' کا ذکر 'سہرے اور مبارکبادیاں' کے ذیل میں گزشتہ صفحات میں کیا جا چکا ہے۔ دوسری نظم 'ساون بیت چکا ہے کِنتو.....' کے کچھ چھند ملاحظہ فرمائیے:

تال تلیوں میں من کو ہر لینے والے کنول وہی
جیون میں ایشور شکتی بھر دینے والے کنول وہی
گھنے گھنے پیڑوں میں پکشی مل کر مالا جپتے ہیں
لالے کے پھولوں کی لپٹ سے لوبھی بھونرے تپتے ہیں
پکڑت ہے نین کے آنچل ہر پھلواری اُسی سمان
پھولوں سے بھر پور ہے اب بھی کیاری کیاری اُسی سمان
ہری ہری بانات بچھی ہے سگرا جنگل لہکا ہے
ساون بیت چکا ہے کِنتو وایو منڈل مہکا ہے

....

ان نظموں میں بڑے خوبصورت مناظر اور نازک جذبات رسیلی اور کومل زبان میں نظم کر دیے گئے ہیں۔ ان کی ادبی قدر و قیمت خواہ بہت زیادہ نہ ہو لیکن ہندی شاعری بہر حال شادؔ کے چلّے کا ایک اور تیر ہے جو زیادہ دور مارنہ ہونے کے باوجود نشانہ صحیح لیتا ہے۔

............☆............

www.urduchannel.in

پروفیسر محمد زماں آزردہ

شادؔ عارفی کی غزل کی انفرادیت

اردو شاعری میں غزل کی صنف فارسی سے آئی ہے۔ اردو والوں نے فارسی غزل گویوں کے تتبع میں اس کے مضامین کا دائرہ بھی اول اول تنگ اور محدود رکھا، مگر اس گود لی ہوئی اولاد ''غزل'' نے بلوغیت تک آتے آتے جب زندگی کی دہلیز پر قدم رکھا تو اس نے اپنے خد و خال، ہاتھ پاؤں اور حسنِ ادا کے جوہر اس طرح دکھلائے کہ زمانے کی آنکھیں خیرہ ہو کے رہ گئیں۔ اردو غزل نے حسن و عشق، تصوف اور مجاز کے مضامین کو اپنے سایہ سے کبھی الگ نہیں ہونے دیا مگر اسی پیرائے میں زندگی کے آلام و اوہام، جبر و اختیار، زیردستی و زبردستی، خود سپردگی و جاں آفرینی، فتح و شکست، اجتماع و انتشار سبھی کوائف کو اس طرح اپنے دامن میں سمیٹے رکھا کہ یہ سب ایک ہی گھر کے مختلف المزاج افراد کی حیثیت سے سانس لیتے رہے، ایک دوسرے کو بچشمِ اعتبار یا بچشمِ کم دیکھتے رہے۔ یہ ایک دوسرے کا منہ بھی چڑھاتے رہے اور ایک دوسرے کے مضر اثرات کو زائل بھی کرتے رہے۔ غرض غزل نے اس پتھر کی صورت اختیار کر لی جو اپنے اندر بتِ ہزار شیوہ رکھتا ہے اور ہر غزل گو اپنے ذہن میں سجے ہوئے بت کو اس پتھر سے تراش کر ایک مثال پیش کرتا گیا، یہاں تک کہ غزل نے ایک ایسی مثالی دنیا آباد کی جس میں ہر آدمی آئینے کی صورت، اپنی صورت یا اپنے ہم شکل کو دیکھتا رہا اور غزل کی مقبولیت کا سب سے بڑا راز یہی ہے کہ یہ ہر آدمی کو اس کا اپنا عکس دکھاتی ہے۔ غم ہو یا خوشی، امارت ہو یا غربت، ہجر ہو یا وصال، دنیا داری ہو یا فقیری، غزل سب کے لیے یکساں طور پر باعثِ تسلی و تشفی ہے۔

اردو غزل کے سفرِ حیات کا اگرچہ قلی قطب شاہ اور اس کے معاصرین سے آغاز ہوا مگر میر تقی میرؔ جسے خدائے سخن بھی کہا گیا اور ناخدائے سخن کہہ کے بھی پکارا گیا، نے غزل کے محدود دائرے کو اتنی وسعت دی کہ یہ دائرہ در دائرہ زندگی کی صورت زندگی کے تمام حقائق یعنی اس کی تمام لطافتوں اور کلفتوں کو اس طرح اپنے اندر سمیٹتی گئی کہ خود غزل ہمارے معاشرے اور ہماری سماجی زندگی کی تصویر اور تفسیر بنتی گئی۔ غالبؔ نے اس میں اور وسعتیں پیدا کر لیں۔ ایسا لگتا ہے کہ میرؔ نے بحرِ حیات میں ایک کنکر اس طرح پھینکا تھا کہ اس سے سمندر کے پانی میں نہ صرف حرکت پیدا ہوگئی بلکہ ایک دائرہ سا بن گیا جو دائرہ در دائرہ پھیلتا ہوا بہت دور تک پہنچا۔ اردو غزل نے اس طرح اپنے حیطۂ عمل میں صرف سماجی اور اخلاقی اقدار ہی کو نہیں لیا بلکہ سیاسی معاملات اور اتھل پتھل کو بھی اپنے کلیجے سے لگایا اور انھیں غزل کی لفظیات، غزل کی تشبیہیں اور استعارے دیے۔ چنانچہ چکبستؔ، اقبالؔ، جگرؔ حسرتؔ اور جوشؔ وغیرہ نے اس خوش گوار اور اہم فریضے کو بحسن وخوبی انجام دیا۔ اس طرح صنف غزل نے اردو کے شاعر کو تخیل کی دنیا کے ساتھ ساتھ اپنے سماجی، تہذیبی اور سیاسی اقدار کا بھی امین بنا دیا۔

شادؔ عارفی اسی روایت کے امین اور اسی سلسلے کی ایک اہم کڑی ہیں۔ بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ اس کا ایک ایسا حصہ ہیں جو بظاہر سب سے الگ ہے مگر تعمق میں سب کا ترجمان ہے۔ شادؔ عارفی نے جب آنکھ کھولی تو ہندوستان کی زندگی مختلف تھی۔ اس سے قبل یہاں کی زندگی میں ایک ابال تو آیا تھا مگر وقت کے تھپیڑوں اور ناکامیوں کے سیلاب نے اس جوش کو اس قدر ٹھنڈا کر دیا تھا کہ ناکامیاں اس کی قسمت اور صبر اس کا مداوا اور شکر اس کا ظاہری پہناوا ہو گیا تھا۔ ایسے میں یہ امید کرنا کہ کوئی زبردست انقلاب نظر آئے گا، نامناسب بات تھی۔ ہندوستان کی حالت اس ستم رسیدہ خاتون کی سی تھی جس کی عصمت ہی نہیں، لباس اور زیور بھی لُٹ چکے تھے اور ذہن کو زنجیروں سے جکڑ رکھا تھا۔ ہاتھ پاؤں آزاد تھے مگر ذہن کی زنجیریں اس کو حرکت نہیں کرنے دیتی تھیں۔ پھر پھڑاہٹ ضرور موجود تھی مگر پرواز اس کی قسمت میں نہیں تھی۔ امیرؔ، منیرؔ، جلالؔ، محرومؔ، فانیؔ وغیرہ غزل کے فن کے اعتبار سے معنی

www.urduchannel.in

آفرینی اور فضا آفرینی میں اپنی جگہ لاجواب تھے، مگر سماجی اور سیاسی سطح پر یہ کسی زبردست تحریک کے نقیب نہ بن سکے۔ اس کمی کو ان شاعروں نے پورا کیا جن کے نام میں اس سے پہلے بھی لے چکا ہوں۔ یعنی چکبستؔ، اقبالؔ، جگرؔ، جوش وغیرہ۔ شادؔ عارفی ان دو لکیروں کے درمیان ایک ایسا نقطہ تھا جو دونوں سے مساوی فاصلے پر دونوں کو دیکھ رہا تھا اور ان دو لکیروں پر براجمان تماشائی بھی اس کو برابر دیکھ رہے تھے۔ شادؔ عارفی کو خود بھی اس بات کا احساس تھا۔ مظفر حنفی صاحب نے ان کے ایک انٹرویو سے، جو سلطان اشرف نے لیا تھا، ان کا ایک جملہ پیش کیا ہے:

''میری شاعری جس ماحول میں پروان چڑھی وہ گھٹا ہوا ماحول تھا اور میں اس گھٹن سے بیزار تھا۔''

شادؔ عارفی ایک چھوٹی سی ریاست لوہارو میں پیدا ہوئے۔ لوہارو اگرچہ ایک چھوٹی ریاست تھی مگر مزاج میں ریاستیں چھوٹی بڑی نہیں ہوتیں۔ مزاج ان کا یکساں ہوتا ہے۔ راجاؤں اور نوابین کے علاوہ کسی کو وہ آزادی نہیں ہوتی جو اوسط درجہ کے انسان کے لیے ضروری ہے، چہ جائیکہ کوئی دانا اور دانش ور ہو، جس کو ویسے بھی خوشامدیوں اور چاپلوسوں، جابروں اور زبردستوں میں رہتے ہوئے گھٹن کا احساس ہوتا ہے۔ شاد عارفی کا تعلق متوسط طبقے سے تھا اور یہ متوسط طبقہ نہ تو قوتِ بازو سے کام لے سکتا ہے اور نہ خوشامدیوں کی زبان استعمال کر سکتا ہے۔ اس کی زبان پر جھوٹ بمشکل آتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ریاستوں میں یہی طبقہ زیادہ مظلوم رہتا ہے۔ مظفر حنفی نے جوشؔ کے حوالے سے ریاستوں کے اس متوسط طبقے کا حال یوں نقل کیا ہے:

''امرا کے گرد و پیش نااہلوں، جاہلوں، خوشامدیوں، منافقوں اور مسخروں کے لشکر جمع ہو جاتے ہیں۔ متوسطین کا طبقہ ہی ہر قوم میں ریڑھ کی ہڈی ہوا کرتا ہے، امرا کے ہاتھ سب سے زیادہ یہی طبقہ پامال اور ذلیل رہتا ہے۔''

چھوٹی ریاستوں میں چونکہ حکمران کمزور ہوتا تھا، اس لیے ان ریاستوں میں متوسط

طبقے پر زیادہ دباؤ رہتا تھا۔ رام پور اور لوہارو دونوں چھوٹی ریاستیں تھیں اور شاؔد عارفی ذہنی اعتبار سے اس قدر بالیدہ تھے کہ باہر سے تنے ہوئے تھے مگر اندر سے قوتِ مدافعت نہ ہونے کے برابر تھی۔ وہ زندگی اپنے رنگ میں جینا بھی چاہتے تھے اور کسی کے سامنے خمیدہ سر ہو کے بھی رہنا نہیں چاہتے تھے۔ چنانچہ اپنی ذات کے بوجھ نے انھیں خمیدہ کمر تو کر دیا لیکن اپنے سر کو خم نہیں ہونے دیا۔ اپنے احساسات کے اظہار کے لیے ظاہر ہے کہ ان کے پاس غزل سے بڑھ کر سہارا نہیں ہوسکتا تھا۔ انھوں نے نظمیں بھی کہیں مگر غزل کے اشعار، غزل کا مزاج اور باوجود تنگیِ داماں کے غزل میں جہاتِ بیاں کے انداز ان کی اندر کی بھڑاس کے نکالنے میں نہایت ممد ہوئے۔ غزل کے اشعار سے انھوں نے آہ اور واہ دونوں کے کام لیے۔ طنز کے ہتھیار بھی وہ غزل ہی کے اشعار کے قالب میں کام میں لاتے رہے۔

شاؔد عارفی کی زندگی میں وہ دور بھی آیا جسے ترقی پسند کے نام لکھ دیا گیا۔ اس لپیٹ میں کئی شاعر آ گئے۔ ترقی پسندوں نے جہاں اقباؔل اور فیضؔ کو گود لینے کی کوشش کی وہاں ان کی امیدیں شاد عارفی سے بھی وابستہ ہوگئیں، جب کہ شاؔد عارفی ایسے مسلمان تھے جسے اپنے مذہب کی وجہ سے انسانوں سے دلچسپی تھی، غریبوں سے محبت تھی، مسکینوں سے ہمدردی تھی۔ ڈاکٹر نصرت جہاں صاحبہ نے صحیح لکھا کہ ''شاؔد عارفی اشتراکی نہیں تھے...... مگر وہ عوام دوست ضرور تھے۔ ظلم کے خلاف احتجاج کے قائل تھے اور مظلوموں کے لیے انصاف طلب کرتے تھے۔''

شاؔد عارفی پر گو شاعر تھے۔ نظمیں بھی بہت کہیں اور غزلیں تو ان کی وافر ہیں۔ جن ناقدین نے ان کی طرف توجہ کی ان کے سامنے بھی ان کا پورا کلام نہیں تھا۔ ایک بدقسمتی یہ بھی تھی کہ وہ کسی گروہ سے وابستہ نہیں رہے اس لیے بھی ان کی طرف ناقدین کی توجہ محض واجبی سی رہی۔ حق تو یہ ہے کہ مظفر حنفی پہلے ناقد ہیں، جنھوں نے شاؔد کی شاعری کو مطالعہ میں لایا اور اس پر سیر حاصل گفتگو کی۔

شاؔد عارفی کی غزلیں ان کے اپنے معاصرین کے رویوں میں ایک اضافے کی حیثیت رکھتی ہیں۔ مظفر حنفی نے ان کی غزل کا تجزیہ کرتے ہوئے غزل کے تئیں اس تنقیدی

www.urduchannel.in

رویے کا بھی ذکر کیا ہے جس میں غزل کو بعض اسباب کی بنا پر بچشمِ کم دیکھا گیا۔ ان اسباب میں سب سے اہم اس کے حیطۂ عمل کا محدود ہونا، مضامین میں تنوع کا فقدان اور حقیقی زندگی سے گریزاں ہونے کو زیادہ دخل ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''حالؔی، عظمت اللہ خان، کلیم الدین احمد اور ظ۔ انصاری جیسے نقادوں نے غزل کی مخالفت میں جو کچھ بھی کہا ہے، اس کی بنیاد اس بات پر کم ہے کہ غزل بہ اعتبار ہیئت بے کار صنفِ سخن ہے بلکہ اصل اعتراضات کی اساس یہ ہے کہ غزل کے موضوعات کا دائرہ بیحد محدود ہے۔''

اصل میں غزل میں بیشتر شعراء نے اندھی تقلید سے کام لیا۔ وہ ہر دور میں حکایاتِ گل وبلبل، وارداتِ عشق و محبت اور کوائفِ حسن و عشق ہی تک اپنے مشاہدہ اور تخیل کا دائرہ محدود کرتے رہے۔ حالانکہ غزل کے ارتقاء کے سفر میں میرؔ اور غالبؔ جیسے شعراء ایک اہم موڑ کی حیثیت سے شامل ہوئے تھے مگر پھر بھی عام غزل گو ایک چھوٹے سے تالاب ہی میں تیرنے کو ترجیح دیتے رہے۔ مقابلتاً شاؔد عارفی کی دنیا بہت وسیع ہے۔ زندگی کے تمام تر کوائف پر ان کی نظر ہے۔ کیا تلخ، کیا شیریں۔ زندگی کا کوئی رخ ان سے پوشیدہ نہیں۔ وہ روح اور جسم، دل اور دماغ، کیا ہونا چاہیے اور کیا ہے، ان سب پر نظر رکھے ہوئے ہیں۔ وہ جذبات کے قائل ضرور ہیں مگر تفکر اور تصور دونوں کو اپنے کلام، خصوصاً غزل میں جگہ دیتے ہیں۔ اسی بات کے پیشِ نظر مظفر حنفی کہتے ہیں:

> ''غزل کے موضوعات کا دائرہ بے حد محدود ہے، اس محدود اور مخصوص مزاج رکھنے والی صنفِ سخن میں موضوعات کا ایسا تنوع، جیسا کہ شاؔد عارفی کی غزل میں ہے، بہت کم شاعروں کے ہاں نظر آتا ہے، فنی ہیئت کا پابند رہ کر غزل کو موضوعات کے بیکراں سمندر کے لیے سفینہ بنا لینا اور وہ لامحدود وسعت عطا کرنا کہ نظم اس کے سامنے ماند پڑ جائے، شاؔد عارفی کا کارنامہ ہے۔'' (شاد عارفی: شخصیت اور فن، مظفر حنفی، ص:۱۳۹)

حق تو یہ ہے کہ شاؔد عارفی نے غزل کو بہت کچھ دیا اور اس کے عوض میں تنقید

نگاروں نے ان کو اس رویے اور توجہ سے محروم رکھا جس کے وہ مستحق تھے لیکن مظفر حنفی نے تنقید نگاروں پر واجب اس قرض کو ادا کر کے اردو قارئین کو کم نگاہ رہنے سے محفوظ کر لیا۔ شاؔد عارفی نے اپنی غزل میں زندگی کا احاطہ اس طرح سے کر لیا ہے کہ شاید ہی زندگی کا کوئی ایسا پہلو ہو، جو ان کی نظر میں نہ رہا ہو۔ بعض لوگ طنز کو بچشمِ حقارت دیکھتے ہیں، وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ طنز کے پیچھے ایسا ذہن کارفرما ہوتا ہے جس کی پختگی، جس کا اعتماد اور اعتبار اس کے دوام کا ضامن ہوتا ہے۔ ملاحظہ کیجیے کہ اس طنز کے پیچھے کس قدر پختہ ذہن کارفرما ہے:

اس نے تو صرف جسم بیچا تھا   ایک فاقے کو ٹالنے کے لیے
لوگ ایمان بیچ دیتے ہیں   اپنا مطلب نکالنے کے لیے

تجربے جن کو جنوں کے نہ گریبانوں کے   طنز کرتے ہیں وہ حالات پہ دیوانوں کے
جو شگوفے کھِل کے پیلے ہو گئے   تم یہ کہتے ہو رنگیلے ہو گئے
گستاخ مریدوں میں بیباک عقیدوں میں   ہر شیخ کا باطن ہے ظاہر سے جداگانہ

فاقہ کش مخلوق کی حاجت سمجھنے کے لیے
ایک دو روزے ہی رکھ لیتے جو خس خانوں میں ہیں
بارہا پائے گئے ہیں لوٹنے والوں کے ساتھ
جن کو دعویٰ تھا کہ ہم سچے نگہبانوں میں ہیں

مانگ لیں ہم سے ہماری بے کسی کا ایک دن
عیش کی راتیں نہیں کٹتی ہیں جن سے بن پیے

ان چند اشعار میں جس طرح شاؔد عارفی نے زندگی کے حقائق کو پیش کیا ہے، ایسا بہت کم شاعروں کے ہاں ملتا ہے۔ اس طرح سے انھوں نے غزل کے دائرے کو ایسی وسعت دی ہے کہ وہ محض جذبات کی نہیں بلکہ احساسات کی بھی ترجمان بن گئی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ غزل کے جملہ محاسن یعنی محاسن لفظی و محاسن معنوی سبھی شاؔد کے یہاں ملتے ہیں۔ خدا لگتی تو یہ ہے کہ شاؔد کا گریباں اگرچہ نپا تُلا ہے مگر دامن نہایت وسیع ہے۔ اس کے

www.urduchannel.in

گریباں کا ایک ایک چاک کئی اطراف کو اپنے گھیرے میں لے لیتا ہے۔

غزل کی فطرت تو یہ ہے کہ اِدھر کانٹا چبھا اُدھر آہ نکلی۔ اور یہ آہ دور تک نہ صرف جاتی ہے بلکہ جس سے ٹکرائے، اسے متاثر کرتی ہے۔ ملاحظہ کیجیے:

ضبطِ ناوکِ غم سے بات بن تو سکتی ہے   آدمی کی انگلی میں پھانس بھی کھٹکتی ہے
بہاروں کی مانگی تھیں ہم نے دعائیں   نتیجے میں دورِ خزاں آ گیا ہے
کمیں گاہ میں بجلیاں اور بھی ہیں   سنبھل کر چلو امتحاں اور بھی ہیں
قتل کا حکم ہی سہی لیکن   ہے جو اس کے گلے میں رس مت پوچھ

ایک کیفیت میں مختلف کوائف کا نظارہ شاعری کی آنکھ ہی کر سکتی ہے۔ شاؔد غزل کے مزاج کو سمجھتے ہیں کہ کوئی ایسی کیفیت نہیں جس کو غزل کے پردے میں بیان نہ کیا جا سکے۔ بعض لوگ یہ بھی خیال کرتے ہیں کہ طنزیہ مزاج رکھنے والا شاعر رومانی لمحات کا امین اور عشقیہ کوائف کا ترجمان نہیں ہو سکتا۔ شاد نے اپنی غزل کے ذریعے اس کو بھی غلط ثابت کر دیا۔ ان کے اس رنگ کے کچھ شعر یہاں پیش کیے جاتے ہیں:

بتانِ دیر سے شکوہ نہیں ہے   جو سنتا ہے وہی سنتا نہیں ہے
مناظر کی کیے جاتا ہوں پوجا   خدا کو آنکھ سے دیکھا نہیں ہے
ابھی انگڑائیاں لی جا رہی ہیں   سمجھتے ہیں ابھی دیکھا نہیں ہے

....

کرمِ خاص چاہتے ہیں ہم   مسکرا دو تو کام ہوتا ہے
میں جو بدنام ہو رہا ہوں تو کیا   آپ کا بھی تو نام ہوتا ہے
ہاتھ سے یا زبان ہی سے نہیں   آنکھ سے بھی سلام ہوتا ہے

....

آتی نہیں پسند گل و یاسمن کی بو
مجھ میں بسی ہوئی ہے کسی گلبدن کی بو
میں نے ہر ایک گل کی مہک پر کیا ہے غور
چھو بھی نہیں گئی ہے ترے پیرہن کی بو

جسے اقارب سمجھ رہے ہیں سکھا رہا ہے حسین گیسو
حسین گیسو کی آڑ میں وہ نگاہ مجھ سے ملا رہا ہے

یہ اشعار صاف اشارہ کرتے ہیں کہ شاؔد ایک حساس ذہن، جذبات سے بھرا دل اور اشیاء کی حقیقت کو سمجھنے والی نظر رکھتے تھے۔ان کے خیالات میں تنوع ہے، ان کی گفتگو میں نغمگی ہے اور ان کی نظر میں جلوہ گری ہے۔جن حالات میں شاؔد کی زندگی گزری ان میں احساسِ کمتری آجاتا ہے، مگر شاد جانتے ہیں کہ اس کے عیب و ہنر اس کے ہیں، بے مثال اور لاجواب ہیں، اس کا سرمایہ ہیں اور اس کو دوسروں سے متمیز کرتے ہیں۔کہتے ہیں:

اے شاد میرے عیب و ہنر ہیں مرے لیے
آتی ہے خوش ہر ایک کو اپنے دہن کی بو

حق تو یہ ہے کہ خودشناسی کے اسی رویے نے شاؔد کو نہ صرف یہ کہ زندہ رکھا بلکہ خود اعتمادی بھی دی اور سر اٹھا کے جینے کا حوصلہ بھی بخشا۔

......☆......

www.urduchannel.in

ماجدالباقری

شاؔد عارفی کی نظمیں

شاؔد عارفی چونکہ اردو زبان کے شاعر تھے اس لیے یہ بات واضح کر دینا بے محل نہیں ہے کہ وہ لوہارو اسٹیٹ (پنجاب) میں پیدا ہوئے تھے اور جوانی سے بڑھاپے تک یوپی کی معروف ریاست رامپور میں رہے۔اس حقیقت کے باوصف کہ ان کا بچپن پانچ دریاؤں کے سرسبز میدانوں میں گزرا وہ اپنی نظموں میں بڑے صاحبِ زبان معلوم ہوتے ہیں۔ میرے اس مضمون کا تعلق چونکہ مرحوم کی صرف نظموں سے ہے اس لیے میں ان کی غزل گوئی کی طرف نہ تو کوئی اشارہ کرنا چاہتا ہوں اور نہ ہی ان کی مجموعی شاعری پر اظہار کا کوئی دروازہ کھولوں گا۔اس طرح میری ہر بات کا تعلق ان کی نظموں ہی سے رہے گا۔

شاؔد عارفی کو اردو زبان پر ایسی قدرت حاصل ہے کہ بڑے بڑے اہلِ زبان ان کے سامنے بونے دکھائی دیتے ہیں وہ اتنا اچھا روزمرہ استعمال کرتے ہیں جو کتابوں کے مطالعے سے یا لغات کی ورق گردانی سے حاصل نہیں ہوتا۔ایسا روزمرّہ مختلف طبقات کے لوگوں کے ساتھ گھل مل کر سیکھا جاتا ہے اور پھر تحقیق اور وجدان کی سان پر رکھ کر اس کا فالتو حصہ گھسنا پڑتا ہے تب کہیں وہ ادبی تحریروں میں استعمال کے قابل ہوتا ہے۔ان کے یہاں ایسے الفاظ بھی ملتے ہیں جنھیں ہم شرفاء کی زبان نہ سمجھ کر صرف محلِّ استعمال سے عدم واقفیت کی بنا پر ٹکسال باہر سمجھتے ہیں۔شاؔد نے ادائے مطلب کے لیے جو زبان استعمال کی ہے اس کا بیشتر حصہ ایسا ہے جو معروف ادباء اور شعرا سے حاصل نہیں کیا گیا بلکہ براہِ راست عوام

سے حاصل کیا گیا ہے جس کی وجہ سے اردو زبان کو انفرادی ٹکسال کے بے شمار الفاظ مل گئے ہیں اور اس میں بھی نکتہ یہ ہے کہ عورتوں کی گھریلو زبان کے اکتساب میں انھوں نے کوئی گوشہ بے توجہی کا شکار نہیں ہونے دیا۔

ہمارے ناقدین کرام شادؔ کو صرف ایک طنز نگار کہہ کر آگے بڑھ جاتے ہیں وہ اس امر کی وضاحت نہیں کرتے کہ طنز ان کے مزاج کا صرف ایک حصہ ہے ان کا مکمل شعری مزاج نہیں ہے اور طنز بھی ایسا کہ صحیح طریقے پر نہ برتا جائے تو شاعری صحافت بن جاتی ہے۔ مگر شادؔ کا منتہا یہ ہے کہ انھوں نے طنز کو اس خلوص کے ساتھ برتا ہے کہ شعروں کا تاثر ہنگامی ہونے کے بجائے دائمی ہو گیا ہے۔ فنکاری کا ایک پرتو یہ بھی ہے کہ شادؔ کی انفرادیت نے اسے شعری سمت نما میں بو دیا ہے جس کے مطالعے سے نئے نئے بوٹے پھوٹتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں اور نئی نئی جہتیں متعین کرتے ہیں۔ ان کی ایک نظم ''نمائش'' کا ایک بند ملاحظہ کیجیے:

ذرا غور کیجے یہ بزمِ سخن ہے   ادب سے یہاں فائدے کی لگن ہے
جو ''لونڈا'' ہے وہ ماہرِ علم و فن ہے   نہ جانے حکومت کا یہ کیا چلن ہے
نہ پوچھے کسی سے نہ خود جانتی ہے
خوشامد کو ''روحِ سخن'' مانتی ہے

بند کے تینوں اشعار میں ایسی کئی باتیں یک جا ہو گئی ہیں جن سے شادؔ مرحوم کے فن اور شخصیت پر ایسی روشنی پڑتی ہے جو میری تحریر کی بے ربطی میں بھی ایک خاص قسم کا ربط ظاہر کرتی ہے۔ انھیں فنِ ادب (جس میں عروض بھی شامل ہے) پر پورا پورا عبور حاصل تھا۔ ان کی نظموں کے طنطنے سے ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے وہ اپنے اگلے پچھلوں سے ذرہ برابر بھی متاثر نہیں ہیں۔ اور اپنے اسلوب کے خود ہی موجد ہیں۔ تخیل کا بے پایاں پھیلاؤ، جمالیاتی حس کی ہمہ وقت بیداری اور پھر ذخیرۂ الفاظ کی فراوانی کچھ اس طرح شیر و شکر ہو کر شعری قالب میں ڈھل جاتے ہیں کہ کوئی دوسرا ان کے رنگ میں کامیابی سے شعر کہہ ہی نہیں سکتا۔ بے جان چیزوں اور جذبوں کو تشخص عطا کرنے میں انھیں یدِ طولیٰ حاصل ہے۔

www.urduchannel.in

ان کی نظموں کی ہیئت سے جدید نظم کو کچھ نہیں مل سکتا کہ وہ خود شادؔ کی اپنی پسند تھی، لیکن ان کے زمانے میں بھی اس فارم میں بھرپور شاعری کرنا امر محال تھا۔ بولتی ہوئی تشبیہوں، زندہ استعاروں کے برمحل استعمال، ایمائیت اور رمزیت کے علاوہ لفظ کے اکہرے معنی سے اجتناب کا رجحان اس خوبصورتی کے ساتھ پایا جاتا ہے کہ جدید سے جدید اور نیا قاری بھی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ بالعموم ہوتا یہ ہے کہ مسلسل اور مربوط نظموں میں سے کسی تمہید کے بغیر اگر ایک بند پڑھ دیا جائے تو وہ پورے معنی نہیں دیتا۔ میں یہاں شادؔ کی نظموں میں سے کسی تمہید کے بغیر ایک ایک شعر پیش کرتا ہوں جن سے شادؔ کے اس رویے کا بھی بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے جو صرف غزل کے لیے مخصوص ہے:

ابھی شوروم جس نے چھوڑا ہے
''شعر'' ہے، بہترین جوڑا ہے

....

ضرورت سے زائد جو شرما رہی ہے
تصور میں ننگی نظر آ رہی ہے

....

''سایۂ تاک'' میں نیت پہ بھروسا کس کو
گود میں آ کے گرے جب ''شجرِ ممنوعہ''

....

گھورتے اعضاء کی ہر جھلکی'' تعاون ماجرا''
عشوہ عشوہ اشتراک آمادہ لیکن ہاں نہ ہوں

....

اب مرے پندار میں تھی اک درندے کی جھلک
جس کو بو دیتا ہے دلدل میں پھنسی چیتل کا خون

....

ہے اچھوتی پہ طربناک اشارہ ڈھونڈے
ظلمتِ گوشۂ تنہا کا سہارا ڈھونڈے

....

مختلف آنچل ہوا کے رُخ پہ بل کھانے لگے
روشنی میں ساریوں کے رنگ لہرانے لگے

....

'' بد نما جلد'' میں بھلے اشعار
کیوں سمجھتے ہو '' قسمتِ عطار''

....

آنکھوں سے نیند سیر کی عادت نے چھین لی
بستر چبھا سمٹ کے اٹھانے کے واسطے

....

سر ڈھک لیے گئے تو ہوئیں باڑیاں درست
سینے پہ اور وجہِ نمائش لباس چست

....

یہ پتھر کے چشمے یہ رجعت پسند
مکانات پنجرے تجلی پرند

....

دق کی ماری آبادی سے دور'' سول لائن کا روپ''
جیسے'' کالی کسبی'' کے منہ پر پوڈر کی ڈھلتی دھوپ

....

اس کو پسلی، اس کو آنکھیں اس کو جاڑا اسکو دست
شہری اپنے حال پہ گریاں اور بدیسی جوڑے مست

....

گھونٹ دوں گھنٹے کی بے ہنگام ٹک ٹک کا گلا
کرسیاں اوٹوں میں الجھا کر حجابی نوچ لوں

....

''اشاروں کی قسمت'' چمکتی رہے گی کنایوں کا پیغام اچھا رہے گا
جواں سال آوارہ صبحوں کے جمگھٹ کا پیچھا سرِ شام اچھا رہے گا

....

www.urduchannel.in

شاؔد اپنی نظموں میں ایک ماہر غوّاص کی طرح مشاہدے اور جذبات کی اوپری سطح پر تھوڑی دیر فکری پیراکی کے کرتب دکھانے کے بعد سمندر کی تہہ تک سیدھے چلے جاتے ہیں۔ جب اور جہاں وہ طوفان کے زیر آب ریلے سے ٹکراتے ہیں صاف صاف دکھائی دیتے ہیں اور اس وقت تک واپس نہیں آتے جب تک سمندر کی تہہ سے کوئی بے بہا موتی ان کی مٹھی میں نہیں آجاتا۔ یہ درِّ نایاب دراصل ان کی نظموں کے ڈرامے کا نقطۂ عروج ہوتا ہے جو انتہائی چابکدستی سے ایک ہی جست میں ہاتھ آجاتا ہے۔ وہ اپنی ایک نظم'' نمائش'' کے ہر بند میں جو تین مصرعوں کا ہے، چودھویں بند تک اپنے مخصوص انداز میں نمائش سے متعلق جزئیات کا ذکر کرتے آئے ہیں اور خاتمے کے بند میں یوں اظہار کرتے ہیں:

ابھی دو بجے ہیں، ابھی سے یہ'' سائے'' یہ شلوار برقعے دوپٹے گھروں کو؟
یہ دو چار، دس پانچ، ان کا تعاقب مبارک رہے'' کم نظر'' سردھروں کو
مگر ہم تو فنکار و شاعر ہیں یعنی پرکھتے ہیں نظروں سے کھوٹوں کھروں کو

آخری مصرعے پر نظم کو کس خوشگوار جھٹکے کے ساتھ ختم کیا ہے طبیعت لوٹ پوٹ ہو جاتی ہے۔ ایسی ہی مہارت وہ تمام نظموں میں دکھاتے ہیں۔ شاؔد کی بیشتر نظموں میں جنسِ لطیف کا روپ رس رچا بسا ہوتا ہے۔ پھر وہ معاشرے کی دکھتی ہوئی رگوں پر باری باری تیکھے طنز کے نشتر لگاتے ہیں۔ ان کا کمالِ فن یہ ہے کہ وہ ایک زمینی مصرعے سے آسمان کی طرف ایسے اڑ جاتے ہیں کہ رفتار اور فاصلے کا احساس تک نہیں ہونے دیتے اور اگلے ہی لمحے پھر اس فضا میں آجاتے ہیں جہاں سے چلے تھے مگر اس طرح کہ قاری کی دلچسپی برقرار رکھتے ہیں اور اشتیاق میں اضافہ کرتے رہتے ہیں۔

شاؔد کی شاعری میں عام تنقید کی شعوری کوشش ایک کامیاب نفسیاتی نکتہ ہے۔ وہ اپنے دیگر ہم عصروں کی طرح معاشرے کی خرابیوں پر اپنے فیصلے صادر نہیں کرتے بلکہ انھیں صاف ستھرے انداز میں بیان کر دینے کے بعد فیصلہ قاری پر چھوڑ دیتے ہیں۔ وہ اپنے بلند مقام سے عوام کی سطح پر نہیں اترتے بلکہ عوام کو اپنی سطح پر لے آتے ہیں۔ اس کے بعد ایک تماشائی کی طرح سب کے ساتھ چلتے پھرتے دکھائی دیتے ہیں۔ بے تکلف گفتگو کا

لہجہ، ڈرامائی ترتیب کا خیال، دلیری اور بے باکی، نفسیاتی ژرف بینی، جنسی غوامص سے مکمل آگہی کے علاوہ مشاہدات اور تجربات کی انفردیت ان کے کلام کے خاصّے ہیں۔ اونچے سماج سے نفرت اور ذہنی وفکری انفرادی آزادی کی تبلیغ ان کا مطمحِ نظر ہے۔ وہ ہر تخلیقی شاعر کی طرح اپنے دور کے عدل وانصاف، انسانی قوانین اور نفسیاتی ضروریات کے مابین تفاوت کے گلہ گزار ہیں۔ یہاں ان کا ایک قطعہ ملاحظہ کیجیے:

بلند و پست میں نسبت ہے غیر قانونی
غرور و عجز میں رشتہ سماج بکتی ہے
کسی امیر کی لڑکی کسی غریب کے ساتھ
نکاح عیب سمجھتی ہے بھاگ سکتی ہے

موضوعات کے انتخاب میں وہ سعادت حسن منٹو سے بہت قریب ہیں۔ عمروں کے تفاوت اور جغرافیائی فاصلوں کے باوجود شادؔ اور منٹوؔ میں ایسا موضوعاتی اشتراک ہے کہ جن موضوعات کو منٹوؔ نے اپنے افسانوں میں چھیڑا ہے وہی شادؔ کی نظموں میں ابھرے ہیں یا جو موضوعات شادؔ کی نظموں کا محور تھے، منٹو کی کہانیاں بھی انہی کے گرد گھومتی ہیں۔ ایک جگہ شادؔ نے منٹوؔ کا ذکر کچھ اس طرح کیا ہے:

بہت سمجھ بوجھ کر گناہوں کا فیض جاری کہا ہے میں نے
جنھیں ''شکاری'' کہا ہے منٹوؔ نے ''کاروباری'' کہا ہے میں نے
''ڈھکے چھپے کسبِ زر کو'' اونچی دکانداری کہا ہے میں نے

شادؔ کی نظموں میں علاقائیت کی فضا کچھ اس طرح بھرپور ہے کہ اگر دنیا کی دیگر زبانوں میں ان کا ترجمہ کیا جائے تو ہر زبان کا ناقد بخوبی اندازہ لگالے گا کہ ہر نظم کا علاقہ اردو ہے۔ اور یہ کہ شادؔ اردو زبان کے شاعر ہیں۔ شادؔ کی مشاقی کا عالم یہ ہے کہ ایک ایک مصرعے میں بڑی بڑی حکایتیں نظم کر دیتے ہیں۔ اردو کا شعری عجائب گھر ایسے مثلثوں، مخمسوں اور مسدّسوں سے بھرا پڑا ہے جن کے ہر بند میں دو چار مصرعے بھرتی کے ضرور ہوتے ہیں، اور نظم کے تسلسل میں بند کے بند قلانچیں بھرتے ہوئے حشو و زوائد کے تہہ

www.urduchannel.in

خانوں میں اڑتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں لیکن شادؔ ایک مصرعہ بھی بھرتی کا نہیں کہتے۔ مضمون آفرینی کا اتنا خیال رکھتے ہیں کہ ڈراموں اور افسانوں کے پلاٹ کے مصرعوں میں سموتے چلے جاتے ہیں۔ ان کی چند نظموں کا ہر بند ایک فلمی کہانی کی تلخیص معلوم ہوتا ہے۔ شادؔ جب جزئیات نگاری کی طرف آتے ہیں تو بال جیسی باریک شے کو موئے قلم سے لمبائی میں چیرتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔ وہ اپنا مافی الضمیر خیالی پیکروں کے ذریعے واضح کرتے ہیں۔ میں اپنے مضمون کو اب زیادہ طویل نہیں کرنا چاہتا اس لیے لمبی لمبی نظموں میں سے چند اشعار اور بند بطور نمونہ پیش کر کے مضمون کو ختم کرتا ہوں۔ ملاحظہ کیجیے:

جالے لگے ہوئے ہیں ابھی آستین پر
رفتار سست سست نگاہیں زمیں پر

....

ہر آہٹ پر جھجک کر جھانک لیتی ہے دریچے سے
وہ میری بلکہ اپنی بھی نگہباں ہے جہاں میں ہوں

....

کھٹ کھٹ...... کون؟ ...... صبیحہ! کیسے ؟ یونہی کوئی کام نہیں
پچھلی رات۔ بھیانک گیرج۔ کیا کچھ ہوا۔ انجام نہیں
میرا ذمہ۔ میں بھگتوں گی۔ تم پر تو الزام نہیں

(''شوفر'' کا پہلا بند)

کچھ ہرنوں پر لرزہ طاری ''ٹھہرے سائے'' ''چلتی ساری''
''کچھ شلواریں ہاری ہاری'' کچھ پورے دن کچھ تیاری''
پھاٹک سے ہٹ کر اندھیاری ''اک نوکر ہے اک دلداری''

(نمائش'' نمبر ا کے خاتمے کا بند)

طنچے سے ہرانا چاہتے ہو تم تو میں ہاری
ہوس کے سامنے انسان کی جاتی ہے مت ماری

تمھیں کچھ سوجھتا بھی ہے؟...... میرا جمپر ، مری ساری

(''مہترانی'' کا آخری بند)

سڑک پڑے گی تو برقے[1] بدن چھپالیں گے
خدا کے گھر میں پہنچ کر نقاب اٹھالیں گے
عشاء کے بعد نمازی گھروں کو جالیں گے
اگر ہوئے بھی تو شرعاً نظر بچالیں گے
جو چار چھ نے تکا بھی تو کیا چھڑالیں گے

(''رت جگا'' کا تیسرا بند)

زہے غمزۂ برقِ موقع شناس
ذرا ہٹ کے پھاٹک سے اوجھل کے پاس
'' تغزل'' میں '' مشغول'' اونچے لباس
لباسوں میں ہلکی سی ردّ و بدل
زحافات و ادغام کا سا عمل
مصور تھی القصہ عریاں غزل

(''مال روڈ'' خاتمے سے پہلے کے دو بند)

......☆......

[1] برقعے کا مقصد جب پردہ پوشی نہ رہے تو وہ برق سے ''برقہ'' تصور کیا جائے گا۔ شاد

پروفیسر سلیم اختر

شخصیت اور فن کا آئینہ۔ شاد عارفی

(ایک نفسیاتی تجزیہ)

شاد ضعیف العمر ہے، لیکن اس کے شعر جواں ہوتے ہیں
ایسے لوگ کہاں ملتے ہیں، ایسے لوگ کہاں ہوتے ہیں

....

صحرا کو گلستاں کہتا ہوں، بجلی کو تجلّی کہتا ہوں
سو معنیٰ پیدا ہوتے ہیں، اتنی بے معنی کہتا ہوں

''میری زندگی نو بہ نو اور رنگ برنگ روپ کی حامل ہے۔''[1]

''شاعری کی تو اس میں ''صدر نشینی'' کی خواہش ہنوز چین سے نہیں بیٹھنے دیتی، حتی المقدور پریشانیوں ، بیماریوں اور دوسری معاشی الجھنوں کے باوجود کام کیے جا رہا ہوں، تا آنکہ زمانہ خود ہی کوئی فیصلہ کر دے۔''[2]

یہ اشعار اور نثری اقتباسات شاد عارفی کی انا کی غمازی سے قطعِ نظر، ان کے شاعرانہ مسلک کو سمجھنے میں ممد ہی نہیں بلکہ زندگی گزارنے کے مخصوص انداز سے جنم لینے والے زاویۂ نگاہ کی تفہیم کے لیے بھی اشاریہ ایسی اہمیت اختیار کر لیتے ہیں۔

غربت سے پیدا ہونے والی یک رنگی شاد کی زندگی کی سب سے بڑی خصوصیت ہی

[1] [2] مکتوب بنام: وصی اقبال

www.urduchannel.in

نہیں سمجھی جا سکتی بلکہ ایسی خصوصیت بھی جوان کے مزاج میں صدرنگی کی موجب بھی بنی۔ اسی کی پیدا کردہ نفسیاتی الجھنوں نے جہاں شادؔ کو تمام عمر ناشاد رکھتے ہوئے شادکامی کے جملہ مواقع کی فراہمی میں روڑے اٹکائے، وہاں دودھاری تلوار ایسے طنز ہی کو ''میوز'' Muse بنا کر رکھ دیا۔ گو سوداؔ کی مانند ان کا کوئی ''غنچہ'' نہ تھا، لیکن عام زندگی میں ان کا انداز کچھ اسی قسم کا معلوم ہوتا ہے، انھیں خود بھی اس کا احساس ہے۔

> ''میرا پختہ یقین ہے کہ مرزا سودا میں مرزا ہونے کے باوجود کوئی افغانی رگ ضرور تھی، جو ہر خلافِ مزاج بات پر بھڑک اٹھتی تھی......سو میں بھی کبھی کبھی مزاج کے خلاف کسی واقعے سے متاثر ہو کر جو منہ میں آئے، کہنے سے نہیں چوکتا، مگر ادب کا دامن بھی تھامے رہتا ہوں۔''

(مکتوب بنام جون ایلیا ۲/نومبر ۱۹۶۲ء)

اور یہ شعر تو اسی عبارت کی تفسیر میں معلوم ہوتا ہے:

اس نے جب سو تیر چلائے — میں نے ایک غزل چپکا دی

شادؔ کے فن کے اساسی خصائص کی تفہیم سے پیشتر اس امر کا تعین لازم ہے کہ وہ خود کیا تھے، ویسے تو انھوں نے اپنے بارے میں یہ بھی کہا:

ہر مصیبت پہ مسکراتا ہوں — شادؔ رونا مرا شعار نہیں

یہ غمِ حالات اور یہ خدمتِ شعر و سخن — دشمنوں کو بھی مرے انجام نے چونکا دیا

اور دراصل ایسے اشعار اور 'میں نے ایک غزل چپکا دی' ایسے انداز ہی کی بنا پر ان کی شخصیت کی نفسی اساس کی دریافت بنیادی اہمیت اختیار کر جاتی ہے۔ یہ اس لیے نہیں کہ ان کا کلام الجھا ہوا ہے، بلکہ ان کا کلام تو الجھا ہوا ہونے کے علاوہ باقی سب کچھ ہو سکتا ہے اسی طرح ادب و فن کے بارے میں کسی چونکا دینے والے تصور یا باغیانہ اور انقلابی نظریات کی وجہ سے بھی نہیں کہ وہ خود کو تو رام پور کے گھٹے ہوئے ماحول میں باغی[1] سمجھتے رہے، لیکن

[1] میری طرح تمھیں بھی رام پور نے سمجھنے کی کوشش نہیں کی یہ بات نہیں میں جہاں سے شاعری کرتا ہوں، وہ ان کی پہنچ سے باہر ہے۔'' (مکتوب بنام دور آفریدی ۹/جولائی ۱۹۶۱ء) اور یہ خط بھی ملاحظہ ہو: ''......اور میں نے بغاوت شروع کر دی چنانچہ مجھے اس بغاوت کے سلسلے میں بڑی دشواریوں کا سامنا ہوا مگر میں نے ہمت نہ ہاری اور نہ سپر ڈالی۔'' (مکتوب بنام: جون ایلیا ۲/نومبر ۱۹۶۲ء)

www.urduchannel.in

انقلاب کا داعی ہونے کے باوجود ان کے ہاں زندگی کے ضمن میں باغیانہ طرزِ احساس اور ادب کے سلسلے میں انقلابی تفکر کا فقدان ملتا ہے۔ الغرض! ان سب امور سے قطعِ نظر کرنے پر بھی ان کی شخصیت کا مطالعہ ان نفسیاتی پیچیدگیوں کے مطالعہ کے لیے ضروری ہے، جس نے فن کا رنگ چوکھا کیا۔ انھیں خود بھی اس کا احساس ہے، کیونکہ صہبا لکھنوی کو اپنا سوانحی خاکہ بیان کرتے ہوئے یہ بھی لکھا:

> ''میری سوانحِ حیات کا احاطہ ٹیڑھی کھیر ہے اس لیے کہ میں ''جلیبی کے سے پھیر'' اور اونٹ کے سے ''کیف خلقت'' کے اتنے موڑ، اتنی الجھنیں اور ایسے ایسے نشیب و فراز ہیں کہ ''سفینہ چاہیے اس کے لیے! اختصار کے ساتھ'' تو میرے اس مطلع میں سب کچھ ہے:
>
> کہہ نہیں سکتا بطرزِ داستاں ہو یا نہ ہو
>
> دیکھیے کوشش تو کرتا ہوں بیاں ہو یا نہ ہو''

اور یہ صرف شادؔ ہی کا نہیں، بلکہ ان کے نقاد اور شخصیت نگار کا بھی یہی مسئلہ ہے کہ بیاں ہو یا نہ ہو۔

شادؔ کی یہ سطریں پڑھ کر احساس ہوتا ہے کہ شاید انھوں نے تمام عمر نادیدہ خطرات سے نبرد آزما ہونے اور عظیم مہمات کی تسخیر میں بسر کی، لیکن معاملہ اس کے برعکس ہے، کیونکہ نہ تو وہ نادیدہ خطرات سے نبرد آما ہوئے اور نہ ہی عظیم مہمات کی تسخیر کی بلکہ دیکھا جائے تو عمر کا پیشتر حصہ رامپور ہی میں گزارا۔ جاہ و حشمت اور دولت و ثروت نہ تھی اس لیے زندگی کا دائرہ سکڑ سکڑا کر صرف اس نیم پختہ[1] مکان کے دو کمروں میں محدود ہو گیا جس میں یہ اور ان کی بوڑھی والدہ لشتم پشتم گزر کیے جا رہے تھے، بعد ازاں وہ بھی بک گیا۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ اس کے باوجود بھی وہ نادیدہ خطرات سے نبرد آزما رہے، مگر وہ خطرات نفسیاتی واہمے اور نفسیاتی خوف تھے، انھوں نے واقعی عظیم مہمات سر کیں، لیکن یہ تو ذات کے ہفت خواں طے کرنے اور بے کراں انا میں ڈوب ڈوب کر ابھرنے کی داستان ہے

[1] شادؔ میں لکھتا کرایہ کے مکانوں پہ غزل — اتنا موقع کبھی گھر گھر کے سفر نے نہ دیا

"جلیبی کے سے پھیر" کہہ کر شاید وہ غیر شعوری طور پر اپنی شخصیت کی مٹھاس کا بھی احساس کرانا چاہتے ہوں، لیکن ایسی کوئی بات نہیں، شخصیت میں جلیبی کے سے پھیر تو یقیناً تھے لیکن شیرے ایسی مٹھاس نہ تھی، البتہ کڑوی نبولی ضرور تھی! کڑواہٹ بدمزہ تو ضرور کرتی ہے، لیکن خون بھی تو صاف کرتی ہے چنانچہ رام پور[1] کے ٹھہرے پانی کے جوہڑ ایسے بند معاشرہ نے شاد کو جو تلخ نوائی بخشی اسے تمام ملک میں عام کر کے ان کا سب سے بدلہ لیا، ان کے بقول:

"میرے دشمنوں نے مجھے اس طرح ناکام و نامراد کرانے کی کوششیں کیں مگر ہمیشہ منہ کی کھاتے رہے۔ میں نے ہمیشہ منہ توڑ جواب دیے، دشمنوں کا یہ احسان میں کبھی نہیں بھولوں گا۔ اگر میرے دشمن میرے ساتھ اس طرح دغا نہ کرتے، مکر و فریب کے جال نہ پھیلاتے، مجھے ذہنی چرکے نہ دیتے تو میں اس مقام کو کبھی نہیں پہنچ سکتا تھا، زلف کو زنجیر کہتا ہوتا، محبوب کی کمر تلاش کرتا ہوتا، غرضیکہ اگلی وحشتوں میں مبتلا ہوتا۔"

(ایک انٹرویو: سلطان اشرف)

مسعود اشعر نے "کٹی پتنگ" کا استعارہ تلاش کرتے ہوئے شاد پر جو خوب صورت خاکہ لکھا، اس کا پہلا پیراگراف بہت معنیٰ خیز ہے:

"کسی حکیم نے شاد عارفی کو اختلاجِ قلب کا علاج یہ بتایا تھا کہ پتنگیں اڑایا کرو اور کبوتر بازی سے شوق کرو۔ ان کا اختلاجِ قلب تو واقعی دور ہو گیا، لیکن آسمان پر نگاہیں جمانے کی عادت ایسی پڑی کہ پھر نیچے نہیں دیکھا، شاد صاحب کے لیے یہ عظمت کی دلیل بھی تھی اور خطرے کا الارم بھی۔ انھوں نے شاعری میں جو رنگ برنگی پتنگیں اڑائیں اور جو بڑے بڑے تکل کاٹے اس نے انھیں اردو کا ممتاز اور منفرد شاعر بنا دیا لیکن تعلقات اور دوستی پرکھنے میں جو وہ "مندا استاد" کا شیشہ پلایا ہوا مانجھا استعمال کرتے رہے، اس نے خدا جانے کتنے دوستوں کی پتنگیں کتنے سے کاٹیں اور کتنے ہی تعلقات کی ڈور تھے سے توڑ ڈالی۔"

[1] تغافل کمالِ فنِ مزاجِ رام پور ہے! ......تو مجھ سے بے رخی میں بزم دوست بے قصور ہے

www.urduchannel.in

سوال یہ ہے کہ آخر مانجھے کی کاٹ اتنی تیز کیوں ہو گئی؟ یہ تو طے شدہ ہے کہ شاد اپنی ذات میں ایک نزاع تھے اور جب ان کے خطوط یا بقلم خود قسم کی تحریروں کا مطالعہ کریں تو اس نزاعی شخصیت کے پس پردہ کارفرما نفسی محرکات کی تلاش اتنی مشکل نہیں رہتی۔ شاد کے خطوط کا مطالعہ یوں بھی بہت سود مند ہے کہ غالب کی طرح شاد نے بھی کمالِ بے تکلفی سے کام لیتے ہوئے انھیں اپنی شخصیت کا آئینہ بنا کر رکھ دیا، گو غالب کی طرح شاد:

خط لکھیں گے گرچہ مطلب کچھ نہ ہو............

ایسا رویہ تو نہیں رکھتے چنانچہ سلطان اشرف کو یکم جولائی ۱۹۶۳ء کے ایک طویل مکتوب میں یوں لکھا:

"..........تمھاری طرح مجھ سے کہا تھا کہ شاد صاحب! آپ نے اپنے خط میں اس قدر بے تکلفی سے ایسے نجی معاملات نہ لکھا کریں تو میں نے جواب دیا کہ یوں تو غالب کی طرح خط لکھیں گے گرچہ مطلب کچھ نہ ہو، والی بات ہو کے رہ جائے گی اور میں اپنا مطلب نہ لکھ سکوں گا تو پھر میری الجھنیں کس طرح دور ہوں گی۔ مثلاً مجھے اصلی گھی کی ضرورت ہے، پُرانے گیہوں کا آٹا اور بیسن ملا کر روٹی کھانے کی حکیم والی رائے پر عمل کرنا ہے اور کوئی لانے والا ہے نہ رقم۔ تو بتاؤ ایسے خطوط جن میں کوئی مطلب نہ ہو، میرے کس کام کے؟ ہاں غالب کو فضول فرصت تھی اور کھانے پینے کے غم سے "بے غم" اس لیے اس کے لیے یہ شغل بے کاراں تھا۔"

قطعِ نظر اس سے کہ غالب کے "بے غم" ہونے والی بات قطعی غلط ہے (کہ اس خط میں آگے جا کر خود ہی اس کے زکوٰۃ طلب کرنے کا ذکر کرتے ہیں) یہ امر بھی دلچسپی کا موجب ہے کہ شاد نے خطوط میں بے تکلفی کو محض "کھانے پینے کے غم" تک محدود قرار دیا، حالانکہ معاملہ اس کے برعکس ہے کیونکہ شاد نے ان خطوط سے وہی کام لیا، جو بعض نیوراتی اپنی ڈائریوں سے لیتے ہیں اور اسی لیے وہ ان میں لڑتے جھگڑتے اور دل کی بھڑاس نکالتے ملتے ہیں اور میرے خیال میں ذہنی پریشانیوں کے گرداب میں پھنسے شاد کی ذہنی صحت مندی

کی برقراری میں ان خطوط نے اچھے خاصے ''سیفٹی والو'' کا کام کرتے ہوئے نیوراتی ہونے سے بچالیا، علاوہ ازیں شاؔد کو ان خطوط کے محفوظ رہ کر طبع ہو جانے کی بھی توقع نہ تھی، کیونکہ محولہ بالا خط ہی سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ:

''غالب کی طرح مجھے بھی یقین نہیں کہ میرے خطوط شائع ہو کر عوام تک...... میری خودی کو ٹھیس پہنچے گی جیسے غالبؔ کے ان خطوط سے پہنچی جس میں اس نے نواب یوسف علی خاں سے زکوٰۃ طلب کی تھی اور وہ خطوط (غالب کے طرفدار نہیں) عرشی صاحب نے طرف دار بن کر ''مکاتیب غالب'' کے نام سے شائع کر کے فاضل کے کورس میں داخل کرا دیے۔ اس لیے مجھے نیاز فتح پوری کی طرح بڑی احتیاط کے ساتھ خط لکھنے میں کوفت ہوتی ہے کہ چن چن کر لفظ رکھوں (جیسے کہ نیاز نے کیے) اور عبارت آرائی کی حماقت سے واضح کروں کہ یہ خطوط چھپنے ہی کے لیے لکھے گئے ہیں تو پھر مجھے اپنا مافی الضمیر بیان کرنے میں کیا تکلف۔ یہ ہو بھی جائے کہ یہ خط اشاعت پذیر ہوں (وہ بھی جب بلّی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹ جائے) تو کم سے کم عوام کو معلوم تو ہوگا کہ شاد پر اس کے وطن میں کیا گزری، حکومت نے اس کی دوستی اور ''بائیں بازو'' کے فرائض پر کیا اثر لیا، اور کس قدر نوازا، پامال کیا...... مجھے بیماری کے علاج اور پرہیز کے لیے پیسوں کی فوری ضرورت ہے، چنانچہ میں بے تکلفی کے ساتھ اپنے نجی حالات لکھنے میں حق بجانب ہوں، تاکہ جب بھی میرے سلسلے میں تحقیقات (ادبی) ہو تو میری پریشانیاں واضح اور صاف ہو کر سامنے

[1] اپنے ساتھ موازنے سے دوسرے کی تذلیل کا پہلو نکالنا شاد کا خاص انداز ہے، چنانچہ نیاز کے علاوہ جوشؔ کا ذکر بھی (مکتوب بنام دت بھارتی ۔۶۲ء) اسی موازنے کے انداز میں کیا گیا۔ یہی نہیں ہم عصروں کی مذمت کرنے میں بھی قلم روکنے کی کوشش نہ کی، چنانچہ ڈاکٹر سید عبداللہ، ڈاکٹر عبادرت بریلوی، رفیق خاورؔ (مکتوب بنام خلیل الرحمٰن اعظمی ۷؍دسمبر ۵۶ء) ماہرؔ القادری (مکتوب بنام مظہر خیری ۱۵؍جون ۶۳؍) نشورؔ واحدی، جذبیؔ (مکتوب بنام فضا کوثری، ۲۵؍دسمبر ۶۱ء) جگرؔ، بہزادؔ لکھنوی (ایضاً ۱۵ اکتوبر ۶۱ء) وغیرہ صرف چند نام ہیں۔

آئیں تاکہ وطن کے وہ ''داستانِ فن'' جنھوں نے میری مخالفت میں حشر برپا کر رکھا ہے، ان کی مونچھیں نیچی ہوں۔ ان کے چہرے پشیمانی کے پسینے میں شرابور ہو جائیں کہ ہم نے ''ہند و پاک'' کے شاعر کے ساتھ کیا بدسلوکیاں کی ہیں...... کم بختوں کو یہ نہیں یاد رہا کہ شاؔد عارفی کی توہین ان کے منہ پر چپت ہے اور ان کی وطنیت پر کلنک کا ٹیکہ ہے۔''[1]

خط کے اس طویل اقتباس سے بہت کچھ عیاں ہوتا ہے۔ تصنّع کے بغیر اظہار کی خواہش، قدر ناشناسی کا کرب، اپنی عظمت کا احساس اور اپنی مصیبتوں اور تکلیفوں سے انائی تسکین!

شاد کے نفسیاتی مطالعہ میں اساسی اہمیت ان کی انا بلکہ بے کراں انا Inflatted Ego کی ہے جو اتنی بے کراں ہے کہ اس سمندر میں دیگر شخصی رجحانات چھوٹے چھوٹے ندی نالوں کی طرح مدغم ہی نہیں ہو جاتے بلکہ اس کی وسعت اور بے کرانی میں اضافہ کا موجب بھی بنتے ہیں اور ان کے اظہار میں صدرنگی کے باوجود بھی شاؔد کی آسودگی نہیں ہو پاتی، چنانچہ ''شاد صاحب کے پاس جو رسالے آتے تھے، ان پر وہ کئی کئی جگہ اپنا نام لکھتے تھے، اردو میں بھی اور انگریزی میں بھی اور پھر مختلف انداز سے یعنی ایک جگہ احمد علی خاں شاد عارفی مع تاریخ تو دوسری جگہ یہی انگریزی رسم الخط میں، تیسری جگہ صرف شاد عارفی، چوتھی جگہ Shad Arfi اور پانچویں جگہ A.A.K. Shad Arfi علیٰ ہذا القیاس، جی نہیں بھرتا تھا مرحوم کا اپنا نام لکھتے لکھتے، دوسروں کی کسر بھی اپنے ہی آپ پوری کر لیتے تھے۔''[2]

وہ اپنے نام کے ساتھ یہ پیار اور اس کی متنوع قلم بندی سے جو انائی تسکین پاتے تھے اور یہ الفتِ ذات کی جس انتہا کی غماز ہے، وہ اتنی واضح ہے کہ اس کی تشریح کی ضرورت

[1] معترضین کے سلسلے میں امانت کمال (۹؍ستمبر ۱۹۶۲ء) کو یوں لکھا:
''...... نہ میں نے فنِ شعر کا کوئی اسکول کھول رکھا ہے کہ اپنے مطالعہ کو کسی 'اَن پڑھ' کے معمولی سے اعتراض کے جواب میں اس پر نثار کر دوں۔ ہاں اگر وہ میری شاگردی اختیار کر لیں تو پھر یہ جواہر پارے ان کے لیے ارزاں ہوں گے۔''

[2] ''ایک اور گنجا فرشتہ''۔ اکبر علی خاں

www.urduchannel.in

نہیں جب غزل بغرضِ اشاعت بھیجتے تو اس کے اوپر۔ مدیر[1] کے لیے، اسے پورے صفحے پر شائع کرنے کی ہدایت بھی درج کرتے (ملاحظہ ہو مظفر حنفی کی مرتبہ ''ایک تھا شاعر'' میں عکسِ تحریر) شاگردوں کے تخلص میں عارفی کا اضافہ کر دیا جاتا کہ ''عارفی ہونا کامیابی کی دلیل ہے۔'' (مکتوب بنام مظفر حنفی ۲/جولائی ۶۲ء) اور پھر ذرا ذرا سی باتوں پر انھیں آڑے ہاتھوں لیا جاتا۔

غالبؔ کی طرح شادؔ میں بھی نسلی برتری کا شدید احساس، انا سے وابستہ پندار کا مظہر ہے، چنانچہ کئی خطوط اور دیگر تحریروں میں اپنے پٹھان ہونے پر بار بار فخر کا اظہار ہی نہ کیا گیا بلکہ اپنی ''سادگی'' ایسی صفات بھی اسی سے وابستہ کی گئیں، چنانچہ مسعود اشعر کے نام ۱۱/جون ۶۱ء کے مکتوب (غیر مطبوعہ) کے بموجب:

''میں تو ایک سیدھا سادا پٹھان شاعر ہوں۔ لگی لپٹی مجھے قطعاً نہیں آتی۔ اس وجہ سے اکثر منافق مجھے ''خلوص'' کا فریب دے چکے ہیں اور اب بھی دے بھاگتے ہیں۔''

''اس خط میں برتری کے احساس نے ایک اور انداز سے بھی تسکین پائی۔ سندھ، کراچی اور لاہور سے کئی مشاعروں کے دعوت نامے ۳۵۰ اور ۵۵۰ کی آفر کے ساتھ آئے مگر میں نے بالترتیب ۵۵۰ اور ۷۵۰ طلب کیے اور اِدھر ہندوستان میں طلب کیے جو ظاہر ہے انھوں نے منظور نہ کیے اور نہ میں اپنی جگہ سے ہلا...... رہا مجموعوں کی اشاعت کا سوال تو وہ بھی مجھے سستے داموں منظور نہیں، چاہے انھیں دیمک چاٹ جائے۔''

یہ مکتوب اس زمانے کا ہے، جب وہ مسلسل پریشانیوں میں گھرے تھے اور ایسے میں جبکہ مشاعروں کا یہ معاوضہ کوئی اتنا کم بھی نہیں، اس کا قبول نہ کرنا محض اپنی بات اوپر رکھنے والی بات ہے۔ انائی تسکین بعض اوقات منفی ذرائع کا سہارا تلاش کرتی ہے۔ یہ خصوصیت سے اس صورت میں ہوتا ہے جب مثبت ذرائع سے متوقع نتائج کا حصول مشکل یا ناممکن نظر آتا ہو۔ شادؔ نے جیسی زندگی گزاری اس کے سرسری جائزے سے کم از کم یہ

[1] نصرت (لاہور) میں ٹھیک طرح نہ چھپنے پر لکھا: ''آپ کو مطلع کرتا ہوں کہ آئندہ میں نصرت کو کچھ نہ بھیج سکوں گا جب تک کہ آپ ''سخت ضرورت'' کا اظہار نہ فرمائیں گے۔'' (ہفت روزہ نصرت۔ ۳۱/جولائی ۱۹۶۰ء)

احساس ہو جاتا ہے کہ ان کے فن سے قطعِ نظر، عام زندگی میں ان کا رویہ بالعموم منفی رہا۔ چنانچہ زمانے، دوستوں اور شاگردوں وغیرہ سبھی کو اپنی انا کی لاٹھی سے ہانکتے ملتے ہیں اور جہاں کہیں دوسرے کی انا ان کی انا سے ٹکرائی، بس وہیں لڑائی! اور اسی لیے تمام عمر منفی رویے سے سب کے خلاف جہاد کرتے کرتے جب تھک گئے تو کہیں جا کر ''بیماری کی وجہ سے''...... طبیعت ''صلح کل'' ہو گئی۔''[1] لیکن جب تک ان کی اپنی حالت مسعود اشعر کے بقول یہ ہو چکی تھی کہ ''اب وہ خود ایک کٹی ہوئی پتنگ تھے۔ جس نے چاہا پکڑ لیا اور جب چاہا چھوڑ دیا۔ ان کے ڈور اب کسی کے ہاتھ میں نہیں تھی۔'' یوں ان کا یہ شعر شاعرانہ الہام میں گنا جا سکتا ہے:

وہی روش بتانِ کو بکو سے دوستی کی ہے
کٹی ہوئی پتنگ جو بھی لوٹ لے اسی کی ہے

ان کے حالات کے سرسری مطالعہ سے ہی یہ واضح ہو جاتا ہے کہ وہ جھگڑے مول لینے والوں میں سے تھے، تحمل، بردباری، طبیعت[2] کی لچک اور صلح کل اور صلح پسندی واقعی مزاج میں نہ تھی، اس پر مستزاد معاشی بدحالی! یہ حقیقت ہے کہ شاد عارفی کی زندگی میں، وہ عزت اور قدر و منزلت نہ ہو سکی، جس کے وہ مستحق تھے، لیکن اس ضمن میں یہ حقیقت بھی فراموش نہیں کی جا سکتی کہ زندہ ادیب کی عزت افزائی میں فن کے ساتھ ساتھ شخصیت بھی خاصہ اہم کردار ادا کرتی ہے بلکہ بیشتر مثالوں میں شخصیت کا حسن فن کے مقابلے میں زیادہ مؤثر ثابت ہوتا ہے۔ اب ظاہر ہے کہ شادؔ ایسی کرخت شخصیت اور فولادی مزاج کا ہر شخص بھلا کیسے والہ و شیدا ہو سکتا تھا؟ ایسا نہ ہو سکتا تھا اس لیے اسی بنا پر سارے رام پور یا ان کے عصروں کو مطعون کرنا بے جا ہوگا۔ شادؔ شکر پر کڑواہٹ لپٹی گولی بھی ہوں لیکن چند شاگردوں یا احباب کے علاوہ اتنے قریب سے کون دیکھ سکتا تھا اور پھر دیکھنے کو آنکھیں کہاں سے آتیں۔

[1] مکتوب بنام: ننھے میاں صابر۔
[2] ''فولاد لچتا نہیں ٹوٹ جاتا ہے، چنانچہ میں نہ لچنا تھا نہ لچا۔'' (مکتوب بنام آل احمد سرورؔ ۱۳/اگست ۶۳ء)

www.urduchannel.in

ضرورت سے زیادہ زودرنجی اور اپنی ذات کے بارے میں حد سے بڑھی ہوئی حساسیت مریضانہ رجحانات ہیں اور ان دونوں ہی کا اندازہ ان کی تحریروں سے ہو جاتا ہے، اس ضمن میں نفسیاتی اہمیت کا حامل یہ نکتہ بھی ذہن نشین رہے کہ زودرنج یا حساس انسان کی سب سے بڑی خامی یہ ہوتی ہے کہ وہ صرف اپنے رنج کے بارے میں ''زود'' اور اپنی ذات کے بارے میں ''حساس'' ہوتا ہے۔ اس کے طرزِ عمل سے دوسروں پر کیا گزر سکتی ہے، اسے یہ سوچنے کی ضرورت ہی نہیں ہوتی، چنانچہ ان کے بقول:

''بیٹھے بیٹھے خیال آ گیا کہ میں نے تمھاری دوستی کا حق ٹھیک ٹھیک ادا نہیں کیا کیونکہ تمھارے خلوص کا تقاضا یہ تھا کہ میں تمھارے جذبات کی قدر کرتا، مگر اپنی بعض کمزوریوں کی بنا پر قاصر رہا۔''
(مکتوب بنام: ننھے میاں صابر)

شاؔد ایسے شخص کے قلم سے یہ بہت بڑا اعتراف معلوم ہوتا ہے، ورنہ اکثر اوقات تو چھوٹی چھوٹی باتوں پر روٹھنے کا انداز ہوتا ہے، مثلاً مسعود اشعر کو ۱۱؍جون ۶۱ء کے محولہ بالا خط میں یوں طعنہ دیا:

''جس شخص نے شہر کے اندر شادی کی دعوت نہ دی وہ ''ملتان بلائے'' یہ بجائے خود ایسا معمہ ہے، جسے خروشیف ہی سلجھا سکتا ہے یا تو......''
(وجہ: مسعود اشعر نے گھر آ کر شادی کی دعوت نہ دی بلکہ کارڈ بھجوایا تھا۔)

ایسے لوگ بلوغت اور سفید سر کے باوجود بھی جذباتی لحاظ سے بچہ کی طرح خام رہتے ہیں۔ بچہ صرف اپنی بات منوانی چاہتا ہے اور بس۔ اس سے اس کے کردار و افعال میں جو بُعد پیدا ہوتا ہے، اس کی طرف کبھی اس کی نگاہ نہیں جا سکتی (کہ ''بچہ'' ہی اسی لیے ہے) لیکن بوڑھے بچے میں اس کا کیا جواز؟

شاؔد کی شخصیت میں بھی یہ جذباتی بُعد نمایاں تر ہے مثلاً آلِ احمد سرؔور کو ۱۳؍اگست ۶۳ء کے مکتوب میں نفسیاتی اہمیت کی حامل یہ سطریں بھی ہیں:

''مجھ سے انتہا درجہ عجز و انکسار سے پیش آتے رہے، میری سب سے بڑی

www.urduchannel.in

کمزوری یہ ہے کہ میں نرمی سے پسیج جاتا ہوں۔''[1]

اور دوسری سب سے بڑی کمزوری کا بیان یوں ہے:

''میری فطرت[2] انتہا پسند رہی ہے......صدرنشینی کا خیال دل سے نہ گیا، یہ صدرنشینی کا احساس آدمی کو جس قدر عزم و عمل کی پختگی بخشتا ہے وہ بیان سے باہر ہے۔'' (مکتوب بنام: وصی اقبال)

صدرنشینی کا یہ احساس تمام عمر کابوس بن کر آسیب ذہن بنا رہا، جس کھیل میں نہ چل سکے (فٹ بال، ہاکی) اُسے چھوڑ دیا، ٹینس اور کرکٹ خوب کھیلی بالآخر صدرنشینی کے لیے شاعری پہ تکیہ کیا اور صدرنشینی کے احساس نے واقعی تمام عمر چین نہ لینے دیا، کیونکہ اگر کسی نے ان کا نام ''احساسِ برتری'' سے لیا تو انھوں نے ''احساس کمتری'' محسوس کرتے ہوئے فوراً ری ایکٹ کرنے میں کوتاہی نہ کی۔ (ملاحظہ ہو مکتوب بنام: مظفر حنفی ۹؍اپریل ۵۹ء) زندگی حرماں نصیبی کی مسلسل داستان تھی، اس لیے کبھی سُکھ کا سانس نہ لیا، اِدھر اپنے احساسِ کمتری کی بنا پر دوسروں کو جب قطب مینار سے بولتے محسوس کیا تو اپنی بغاوت کا ''نتیجہ یہ ہوا کہ اپنی خودی کو بلند کرتا چلا گیا مگر اتنی بلند بھی نہیں کہ خدا بندے سے اس کی رضا جوئی کرنے لگے۔'' (مکتوب بنام جون ایلیا ۳؍نومبر ۱۹۶۳ء)

اس خودی کی اساس کیونکہ منفی اندازِ نظر کی پیدا کردہ تھی اور کردار کی کجی سے عبارت تھی، اس لیے فنکارانہ زعم تو ہے ہی لیکن اس کے ساتھ ساتھ اپنی ناکامیوں اور پریشانیوں کو تمغۂ امتیاز بنانے کا رجحان بھی قوی تر ہے، اس رجحان کو مزید تقویت یوں ہوتی ہے کہ وہ خود کو باغی سمجھ کر سب سے برسرِ پیکار تصور کرتے تھے، لیکن جب اس بغاوت سے دنیا اور معاشرہ کا کچھ نہ بگڑا تو بالآخر یہی سب سے بڑی پناہ گاہ ثابت ہوکر نفسی آسودگیوں کی باعث بنی، ایسے رجحان کے حامل افراد بالعموم اس نفسیاتی خوش فہمی میں مبتلا ہوتے ہیں کہ ضرور ہم

---

[1] اپنی فطرت کی فولادیت کی طرف اشارہ کرنے والے مکتوب سے موازنہ کیجیے اور یہ شعر بھی:
جو پیش آئیں غریبوں سے انکسار کے ساتھ — تو ہم کو ضد بھی نہیں اہلِ اقتدار کے ساتھ

[2] ''اندھیر نگری'' کے دیباچے میں بھی لکھا: ''میں انتہا پسند واقع ہوا ہوں۔'' (ص ۱۰)

میں کوئی نہ کوئی ایسی انوکھی خصوصیت ہے، جس کی وجہ سے تمام زمانہ مٹانے کے درپے ہے، شاید ہماری تخلیق کا کوئی ایسا مقصد ہے کہ تمام کارکنانِ قضا و قدر کا ہمارے خلاف متحدہ محاذ ہے، یوں آفات، ذہنی کرب اور جسمانی تکلیف کے ساتھ ساتھ انائی غذا بھی بنتی ہیں جس کے نتیجے میں وہ ان ہی پر پنپتی رہتی ہیں۔ ایسی ذہنی حالت کسی حد تک ایذا پسندی Mesochism سے مشابہ قرار دی جاسکتی ہے، جس کی انتہائی اور مریضانہ صورت ایذائی خبط Persecution Mania کے روپ میں دیوانگی کا پہلا مرحلہ ثابت ہوتی ہے چنانچہ ایسے افراد کو ہر شخص اپنا دشمن نظر آتا ہے، سبھی اپنے خلاف سازشوں میں مصروف معلوم ہوتے ہیں اور یوں وہ سب سے برگشتہ ہو کر مریضانہ احساسات کی خود تیار کردہ دلدل میں دھنستا چلا جاتا ہے۔ شاؔد کے ہاں بھی یہ سب کچھ معلوم ہوتا ہے گو وہ مریضانہ نہیں، لیکن آل احمد سرورؔ (۱۳؍اگست ۶۳)، سلطان اشرف (یکم جولائی ۶۳ء) اور مسرت حسین آزاد (۳؍جولائی ۶۳ء) کے نام ''ایک تھا شاعر'' میں شامل طویل مکاتیب سے ان کی ذہنی حالت کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ یہ تینوں خط دو ماہ کے اندر لکھے ہیں بلکہ دو خطوں میں تو صرف تین دن کا فرق ہے، آخری خط سے چند منہ بولتی سطریں درج ہیں:

> ''اسی داد کے بارے میں میرے ہم وطن شعرا مجھ سے حسد برتنے لگے اور وہ رفتہ رفتہ ان کے چہروں، ان کے لبوں تک آ گیا، میرے منہ پر میری تعریفیں اور غیبت میں نکتہ چینیاں کرنے لگے، مگر کسی میں ہمت نہ ہوئی کہ مدِ مقابل بنتا، ہاں ریشہ دوانیاں جاری رکھیں۔''

کوئی عام انسان ہو یا نفسیاتی الجھنوں میں گرفتار شاعر، بیوی سب کے لیے بہت ضروری ہے کہ جنسی آسودگی سے مرد کو مصافِ زیست میں اعصابی سکون مہیا کرنے کے ساتھ ساتھ لڑائی، جھگڑے کی وجہ سے جذباتی ابال جذبات کا بخار نہیں بننے پاتا، اسی طرح شفقت اور پیار محبت یا مار پیٹ اور ڈانٹ ڈپٹ ہر دو لحاظ سے ہی بچے[1] اعصابی تناؤ میں کمی

---

[1] مسعود اشعر کو ۱۱؍جون ۶۱ء کے مکتوب (غیر مطبوعہ) میں یہ دلچسپ سطریں مشورہ ہیں یا طنز؟
''تم نے جتنے بچے پیدا کیے ہیں، وہ کوئی قابلِ ذکر مقدار میں نہیں ہیں مدیرانِ اخبار اور مولوی صاحبان کے لیے نمایاں حیثیت درکار ہے اور کوشش کرو۔ پھر اور کوشش کرو۔ فطرت خود کوئی نتیجہ نکال لے گی۔''

www.urduchannel.in

کے وسیلے سے بہت بڑی نفسیاتی ضرورت پوری کرتے رہتے ہیں، لیکن شاؔد اپنے اعصاب کی جھنجھناہٹ سے چھٹکارے کے لیے نفسیاتی اہمیت کے حامل ان جائز ذرائع سے بھی محروم رہے، اس کی وجہ محض غربت ہی نہیں کیونکہ غریب سے غریب مرد (بلکہ بھکاری تک بھی) شادی کر کے مرتا ہے، اس کی وجہ بھی ان کی اس انتہا پسندی میں تلاش کی جاسکتی ہے، جس نے انھیں تمام عمر سب سے برسرِ پیکار رکھا، انھوں نے مختلف خطوط اور سوانحی خاکوں میں اپنی دو ناکام محبتوں کا ذکر کیا۔ ان کے بقول:

> ''جوانی میں دو لڑکیوں سے عشق ہوا اور ہر مرتبہ اتنی شدت سے ہوا، جتنا کہ پہلا عشق تھا، اور میرا دعویٰ ہے کہ اگر انسان جوانی سے نہ کھسکے تو وہ پچاس مرتبہ عشق کر سکتا ہے، بشرطیکہ اس کے عشق میں بوالہوسی کو دخل ہو...... پہلا عشق ایک خاندانی لڑکی سے ہوا تھا، مگر وہاں بعض قومی کمزوریوں کی بنا پر ہماری شادیاں ممنوع تھیں، اس لیے وہ عشق انتہائی اندوہناک انجام تک جا پہنچا اور میں نے شادی نہ کرنے کا فیصلہ کر لیا، اس عشق کے تین سال بعد ایک ہندو لڑکی سے عشق ہوا، جس کا جواب کافی ہمت افزا تھا، مگر خاندانی اور مذہبی دوریوں نے یہاں بھی روڑے اٹکائے...... میں نے والدہ کی آنکھیں خراب ہونے کے بعد ان کی خدمت کے لیے گھریلو حالات کی ابتریوں سے تنگ آ کر ۳۹ برس کی عمر میں شادی کی تھی، مگر میری بیوی ڈیڑھ سال زندہ رہ کر فالج کی نذر ہو گئی اور میں پھر تنہا رہ گیا۔''
> (مکتوب بنام جون ایلیا۔ ۲؍نومبر ۶۲ء)

ان خطوط سے مرتب ہونے والی داستانِ حیات میں خوشی کی پھل چھڑیاں اور تبسم کی کرنیں نہیں۔ غربت نا آسودگی اور ان کا پیدا کردہ اعصابی تناؤ ہے۔ ان حالات میں اور ایسی زندگی گزارنے پر اگر شاؔد نے اپنے قلم کو زمانے بھر کے خلاف شمشیر بنائے رکھا تو اس میں تعجب نہ ہونا چاہیے۔ شاعری، طنز اور پھر اس طنز کی کاٹ، یہ سب انہی تلخ المیوں کا اثر ہیں (واضح رہے ''اندھیر نگری'' کا پہلا نام ''کڑوے پھل'' تھا)۔

جون ایلیا کے نام اسی خط (۲؍نومبر ۶۲ء) میں یہ جملے بہت معنی خیز ہیں:

''اس مرتبہ لڑائی کے بعد گھونسہ یاد آ رہا ہے، ورنہ پہلے تو ہمیشہ تُرکی بہ تُرکی، کلّہ بہ کلّہ جواب دیتا رہا ہوں۔''

یہ اندازِ زیست تو تھا، اندازِ فن کیسے بنا؟ اس سوال کا جواب بھی ان خطوط ہی سے مل جاتا ہے:

''ملازمتیں ختم کرائی جاتی رہیں، جس کے نتیجے میں میرا طنز اور تیز ہوتا چلا گیا۔'' (بنام آل احمد سرورؔ۔ ۱۳؍اگست ۶۳ء)

''ان دونوں عشقوں میں ناکامی نے عشق کی عمر ختم کر دی اور میں رفتہ رفتہ طنز کی طرف آتا چلا گیا۔'' (بنام جون ایلیا، ۲؍نومبر ۶۲ء)

''طنز چونکہ میرے خمیر میں پڑا ہوا تھا، اس لیے میں نے آخر کار ماحول کے تقاضوں سے تنگ آ کر خالص طنزیہ شاعری شروع کر دی اور حالات کی الجھنوں میں اضافہ کے ساتھ اس میں ترشی اور تلخی شامل کرتا رہا اور کر رہا ہوں...... اب اگر میرا طنز گہرا اور مرچیں لگانے والا ثابت ہو رہا ہے تو اس میں میرا کیا قصور، جس طرح عموماً پٹنے والا دل میں گالیاں دیتا ہے، اسی طرح طنز گو ظلم سہہ کر کڑوی کسیلی باتیں کہہ کر اپنے دل کی بھڑاس نکال لیتا ہے۔'' (شاد عارفی سے ایک ملاقات: وصی اقبال)

چنانچہ:

بے کسوں پر ظلم ڈھا کر ناز فرمایا گیا
طنز کی جانب میں خود آیا نہیں لایا گیا

....

میں دنیا پہ طنز کروں گا
دنیا میرے کیوں درپے ہو

....

یہ فنِ طنز مرے حق میں در حقیقت شادؔ
بہت بڑا المیہ ہے اختصار کے ساتھ

www.urduchannel.in

یہ اور اسی نوع کے بہت سے اشعار صحیح معنوں میں ذاتی واردات کے ثمر ہیں البتہ تلخ!

شاد عارفی ان شعرا میں سے ہیں، جن کی نہ صرف اپنی شاعری کے بارے میں ایک رائے ہوتی ہے بلکہ جو ادب و فن کو بھی ایک مخصوص زاویۂ نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ شادؔ کی زندگی کے اس تفصیلی مطالعہ سے یہ تو عیاں ہو جاتا ہے کہ کن نفسی محرکات نے انھیں طنز نگار بننے پر مجبور کر دیا، لیکن اس کے ساتھ اگر ان کے نظریۂ فن کا محاکمہ بھی کر لیا جائے تو ان کے اشعار کی پرکھ اور تفہیم کے لیے زیادہ وسیع پس منظر مہیا ہو سکتا ہے، اس ضمن میں بھی ان کے خطوط سے بالخصوص امداد ملتی ہے کہ وہاں ذاتی انکشافات کے پہلو بہ پہلو فنی انکشافات بھی ملتے ہیں، شاگردوں کا حلقہ وسیع تھا، اس لیے غزل کی اصلاح کے ساتھ ساتھ بہت سے امور پر دلچسپ فنی بحثیں کی ہیں، جن سے کئی تنقیدی نکات واضح ہوتے ہیں، اصلاح والے خطوط کے علاوہ بھی انھوں نے دیگر خطوط میں برسبیلِ تذکرہ بہت سی ایسی باتیں بھی لکھ دیں، جن کی روشنی میں ان کی تنقیدی نگاہ کی ''ژرفیت'' کا اندازہ لگانا دشوار نہیں رہتا اور پھر ان پر مستزاد دیگر تحریریں۔

''سویرا'' (نمبر ۱۸۔۱۷۔ ۱۹۵۵ء) میں انھوں نے روایت اور انفرادی صلاحیت کے سلسلے میں جن آراء کا اظہار کیا، ان میں سے یہ بہت معنی خیز ہیں:

''شعر کوئی قطب نما نہیں ہوتا کہ اس کی سوئی قطب ستارے کی طرف ہی رہتی ہو۔''

فضاؔ کوثری کو ۲۶؍دسمبر ۵۸ء کے مکتوب میں ان کی غزل پر تنقید کرتے ہوئے لکھا:

''شعر سب صحیح ہیں مگر شعر کا صحیح ہونا قابلِ تعریف نہیں، شعر کے اندر کوئی نُدرت اور چونکا دینے والی بات ہو۔''[1]

---

[1] اسی خیال کا اظہار انھوں نے مختلف اوقات میں مختلف مواقع پر کیا۔ مثلاً صہباؔ لکھنوی کو لکھا:

''ندرتِ ادا میرے لیے شعر کی جان ہے، اسی لیے میں کسی بھی رنگ میں ''ندرت ادا'' کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتا۔''

ندرتِ فن کے واسطے اے شادؔ
میرے مضمون میرے شعر چراؤ

''اندھیر نگری'' کے دیباچے میں ''زبراستادہ'' کے عنوان تلے یوں لکھا:

''...... میں رستہ چلتے میں اِدھر اُدھر کے مناظر کو نظر انداز نہیں کرتا کیونکہ میں چاہتا ہوں کہ جس منظر اور مشاہدے میں کچھ تفریح، کچھ رنگینیِ خیالات پائی جائے وہ کسی نظم، غزل، قطعے یا رُباعی میں سمو کر ناظرین کے حوالے کردی جائے کہ ان کی امانت ہے۔''

''میرا فن'' (ایک تھا شاعر) کے عنوان تلے جو لکھا اس کی چند سطروں کو مندرجہ بالا بیان کے ساتھ ملا کر پڑھیے:

''یہاں یہ بات بھی بتاتا چلوں کہ میری کوئی نظم ''ہوائی'' نہیں ہے ہر نظم کا ماڈل میرے سامنے رہا ہے، شاعرانہ بناوٹ ضرور ہے مگر یہ کہ نظم بے سر و پا ہو، قطعاً غلط تصور ہوگا۔''

شآد عارفی کلاسیکل شاعری اور روایتی غزل کے سخت خلاف تھے، چنانچہ گوندر شکؔ کو ۲۵ رمئی ۶۳ء کے مکتوب میں لکھا:

''کلاسیکل شاعری کی اب عوام کے لیے ضرورت کہاں رہی۔''[1]

اسی طرح روایتی غزل کی مذمت کا کوئی موقع بھی ہاتھ سے نہ جانے دیا۔ معلوم ہوتا ہے غزل کو وہ انتشارِ مضمون کی بنا پر بھی ناپسند کرتے تھے، کیونکہ کئی مواقع پر شاگردوں کو غزل کے موڈ کی برقراری کی تلقین ملتی ہے، مثلاً مظفر حنفی کو ۷ راگست ۶۳ء کے مکتوب میں لکھا:

''غزلوں میں اشعار کی ترتیب موڈ کے لحاظ سے ہونی چاہیے یعنی اگر مطلع سیاسی ہے تو پوری غزل سیاسی ہونی چاہیے، عاشقانہ ہے تو سب شعر عاشقانہ ہوں، ایک قافیہ دوسرے کو کاٹتا ہوا نہ ہو ''نفی'' اور ''اثبات'' کا اجتماع ٹھیک نہیں۔ مثلاً ابھی رنج و غم کی بابت لکھا کہ وہ اچھی چیز ہے اور

---

[1] شراب و شاہد کے تذکرے ان سے چھین لیجے تو کیا کریں گے
شراب و شاہد کے تذکروں تک ہی جن کی جادو بیانیاں ہیں

آگے چل کر قنوطیت کے خلاف شعر آگیا، یہ تسلسل کے خلاف ہے کہ دو طرح کے نظریے جمع کر دیے جائیں، ہر غزل ایک نظریہ کے تحت ہونی چاہیے۔''

یہ اور اسی نوع کے دیگر خطوط میں بکھرے بکھرے تنقیدی اشارات و نکات اس لیے تو اہم ہیں ہی کہ ان سے شآد کے نظریۂ فن پر روشنی پڑتی ہے، لیکن اس کے علاوہ بھی یوں اہمیت کے حامل ہیں کہ یہ خود شآد کے فن کی پرکھ کے لیے اچھے خاصے معیار کی صورت اختیار کر جاتے ہیں۔ بلکہ شاد ایسے شاعر کے مطالعے میں اس کی نفسی واردات سے چشم پوشی برتنے اور اس کے نظریات کو پسِ پشت ڈالنے کا نتیجہ گمراہ کن ثابت ہوسکتا ہے۔ اس لیے میں نے بھی تاریخِ پیدائش، ولدیت، بچپن اور تاریخِ وفات وغیرہ کی صورت میں زندگی کے کوائف مدون کرنے کے بجائے نفسی واردات کی تفہیم سے ان کی شخصیت کی نفسیاتی اساس دریافت کرنے کی کوشش کی ہے، ان کے خطوط سے مرتب ہونے والی یہ ''نفسی سوانح عمری'' کسی حد تک درست ہے، اس کے بارے میں گو مجھے تو کوئی دعوے نہیں کرنے (کیونکہ ابھی تک قارئین اور ناقدین کا ایک طبقہ نفسیات کے آئینے کو شک و شبہ کی نگاہ سے دیکھتا چلا آرہا ہے) لیکن اس امر پر یقیناً زور دوں گا کہ شآد ایسی الجھی شخصیت اور ''جلیبی صفت'' انسان کو نفسیات کی امداد کے بغیر سمجھنا ان کے ساتھ ظلم اور کلام کے ساتھ زیادتی ہے۔ بہت کم ایسے شعرا ہوں گے جنھوں نے شاد کی طرح انتہا تک پہنچتے ہوئے کلام کو ''سوانحی'' بنا دیا ہو، شاید اسی لیے ان کے خیالات، تحریروں اور کلام میں تضاد تو بڑی بات ہے، معمولی سا بُعد بھی نہیں ملتا۔ الغرض طنز و مزاح کے دو کناروں کے درمیان شآد عارفی کی شخصیت کسی طوفانی ندی کی طرح راہ کے سنگ ریزوں اور پتھروں کو ہٹاتی، بڑی بڑی چٹانوں سے ٹکراتی، کف اڑاتی اور موجیں مارتی رواں دواں، رواں دواں ملتی ہے۔

شآد عارفی کی شخصیت کے بعد فن کا جائزہ لیں تو سب سے پہلے یہ بات سامنے آتی ہے کہ نقادوں کی اکثریت نے انھیں اکبر الٰہ آبادی سے مشابہ سمجھتے ہوئے اگر انھیں اکبؔر کا مقلد اور پیرو نہ بھی قرار دیا تو کم از کم اس کی شاعرانہ روایات میں اضافہ کا موجب ضرور ہی

www.urduchannel.in

گردانا۔لیکن میرے خیال میں یہ محض سطح کو اساس سمجھ لینے والی بات ہے۔شاد اور اکبر میں محض مزاح یا طنز قدرِ مشترک ہے (ویسے مجھے شاد کو مزاح نگار سمجھنے میں بھی تامل ہے) اگر ایک لمحے کو اسے درست بھی تسلیم کرلیا جائے تو مزاحیہ اور طنزیہ شاعری تو سودا بلکہ جعفر زٹلی جتنی قدیم ہے اس لیے کیا اس بنا پر شاد کو جعفر زٹلی کا مماثل قرار دیا جاسکتا ہے! اگر مزاج کے اعتبار سے دیکھیں تو شاد، اکبر کے مقابلے میں سودا کے زیادہ قریب معلوم ہوتے ہیں، شاید انھیں بھی غیر شعوری طور سے اس کا احساس ہوگا جس کا اظہار وہ (سطور بالا میں مندرج) ایک خط میں کر چکے ہیں۔

اکبر کے طنز اور زندگی میں بُعد ملتا ہے،اس کی زندگی مفاہمت کی نمایاں ترین مثال ہے، وہ مفاہمت جو اس نچلے طبقے کے ضمیر میں ہے، جو جہدِ زیست میں ہمیشہ اس بنا پر خوب سے خوب تر کا جویا ہوتا ہے کہ جادۂ زیست پر قدم ڈگمگائے تو وہ نچلے طبقے کی تحت الثریٰ میں جا گرے گا۔اکبر نے معمولی بلکہ کم حیثیت سے ترقی کی۔اتنی کہ انگریزی حکومت میں اونچا منصب پایا اور یوں اپنے بیٹے عشرت کو انگلستان میں اعلیٰ تعلیم کے لیے روانہ کیا۔اس کے برعکس شاد کی تمام زندگی عدمِ مفاہمت کی آئینہ دار ہے، وہ تمام عمر مالی مصائب میں مبتلا رہے، ذہنی پریشانیوں کے بھنور میں گھرے رہے، لیکن گردن خم نہ کی۔ چنانچہ ادارۂ نیا خواب نے یومِ شاد پر جو کتابچہ مدون کر کے طبع کیا، اس میں شاد نے یہ بھی لکھا:

''اس دوران میں میرے سامنے کانگریسی وقار تھا اور سوچتا تھا کہ ریاستیں ختم ہوں گی تو کانگریسی دورِ حکومت عوام کے لیے بہت سازگار ہوگا مگر انجام کار اپنے تصور پر آج تک پشیمان ہوں اس لیے کہ جس کانگریس کے لیے میں نے فاقے تک کیے وہ مجھے خوشامدی نہ ہونے کی وجہ سے لائق اعتنا نہیں سمجھتی، یہی نہیں بلکہ مجھے ملازمت سے بھی علاحدہ کر دیا، اور آج آٹھ سال ہونے کو آئے پراویڈنٹ فنڈ تک کی رقم نہیں ملی......
یقین مانیے مبلغ تیس روپے کی رجسٹریاں کیں مگر جواب نہ ملا۔''

خوشامدی نہ ہونا اچھی صفت کے علاوہ انائی پندار بھی ہوسکتا ہے،لیکن سوال یہ ہے

www.urduchannel.in

کہ اکبر میں انگریزوں کے خلاف انائی پندار نے قومی پندار کی صورت میں ایک دفاعی حصار کیوں نہ قائم کیا؟ اکبر نے تو حکومت کی باز پرس پر بلوۂ کانپور پر لکھی گئی نظم اور جنگِ عظیم کے سلسلے میں بعض اشعار لکھنے پر معذرت بھی کرلی جبکہ شاد کا موٹو ہی یہ معلوم ہوتا ہے:

عظمتِ فن کی روایات کو مرنے نہ دیا
شعر سے بچ کے کوئی ظلم گزرنے نہ دیا

اس کا ثبوت جبل پور میں فساد کے موقع پر لکھی گئی جذبات میں ڈوبی، طویل جوشیلی نظم ''ابھی جبل پور جل رہا ہے'' پیش کی جاسکتی ہے۔اکبر کو قدم قدم پر اپنی سرکاری حیثیت کا احساس تھا اور اسی لیے مزاح اپنایا۔ان کا یہ مشہور شعر دراصل اسی ''مفاہمت'' کا غماز ہے:

سرد ہے موسم ہوائیں چل رہی ہیں برف بار
شاہدِ معنی نے اوڑھا ہے ظرافت کا لحاف

اس ضمن میں یہ اور اس نوع کے دیگر اشعار کی تلاش چنداں مشکل نہ ہوگی:

موقعۂ بحث نہیں صاحبِ اقبال ہیں آپ
میری ہر بات بُری آپ کی ہر بات اچھی

اس کے برعکس شاد کا انداز منافقانہ نہیں بلکہ جارحانہ ہے:

پئے تحسینِ وطن طنز ہمارا فن ہے
ہم کسی خانہ برانداز سے ڈرتے ہی نہیں

اکبر دراصل اسی شکست خوردگی، احساسِ بے چارگی، دروں بینی اور نفسی پژمردگی کی علامت ہے، جو ۵۷ء کے بعد مسلمانوں میں سرایت کر چکی تھی اور جس نے قومی سطح پر ایک خاص نوع کا احساسِ کمتری پیدا کر رکھا تھا، جس کے بوجھ تلے دب کر اگر ایک طبقہ نے انگریزی تعلیم، وضع قطع اور طرزِ بود و باش کو ترقی کا زینہ جانا تو دوسری طرف اُسے شک وشبہ یا نفرت اور حقارت سے دیکھنے والوں کی بھی کمی نہ تھی (سرسید کیونکہ اس تحریک کے سربراہ اور اندازِ نظر کے داعی تھے اس لیے اس نفرت کا مرکز بھی وہی تھے) اس تمام سلسلے میں اکبر کی اپنی مفاہمت والی پالیسی برقرار رہی۔

مدخولۂ گورنمنٹ اکبر اگر نہ ہوتا
اس کو بھی آپ پاتے گاندھی کی گوپیوں میں

دراصل ''مدخولۂ گورنمنٹ'' ہونے کے احساس نے ہی ان کے طنز کے تیوروں کی

صورت میں فن کے انداز کا تعین کیا، انگریزی اقدار کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرنے کی جرأت نہ تھی، اس لیے مغربی تعلیم اور مغربی تہذیب سے وابستہ چند بے ضرر سی اشیا (انجن، ڈبل روٹی، ہیٹ، موٹر وغیرہ) اور اس کی مثالوں کی صورت میں چند ہدف چن کر طنز کے لیے شیخ، جُمن، سیّد اور بدّھو وغیرہ چند علامات مقرر کر لیں، علاوہ ازیں تضمین، پیروڈی، مضحک الفاظ وقوافی اور تراکیب وغیرہ سے اپنے اسلوب میں چاشنی اور طنز میں تیزی اور نشتریت پیدا کی۔ یہ سب کچھ اس لیے کہ بات دو اور دو چار ایسے قطعی انداز میں نہ کہی جا سکے اور اسی لیے شاہدِ معنی کو ظرافت کا لحاف اوڑھایا۔ بالفاظِ دیگر اکبر کا طنز اتنا مضامین کا نہیں جتنا اسلوب کا ہے!

شاد کیونکہ اکبر کے مفہوم میں مدخولۂ گورنمنٹ نہ تھے، اس لیے انھوں نے شاہدِ معنی کو ظرافت کا لحاف اوڑھانے کی ضرورت نہ محسوس کی، بلکہ یوں معلوم ہوتا ہے کہ وہ تو طنز سے شاہدِ معنی کو عریاں کرنے پر تُلے بیٹھے ہیں، ان کا اندازِ نظر اس شعر سے عیاں ہے:

ہم سے اس قسم کی امید نہ رکھے دُنیا
ہم کسی شخص کی تعریف تو کرتے ہی نہیں

اسی اندازِ نظر کی روشنی میں ہی ان کے اسلوب کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے، چنانچہ جہاں اکبر بہت سے لوازم سے حقیقت چھپاتے ہیں وہاں شاد کی شاعری حقیقت کو عریاں کرنے کے لیے ہر طرح کے شاعرانہ لوازم اور بالخصوص اسے کیموفلاج کرنے والے عناصر سے پاک ہے، اسی لیے اکبر کے مقابلے میں شاد کا اسلوب روکھا پھیکا بلکہ ''کھرّا'' معلوم ہوتا ہے کیونکہ انھیں بات چھپانے کی ضرورت نہ تھی، اس لیے انھوں نے کھل کر زندگی اور اس کے مسائل سے دلچسپی لی اور اہلِ نگاہ کو ان کے ہاں تنوع کی کمی کا قطعی احساس نہیں ہو سکتا جب کہ اکبر کا دائرۂ نگاہ شاد کے مقابلے میں محدود تر ہے اور محض ''انگریزیت'' محورِ فکر! اس لیے شاد کے ہاں طنز، اسلوب سے نہیں بلکہ مضامین کے تنوع سے جنم لیتا ہے۔ اکبر اور شاد میں یہ ایسا بنیادی فرق ہے جسے نظر انداز کرنے پر نتیجہ خلطِ مبحث کی صورت میں ظاہر ہو سکتا ہے۔

اکبر تلخی کو شعوری طور پر مزاح کی شکر میں لپیٹتے ہیں، جب کہ شاد اس کے برعکس طنز

www.urduchannel.in

میں زیادہ سے زیادہ تلخی اور زہرناکی بھرنے کی مساعی میں مصروف نظر آتے ہیں۔ اکبر طنز کا لہجہ دھیما رکھتے ہوئے اس سے اصلاح کا کام لینا چاہتے ہیں:

بارِ خاطر ہو تو واعظ کا بھی ارشاد بُرا
دل کو بھا جائے تو اکبر کی خرافات اچھی

لیکن شاد کا ''کھرّا'' انداز ایسا ہے کہ بعض اوقات منہ پر تھپڑ پڑنے کا احساس ہوتا ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ شاعری اس کے لیے ڈھال اور طنز ایک اہم ہتھیار ہے:

بے کسوں پر ظلم ڈھا کر ناز فرمایا گیا
طنز کی جانب میں خود آیا نہیں لایا گیا

....

اس نے جب سو تیر چلائے　　میں نے ایک غزل چپکا دی

....

ہلکے پھلکے طنز[1] سے گویا ٹکڑے ٹکڑے پتھر دیکھا
جس نے مجھ کو گھور کے دیکھا میں نے اس کو ہنس کر دیکھا

اکبر کو شاد پر خالص مزاح کے اعتبار سے البتہ فوقیت دی جا سکتی ہے، شاد کے ہاں ایسے اشعار برائے نام ہیں، جنھیں محض مزاح سمجھا جا سکے۔ شاد نے تمام عمر جس طرح ناشاد رہ کر بسر کی اور محرومیوں نے جن تلخیوں سے دوچار کیا، وہ غالب کی مانند ان کا ارتفاع نہ کر پائے اس لیے ''حیوانِ ظریف'' نہ بن سکے، دراصل جلا بھنا اور پھپھولا بنا شاد مزاح کا اہل نہ تھا، اپنے اس دعوے کے باوجود:

ہر مصیبت پہ مسکراتا ہوں　　شاد رونا میرا شعار نہیں

اصل حقیقت کے ترجمان تو مندرجہ ذیل اشعار ہیں:

یہ غمِ حالات اور یہ لذتِ شعر وسخن
دشمنوں کو بھی مرے انجام نے چونکا دیا

---

[1] ''سفینہ چاہیے'' میں یہ بھی لکھا:
''یہی وجہ ہے کہ وہ جو دوست ہیں نہ دشمن نہ ناقد ہیں نہ تبصرہ نگار، میرے گہرے طنزوں سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔''

یہ فنِ طنز مرے حق میں درحقیقت شادؔ بہت بڑا المیّہ ہے اختصار کے ساتھ

نیاز فتح پوری نے صرف درج ذیل ایک ہی شعر ''شاعرانہ زہر خند یا تبسم زیرلب'' کی مثال کے طور پر پیش کیا ہے:

چاپ سن کر جو ہٹا دی تھی اٹھا لا ساقی
شیخ صاحب ہیں، میں سمجھا تھا مسلماں ہے کوئی

اس انداز کے شاید چند اور اشعار بھی نکل آئیں، ورنہ ان کے ہاں خالص مزاح نہ ہونے کے برابر ہے۔ ویسے بھی شیخ صاحب کے حوالے سے مزاح پیدا کرنا اردو غزل کی قدیم ترین روایات میں سے ہے۔

شادؔ اور اکبر کا تقابلی موازنہ مقصود نہیں، دونوں کا طنز مخصوص عصری اور نجی حالات کا ہی پیدا کردہ نہیں بلکہ دونوں کے نظریۂ حیات اور مقصودِ فن میں بھی بُعد ملتا ہے۔ اکبؔر کے ذہن میں کوئی مخصوص نظریۂ فن نہ تھا، اسی لیے اس نے مذہب اور ماضی پرستی کے نام پر انگریزی تہذیب کے اثرات کے سدِّ باب کی جو سعی کی، اسے بلحاظِ نوعیت ''منفی'' قرار دیا جا سکتا ہے۔ لیکن شادؔ کا ایک مخصوص نظریۂ فن ہے اور ان کے یہاں ایسے اشعار کی کمی نہیں جن میں اپنے شاعرانہ منصب کا احساس ملتا ہے، وہ کوئی تنقیدی مضمون نہ لکھ رہے تھے، لیکن خطوط میں بکھرے تنقیدی اشارات کی روشنی میں جب ان بکھرے بکھرے اشعار کو مسلسل پڑھیں تو بہت کچھ سامنے آ جاتا ہے:

صداقتوں کی تلخیوں کے ساتھ شاد عارفی
لطافتِ بیانِ واقعہ غزل کی جان ہے

....

سوال اس میں نہیں حسینوں کو بُت نہ کہیے ضرور کہیے
مگر بعید از قیاس ہو جائے گا کہ پتھر بھی بولتا ہے

---

[1] اسی لیے یوں طنز کیا:

مبالغے کی تمام قسمیں جو شادؔ میں نے گلوں پہ چھڑکیں
پکار اٹھے باغباں کے پٹھو کہ واہ کیا شعر کہہ دیا ہے

جنھیں حقیقت[1] بیان کرنا خلافِ آئین و مصلحت ہے
سمجھ رہے ہیں معاشرے میں غزل تغزل کی مملکت ہے
جبھی تو ان شاعروں کو سن کر گماں گزرتا ہے ایسے خط کا
لکھا ہو جس میں سوائے فاقہ وطن میں سب خیر و عافیت ہے

....

اے شادؔ میں اکثر غزلوں میں، اے شادؔ میں اکثر نظموں میں
مجھ پر بھی صادق آتی ہے، ایسی جگ بیتی کہتا ہوں

....

تلخیِ گفتار[2] کی تائید میں خطرہ ہے شادؔ
مجھ سے بچتے ہیں اگر نقادِ فن تو کیا ہوا

....

صحرا کو گلستاں کہتا ہوں، بجلی کو تجلی کہتا ہوں
سو معنی پیدا ہوتے ہیں، اتنی بے معنی کہتا ہوں

....

اس وقت کہ ماحول بھی للکار رہا ہے
کیا موقعۂ رنگینیِ گفتار رہا ہے

....

---

[1] ایک موقع پر شادؔ نے یوں لکھا ہے:
''واقعیت کا فقدان طبیعت پر کھلنے لگا......اب جو چل مرے خامہ بسم اللہ کہہ کر اپنے لیے ایک نئی راہ نکالی تو ثابت ہوا کہ خوبصورتی کے ساتھ واقعیت کو مصور کرنا آسان کام نہیں، مگر ڈھونڈھنے سے خدا ملتا ہے۔''

[2] صہبا لکھنوی کے نام مکتوب میں یوں لکھا:
''میری خواہش یہ ہے کہ یہیں بھارت میں مروں، بھارت میں بھی اس طرح کہ جیل میں موت آئے تا کہ میری شاعری کی تلخی پر مُہر لگ جائے۔''
اس سلسلے میں یہ شعر ملاحظہ ہو:

تلخیِ گفتار کی تائید میں خطرہ ہے شادؔ
لکھ رہا ہے مجھ پہ ہر نقادِ فن ڈرتا ہوا

www.urduchannel.in

شآد ہجر و وصل تک محدود تھی میری نظر، اک زمانہ تھا مگر
آج میری ہر غزل وابستۂ حالات ہے، سوچنے کی بات ہے

....

جہاں جہاں غمِ دوراں پہ گفتگو نہ ہوئی
وہاں وہاں مرے شعروں کی آبرو نہ ہوئی

....

دوسروں کی داستانِ عشق اپناتے ہیں وہ
جن سخن سازوں کی اپنی داستاں کوئی نہیں

صداقتوں کی تلخی، لطافتِ بیانِ واقعہ، بعید از قیاس (نہ ہو)، حقیقت کا اظہار، تلخیِ گفتار (کیا موقعۂ رنگینیِ گفتار)، غزل وابستۂ حالات، غمِ دوراں، اپنی داستاں۔ یہ ہیں وہ خطوط جن سے ان کی نظریۂ فن اور تصورِ اسلوب کی تشکیل ہوتی ہے اور ان کی غزلیں ان خطوط سے تشکیل پانے والے تصورِ فن کی منہ بولتی تصویریں ہیں۔ گو فنی لحاظ سے ان کی سطح یکساں نہیں، لیکن اس کے باوجود وہ ان کی حیات اور فن کی تفسیر یقیناً ہیں۔ شآد کا مقصودِ فن کیا تھا؟ اس سوال کا جواب بھی اشعار کی صورت میں ملتا ہے۔

سرمایہ دارسُن کے جسے تلملائیں شاد
ایسی غزل کی ہم سے تمنا کرے کوئی

....

عظمتِ فن کی روایات کو مرنے نہ دیا
شعر سے بیچ کے کوئی ظلم گزرنے نہ دیا

....

پئے تحسینِ وطن طنز ہمارا فن ہے
ہم کسی خانہ برانداز سے ڈرتے ہی نہیں

نظریۂ فن اور مقصودِ فن کا یہ عالم ہو تو تلخیِ گفتار نے اسلوب کا رنگ چوکھا کرنا ہی تھا، لیکن رنگینیِ گفتار سے محترز ہوتے ہوئے بھی یہ کہتے ہیں:

حقیقت نا گوارِ خاطرِ نازک نہ بن پائی
کچھ اس تکنیک سے ہم نے انھیں قصے سنائے ہیں

www.urduchannel.in

اوج دینے کے لیے تلخیِ معروضات کو — سوئے افسانہ گھما دیتا ہوں سیدھی بات کو

مندرجہ بالا یا اس نوع کے دیگر اشعار کے مطالعہ کے بعد جب شاد کا یہ دعویٰ پڑھیں تو یہ تعلّی نہیں بلکہ حقیقت معلوم ہوتا ہے:

پہنچ گیا ہوں وہاں پر کہ واقعات نویس — لکھے کہ طنز میں تھا منفرد شعور مرا

الغرض اس کا اندازہ لگانا دشوار نہیں کہ شآد کے ذہن میں اپنی زندگی اور فن کے بارے میں واضح مقاصد تھے اور ان مقاصد کو محدود بھی تو نہیں کیا جا سکتا۔

شآد خود کو ترقی پسند سمجھتے تھے اور بلا شبہ انھیں ان ترقی پسندوں میں شمار کیا جا سکتا ہے جنھوں نے خلوص نیت اور نظریۂ حیات کی بنا پر اس تحریک سے وابستگی اختیار کی نہ کہ فوری شہرت کے لیے ایک زینہ بنانے کا سوچا ہو۔ لیکن ترقی پسندی کے باوجود بھی انھوں نے اپنی انفرادیت برقرار رکھتے ہوئے ٹریڈ مارک کی طرح ترقی پسندوں کے محبوب اور منظور شدہ مضامین کو اپنے لیے اوڑھنا بچھونا بناتے ہوئے سب کے ساتھ مل کر سرخ سویرا کا کورس نہ گایا۔ وہ ادب برائے زندگی کے تو قائل تھے، مگر کمیونزم کے نہیں، بقول خود:

> ''اب میرے شعور میں[1] ادب برائے زندگی کا چسکا پیدا ہو گیا ہے، جو ہنوز قائم و دائم ہے......بعض مجھے کمیونسٹ خیال کرتے ہیں، یہ غلط ہے کیونکہ اسلام کے اندر کمیونزم کے پنپنے کا امکان نہیں ہے۔''

---

[1] ملاحظہ ہوں یہ اشعار:

قفس میں شاعر غزل سرا ہیں، چمن میں ہلّڑ مچا ہوا ہے
ادب برائے ادب کی پہلی شتابدی پر مشاعرہ ہے

....

شباب و خلوت کی بات اچھی تو ہے مگر آج کل نہ کہیے
غزل برائے حیات لکھیے، غزل برائے غزل نہ کہیے

....

فن برائے فن کا رجحانِ کہن میری طرف
شال کے اندر بڑھاتا ہے کفن میری طرف

شاؔد کو نہ صرف اپنے فنی مقاصد سے پیار تھا، بلکہ عظمتِ فن کی روایات کا پرچم تھامنے کے احساس نے جب شخصیت کی انا کا سہارا پایا تو اس نے انفرادیت کے اس احساس کو جنم دیا، جو ذات کی بالیدگی کے ساتھ ساتھ فن میں بھی اظہار پاتا رہتا ہے، انھیں اس انفرادیت کا شعوری طور پر احساس ہے اور اس کا بیان تعلّی کی حد سے جا ملتا ہے:

شاؔد وہ لوگ بہر حال بڑے شاعر ہیں
جن کو قانون میں آتا ہے غزل خواں ہونا

....

فضول سی اک غزل جو اے شاؔد فن پناہوں کی لے میں لکھوں
تو اس سے بڑھ کر فضول یہ ہے کہ میں ستارے شمار کو لوں

خود کو ہم عصر شعرا سے مختلف (اور ممتاز) سمجھنے کا احساس ان میں اس خیال کی جنم دہی کا ثبوت بنتا ہے کہ میں حال کے ساتھ ساتھ مستقبل کا بھی شاعر ہوں، وہ اپنے گرم خون کی بنا پر خود کو آنے والی اس نسل کے نمائندے کے روپ میں دیکھتے ہیں جن کا خون بھی گرم ہوگا۔ چنانچہ تلخیِ گفتار کا یہ غازی اپنے ہم عصروں کو تحقیر سے رجعت پسند قرار دیتے ہوئے خود کو مستقبل کی جواں تہذیب کا نقیب جانتا ہے:

مجھے اے شاؔد ان رجعت پسندوں سے تو کیا کہنا
کرے گی یاد مستقبل کی تہذیب جواں مجھ کو

....

کہا کس نے ہماری ہر غزل شاؔد
متاعِ عہد مستقبل نہ ہوگی

....

کریں گی یاد مجھے شاؔد کل نئی قدریں
جو آج رسم و رواجِ کہن پہ چوٹ کروں

اس نوع کے اشعار کا مطالعہ کرتے وقت یہ حقیقت فراموش نہیں کی جا سکتی کہ ''مستقبل کا شاعر'' ہمیشہ انقلاب یا پیغام کا شاعر ہوتا ہے، لیکن شاؔد کی شاعری پیغام سے عاری ہے، ان کے پاس مستقبل کے لیے ایسا کوئی لائحۂ عمل نہیں ہے، جس پر انحصار کرتے

www.urduchannel.in

وقت وہ خود کو نئی قدروں کا پرچارک قرار دیں، دراصل یہ بھی ایک طرح کی تسکین کا انداز ہے، جس کی تہہ میں خود کو مظلوم سمجھنے کا نفسیاتی احساس ہے، ویسے تو انھوں نے انقلاب پسندی کا بھی ثبوت دیا، لیکن یہ انقلاب بھی جذباتی بحران کے تناؤ سے چھٹکارے کا ایک نفسیاتی ذریعہ ہے، جس نظام نے انھیں مسلسل ذہنی کرب میں مبتلا رکھا، اس کو سرنگوں دیکھنے سے ذہنی تسکین حاصل کی جاتی ہے، تفکر کے بغیر انقلاب پسندی محض ایک نعرہ قرار پاتا ہے۔

یقیں کیجیے انقلابات ہستی   محلات کے سائے سائے کھڑے ہیں

....

اک انقلاب دیکھ رہا ہوں چمن چمن   میری نظر جہاں ہے تمھاری نظر نہیں

....

اور وہ مسلسل غزل جو کلیم الدین احمد کو سخت ناپسند ہے، اور جس کا مطلع یوں ہے:

چمن کو آگ لگانے کی بات کرتا ہوں   سمجھ سکو تو ٹھکانے کی بات کرتا ہوں

شاؔد کی افتادِ طبع اور موضوعات، غزل کی تنگنائے کی تاب نہ لا سکتے تھے، اس لیے وہ غزل میں انقلابی تبدیلیوں کے خواہاں تھے۔ نئے موضوعات اور اسالیب خود مروج کرنے کے ساتھ ساتھ روایتی غزل کا مضحکہ اڑانے کا یا تحقیر کرنے کا کوئی موقع بھی انھوں نے ہاتھ سے نہ جانے دیا۔ اسی احساس نے عملی صورت اختیار کی تو ان کی غزل ہم عصر غزل سے ممیّز ہوئی۔

غزل کی تنگ دامانی کا احساس غالبؔ سے شروع ہو چکا تھا اور حالؔی، عظمت اللہ خاں اور کلیم الدین احمد نے تنقید میں بھی اس پر اعتراضات کیے اور شاؔد بھی ایک لحاظ سے ان ہی کے ہم نوا قرار پاتے ہیں چنانچہ انھوں نے اپنے مخصوص انداز میں روایتی غزل کو ادب کی قحبہ قرار دے دیا:

وہ جو ننگی ناچتی رہتی ہے بزمِ عیش میں
اس غزل کا شاؔد کیا، ماحول بھی قائل نہیں

---

[1] بعض مواقع پر تو انھوں نے کمیونسٹوں پر واضح قسم کی چوٹیں بھی کیں:

سرُخ شاعر مصلحت کی کینچلی جھاڑیں جو شاؔد   پھول کو دل اور نکہت کو فغاں کہنے لگیں
وہ بدلتے ہوئے ماحول کا سانچہ ہی سہی   کوئی سکہ تو نہیں ذہن کہ ڈھل جائے گا

وسمہ و غازہ کی یہ شوقین بُڑھیا تا بکے
فرض کر لیجے غزل میں بانکپن باقی بھی ہے

....

انقلاب آمادہ ذہنوں کو غزل کی چاشنی
تجھ میں اے مطرب تمیزِ اہلِ فن باقی بھی ہے

....

عُریاں غزلیں چھوڑ چکا ہوں
فن کی دھارا موڑ چکا ہوں

....

ان ناقدینِ شعر و ادب نے جنابِ شادؔ
عُریانیِ غزل کا کبھی جائزہ لیا!

....

دراصل شادؔ، عظمت اللہ خاں کی طرح بحیثیت صنف، غزل کی گردن مار دینے کے حق میں نہیں، بلکہ انھیں غزل کی بعض روایات، مخصوص مضامین اور فارمولے کی صورت اختیار کر جانے والے بندھے ٹکے اسلوب سے چڑ معلوم ہوتی ہے، ورنہ وہ خود تمام عمر غزلیں نہ کہتے کیونکہ شعر کو زندگی کے مسائل کا ترجمان دیکھنے کے خواہش مند تھے، مگر ’’حسین و نازک غزل‘‘ کا مخصوص سانچہ حقیقت نگاری میں آڑے آتا ہے، اس لیے عصری تقاضوں سے روگردانی کے جرم میں اسے معتوب گردانتے ہیں، ایک لحاظ سے دیکھا جائے تو یہ اعتراضات غزل پر نہیں، بلکہ ان کے ہم عصر سبھی غزل گو شعرا پر وارد ہوتے ہیں، چنانچہ بعض اوقات تو وہ واضح الفاظ میں روایتی غزل گو کو ہدفِ ملامت بناتے نظر آتے ہیں:

شراب[1] و شاہد کے تذکرے ان سے چھین لیجے تو کیا کریں گے
شراب و شاہد کے تذکروں تک ہی جن کی جادو بیانیاں ہیں

....

شاد وہ لوگ بہر حال بڑے شاعر ہیں
جن کی قانون میں آتا ہے غزل خواں ہونا!

[1] کہیں اشارہ جگر مرادآبادی کی طرف تو نہیں!

www.urduchannel.in

وہ شاعرانِ فرار و رجعت حیاتِ نو کا پیام کیا دیں
جو شہر آشوب کے محل پر حسین و نازک غزل سنا دیں

....

قفس میں شاعر غزل سرا ہیں چمن میں ہلڑ مچا ہوا ہے
ادب برائے ادب کی پہلی شتابدی پر مشاعرہ ہے

....

یہ تغزل کے پرستار پرانے شاعر
زُلف کو عارضِ گلنار پہ دیتے ہیں شرف

....

اس کا مطلب ہے جوانوں کو وہ اپنے ہمراہ
روشنی سے لیے جاتے ہیں اندھیروں کی طرف

....

جوان شاعر تو شاد اس لغویت سے دامن چھڑا چکے ہیں
مگر ضعیفوں میں اب بھی چرچا ہے چاک دامانیِ رفو کا

....

وہ ہم عصر غزل گو پر اسی لیے یہ چوٹ کرتے ہیں:

گلے میں اے شاد جن کے رس ہے، جنھیں تھرکنے پہ دسترس ہے
مشاعرے میں پرانی غزلوں پہ داد پائیں خراج مانگیں

....

اسی اندازِ نظر نے ان میں اپنی برتری کا احساس پیدا کیا:

اے شادؔ جو تھے تلخیِ افکار کے حامی
وہ بھی مرے شعروں سے بُرا مان رہے ہیں

....

جب اربابِ مدح و تغزل لُطف کی بھکشا مانگ رہے تھے
میں نے تاج و تخت شہی کی جانب ہاتھ بڑھا کر دیکھا

....

اے شادؔ غزل کا ہر دشمن ہٹ دھمی چھوڑے، غور کرے
نو لمبی لمبی نظموں سے نو شعر ہمارے کیا کم ہیں[1]

شاد کی زندگی کے عام حالات کو مدِ نظر رکھیں تو جس تلخیِ گفتار کے وہ غازی ہیں، وہ دراصل نجی قسم کی ہے، لیکن یہ ان کا کمال ہے کہ انھوں نے اس تلخی کا بھی ارتفاع کر کے اسے حالات کی عکاسی اور ترجمانی کے لیے وقف کر دیا، اس لیے جب انھیں ہم عصر شعرا کا کارواں غزل کی روایت کے راستے پر افتاں وخیزاں چلتا نظر آتا ہے تو وہ اظہارِ بے زاری تو کرتے ہیں، لیکن اس میں بھی انائی تسکین کا سامان ڈھونڈ لیتے ہیں، چنانچہ:

ندرتِ فن کے واسطے اے شادؔ
میرے مضمون میرے شعر چراؤ

....

میں چُراتا نہیں مضمونِ شگفتہ اے شادؔ
چھین لیتا ہوں اگر دامنِ الہام میں ہوں

....

میں کسی رنگ میں مجبور نہیں ہوں اے شادؔ
ورنہ ہر شخص کا اک طرزِ بیاں ہوتا ہے

....

شادؔ مجھے یہ دھن رہتی ہے
اپنا نغمہ اپنی لَے ہو

....

اسی لیے بعض اوقات یوں محسوس ہوتا ہے گویا فن اور انا نے مل کر ایک اونچے پیڈسٹل کی صورت اختیار کر لی، جس پر متمکن شادؔ یوں خطاب کرتے ہیں:

ہماری غزلوں، ہمارے شعروں سے تم کو یہ آگہی ملے گی
کہاں کہاں کارواں لٹے ہیں، کہاں کہاں روشنی ملے گی

---

[1] یہ مطلع بھی ملاحظہ ہو
تائیدِ غزل کے بارے میں دو چار اشارے کیا کم ہیں نو لمبی لمبی نظموں سے نو شعر ہمارے کیا کم ہیں

www.urduchannel.in

شباب وخلوت کی بات اچھی تو ہے مگر آج کل نہ کہیے
غزل برائے حیات لکھیے، غزل برائے غزل نہ کہیے

....

صحرا کو گلستاں کہتا ہوں، بجلی کو تجلی کہتا ہوں
سو معنے پیدا ہوتے ہیں اتنی بے معنی کہتا ہوں

....

مجھے بھی شادؔ ریشمین شاعری سے شوق تھا
مگر وہ عمر سر خوشی کی تھی یہ آگہی کی ہے!

....

وہ شادؔ ہوں گے پشیمانِ آگہی اک دن
لگاؤ جن کو نہیں ہے مرے کلام کے ساتھ

....

اب تک پیش کی گئی اشعار کی ان وافر مثالوں سے ان کے نظریۂ فن، مقصودِ فن اور مسلکِ فن کی وضاحت ہی نہیں ہوتی بلکہ اسلوب کا اندازہ لگانا بھی دشوار نہیں رہتا۔ میں نے ابتدا میں ان کے اسلوب کو ''کھُرّا'' قرار دیا تھا، سو ان اشعار سے اس کی بھی تائید ہو جاتی ہے، ایک بھی ایسا شعر نہ ملے گا جس میں انھوں نے بات کو شعوری طور سے خوبصورت بنانے کی کوشش کی ہو، یوں محسوس ہوتا ہے کہ انھیں طرزِ ادا کے جمالیاتی عناصر سے کسی طرح کی بھی دلچسپی نہ تھی، اشعار کو دوٹوک بنانے کے لیے رنگینیِ گفتار سے کلّی پرہیز کیا کہ یہ ان کی خیال میں ''ریشمین شاعری'' کی صفت ہے علاوہ ازیں موضوع کی یک رنگی اور مقصد کی لگن نے غزل کی روایتی تکنیک کا پابند بھی نہ رہنے دیا، ان کی جوشیلی طبیعت محض دو مصرعوں میں مضمون اور اس کے تمام نوکیلے پہلوؤں کو سمونے میں ناکام رہتی ہے، اس لیے بیشتر غزلیں مسلسل ہی نہیں بلکہ اپنی ''سادہ کرختگی'' کی بنا پر طنزیہ نظموں سے کسی طرح سے کم نہیں ایسی نظمیں جو ان دنوں اخبارات کے سنڈے ایڈیشنوں کی زینت بنتی ہیں، اور یوں بعض اوقات شعر بالکل سپاٹ اور محض ''خبر'' بن کر رہ جاتا ہے، یہ ایک ایسی خامی ہے جس کا احساس قدم قدم پر ہوتا ہے، چند مثالیں کافی ہیں:

جس کی لاٹھی اسی کی بھینس ہے آج
کیا اسی کو کہیں گے جنتا راج

....

ان کے مداح اس زمانے میں
جیسے کتّے قصائی خانے میں

....

کل تھا لیکن آج نہیں ہے
طاقت ور کا ٹھینگا سر پر

....

سلجھانے کی بات بنا کر
داڑھی چوٹی سے الجھا دی

....

اگر ہمارا یقیں نہیں ہے تو آیئے آپ کو گنا دیں
بہار میں جن کے آشیانے لٹے ہیں وہ اپنے ہاتھ اٹھا دیں

....

ہے تو احمق چونکہ عالی شان کاشانے میں ہے
اس لیے جھک مارنا بھی اس کا ، فرمانے میں ہے

....

اقبالؔ کے ہاں بھی مسلسل غزلوں کی کمی نہیں ہے چنانچہ ''بالِ جبریل'' کی بیشتر غزلیں مسلسل غزلیں کم اور یک موضوعی نظمیں زیادہ معلوم ہوتی ہیں، لیکن اقبالؔ کا اسلوب انھیں سپاٹ ہونے سے بچا کر تاثر آفرینی میں اضافہ کا موجب بنتا ہے لیکن شادؔ کا ایک تو انداز گمبھیر نہیں، اس پر تفکر کا فقدان۔ گو وہ معاشرے کے کسی بھی پہلو کو نہیں چھوڑتے، سب پر طنز کے نشتر سے ''حملہ آور'' ہوتے ہیں، لیکن ان کے پاس کوئی مثبت لائحۂ عمل نہیں اور وہ کسی نظام کے داعی بھی نہیں۔ مندرجہ ذیل اشعار طنز کی کامیاب مثالیں ہیں، اس طنز سے وہ ہماری بصیرت میں اضافہ بھی کرتے ہیں۔ ان اشعار میں جذبات کی انگیخت تو ہے مگر ان کے لیے رہنمائی نہیں:

صرف اپنوں کے تقرر کا ارادہ ہوگا
اور اخبار میں اعلانِ ضرورت دیں گے

....

ہمارے ہاں کی سیاست کا حال مت پوچھو
گھری ہوئی ہے طوائف تماش بینوں میں

....

سینک سکتے ہیں آپ بھی آنکھیں
جل رہے ہیں نشیمنوں کے الاؤ

....

اصطلاحاً بُرے کو بھلا کہہ دیا
یعنی گالی نہ دی رہنما کہہ دیا

....

زک پہنچانے کی تاک میں ہیں ہم دونوں لیکن کہنے کو
وہ مجھ کو پڑوسی کہتے ہیں، میں ان کو پڑوسی کہتا ہوں

....

یہ اور اس نوع کے دیگر اشعار تاثر سے عاری نہیں لیکن مجموعی طور سے یوں محسوس ہوتا ہے کہ بس ''غزل چپکا دی'' یا پھر پہاڑی ندی کا زور شور ہے!

جب ان کی زندگی اور فن کا پہلو بہ پہلو جائزہ لیں تو دونوں بالمقابل آئینوں کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ آئنہ میں آئینے کا عکس اردو ادب کی ایک نادر مثال ہے۔ فن نے دکھی زندگی سے جنم لیا اور دکھی زندگی نے فن میں پناہ پائی۔ اس لیے شاعری میں جلد ہی وہ مقام آ گیا جہاں طنز اور شادؔ میں امتیاز باقی نہ رہا، چنانچہ مسعود اشعرؔ کو ۱۱/جون ۱۹۶۱ء کے مکتوب میں یوں لکھا:

''بات یہ ہے کہ میں ہندوستان میں مرنا چاہتا ہوں تا کہ زمانہ دیکھ لے کہ

www.urduchannel.in

میری شاعری کا پس منظر کیا تھا اور کتنی تنگ دستی اور پریشانی میں اپنی ادبی زندگی گزاری۔''

یوں شاؔد کے لیے زندگی ایک مسلسل جہاد بن گئی، جس میں قلم سب سے بڑا ہتھیار بنا تو طنز کا زہر روشنائی! وہ اس زہر کو معاشرے کی رگ و پے میں سرایت کرنے کے متمنی تھے، لیکن آگ سے کھیلنے والے اپنا ہی دامن جلایا کرتے ہیں، ویسے شاؔد کا مرنا رائگاں نہ گیا، اور کلام کی صورت میں واقعی اس نے ایک پس منظر مہیا کر دیا۔ تضادات کے تمام رنگوں والا پس منظر جو اس کی زندگی ہی نہیں بلکہ اس کے عصر کا بھی ہے اور یوں یہ شعر اس کی زندگی اور فن کا آئینہ بن جاتا ہے:

یہ فنِ طنز مرے حق میں در حقیقت شاؔد
بہت بڑا المیہ ہے اختصار کے ساتھ

............☆............

پروفیسر محمد نعمان خاں

صاحبِ طرز طنز نگار شاعر: شاؔد عارفی

اسالیبِ ادب میں طنز و مزاح ایک دوسرے سے قریب تر ہوتے ہوئے بھی اپنی علاحدہ شناخت رکھتے ہیں۔ معروف طنز و مزح نگار مشتاق یوسفی کے بقول:

''وار ذرا اوچھا پڑے اور بس ایک آنچ کی کسر رہ جائے تو لوگ اسے بالعموم طنز سے تعبیر کرتے ہیں، ورنہ مزاح۔''

اردو شعر و ادب میں طنز و مزاح کی روایت خاصی وقیع ہے لیکن ایسے شعرا کی تعداد بہت ہی کم ہے جنھیں کلیتًا یا خالصتاً طنز و مزاح نگار کہا جا سکتا ہے۔ خالص مزاح نگار شعرا کے مقابلے میں خالص طنز نگار شعرا معدودے چند ہی ہیں۔ اکبرالہ آبادی کے بعد دوسرا اہم نام شاؔد عارفی کا ہے جنھوں نے بذریعہ طنز اپنی خلاقانہ ذہانت اور لسانی اور شعری صلاحیتوں کا مؤثر اظہار کیا ہے۔ شاؔد عارفی ذکی الحس، ذہین، بے باک انسان اور حق گو فنکار تھے۔ ان کا طنز ان کی افتادِ طبع ہی کا عکاس نہیں ہے، بلکہ ان کے اپنے نجی اور ان کے عہد کے مخصوص سیاسی، سماجی، معاشی اور تہذیبی حالات کا نتیجہ بھی ہے۔ اپنوں کی بے اعتنائی، حالات کی نامساعدت، عام سماجی بے راہ روی نے انھیں طنز نگار بننے پر مجبور کر دیا تھا۔ خوشامد، مصلحت پسندی، خود نمائی، منافقت، خود غرضی وغیرہ کو وہ انسانیت کے منافی تصور کرتے تھے، اس لیے انفرادی یا اجتماعی سطح پر مذکورہ بالا عوامل انھیں جہاں بھی نظر آ جاتے تھے، وہ اس کے

www.urduchannel.in

خلاف آواز احتجاج بلند کیے بغیر نہیں رہتے تھے۔ اپنی حق گوئی، تلخ نوائی اور طنز نگاری کے سبب انھیں زندگی بھر گونا گوں سازشوں، محرومیوں، نا آسودگیوں اور ذہنی و مالی پریشانیوں سے دو چار ہونا پڑا لیکن انھوں نے حالات سے سمجھوتہ نہیں کیا۔ ان کے یہ اشعار ان کی فکر و فن اور مزاج و ماحول کے آئینہ دار ہیں:

یہ فنِ طنز، مرے حق میں در حقیقت شادؔ
''بہت بڑا المیہ'' ہے اختصار کے ساتھ!

بے کسوں پر ظلم ڈھا کر، طنز فرمایا گیا
طنز کی جانب میں خود آیا نہیں، لایا گیا

پئے تحسینِ وطن، طنز ہمارا فن ہے
ہم کسی خانہ بر انداز سے ڈرتے ہی نہیں

شادؔ عارفی کے طنز کی بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ مستعار و مصنوعی نہیں ہے، بلکہ ان کے مزاج و ماحول کی ہی دین ہے جسے ان کی شخصیت اور اسلوب سے علاحدہ کر کے نہیں دیکھا جا سکتا ہے۔ طنز نے ان کے یہاں لازم و ملزوم کی حیثیت ہی اختیار نہیں کر لی ہے، بلکہ اردو شاعری میں انھیں منفرد و ممتاز مقام بھی عطا کر دیا ہے۔ شادؔ عارفی کی زندگی نا موافق اور ناسازگار حالات میں بسر ہوئی۔ انھوں نے زندگی و سماج سے جو کچھ اور جیسا کچھ حاصل کیا اسے بعینہٖ اپنے شعروں میں ڈھال دیا ہے۔ خودداری، بے باکی، بے ریائی اور حق گوئی ان کے مزاج کی کمزوری بھی تھی اور خوبی بھی۔ ایک خط میں انھوں نے لکھا ہے:

''میری سب سے بڑی کمزوری (جس کو میں اپنی دانست میں خوبی سمجھتا ہوں) یہ ہے کہ انتہائی ضرورت کے وقت بھی دھوکہ اور فریب نہیں کرتا، نہ جھوٹ بول کر فائدہ اٹھا سکتا ہوں۔''

مذکورہ بالا کمزوریوں یا خوبیوں کے سبب شادؔ عارفی کی غزلیات، منظومات، قطعات، گیتوں، خطوط اور مضامین غرض کہ ان کی ہر تحریر و تخلیق میں حقیقت بیانی اور طنز و

www.urduchannel.in

نشتریت کے عناصر نمایاں نظر آتے ہیں۔ بقولِ خود:

گیت، افسانہ، رباعی، داستاں، نغمہ، غزل
سیکڑوں سانچوں میں ڈھالا ہے غمِ حالات کو

....

عظمتِ فن کی روایات کو مرنے نہ دیا
شعر سے بچ کے کوئی ظلم گزرنے نہ دیا

....

اس نے جب سو تیر چلائے
میں نے ایک غزل چپکا دی

....

نقدِ ماحول کہ فن ہے میرا
ہر طرف روئے سخن ہے میرا

....

یہی ہے شادؔ میں سب سے بڑا عیب
وہی لکھتا ہے، جو کچھ دیکھتا ہے

....

شادؔ مجھے یہ دھن رہتی ہے
اپنا نغمہ، اپنی لَے ہو

....

ہم سے اس قسم کی امید نہ رکھے دنیا
ہم کسی شخص کی تعریف تو کرتے ہی نہیں

....

غزل کا فن شیشہ گری کا سا نازک فن ہے۔ نغمگی اور اشارے، کنائے کی حامل صنفِ غزل کے نرم و نازک مزاج کو راست اندازِ بیان، سپاٹ پن، نشتریت اور مکالمہ طرازی عام طور پر راس نہیں آتی ہے، لیکن جن شعرا نے لہجے کی تمازت اور کھردرے پن کے باوجود، حقیقی مسائل نیز جذبات و احساسات کا آئینہ بنا کر اپنی قادرالکلامی کے ذریعے

اردو غزل کو بامعنی نئے لب و لہجے سے آشنا کیا ہے، ان میں شآد عارفی کا نام بہت نمایاں ہے۔ ان کے ان اشعار سے مذکورہ باتوں کے علاوہ سہلِ ممتنع کا بھی اندازہ لگایا جا سکتا ہے:

وہ ہمیں تلقین فرماتے ہیں ایسے مشورے
جیسے اندھے سے کہا جائے کہ ’ بائیں ہاتھ کو‘

....

آپ کو کتنی اذیت ہوگی
میں اگر آپ کی باتوں میں نہ آؤں

....

میں نے نزدیک سے دیکھا ہے اُسے
وہ نہیں ہے کہ جو مشہور ہے، وہ

....

آپ کے تیور بتاتے ہیں، بُرا مت مانیے
آپ سے کوئی اصولی کام ہونے سے رہا

....

دیکھ لینا کہ ہر ستم کا نام
عدل ہوگا کسی زمانے میں

حقیقت یہ ہے کہ شآد عارفی نے ’غزل برائے غزل‘ کے بجائے ’غزل برائے حیات‘ کہہ کر ’جمال‘ کو ’جلال‘ میں تبدیل کر دیا ہے۔ اس اعتبار سے ان کا یہ دعویٰ غلط نہیں ہے:

شباب و خلوت کی بات اچھی تو ہے مگر، آج کل نہ کہیے
’غزل برائے حیات‘ لکھیے، ’غزل برائے غزل‘ نہ کہیے

....

شآد عارفی نظریاتی اعتبار سے ترقی پسند نہیں تھے لیکن حقیقت پسندانہ طریقۂ عمل کے سبب ان کے کلام میں اکثر جگہ ترقی پسندانہ فکر و نظر کی کارفرمائی نظر آتی ہے۔ مثلاً:

اک انقلاب دیکھ رہا ہوں چمن چمن
میری نظر جہاں ہے تمھاری نظر نہیں

یقیں کیجیے انقلاباتِ ہستی
محلات کے سائے سائے کھڑے ہیں

....

ہم خدا کے ہیں وطن سرکار کا
حکم چلتا ہے مگر زردار کا

....

جس کی لاٹھی اسی کی بھینس ہے آج
کیا اسی کو کہیں گے جنتا راج؟

....

خشک لب کھیتوں کو پانی چاہیے
کیا کریں گے ابرِ گوہر بار کا

....

سینک سکتے ہیں آپ بھی آنکھیں
جل رہے ہیں نشیمنوں کے الاؤ

....

یہاں چراغ تلے لوٹ ہے اندھیرا ہے
کہاں چراغ جلانے کی بات کرتا ہوں

رنگ کو دھوپ کھا گئی، بو کو ہوا اڑا گئی
کہیے اس اعتبار سے آئی بہار، یا گئی

....

کیا تعجب ہے کہ تیشوں کی طرف بڑھ جائیں
لوگ ہاتھوں کو سوالوں سے جو مہلت دیں گے

....

لاکھوں ہیں ہم سب بے چارے
اے شہزادو! تم کے ہو؟

شآد عارفی کی طنز نگاری، جدت طرازی اور قادر الکلامی کا اعتراف سبھی اہم ناقدین

www.urduchannel.in

نے کیا ہے۔معروف ومعتبر نقاد شمس الرحمٰن فاروقی لکھتے ہیں:

''............ان کا تیور نئے مزاج کی فریب شگفتگی سے زیادہ قریب تر ہے لیکن یہ شاعری بھی لفظی توازن کے بل بوتے پر قائم ہے۔ یہ نئی غزل کی طرف اشارہ کرتی ہے لیکن خود نئی نہیں ہے۔............انھوں نے شاعرانہ موضوعات کی کچی عمارت ڈھادی اور یہ دکھایا کہ خلاقانہ ذہن کے لیے ہر موضوع شعر کا موضوع بن سکتا ہے۔''

شاد عارفی لہجے کی سان کے اعتبار سے ہی منفرد شاعر نہیں ہیں بلکہ نئے موضوعات کو نئے انداز سے برتنے کے سبب بھی وہ اپنی جو علاحدہ شناخت رکھتے ہیں اس لحاظ سے بھی انھیں صاحبِ طرز اور خالص طنز نگار شاعر کہنا غلط نہ ہوگا۔

میں اپنی بات شاد عارفی کے اس شعر پر ختم کرتا ہوں:

شاد ضعیف العمر ہے لیکن اس کے شعر جواں ہوتے ہیں
ایسے لوگ کہاں ہوتے تھے؟ ایسے لوگ کہاں ہوتے ہیں؟

......☆......

www.urduchannel.in

عروج زیدی

شاد عارفی کا آخری سفر

اے ہم نفسانِ محفلِ ما
رفتید ولے نہ از دلِ ما
(فیضی)

جنوری ۱۹۶۴ء کے آخری دو ہفتوں سے مقامی اخبارات میں شاد عارفی کی تشویشناک علالت کی خبریں چھپ رہی تھیں۔ میں ہجوم کارِ سرکار اور دوسری مصروفیتوں کے باعث بہ ذاتِ خود تو عیادت کے لیے نہ جا سکا البتہ مختلف ذرائع سے ان کی مزاجی کیفیت اور خیریت معلوم کرتا رہا۔ ماہ فروری کے پہلے یکشنبہ کی تعطیل میں وقت نکال کر میں جب ان کی مزاج پُرسی کے لیے حاضر ہوا تو ان کی صحت کی سقیم حالت دیکھ کر میرا دل اچانک دھک سے رہ گیا۔ طویل علالت نے انھیں چراغِ سحری بنا دیا تھا۔ چہرے پر قدرے ورم تھا۔ اٹھنا، بیٹھنا دوبھر تھا اور بیماری خطرناک دور میں داخل ہو رہی تھی۔ ان کی جسمانی اور مادی قوتیں مضمحل ہوتی جا رہی تھیں۔ ان کے گلشنِ زندگی پر چھائی ہوئی خزاں کے سائے لمبے اور لمبے ہوتے جا رہے تھے۔ مجھے رہ رہ کر یہ خوفناک خیال سانپ کی طرح ڈسنے لگا کہ لمحوں کی راکھ تلے یہ شعلہ جلد ہی دب کر نہ رہ جائے کیونکہ میں دیکھ رہا تھا کہ رفتہ رفتہ شاد صاحب پر موت کا سایہ گہرا ہوتا جا رہا ہے اور ان کی زندگی موت کے غار کے منہ پر کھڑی ہے۔

مرحوم غالباً نفسیاتِ انسانی کے نباض تھے انھوں نے میرے دل کی کیفیت کا میرے چہرے سے اندازہ کر لیا اور فرمایا ''موت اچھے آدمیوں کو پسند کرتی ہے اور بُرے آدمیوں سے دور بھاگتی ہے۔'' میں نے گھبرا کو پوچھا کہ میرے آتے ہی یہ موت وحیات کا

فلسفہ کیوں بحث میں آ گیا، وہ فوراً بات کا رُخ بدلتے ہوئے بولے ’’لو یہ شعر سنو:

بے ہنر مسند نشیں، اہلِ خرد خانہ خراب
عقلِ انساں سے خدا کا کارخانہ دور ہے‘‘

میں نے عرض کیا ’’مفہوم شعر تو حقیقت پر مبنی ہے اور لائق داد ہے لیکن مصرعۂ ثانی میں ’کا‘ کی تکرار (کا کا) پسند نہیں‘‘ اس معروضہ پر مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے فرمایا: ’’خدا کا شکر ہے کہ شعر میرا نہیں ہے۔‘‘

اتنے ہی میں انھیں رہ رہ کر کھانسی نے ستانا شروع کیا۔ ابھی سانس پر مشکل سے قابو پایا تھا کہ میں نے یہ قطعہ سنایا:

سانس پھولے گی کھانسی سوا آئے گی
لب پہ جانِ حزیں بارہا آئے گی
دارِ فانی سے جب شوقؔ اٹھ جائے گا
تب مسیحا کے گھر سے دوا آئے گی

کیونکہ قطعہ حسبِ حال تھا اس لیے بہت محظوظ ہوئے اور کہنے لگے ’’شاید آپ نے یہ دونوں شعر ابھی گھڑ لیے ہیں۔ چوتھے مصرع میں لفظ ’مسیحا‘ کے استعمال نے مجھے بڑا مزا دیا۔ واہ۔ واہ، سبحان اللہ۔‘‘

میں نے عرض کیا ’’بندہ نواز تیسرے مصرع میں تو شاعر کا تخلص موجود ہے۔ آپ نے قطعے کو میرا نتیجۂ فکر کیونکر سمجھ لیا؟ یہ اشعار جناب شوقؔ بہرائچی کے ہیں۔‘‘ جواباً ہنستے ہوئے بولے ’’معاف فرمایئے۔ میں نے تو شوقؔ کو شادؔ سمجھا:

دارِفانی سے جب شاد اٹھ جائے گا‘‘

اسی نشست میں انھوں نے فرمایا کہ ڈاکٹر اقبالؔ کا ایک شعر اس وقت یاد نہیں آ رہا ہے اس کا قافیہ ہے طوفاں اور ردیف ’بھی ہے‘ میں نے حافظہ پر زور دے کر یہ شعر پڑھا:

کیوں گرفتارِ طلسمِ ہیچ مقدوری ہے تو
دیکھ تو پوشیدہ تجھ میں شوکتِ طوفاں بھی ہے

www.urduchannel.in

شعر سنتے ہی جھوم اٹھے اور فرمایا ’’میں اسی شعر کو یاد کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔‘‘ پھر بات کا سلسلہ جاری رکھتے ہوئے کہا ’’واقعی آدمی کو احساسِ کمتری میں مبتلا نہیں ہونا چاہیے‘‘ اس کے بعد حکومت اور ابنائے زمانہ پر اس انداز سے تنقید کی جسے ساحرؔ لدھیانوی اور شوقؔ بہرائچی نے اپنے اپنے لہجے میں ان الفاظ کا جامہ پہنایا ہے:

درِ زنداں سے دیکھیں یا عروجِ دار سے دیکھیں
تمھیں رسوا سرِ بازارِ عالم ہم بھی دیکھیں گے
(ساحرؔ)

زمانہ یوں مرے سائے سے دور رہتا ہے
کہ جیسے کاٹ ہی کھائے گی مفلسی میری
(شوقؔ)

مستقبل حال میں ابھرتا اور حال ماضی میں ڈوبتا رہا۔ رُت بدلی موسم بدلے۔ مگر نہ بدلے تو شادؔ عارفی کے حالات۔ مجھے ذاتی طور پر معلوم ہے کہ ان پر ایسے وقت بھی گزرے جب وہ نانِ شبینہ تک سے محروم رہے اور بیگانے تو بیگانے، اپنوں نے بھی دستِ تعاون دراز نہیں کیا حالانکہ بعض استفادہ کرنے والے اس حالت میں بھی ان کی رہائش گاہ پر ڈیرا ڈالے نظر آتے تھے۔ اقتصادی بدحالی کا مسئلہ بڑا اہم تھا۔ دورانِ علالت ان کے دماغ پر اس اہمیت کی گرفت روز بروز مضبوط ہوتی جا رہی تھی۔ ان کی زندگی تلخیوں کا عجیب وغریب نمونہ تھی۔ آہ اس ناقدِ بے باک وحقیقت پسند فن کار کی زندگی۔

شادؔ عارفی ترقی پسند شاعر ہونے کے باوجود بڑے دیندار اور پابندِ صوم وصلوٰۃ تھے۔ میں نے ایک مرتبہ جب ان کے گلے میں لٹکنے والے تعویذوں کے بارے میں استفسار کیا تو فرمایا کہ کسی آئندہ موقع پر اس بارے میں تفصیل سے بتاؤں گا سرِ دست یہ سن لیجیے:

میں فدائے پنجتن ہوں شادؔ لیکن میرے دوست
اس عقیدے پر اڑے ہیں پانچویں کالم میں ہوں

شادؔ عارفی اعتکاف پسند نہ تھے۔ اگرچہ مشاعروں کی شرکت سے گریزاں تھے

کیوں کہ ان کی آواز میں نہ لوچ تھا نہ مٹھاس نہ رس، دوسرے روز افزوں نقاہت اور جان لیوا علالت نے چلنے پھرنے سے معذور کر دیا تھا۔ بہ ایں ہمہ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ آخری سفر کے لیے تیار ہیں۔ اسی ملاقات میں انھوں نے فرمایا تھا کہ موت کوئی گالی نہیں ہے۔ موت کا آنا برحق ہے، ہم تیار ہوں یا نہ ہوں۔ وہ وقتِ مقررہ پر ضرور آئے گی۔ فرانس کے ایک دانشور کا قول ہے کہ مفلس کے دماغ میں دانائی کا گلا گھٹ جاتا ہے مگر ہم نے دیکھا کہ شاؔد عارفی کی دماغی توانائی میں کوئی فرق نہیں آیا اور ان کی شعری صلاحیتیں مفلوج ہونا تو در کنار متاثر تک نہیں ہوئیں۔ حالانکہ زندگی نے اس عظیم المرتبت اور البیلے فن کار کو ٹھکرا کر اس سے ملازمت، روپیہ، پیسہ، صحت، طاقت، بیوی، گھر، سکونِ قلب، دردمند و غم گسار احباب المختصر سب کچھ چھین لیا تھا:

زباں ضعفِ پیری میں چلتی رہی
سحر ہو گئی شمع جلتی رہی
(امیؔر مینائی)

آغوشِ اجل میں ابدی نیند سونے تک وہ اپنی غزلوں اور نظموں میں تیکھی تیکھی باتیں کہتے رہے۔ اگرچہ وہ ہڈیوں کا ایک ایسا ڈھانچہ تھے جس پر محض کھال چڑھی تھی اور عسرت زدگی، تنگ دستی اور کسمپرسی کا یہ عالم تھا کہ مرض الموت میں بھی انھیں مناسب طبی امداد نہ مل سکی مگر کیا مجال کہ آخر وقت کے کلام میں بھی یاس اور قنوطیت نے جگہ پائی ہو۔ وقت نے ان کی دنیا کو جہنم بنا دیا تھا، ان کی زندگی سے تمام قہقہے اور تمام مسرتیں چھین لی تھیں بہ ایں ہمہ ان کی شاعری میں آنسوؤں اور آہوں کا پتہ نہیں چلتا۔ ان کے اشعار ہمیشہ کی طرح جینے کا حوصلہ بڑھاتے ہیں۔ شاؔد عارفی اکتسابی نہیں وہبی شاعر تھے، کم سواد بھی نہیں تھے۔ ان کے کلام میں قنوطیت بالکل نہیں ہے اور اس پر اس شعر کا اطلاق بالکل نہیں ہوتا:

دندان تو جملہ در دہانند
چشمانِ زیر ابرو انند

www.urduchannel.in

ان کے کلام میں جدت اور ندرت کے ساتھ ساتھ نتیجہ انگیز پہلو ہیں۔ ان کی شاعری کا موضوع سماج اور ان کی اپنی دنیا کے چلتے پھرتے انسان ہیں۔ آدمی کتنا ہی صاحبِ ذوق ہو مگر شاعری میں یکسانیت اکثر بور کر دیتی ہے اس نقطۂ نظر سے اگر انکا کلام دیکھا جائے تو ان کے ہاں متنوع مضامین کی فراوانی ملے گی۔ ان کا ہر شعر اپنے ساتھ تاثر لے کر چلتا ہے۔ رہ نوردانِ ادب میں انھیں نے اپنے لیے جس ڈگر کا انتخاب کیا تھا اس پر چل کر انھوں نے نہ صرف اپنی منزل کو پا لیا بلکہ اہلِ نظر سے اپنی انفرادیت کا بھی اعتراف کرا لیا۔ ان کی غزلیں اور نظمیں ادب میں جمود کی شکایت کرنے والوں کے ان دریچوں کو کھول دینے کے لیے کافی ہیں جو انھوں نے خود اپنی بصارت اور بصیرت کے درمیان حائل کر لیے ہیں۔

وہ آراستگیِ خیال و زبان پر زور دیتے تھے، ان کی شاعری فی الاصل تنقیدِ زندگی ہے، ناپسندیدہ بات سن کر، پڑھ کر یا آنکھوں سے دیکھ کر ان کے ذہن میں ایک چھنا کا سا ہوتا تھا جیسے شیشہ کا پختہ گلاس فرش پر گر کر ٹوٹ جائے اور پھر ایک آگ، سیال آگ ان کی رگ رگ میں دوڑنے لگتی تھی۔ ایسے موقع پر ان کے ذہن میں بڑی بے ترتیبی اور ہنگامہ ہوتا تھا اور وہ اپنے خیالات کو فوری طور پر کسی ایک منظر پر مرکوز نہیں کر سکتے تھے۔ میری اس بات کے تو آج بھی بہت سے گواہ موجود ہیں کہ تلخ احساسات ان کے دماغ و دل میں اکثر ہلچل مچائے رہتے تھے۔ وہ عموماً نرالی بات کہتے تھے۔ الفاظ کی صوتیاتی تاثیر پر ان کی نظر تھی۔ انھوں نے پُرانے اسلوب کو نئی معنویت دینے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ ان کا فن یہ تھا کہ وہ فرسودہ اندازِ بیان سے محترز تھے اور ان کے اختیار کردہ طریقِ فکر اور اندازِ ادا سے مضمون کا چہرہ دمک اٹھتا تھا وہ چاہتے تھے کہ ان کی انفرادیت ہر جگہ نمایاں رہے۔ ہر جگہ الگ سُر میں گونجے۔

یہی ہے شاؔد میں سب سے بڑا عیب
وہی لکھتا ہے جو کچھ دیکھتا ہے

انھوں نے نظیرا کبرآبادی کی طرح جو دیکھا اور جو محسوس کیا، اپنے انداز میں وہی لکھا۔ بھرتری ہری کا مقالہ ہے کہ دنیا میں پھول دو قسم کے ہوتے ہیں ایک وہ جو سر چڑھتے

ہیں دوسرے وہ جو جنگل میں کھل کر خود بہ خود مُرجھا جاتے ہیں۔ یہی حال انسانوں کا ہے۔ میرے خیال میں شادؔ عارفی دوسری قسم کے پھول تھے جن کے اندازِ فکر اندازِ نظر اور کھرے نیز نوکیلے طنز نے انھیں کسی کے سر چڑھنے کا موقع نہ دیا۔ انھوں نے زندگی بھر اپنے اور بیگانوں کے امتیاز کے بغیر لوگوں کے کردار میں کیڑے ڈالنے کی کوشش کی اور غزل کا محمود بن کر بت شکنی کے بجائے دل شکنی کرتے رہے یہی وجہ ہے کہ انھیں تا حیات ناموافق و نامساعد اسباب کا سامنا کرنا پڑا۔

ان کا اسلوبِ بیان اور انداز اظہار ان کے خلوص کا آئینہ دار ہے اور یہی خلوص ان کے فن کا مزاج ہے۔ ان کا تجربہ اور ان کا مشاہدہ ایک وسیع دنیا رکھتا تھا۔ اس کے باوجود مشاعروں اور ادبی نشستوں میں مبتدیوں تک کے بے تعلق اشعار پر داد دینے میں بخل سے کام نہ لیتے تھے۔ دورانِ گفتگو میں ایک مرتبہ میں نے نازشؔ حیدری کا یہ شعر سنا کر انھیں دیر تک جھومتے اور لطف اٹھاتے ہوئے دیکھا:

فریبِ وقت نے گہرا حجاب ڈالا ہے
وہاں بھی شمع جلا دو جہاں اجالا ہے

یہ کہنا تو بے محل ہے کہ مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی کیونکہ ان کے دارالمحن میں مناسب دوا اور پرہیز کا ایسا خواب تھا جو شرمندۂ تعبیر نہ ہوا۔ ہاں فلاکت کے باعث بیماری نے پاؤں پھیلا دیے اور بیماری کی وجہ سے نقاہت میں اضافہ ہوتا گیا۔ علالت بڑھتی گئی اور قوتِ مدافعت کم ہوتی گئی مگر زندگی اور موت کی یہ کشمکش بھی کب تک قائم رہتی۔ آخر وقت نے کروٹ لی اور حالات کی مجبوریوں کے سامنے انھوں نے گھٹنے ٹیک دیے اور آہستہ آہستہ خانہ خرابی کے عالم میں ہماری نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ بالفاظِ دیگر اس جنگ میں موت کو غلبہ نصیب ہوا چنانچہ ۸/ فروری ۱۹۶۴ء مطابق ۲۳/ رمضان المبارک ۱۳۸۳ھ کی سہ پہر کو شاد عارفی نے بے کسی کے عالم میں سسک سسک کر دم توڑ دیا۔ ان کی زندگی سگریٹ کی طرح جل کر ختم ہو گئی۔

۹/ فروری ۱۹۶۴ء بروز اتوار (مطابق ۲۴/ رمضان المبارک ۱۳۸۳ھ) مرحوم کا

www.urduchannel.in

جسدِ خاکی بعد تکفین بوقتِ ظہر سابق تحصیل کے میدان میں جامع مسجد کے دروازے پر نمازِ جنازہ کے لیے لایا گیا تھا جہاں نماز کے بعد جنازے کے فوٹو لیے گئے۔ اگرچہ کم تعداد میں تھے مگر پھر بھی یہ عینی مشاہدہ ہے کہ ہر مذہب و ملت اور ہر فرقہ کے لوگ ان کے جنازے میں شریک ہوئے۔ بیشتر کی آنکھیں پُر آب تھیں۔ آخر منزل بہ منزل یہ سفر بھی ختم ہوا اور بسترِ علالت پر کی ہوئی وصیت کے مطابق اس فلک بوس ادبی گنبد کو جو دنیائے شعر میں شادؔ عارفی کے نام سے پہچانا جاتا تھا، احاطہ شاہ ولی اللہ صاحبؒ میں بوقتِ سہ پہر سپردِ خاک کر دیا گیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

راہِ عدم کا مسافر جو تغافل کمال فن کو مزاج رام پور کہتا تھا ممکن ہے اس کی روح میت کے سفر کا منظر دیکھ اس انداز سے سوچ رہی ہو:

آئے ہیں تا قبر، دوشا دوشِ احباب اے ریاضؔ
کچھ نہ کچھ عزت تو کی یاروں نے مر جانے کے بعد

وہ دنیا کی نظر میں سمانے کے لیے خود اپنی نظر سے گرنا نہیں چاہتے تھے۔ انھوں نے زندگی بھر اس امر کی کوشش کی کہ ان کی انا مجروح نہ ہو اور وہ اس کوشش میں کامیاب ہوئے۔ ایک بار میرے خلفِ اکبر، عرفان میاں سلّمہٗ سے دورانِ گفتگو میں میری موجودگی میں فرمایا:

''یہ دنیا بڑی سنگ دل اور جابر ہے۔ اس دور میں تو صرف وہ لوگ کامیاب ہو سکتے ہیں جو کھری کھری کہنے کے بجائے مصلحتِ وقت کے ماتحت ہر چمکتی ہوئی چیز کو سونا کہہ دیں جو گناہ کو ثواب کا نام دے سکیں۔ جو زردار بے وقار اور سماج دشمن عناصر کو اپنے ضمیر کی آواز کو دباتے ہوئے عالی جاہ اور والا مرتبت کہہ سکیں۔''

ان کی افتادِ طبع پر روشنی ڈالنے کے لیے ایک مقامی واقعہ کا دہرانا بے محل نہ ہوگا۔ زراعتی نمائش رام پور کے پنڈال میں ۱۲/ اور ۱۳/ مارچ ۱۹۴۵ء کی درمیانی شب میں ایک آل انڈیا غیر طرحی مشاعرہ ہونا تھا جب اس کا دعوت نامہ شادؔ مرحوم کے ہاتھوں میں پہنچا تو

آپ نے مرسلہ دعوت نامے کی پشت پر یہ سطور لکھ کر فوراً واپس کر دیا:

’’جناب چیئر میں صاحب مشاعرہ کمیٹی۔

جلی ہوئی رسی کے بل اور گھڑے کی چکناہٹ۔ ان دونوں میں مجھے کیا
پسند ہے سب جانتے ہیں۔ سب کیا پسند کرتے ہیں مجھے خبر نہیں۔‘‘

(شاؔد عارفی)

اس مشاعرہ کمیٹی کے چیئر مین جناب یوسف علی خاں یوسفؔ تھے جو ریاستی دور میں ناظم مال کی حیثیت سے صاحبِ اختیار اعلیٰ عہدے دار ہی نہیں خود نواب حامد علی خاں کے ہم زلف بھی تھے۔ اس دعوت نامے کو محبی ساز سیمابی صاحب نے بہ نظرِ احتیاط چپراسی سے واپس لے لیا تھا جو مرحوم کی مندرجہ بالا تحریر کے ساتھ آج بھی ان کے پاس محفوظ ہے۔ شاؔد صاحب لوگوں کی ظاہری شرافت، نام و نمود اور شخصیت کی سطح سے مرعوب تو کجا متاثر تک نہیں ہوتے تھے۔ ہاں وہ ہمہ وقت دلوں کے اندر جھانکنے کی کوشش کرتے تھے اور اس کا برملا اظہار کرتے تھے تا کہ لوگ اس میں اپنے اصلی خد و خال دیکھ سکیں اور اپنی اصلاح کر لیں۔

ایک ملاقات میں شعر و ادب میں طنز پر گفتگو ہو رہی تھی۔ شاؔد صاحب نے کہا کہ معاف فرمایئے آپ کو اس بارے میں ذاتی تجربہ نہیں ہے کیوں کہ آپ اس میدان کے مرد نہیں۔

فی زمانہ تنقید اور طنز کے انعام شب و شتم کے علاوہ اور کچھ نہیں۔ جب بھی آپ اپنے ہمسایہ کی کوئی غلطی نکالیں گے وہ یہی کہنے لگے گا کہ اللہ اتنا بُرا پڑوسی کسی کو نہ دے۔ میں نے عرض کیا کہ یہ بات الگ ہے کہ لوگ اپنی کمزوریاں اور خامیاں سن کر دور کرنے کی کوشش نہیں کرتے اور اس کے برخلاف ناقد سے ناراض ہو جاتے ہیں۔ مجھے حسن بصری کا یہ قول یاد ہے: جو تمھاری عیب جوئی کرے تم اس کو خوش آمدید کہو کیوں کہ اس نے اپنی نیکی تم کو بہ طور ہدیہ پیش کی ہے۔

یہ سن کر شاد صاحب نے مسکراتے ہوئے فرمایا تھا کہ اب اس طرح کے لوگ کہاں

www.urduchannel.in

ہیں۔ عملی تجربہ کے لیے کل آپ عمومی حیثیت سے کسی مقامی اخبار میں میرے اس نظریے کا اعلان کر دیں کہ دولت کی زیادتی اور ایمان کی کمی کے باہمی ملاپ سے ’’فرعونیت‘‘ کا جنم ہوتا ہے اور پھر دیکھیں کہ رام پور میں اس کی اشاعت سے کتنی پیشانیاں خواہ مخواہ شکن آلود ہو جائیں گی۔ ساتھ ہی یہ بھی بتا دوں کہ اس کی دو وجوہ ہوں گی اول تو یہ کہ پانی نشیب پر مرتا ہے۔ چنانچہ حالات کی مطابقت سے اپنی پوزیشن کا اذیت ناک احساس ہوگا۔ قسم دوم: ’الحقُّ مرٌّ‘ سچی بات کڑوی ہوتی ہے۔

شاد عارفی کے کلام میں غیر سنجیدہ شوخ نگاری، آشفتہ گفتاری، کم عیاری و سبک مقالی کی مثال بہ مشکل ملے گی۔ سخن سنجی کے معاملے میں ان کو مجتہدانہ بصیرت حاصل تھی۔ ان کے مذہبِ فکر اور طرزِ ادا میں بڑا نیا پن ہے۔ انھوں نے دنیا اور دنیا والوں کو مختلف زاویوں سے دیکھا، ان کے اشعار ذوق ادب و رجحان طبع کے آئینہ دار ہیں۔ ان کے اُن لاغر بازوؤں میں سماج سے لڑنے کی طاقت تھی۔ وہ صبح نو پر اندھیرے کی پیہم یورشوں، سماج اور معاشرت کی روز افزوں خرابیوں اور مکدر فضا و مسموم ماحول کو بہ نظر غائر دیکھ رہے تھے چنانچہ یہی وجہ ہے کہ جیتے جی ان کے قلم کی پوری توانائی ان تخریبی حالات کے خلاف جہاد میں مصروف رہی۔ وہ کہتے تھے کہ کیا میں دیوانہ ہوں کہ اپنی آنکھوں سے سب کچھ دیکھوں مگر کچھ نہ سمجھوں، میرے ہوش و حواس قائم ہیں۔ میری آنکھیں دیکھ رہی ہیں، میرے کان سن رہے ہیں، میرا دماغ سوچ رہا ہے پھر بھی اگر میں خاموش رہوں تو اس کی وجہ بزدلی کے سوا کچھ نہ ہوگی۔ اب آپ اسے مصلحت کا نام دے دیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ ان کا قلم کوہِ آتش فشاں بنا ہوا تھا جس میں آگ ہی آگ تھی اور اس سے ہر وقت آتش ریز، آتش افروز اور آتش انگیز لاوا پھوٹ پھوٹ کر نکلتا رہتا تھا۔

شاؔد عارفی سے ان کی زندگی ان کا حق مانگتی تھی اور اس کے لیے انھوں نے ہاتھ پاؤں مارنے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا۔ انھوں نے راہیِ دارالبقا ہونے سے قبل کم و بیش ۹۰ روپے محبی سلطان اشرف صاحب کے پاس اپنی تجہیز و تکفین کے لیے جمع کر دیے تھے تا کہ ان کی روح گور و کفن کے معاملے میں کسی کی زیرِ بار احسان نہ ہو۔ جی چاہتا تھا کہ

اس دور میں حکمراں پارٹی کی تبدیلی، بڑھی ہوئی گرانی اور روز افزوں ہنگاموں کے زمانے میں وہ کچھ دن اور زندہ رہتے۔

اس زمانے میں ان کا فنِ طنز اور زیادہ نکھر کر سامنے آتا اور شعری سرمائے میں معتد بہ اضافہ ہوتا مگر:

بروئے لالہ و گل خواستم کہ می نوشم
زشیشہ تا بقدح ریختم ، بہار گزشت

شاؔد عارفی اب اس دنیائے فانی میں نہیں رہے۔ یہ پہاڑ وقت کی چکی میں پستے پستے ختم ہو گیا۔ مجھے کہنے دیجیے کہ آج بھی بہت سے بندگانِ خدا کے دلوں میں مرحوم کی محبت کے گہرے نقوش ہیں اور بعض مجروحوں کے دلوں میں ان کے نشترِ قلم کے گہرے زخم بھی ہیں مگر اب ان باتوں کا تذکرہ عبث ہے: ''آں قدح بہ شکست وآں ساقی نہ ماند''

ہوئے نامور بے نشاں کیسے کیسے
زمیں کھا گئی آسماں کیسے کیسے

ربِّ کریم بڑا ستار العیوب ہے اس نے رمضان المبارک کے مقدس و متبرک مہینہ میں شاؔد عارفی سے آخری سفر کرایا ہے تو جادہ و منزل کی جملہ آسانیوں کا بھی وہی ضامن ہے۔

☆☆☆

www.urduchannel.in

پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی

شاؔد کی ایک نظم کے حوالے سے یکجائی کی دوئی

شاؔد عارفی کلاسیکی اقدار کے شاعر تھے۔ لیکن وہ انسان کو تمام قوتوں کا پیکر مانتے ہیں اور انسان کی وحدت کے قائل ہیں۔ وہ انسان کے دکھ سے دکھی ہوتے ہیں، ہمدردی اور محبت کا جذبہ ان کی فطرت میں شامل ہے۔ اسی لیے انسانیت کی استحصالی طاقتوں کو دیکھ کر حزن و ملال میں ڈوب جاتے ہیں۔ اذیت کے عفریت انھیں کالے ناگ کی طرح ڈستے ہیں اور احساس کے زخم مصیبت کے پہاڑ لگتے ہیں۔

ہندوستان کے مغلوب اور مقہور مسلمان آزادی کے بعد سے آج تک فرقہ وارانہ فساد کی آگ میں جلتے رہے ہیں۔ شاؔد عارفی نے بھی کھلی آنکھوں سے زمانے کی سیاسی چال کے مختلف پہلو کو دیکھا ہے، جبر کی شمشیر کو عریاں پایا ہے اور لٹے پٹے لوگوں کے درد کو محسوس کیا ہے۔

انسانی لہو کی پامالی اور ذلت کا موضوع ایسا ہے جو کلام کو معنویت بخشتا ہے۔ شاد عارفی نے جبل پور کا فساد دیکھا ہے۔ اس فساد کا نقشہ وہ جس طرح کھینچتے ہیں اور لفظیات کے استعمال سے سماج کے چہرے کے داغ کو جس طرح قطرہ قطرہ حوادث سے ٹپکایا ہے وہ ان ہی کا حصہ ہے:

''لگانے والے'' بنا کے باتیں، لگی ہوئی کو بجھا رہے ہیں
دھوئیں کے بادل، افق کے ماتھے، کلنک ٹیکے، سجا رہے ہیں
شفق کی سرخی مگر بتاتی ہے طور'' لاوا اگل رہا ہے''
ابھی جبل پور جل رہا ہے

چنار کی طرح شاخ در شاخ، تلملاتے ہیں ''برق پارے''
کسی نشیمن کے اس کنارے، کسی نشیمن کے اُس کنارے
جو ظلم بویا گیا تھا انسان کا لہو پی کے پھل رہا ہے
ابھی جبل پور جل رہا ہے

فساد میں کیا کچھ جلتا ہے اور مسلمانوں کی تہذیب و ثقافت کو کس طرح مٹانے کی کوشش کی جاتی ہے اس کا منظر نامہ شاؔد عارفی نے اس طرح بیان کیا ہے:

یہ مسجدیں، یہ مکان، یہ مدرسے، یہ ''بھرپور کارخانے''
یہ برج و محراب و طاق و در، اور جلی کتابیں، کھلے خزانے
نقوش کا لک سے بھر گئے ہیں مگر پتہ صاف چل رہا ہے
ابھی جبل پور جل رہا ہے

فساد کی خبریں ریڈیو سے دی جاتی ہیں۔ حالات ناگفتہ بہ کے بارے میں بتایا جاتا ہے لیکن روک تھام کے عمل میں جان بوجھ کر تاخیر کی جاتی ہے تا کہ آگ زنی ہوتی رہے اور جان مال کو نقصان پہنچتا رہے:

''اکاش وانی'' سنا رہی ہے فغان و فریاد و آہ اب تک
دبی دبی سسکیوں میں ڈوبی ہوئی بلکتی کراہ اب تک
مگر سنی ان سنی ہوئی ہے، ستم کا چکر وہ چل رہا ہے
ابھی جبل پور جل رہا ہے

جانور اور پرندے بھی فساد کی آگ میں جھلس جاتے ہیں۔ یہ منظر دیکھیے:

یہ ''بھینس'' رسّی نہ توڑ پائی وہ ''گائے'' جل بھن کے رہ گئی ہے
کبوتروں، مرغیوں کے ٹاپوں میں روئی سی دھن کے رہ گئی ہے
جوازِ قہر خدائے عادل کے واسطے وقت ٹل رہا ہے
ابھی جبل پور جل رہا ہے

فساد میں آگ زنی سے پیڑ پودے بھی محفوظ نہیں رہتے ہیں۔ شاؔد عارفی کا مخصوص تیور ملاحظہ کیجیے:

www.urduchannel.in

انار، امرود، ناشپاتی کے پیڑ جھلسے کھڑے ہیں اب تک
وہ نیم، جامن، سرس جو تیورا کے گر پڑے تھے پڑے ہیں اب تک
ہنوز ''عبرت کے حامیوں'' کو پتہ تباہی کا چل رہا ہے
ابھی جبل پور جل رہا ہے

فساد میں کارخانے جلائے جاتے ہیں تا کہ معاشی طور پر کمر ٹوٹ جائے:

یہ کارخانہ کہ جس کا پھاٹک، دھواں اگلتا ہے منہ کو پھاڑے
جو گھپ اندھیروں میں چور کرتے، عمل ہوا اس پہ دن دہاڑے
یہاں یہ اسٹاک جل رہا ہے وہاں وہ شعلوں میں ڈھل رہا ہے
ابھی جبل پور جل رہا ہے

عام طور پر ہوتا یہ ہے کہ کہیں آگ لگتی ہے تو پورا محلّہ دوڑ پڑتا ہے۔ لیکن جب پلان کر کے آگ لگائی جاتی ہے تو ایسے موقع پر ظلم و ستم کا پلہ بھاری ہو جاتا ہے۔ شاد عارفی نے سچائی بیان کی ہے:

جو آگ لگتی ہے خود، بجھانے کو دوڑ پڑتا ہے کل محلّہ
لگی ''لگائی گئی'' پہ بھاری رہا ہے ظلم و ستم کا پلّہ
فسادیوں کا ''پلان'' تجویز کے مطابق اٹل رہا ہے
ابھی جبل پور جل رہا ہے

ہندوستان میں ''رام راج'' قائم کرنے کے لیے اور تخت و تاج حاصل کرنے کے لیے جو ہتھکنڈے اپنائے جاتے ہیں وہ اظہر من الشّمس ہیں لیکن بعض محافظ ایسے بھی ہیں جن سے وطن کی، ملک کی عزت باقی ہے:

محافظوں نے ''نظر بچا کر'' وطن پناہی کی لاج رکھ لی
سیاستِ ''رام راج'' رکھ لی، کیاستِ تخت و تاج رکھ لی
تو آمریت کا دیو، جمہوریت کے پردے میں پل رہا ہے
ابھی جبل پور جل رہا ہے

لیکن محافظت کرنے والے کم اور درندگی کا مظاہرہ کرنے والے زیادہ نظر آتے ہیں۔ پولیس کی کارستانی کی سچائی سے سبھی واقف ہیں۔ شاد عارفی کا مشاہدہ صد فی صد حقیقت پر مبنی ہے:

سُنا ہے وحشی سپاہیوں نے جو 'اس کو' بوٹوں سے روند ڈالا
تو ''اس کو'' سنگین پر اٹھا کر ''بھڑکتی اگنی'' کے رخ اچھالا
زمین رہ رہ کے کانپتی، آسمان تھم تھم کے چل رہا ہے
ابھی جبل پور جل رہا ہے

نہیں بسائے گئے ہیں اب تک جو خانہ برباد ہو چکے ہیں
نہ چین سے سو سکے ہیں اب تک، ابھی نہ جی بھر کے رو چکے ہیں
لیے ہوئے رائفل ابھی تک سروں پہ خطرہ ٹہل رہا ہے
ابھی جبل پور جل رہا ہے

فساد کے بعد، گھروں کے جلنے کے بعد، سامان لوٹ لیے جانے کے بعد، بے گھری اور بے سروسامانی کے بعد ''کیمپ'' کو مسکن بنانا پڑتا ہے۔ زندگی کی یہ مجبوری کتنی اذیت ناک ہوتی ہے اس بارے میں شاد عارفی بتاتے ہیں:

یہ جیل کی طرح اک عمارت جو کیمپ کا کام دے رہی ہے
جو دور سے اپنے ساکنوں کا ''پیام'' انجام دے رہی ہے
اداس چہروں سے نا موافق غذا کا طرزِ عمل رہا ہے
ابھی جبل پور جل رہا ہے

نہیں ہے ہر سو میں ساٹھ ستر کے پاس کچھ ''اوڑھنا بچھونا''
جو جاگنا دن کو سر بہ زانو، تو شب کو ہاتھوں کے بل پہ سونا
سحر کو جو ہاتھ سر کے نیچے رہا تھا، مفلوج و شل رہا ہے
ابھی جبل پور جل رہا ہے

کسی کو شکوہ، کہ ''جب سے آئے ہیں، چائے پلے نہیں پڑی ہے''

www.urduchannel.in

کسی کا کہنا کہ ''پیٹ سے کم غذا'' کی آفت بہت بڑی ہے
وہاں ''پٹا تھا'' اگر دوالہ، یہاں ''کچومر نکل رہا ہے''
ابھی جبل پور جل رہا ہے

وہ عورتیں ''جن کے بال بکھرے'' یہ لڑکیاں ''جن کے جسم ننگے''
پھٹیں جو کرتوں کی آستینیں، تو ''کٹ کے'' فرشی بنے اوٹنگے
معاونت کا سوال و وعدہ ہنوز ہونٹوں پہ چل رہا ہے
ابھی جبل پور جل رہا ہے

تجربات و مشاہدات سے روشناسی کے بعد شاد عارفی غیرت مند، خوددار، اور منفرد طرز کے انوکھے لوگوں کی حالت زار اس طرح بیان کرتے ہیں:

جو دوسروں کو کھلا رہے تھے، وہ آج خیرات کھا رہے ہیں
جو ''مرغ و ماہی'' پہ لقمہ زن تھے، وہ دال سے بھات کھا رہے ہیں
جو ہاتھ ''مونچھوں کو تاؤ دیتا تھا'' آج کھرچن پہ چل رہا ہے
ابھی جبل پور جل رہا ہے

واشگاف قسم کے اذیت ناک عمل سے اور حکومت کے مثبت اور منفی اثرات سے کیمپ میں رہنے والے لوگ کانپتے ہیں اور سراسیمہ بنے رہتے ہیں:

بسائے گی پھر جنھیں حکومت وہ اس عنایت سے کانپتے ہیں
جو دے چکے ہیں، انھیں اذیت، وہ ان کے تیور بھی بھانپتے ہیں
یقین وعدہ بھی لازمی ہو گیا ہے، جی بھی دہل رہا ہے
ابھی جبل پور جل رہا ہے

شاد عارفی نے اخبار والوں کے رویے کے تاریک رخ سے بھی پردہ اٹھایا ہے کہ سارے نیشنل پیپر معاشرہ اور ماحول کا جائزہ لیتے وقت پیچ و خم کی مشاطگی کرتے ہیں:

سلگ رہے ہیں مرے تصور میں روز ناموں کے وہ تراشے
مدیر جن کے کوئی ''اکالی'' کوئی ''مسیحی'' کوئی ''مہاشے''

بنام انسانیت و آدمیت ، یہ حادثہ سب کو کھل رہا ہے
ابھی جبل پور جل رہا ہے

کیمپ میں زندگی گزارنے والوں کے ساتھ سیاسی داؤ پیچ والے لوگ ہمدردی جتا کر اپنا الو سیدھا ضرور کرتے ہیں۔ پھر وقتی آنسو پونچھنے کے لیے پرائم منسٹر کی آمد کی خبر ملتی ہے۔ تب حل وعقد جس طرح بحر و بر ہوتے ہیں اس کا نقشہ شاؔد عارفی نے اس طرح کھینچا ہے:

خبر یہ پا کر ”وزیراعظم کریں گے ساگر کی سمت پھیرا“
محافظانِ وطن کے، اخفائے راز سے چھٹ گیا اندھیرا
قنات اس گھر پہ تن رہی ہے تو اس کا چھجہ سنبھل رہا ہے
ابھی جبل پور جل رہا ہے

کھنڈر جدھر سے نظر نہ آئیں وہ راہ تجویز کی گئی ہے
گھروں کے منہ دھو دیے گئے ہیں درست ”دہلیز“ کی گئی ہے
اگل رہے تھے جو گیس، اب ان نلوں سے پانی ابل رہا ہے
ابھی جبل پور جل رہا ہے

یہ گھر جو ہندو رئیس کا ہے، کہیں گے اس کو رئیس خاں کا
بعینہٖ جیسے ”راج موہن“ نے روپ دھارا ہو ’گل زماں‘ کا
پہن کے شلوار و پوستیں ’بھوپ چند‘ در پر ٹہل رہا ہے
ابھی جبل پور جل رہا ہے

کوئی کہے گا ’صمد کے حقے‘ کی آگ ایندھن میں جا پڑی تھی
پڑے تھے جس پر لحاف و بستر وہ کھاٹ بھی پاس ہی کھڑی تھی
اقلیت کا یہ ’جرم معلوم‘ اکثریت پہ ڈھل رہا ہے
ابھی جبل پور جل رہا ہے

......☆......

شان بھارتی

شاؔد عارفی کا اندازِ فکر

استادِ سخن جناب شاد عارفی کی شخصیت وشاعری پر تاثرات قلمبند کرنا بازیچۂ اطفال نہیں ہے۔ان کے تلامذہ کی تعداد چالیس کے اوپر ہے۔ان کا اسم گرامی مسعود اشعر جیسے صحافی اور خلیل الرحمٰن جیسے شاعر و ناقد نے آفتابِ جہاں تاب کی طرح روشن کیا۔ ڈاکٹر مظفر حنفی چودہ پندرہ مہینے کی قلیل مدت تک ہی ان سے بذریعہ ڈاک استفادہ کر سکے لیکن نصف صدی سے ان پر کام کر رہے ہیں۔ وہ اختراعی ذہن رکھنے والے فنکار تھے اور ان کا شمار معدودے چند صاحبِ اسلوب اور منفرد لب و لہجے کے شعراء میں ہوتا تھا:

شریکِ راہِ محبت ہے طبع موزوں شاؔد
ہر ایک شعر مرا حسبِ حال ہوتا ہے

زمانۂ قدیم سے عہد حاضر تک ایسے متعدد شعراء ہیں جو اپنے اشعار کے معنی ومفہوم کو سمجھنے سے قاصر رہے ہیں۔ علامہ اقبال نے اپنے کلام کی تشریح نہیں کی اور اسے شارح سے سمجھنے کی تلقین کی۔ واقعہ یہ ہے کہ کچھ اردو دانوں نے جگر مرادآبادی سے ان کے مخصوص اشعار کے معنی ومفہوم کو سمجھنے کے لیے سعی کی۔ انھوں نے سوال کنندہ کو مشورہ دیا کہ اس کے معنی ومفہوم کو سمجھنے کے لیے کسی ملّا سے رابطہ قائم کیجیے۔ سوال کنندہ جگر مرادآبادی کا جواب سن کر لاجواب ہو گیا۔

منور لکھنوی کا واقعہ ہے کہ ان پر ایک شعر کی آمد ہوئی۔ انھوں نے خود اپنے شعر کے

www.urduchannel.in

مفہوم کو سمجھنے کی کوشش کی لیکن ان کو اپنے شعر سے بوئے ابہام آنے لگی۔ شعر پلّے نہیں پڑا۔ حضرت منور کا وہ مبہم شعر مندرجہ ذیل ہے:

ہر چند دو جہاں کا سفر کر چکا ہوں طے
اٹھا نہ اک قدم بھی مگر رہ نما کے ساتھ

اس ادق شعر کی تشریح وتوضیح ان کے شاگرد رشید گیان پرشاد اختر بریلوی نے کی اور استاذ محترم کو مطمئن کر دیا۔ حضرت شاد عارفی میں شعر گوئی کی بھی صلاحیت تھی اور شعر فہمی کی بھی۔ وہ اشعار میں ابہام و معانی آفرینی کو بہت پسند کرتے تھے۔ ان کے اشعار میں معنوی نزاکت کے اچھے نمونے ملتے ہیں:

یہ اتفاق ہے مگر عجیب اتفاق ہے
جہاں بھی میں رکا وہ برق سرو قد ٹھہر گئی

بھیجا ہے اس لحاظ سے شادؔ اس کو آئینہ
کیا حال ہو گیا ہے محبت چھپا کے دیکھ

عتاب کی نگاہ سے جھلک رہی ہیں شوخیاں
کسی بھی فن میں ہو مگر کمال بھی تو چاہیے

بھاگتا ہے جیسے جنگل میں شکاری سے ہرن
وہ اِدھر در پر نظر آیا اُدھر روپوش تھا

مندرجہ ذیل شعر کی معنوی نزاکت بھی قابلِ داد ہے:

کہیں وہ مسکرا دیے کہیں جبیں پہ بل پڑے
یہ اس لیے کہ التماس حال میں خلل پڑے

معشوق جان بوجھ کر عاشق کا حالِ دل سننے سے گریز کرتا ہے تاکہ وہ تڑپے ترسے، دیوانہ ہو جائے چاہے کچھ ہو جائے۔

www.urduchannel.in

شاد عارفی کے کلام کو سمجھنا زیادہ مشکل نہیں ہے تو زیادہ آسان بھی نہیں ہے۔ اقبالؔ کی طرح ان کو نہ اپنے فلسفے پہ ناز تھا اور نہ حکمت پر۔ ان کو اپنی اختراعی ذہنیت پر ناز تھا۔ باکمال استادِ فن شاعر تھے۔ جو شاعر اختراعی ذہن کا مالک نہ ہو وہ عظیم شاعر ہو بھی نہیں سکتا ہے۔ ان کی غزلیں اور نظمیں اپنے مخصوص لہجے کی بنا پر اپنی شناخت رکھتی ہیں۔ بیسویں صدی کی تیسری سے چھٹی دہائی تک ہندو پاک کے معیاری رسائل و جرائد میں ان کی تخلیقات شائع ہوتی رہیں۔ تمام جریدوں، رسالوں اور اخبارات میں ان کے کلام کو مقبولیت حاصل ہوئی لیکن ان کی طنزیہ شاعری، جدت پسندی اور جرأت پسندی کو متعدد حضرات ناپسند کرتے تھے۔ ترقی پسندانہ شاعری تو کی لیکن کٹر کمیونسٹوں سے پنگا لے رکھا تھا۔ روایت کا احترام تو کیا لیکن روایت پرستی نہیں کی۔ حضرت عجب دل و دماغ کے آدمی تھے۔ چند اشعار ملاحظہ فرمائیے:

اپنے سر الزام کیوں لیتے ہو پھونکیں مار کر
آپ ہی بجھ جائیں گے بے نور مٹی کے دیے

ہم سے اس طرح کی امید نہ رکھے دنیا
ہم کسی شخص کی تعریف تو کرتے ہی نہیں

جن کی منزل طلبی اپنے لیے ہوتی ہے
ان کے نقشِ کفِ پا مٹ کے ابھرتے ہی نہیں

شباب و خلوت کی بات اچھی تو ہے مگر آج کل نہ کہیے
غزل برائے حیات لکھیے، غزل برائے غزل نہ کہیے

تنقید نگاروں کی بیجا جانب داری سے خفا رہے اور ہم عصر ناقدین میں نیاز فتح پوری، ظ۔ انصاری، محمد حسن صاحب کو اپنی تنقید کا نشانہ بنا رکھا تھا۔ جواباً ناقدین نے بھی ان کو نظر انداز کیا۔

شعوروں کے لیے شعلے ہیں طنز نا وفاداری
وفاداروں کی غیرت پر یہ اوچھا وار کرتے ہیں

گزر چکا ہے عہدِ بربریت فریب ہے دور آدمیت
جو ناپتے ہیں ہماری گردن ہم ان کا احسان اتار دیں گے

مرے اصولِ بندگی میں چند خامیاں سہی
مگر جبینِ خو لگی ہوئی ہے اپنے کام سے

نشاط و کیف و سرخوشی انھیں جو نکتہ سنج ہیں
تو سطح بیں کے واسطے خلش مرے کلام سے

ناقدین کی ناانصافیوں کے خلاف آواز بلند کرنے کی وجہ سے موصوف ہر حلقہ میں معتوب رہے لیکن کسی سے تائب کبھی نہیں ہوئے:

شاد صاحب یہ نقاد بر خود غلط　　فنِ شعر و ادب کو نہ رسوا کریں
ضبط ناوکِ غم سے بات بن تو سکتی ہے　　آدمی کی انگلی میں پھانس بھی کھٹکتی ہے

غریب و بے کس ہر اک ستم پر نہ کیوں دوئیں ہزار دیں گے
اگر وہ ایسا نہیں کریں گے تو آپ گردن نہ مار دیں گے

ان کی حیات میں ان کا شعری مجموعہ بھی سلیقے سے شائع نہیں ہوا۔ ان کے شاگرد رشید ڈاکٹر مظفر حنفی نے تقریباً ساڑھے آٹھ سو صفحات پر مشتمل کتاب ''ایک تھا شاعر'' شائع کی۔ ماہنامہ کتاب نما نے مرحوم کی پچاسویں برسی کے موقع پر ''شاد عارفی نمبر'' ابھی حال ہی میں شائع کیا ہے جس کی حلقہ ادب میں کافی پذیرائی ہو رہی ہے۔
شاد عارفی کا شمار اردو دنیا کے ان باکمال شعراء میں ہوتا ہے جو اردو زبان، قواعد،

www.urduchannel.in

عروض اور اہمال کے ماہر تھے۔ جنھوں نے جدید غزل کے رنگ کو شیریں زبان میں پیش کیا۔ زبان و بیان کے ادا شناس تھے۔ انھوں نے ہر جگہ اعلیٰ شعری اور جمالیاتی اقدار کا خیال رکھا ہے۔ بڑی حد تک ان کا شعری منظر نامہ لسانی، فنی اور عروضی سچائیوں اور اچھائیوں کا شاہکار ہے۔ انھوں نے غزل کو عہد حاضر کے مسائل سے ہم آہنگ کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ وہ اپنے وقت کے ترقی پسندی کے ماحول میں جدید ذہن کے شاعر تھے مگر ان کے یہاں جدت مصنوعی نہیں اور نہ انھوں نے ایسی علامتوں کا استعمال کیا ہے جو غزل کے روایتی اسلوب سے مطابقت نہ رکھتی ہوں۔ ان کی شاعری تشبیہات و علامات کے بے ضرورت استعمال سے بوجھل نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے اشعار میں زبان کی سادگی اور بیان کے حسن کا احساس قدم قدم پر ہوتا ہے۔
کلیات شاد عارفی (مرتب: ڈاکٹر مظفر حنفی) کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ ان کی شاعری چاروں دشاؤں میں منزل بہ منزل سفر کرتی ہے۔ موضوع کا تنوع اور اظہارِ بیان میں سادگی ان کی خصوصیت ہے۔ اس انا پسند شاعر کی شاعری میں غمِ روزگار سے آنکھیں ملانے کا شعور بھی ہے ظلم وستم سے ٹکرانے کا حوصلہ بھی۔ کارواں سے بچھڑے ہوئے راہی کے بے سمت راستوں کا غبار بھی اور عشقیہ شب و روز کا طلسم بھی۔ ملاحظہ کیجیے:

بارہا خط دے کے واپس نامہ بر سے لے لیا
اور یہ سب جانتے ہیں جس نظر سے لے لیا

جس سے خالی ہے ابھی دستِ دعائے بے خلوص
میں نے دو سجدوں میں ان کے سنگِ در سے لے لیا

تو انقلابِ وطن کو وجہِ حیاتِ نو ماننا پڑے گا
بہار ایسی حسین شے کو خزاں کا ردِ عمل نہ کہیے

کہتے نہیں ہیں منہ پہ مروت سے آپ کی

نا مطمئن ہیں ورنہ سیاست سے آپ کی

عزت مآب ہونے کے ناطے جنابِ شاد
عزت مجھے عزیز ہے ذلت سے آپ کی

ماضی گواہ شاد کہ ''عہدِ قصیدہ گو''
سب کا عدو رہا ہے سو میرا عدو بھی ہے

یہ ڈوبنے کی بات خدا ساز بات تھی
فرعون ورنہ بے سر و ساماں نہیں رہا

اشک و شبنم سے موسوم ہونے لگے
ان دمکتے شراروں کی حد ہو گئی

شاد عارفی کی اولین مطبوعہ نظم ''ہلال عید'' ہے جو ''خاتونِ مشرق'' میرٹھ بابت مارچ ۱۹۳۰ء میں شائع ہوئی۔ آخری نظم ''وصی اقبال کا سہرا'' ہے جو ۱۹۶۳ء میں لکھا گیا۔ اولین شعری مجموعہ رشید احمد خاں مخمور نے ۱۹۴۶ء میں شائع کیا لیکن دوبارہ اس کی باقاعدہ اشاعت نہیں ہوئی۔ دیگر تصانیف جو شائع ہوئیں ان کے نام مندرجہ ذیل ہیں:

(۱)	نثر و غزل دستہ	(مرتبہ: ڈاکٹر مظفر حنفی)	۱۹۶۷ء
(۲)	شوخیِ تحریر	(مرتبہ: ڈاکٹر مظفر حنفی)	۱۹۷۱ء
(۳)	شاد عارفی کی غزلیں	(مرتبہ: ڈاکٹر مظفر حنفی)	۱۹۷۴ء
(۴)	کلیاتِ شاد عارفی	(مرتبہ: ڈاکٹر مظفر حنفی)	۱۹۷۵ء
(۵)	انتخابِ شاد عارفی	(انجمن ترقی اردو)	۱۹۵۶ء
(۶)	شاد	(عابد رضا بیدار کا مرتب کردہ کتابچہ)	۱۹۶۲ء
(۷)	سفینہ چاہیے	(مرتبہ: سلطان اشرف)	۱۹۶۵ء

www.urduchannel.in

(۸)	اندھیر نگری	(نیا ادارہ، لاہور)	۱۹۶۷ء
(۹)	دکھتی رگیں	(مرتبہ: سلطان اشرف)	۱۹۸۲ء

یہ کتابیں ان کی شخصیت اور شاعری پر یادگار کتابیں ہیں۔

ڈاکٹر مظفر حنفی صاحب نے شاد عارفی کی شاعری و شخصیت پر ۱۹۷۲ء میں تحقیقی مقالہ لکھا جس پر ان کو ۱۹۷۴ء میں بھوپال یونیورسٹی نے پی ایچ۔ ڈی کی ڈگری تفویض کی۔

''ترقی پسند تحریک''، ''مضامینِ نو''، ''شخصیتیں''، ''آتی جاتی لہریں''، ''نقد ریزے''، ''زندہ کتبے''، ''ادب کی تلاش''، ''شاخِ آگہی''، ''مظفر حنفی: حیات، شخصیت اور کارنامے'' ایسی کتابیں ہیں جن میں شاد عارفی کے فن اور شخصیت پر خلیل الرحمٰن اعظمی، دور آفریدی، مظہر امام، مظفر حنفی، عروج زیدی، بلراج کومل، حرمت الاکرام اور محبوب راہی کے جامع اور مدلل مضامین شامل ہیں۔

اپنے طرز و اسلوب کے واحد شاعر شاد عارفی کا انتقال پر ملال ۸/فروری ۱۹۶۴ء کو ہوا۔

......☆......

ڈاکٹر محبوب راہی

کارزارِ تنقید میں شاد عارفی کی معرکہ آرائیاں

نظم ہو چاہے نثر تحریر کی شکل میں ہو یا تقریر کی، طنز اپنے اندر عین وہی تاثیر رکھتا ہے جو ایک نشتر کسی زخم یا پھوڑے سے فاسد مادہ نکالنے کے لیے عملِ جراحی میں بنیادی کردار کا حامل ہوتا ہے۔ اسی لیے طنزیہ شاعری باوجود اپنی نشتریت کے اپنی افادیت بخش اثر انگیزی کی بنا پر راست ناصحانہ کلام کے مقابلے میں زیادہ مقبول اور پسندیدہ رہی ہے۔ اسی لیے ہر شاعر کے کلام میں اس کے مزاج کی مناسبت سے بقدر موضوع یا گنجائش طنز کی آمیزش کم و بیش لازماً ہوتی ہی ہے۔ اردو شاعری کی چار سو سالہ تاریخ میں تلاش بسیار کے بعد ہمیں شاد عارفی اور یگانہ چنگیزی صرف یہی دو شاعر ایسے ملتے ہیں جو خالصتاً طنزیہ شاعری کی بناء پر اپنی مخصوص شناخت رکھتے ہیں۔ اس سلسلے میں اور بھی چند نام لیے جاتے ہیں لیکن واقعہ یہ ہے کہ ان کے ہاں مزاح یا ظرافت کی آمیزش طنز کی نشتریت یعنی اثر انگیزی کو کم اور کبھی کبھار ختم کر دینے کا موجب ہوتی ہے۔ شاعری کے ساتھ ساتھ شاد و یگانہ نے اپنے تنقیدی مضامین میں بھی طنز کی بھرپور نشتریت کو بروئے کار لایا ہے لیکن یگانہ کی شاعری ہو یا نثر ان کی معرکہ آرائیاں محض اپنی ذات کی تنہائیوں تک محدود اور محصور ہونے کے باعث ان میں داخلیت کے تنوع کے باوصف ولا محدود وسعتیں پیدا نہیں کر پائیں جو شاد عارفی کے سماجی معنویت کے حامل فن میں اس کی داخلیت اور خارجیت کے متوازن امتزاج کی بنا پر ملتی ہیں۔ دوسرے یہ کہ مغلوب الغضب اور تلخ و تند مزاج رویوں کے اعتبار سے بھی یگانہ کی

www.urduchannel.in

جھلاہٹ، برہمی، چڑچڑے پن، چہرے کے بگڑے خطوط، آواز کی تیزی اور اعصابی تشنج کے مقابلے میں شاد عارفی کی طبعی شائستگی کی بنا پر ماتھے پر پڑنے والی سلوٹوں میں بے لاگ مہذب طنزیہ مسکراہٹ کی آمیزش انھیں یگانہ کی طرح شدید ناپسندیدگی اور عدم مقبولیت کا شکار ہو کر تذلیل آمیز عوامی ردعمل سے محفوظ و مامون رکھتی ہے بلکہ یہ کہ دبی زبان ہی میں سہی ان ناقدین سے خراج داد و تحسین وصول کر لیتی ہے جن سے ان کی تنقیدی جارحیت کا ہدف بننے کے باعث ان کی معاصرانہ چشمکیں رہی ہیں۔ مثالیں پیش کرنے سے قبل ضروری سمجھتا ہوں کہ شاد عارفی کے تنقیدی نظریات پر سرسری روشنی ڈالتا چلوں۔ ان کی رائے میں:

> ''ہر لکھنے والے کا فرض ہے کہ اپنے ناظرین کے جذبات کا لحاظ رکھتے ہوئے منظر میں تبدیلی کرتا چلے تاکہ شوق منزل میں انحطاط و افتادگی پیدا نہ ہو۔''

تنقید کے مسلمہ اور مروجہ اصولوں سے یکسر انحراف کرتے ہوئے ناظرین کے جذبات کے احترام میں مناظر میں نو بہ نو تبدیلیاں کرتے ہوئے شاد عارفی نے بیباکانہ مصلحت ناشناسی، خوشگوار شگفتگی اور سفاکانہ صاف گوئی کے معتدل اور متوازن امتزاج سے فن تنقید کو ایک نئے رنگ و آہنگ، نئے لب و لہجے اور نئے ذائقے سے روشناس کرایا۔ اسی لیے ان کی تنقیدی نگارشات خشک، یک رنگی کی بنا پر بوریت کا سبب نہیں ہوتیں بلکہ ان میں تنوع اور رنگارنگی کی شمولیت قاری کے لیے گوناگوں دلچسپیوں کے اسباب فراہم کرتی ہے۔ شاد عارفی کے ان تنقیدی مضامین کو بوجوہ دو حصوں میں بآسانی منقسم کیا جا سکتا ہے۔ ایک ہم عصروں بالخصوص خوردوں یا شاگردوں کے مجموعہ ہائے کلام پر تحریر کردہ ان کے پیش لفظ مقدمے یا تعارفی مضامین جن میں توصیفی پہلوؤں پر نسبتاً زیادہ زور دیتے ہوئے لغزشوں یا خامیوں کو شعوری طور پر نظر انداز کیا گیا ہے۔ ایسے مضامین تاثراتی تنقید کے زمرے میں آتے ہیں۔ چند مضامین تحقیقی نوعیت کے ہیں جن سے شاد صاحب کی محققانہ عرق ریزی ژرف بینی اور دیانتداری کا اندازہ ہوتا ہے لیکن زبان و بیان کے چٹخارے اور طرزِ اظہار کی

لطف اندوزی کی بنا پر کیف وانبساط مطالعہ کے حامل ان کے وہ تنقیدی مضامین ہیں جو ہم عصر اور کم وبیش ان کے ہم رتبہ اور ہم قد وقامت ارباب قلم کے ان پر لکھی گئی منفی تنقیدوں کے ردعمل کا نتیجہ ہیں۔ان مضامین میں بات بات میں جملہ ہائے معترضہ نکیلی کٹیلی چٹکیاں، لطف اندوزی چھیڑ چھاڑ، اعتراضات پر چلتے چلاتے جوابی حملے، لطائف نیز دلچسپ واقعات وتجربات کی آمیزش نے ان مضامین میں کچھ ایسی خوش ذائقی اور شگفتگی پیدا کردی ہے کہ قاری نقد ونظر کے ادبی نکات سے آگہی کے ساتھ ساتھ انشائیہ نگاری کے ذائقے سے بھی لطف اندوز ہوتا ہے۔ یہاں لطف کے اس پہلو کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ شاد عارفی کا دلچسپ اور شگفتہ انشائیہ نگاری کا یہ تنقیدی اسلوب انکا اپنا شعوری طور پر اختراع کردہ ہے جس کا ثبوت ''عین اور قاف'' عنوان کے تحت ان کے ایک طویل تحقیقی مضمون کے حسبِ ذیل اقتباس سے مل سکتا ہے:

> ''اگر وہ واقعی ایسا ہی مضمون ہو جیسا کہ یہ ہے کہ تو اس میں حتی الوسع گلکاری تحریر اور فریب دہی قلم سے پڑھنے والے کو یہ بتا دینا چاہیے کہ وہ فضولیت میں مبتلا نہیں ہے بلکہ ان تنقیدی مراحل سے گزر رہا ہے جو بعض جتھا بند اور جغادری قسم کے بے بدل نقاد اپنے احساس برتری پر پالش کرنے کے لیے آئے دن ان شعراء پر کرتے رہتے ہیں جو انھیں درخور اعتنا نہیں سمجھتے یا ان کی غلط سلط تحریک پر انھیں نہیں پوچھتے۔''

تنقید جیسے خشک موضوع پر اس مختصر سے اقتباس میں گلکاری تحریر، فریب دہی قلم، جغادری اور بے بدل قسم کے نقاد، احساس برتری پر پالش کرنا جیسی دلچسپ اور دلکش ترکیبوں نے تحریر کو جولا جواب اور بے بدل گلکاری اور شگفتگی عطا کی ہے اسے تو بس محسوس کر کے لطف ہی اٹھایا جا سکتا ہے۔جن جتھا بند جغادری اور بے بدل نقادوں کو اس تحریر میں ہدف تنقید بنایا گیا ہے وہ محض چھیڑ چھاڑ برائے تفریح اور دل لگی نہیں بلکہ ردعمل ہے ان جتھا بند نقادوں کے ان مخاصمانہ برتاؤ یا شاد صاحب کو جان بوجھ کر نظر انداز کیے جانے والے ان سازشی رویوں کا جوان کے ساتھ روا رکھے گئے جن کی طرف انھوں نے اپنے اشعار میں

www.urduchannel.in

اشارے بھی کیے ہیں، مثلاً:

تلخیِ گفتار کی تائید میں خطرہ ہے شاد — لکھ رہا ہے مجھ پہ ہر نقادِ فن ڈرتا ہوا
حیدرآباد میں فانی پہ جو بیتی اے شاد — مجھ پہ یو۔پی میں وہی ظلم ہنر ہے کہ نہیں
ہم سے اس قسم کی امید نہ رکھے دنیا — ہم کسی شخص کی تعریف تو کرتے ہی نہیں
یہی ہے شاد میں سب سے بڑا عیب — وہی لکھتا ہے جو کچھ دیکھتا ہے
یہ فن طنز میرے حق میں درحقیقت شاد — بہت بڑا المیہ ہے اختصار کے ساتھ

طنز کے وسیلے سے جو دیکھنے وہی لکھنے کا عیب شاد کے لیے واقعتاً بہت بڑا المیہ ثابت ہوا کہ تنگ آمد بجنگ آمد کی مصداق جوابی ردعمل کے نتیجے میں پیدا شدہ ان کی انتہا پسندی قدم قدم پر ان کے لیے گھاتک ثابت ہوتی رہی اور اپنی منفرد تخلیقی صلاحیتوں کے پیشِ نظر جس توجہ کے وہ مستحق تھے انھیں نصیب نہیں ہو پائی برخلاف اس کے بقول مسعود اشعر یہ ہوا کہ تمام استادانِ سخن نے ان کے خلاف متحدہ محاذ بنا لیا اور بقول ناصر کاظمی:

> ''شاد عارفی کے رامپور میں بڑے بڑے رؤسا قسم کے اساتذہ کرسی غزل پر جلوہ افروز تھے اور پھر داغ اسکول کے زوال پسند تک بندوں نے وہ شور غل مچا رکھا تھا کہ کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔''

میدانِ شعر وادب کے ان سورماؤں کے ساتھ شاد عارفی کے مناقشات دن بہ دن فزوں تر ہوتے چلے گئے۔ ان کے خلاف ریشہ دوانیوں کے سلسلے جاری ہوئے۔ ادبی معاملات میں تو خیر ان کا کچھ بگاڑا نہ جا سکا البتہ ان کے خلاف سازشیں رچ کر معاشی اعتبار سے انھیں اس درجہ قلاش اور مجبور کیا گیا کہ انھیں لکھنا پڑا کہ ''فاقہ سے مر رہا ہوں مزید براں بہ اعتبار صحت بھی دل برداشتہ۔''

> ''ہمارے مذہب میں خودکشی حرام ہے، یہی نہیں بلکہ موت کی دعا مانگنا بھی گناہ ہے ورنہ میں اب تک خودکشی کر چکا ہوتا۔''

لہٰذا مرتا کیا نہ کرتا کی مصداق شاد عارفی نے سماج میں مروجہ بیہودگیوں اور ہٹ دھرمیوں کے ساتھ ساتھ ادبی محاذوں پر اپنے دیدہ اور نادیدہ مخالفین پر ردعمل میں اپنی شدید

برہمی اور خفگی کا اظہار طنز و تشنیع کی کاری ضربیں لگا کر کیا۔ پہلے پہلے تو ان کی ضربوں کا ہدف مقامی نام نہاد اساتذۂ سخن رہے بعد ازاں بڑھتے بڑھتے ان کی محاذ آرائی کی حدیں وسیع تر ہوتی چلی گئیں اور میدان ادب کے بڑے بڑے شہ سواروں اور قد آور سورماؤں کو اپنے تنقیدی حملوں کا ہدف بنانے میں انھیں کوئی جھجک یا ہچکچاہٹ محسوس نہیں ہوئی۔ ان کے تنقیدی حملوں کا ہدف بننے والوں کی فہرست میں بلا امتیاز تقدیم و تاخیر کلیم الدین احمد، آل احمد سرور، سید احتشام حسین، مجنوں گورکھپوری، رشید احمد صدیقی، وزیر آغا، ڈاکٹر سید عبداللہ، ممتاز حسین، ڈاکٹر محمد حسن، ساغر نظامی، نیاز فتح پوری، جوشؔ ملیح آبادی، فراق گورکھپوری، معین احسن جذبی، اثر لکھنوی، وقار عظیم، ڈاکٹر عبدالعلیم، عبادت بریلوی، مرزا ادیب، جگر مراد آبادی، ابر احسنی، خواجہ احمد فاروقی، ماہر القادری، ناطق گلاؤٹھی، محوی صدیقی، امتیاز علی عرشی، میراجی، ضمیر جعفری وغیرہ کے نام آتے ہیں۔

شادؔ عارفی کے منہ پھٹ تیز و تند مزاج کی وجہ سے بیشتر ناقدین نے انھیں نظر انداز کرنے پر اکتفا کرتے ہوئے ان کے حملوں کا راست جواب دینے کی جسارت بالخصوص ان کی زندگی میں بہت کم کی۔ البتہ ان کے فن پر ہلکے پھلکے انداز میں چند ارباب قلم نے اپنے منفی رویوں کا اظہار کیا ہے ان میں سر خیل نقاد کلیم الدین احمد ہیں جنھوں نے شادؔ عارفی کی ''بات کرتا ہوں'' ردیف والی غزل کو ہدف تنقید بناتے ہوئے بالخصوص ردیف ''بات کرتا ہوں'' ہوں پر بھونڈے انداز میں پھبتی کستے ہوئے لکھا ہے کہ اور بھی بہت سے لوگ بات کرتے ہیں۔ سیکنڈ ہینڈ باتوں کو اس شان سے کہنا مذاق صحیح و لطیف کی کمی کی غمازی کرتا ہے۔ مولانا سلمان شاہجہاں پوری نے شادؔ عارفی کے مولانا آزادؔ کی جائے پیدائش کے بارے میں شک و شبہ کا اظہار کرنے پر ان کی صحت زبان و بیان پر حرف گیری کرتے ہوئے ان کے چار سطریں بھی صحت زبان و بیان کے ساتھ شریفانہ انداز میں نہ لکھ سکنے پر ان کی بات میں کبھی وزن پیدا نہ ہونے اور ان کی رائے کے بے وقعت ہونے کا فیصلہ صادر فرمایا ہے، جب کہ شہرت بخاری کی انتقادی نظر میں شادؔ عارفی کی شاعری صحافتی شاعری ہے ان کے رائے میں وہ اردو تاریخ صحافت میں ٹامک ٹوئیاں مارتے رہ گئے۔ شمس الرحمٰن فاروقی

www.urduchannel.in

شادؔ عارفی کے رواں دواں پان چباتے ہوئے گفتگو کرتے جانے، بر سبیل تذکرہ بڑے بڑے دعوے کرنے دوسروں پر سخت نرم، ذاتی، غیر ذاتی حملے کرنے کا اسلوب ابھر کر سامنے آنے کو بے ضرورت جارحانہ پن سے تعبیر کرتے ہیں جو طبیعت کے منغض کرنے کا باعث ہوتا ہے......ڈاکٹر محمد حسن، شادؔ کی نظموں کو جمالیاتی ذوق سے عاری منظوم نثر قرار دیتے ہیں جن میں بقول ان کے ''جو تجربے خود شاعری کی فصیلوں کو توڑنے کے مدعی ہوں ان کا تذکرہ شعری تجربوں کے ضمن میں اچھا نہیں لگتا۔''

شادؔ عارفی کے فن پر ناقدین کی ان منفی آراء کا جواز ''من ترا حاجی بگویم تو مرا ملا بگو'' یا توصیف باہمی کے مروجہ اصولوں کے برخلاف ان کے اس روکھے سوکھے بے مروت اور غیر مصلحت شناس رویے سے بھی ملتا ہے جس کا اندازہ مظفر حنفی کی شاد صاحب پر مرتبہ کتاب ''نثر و غزلدستہ'' میں شامل شادؔ صاحب ہی کے بیان کردہ ایک واقعے سے جس کی تائید خلیل الرحمٰن اعظمی نے بھی کی ہے، لگایا جا سکتا ہے۔ شادؔ صاحب فرماتے ہیں:

> ''اس سلسلے میں ایک خاکہ پیش کروں گا تا کہ آپ کو اندازہ ہو جائے کہ کون ناقد مجھ سے کیوں تعصب یا بغض للّٰہی رکھتا ہے۔ ڈاکٹر محمد حسن (مراد آبادی) نے مجھے خط لکھا کہ آپ اپنے شائع شدہ مجموعے اور غیر شائع شدہ غزلیں وغیرہ لکھ کر بھیجیں تا کہ میں آپ پر مضمون لکھوں۔ میں نے کہا مجھے اتنی فرصت کہاں، آپ فلاں پتے پر ''سماج'' مول منگا لیں اور کہ آپ بات کہاں سے کر رہے ہیں۔ چنانچہ محمد حسن مراد آبادی مجھ سے نارض ہو گئے اور ایک گھٹیا سے رسالے میں میرے خلاف بے سر و پا باتیں لکھ دیں۔ یہی نیاز فتح پوری کے ساتھ ہوا۔ عبادت بریلوی، وزیر آغا، قادری زور، ان کو بھی میں نے اپنا کلام نہیں بھیجا تھا اور سید عبداللہ وغیرہ میرے مخالف ہیں جن کے پاس وجہ مخالفت اس کے سوا کچھ نہیں کہ میں نے ان کو اچھا نقاد تسلیم نہیں کیا۔''

اپنے زمانے کے ان سکہ رائج الوقت قسم کے ثقہ ارباب قلم کو اچھا نقاد تسلیم نہ کرنا تو

در کناران کی ہر کمی کجی یا جھول پر ٹوکنے کو اپنے فرض کی طرح ادا کرنے والے شاؔد عارفی نے بغیر کسی مصلحت اور ہچکچاہٹ کے طبعی دلیری، ہمت مردانہ اور جرأت رندانہ کے ساتھ اپنے مخصوص ٹیڑھے ترچھے طنزیہ انداز میں پے بہ پے تیر برسائے لہٰذا کبھی عبادت بریلوی کی تحریر میں شتر گربگی کی نشاندہی کی گئی، کبھی نیاز فتح پوری کے مضمون میں عروس سخن کو سنبھالنے کو محل نظر قرار دیا گیا۔ کبھی صائب کے مصرعے ''من قاش فروش دل صد پارہ خویشم'' میں دل صد پارہ کی قاش کی ترکیب میں اہمال ڈھونڈ نکالا گیا۔ تو کبھی جوشؔ ملیح آبادی کے ایک شعر کے دو مصرعوں میں سوز دل کا ماجرا اور روداد گدا کو ایک ہی بات اور حریم حضرت سلطان اس ترکیب میں حریم وحضرت کے ساتھ سلطان کی کیفیت کو اضافی قرار دیا گیا۔ کہیں ماہر القادری جیسے ماہر عروض کے ایک شعر میں '' عاقبت کی اور سلامت روی کی'' اضافی ترکیب کو غیر فصیح تکرار کی بھینٹ چڑھنے کے مترادف سمجھا گیا۔ کبھی مجروح سلطانپوری کے شعر کے دو مصرعوں ''چمن میں رہے'' اور ''انجمن رہے'' میں چمن اور انجمن میں میم کی تکرار اور حروف ردی جیسے بچکانہ ابجد سے عدم آگہی پر اظہار حیرت کیا گیا، کبھی جوش کی طولانی نظموں کی بے ربطی کو لفظی بھان متی کا کنبہ جوڑنے سے تعبیر کیا گیا۔ شاؔد صاحب کی مصلحت ناشناس بیباکی اور جرأت مندی کا ثبوت ان کے ہم عصر بلند قامت اور مشہور و مقبول خاص و عام ارباب نقد و نظر اور عوامی شہرتوں کے حامل شعراء کے تعلق سے ان کی بے لاگ ٹھیٹ اور بے باک آراء کے اقتباسات ملاحظہ کیجیے، فرماتے ہیں:

''اثرؔ لکھنوی مجھے جانتے ہیں، فراقؔ بھی مجھے پہچانتا ہے، معمولی لوگوں کا ذکر نہیں۔''

اپنے دور کے مقبول زمانہ شاعر جگرؔ مرادآبادی کے تعلق سے رقم طراز ہیں:

''جگر کے ہاں فنی خامیوں کی بھرمار ہے، اسی لیے وہ بیچارہ کسی بھی مشاعرے میں مجھ سے آنکھیں چار نہ کر سکا بلکہ میری تواضع میں لگا رہا۔''

ہم عصر و افق ادب کے کئی تابناک ستاروں پر شاؔد صاحب بیک وقت کس طرح چوٹ کرتے ہیں ملاحظہ کیجیے:

www.urduchannel.in

''جگر کے یہاں لفظی و معنوی جھول بھی ملتے ہیں۔ جوشؔ کا کیا حال بنا، یہ بیچارہ تو زندگی ہی میں تباہ ہو گیا۔ آج اس کے ہوا خواہ ہی اسے برا کہہ رہے ہیں۔ روشؔ صدیقی اور عدمؔ تو ٹھیک ہیں مگر نشور واحدی اور جذبؔی دونوں کافی غلط ہیں ان کے انداز کلام سے بچو۔''

طنز کے اسلوب میں تنقید کا یہ شدید اور تیز، تلخ و ترش جارحانہ لہجہ سخت تیکھے کڑوے کٹیلے انداز میں یہ مسلسل تیر اندازی مزاج کی یہ درشتگی، تلخ گفتاری نیز تضحیک و طنز کے ان استہزائیہ تیوروں کے ساتھ ہر کس و ناکس اور بالخصوص اپنے ہم مشرب، ہم عصر اور ہم قد و قامت میدان نقد و نظر کے سورماؤں اور شہ سواروں کو مسلسل چھیڑتے ہوئے شمشیر برہنہ ہو کر بار بار دعوت مبارزت دینے اور لگاتار محاذ آرائی کے لیے چیلنج کرتے رہنے کے جو نتائج متوقع تھے برآمد ہو کر رہے لہٰذا ان کے ہم عصر بیشتر ناقدین نے شاؔد عارفی کے جوابی حملوں سے محفوظ رہنے کے خیال سے حفظ ماتقدم کے طور پر چپ سادھے رہنے میں ہی اپنی عافیت سمجھی۔ چند ایک نے حوصلہ جٹا کر مدافعت میں متذکرہ بالا جوابی وار کیے بھی تو ''بیکار سے بیگار بھلی'' کی مصداق یونہی اچٹتے ہوئے سے۔ بالعموم ایک منصوبہ بند سازش کے تحت ''سانپ بھی مرے لاٹھی بھی نہ ٹوٹے'' والے مقولے پر عمل پیرا رہتے ہوئے انھیں کلی طور پر نظر انداز کر دینا ہی بہتر سمجھا گیا بقول شاعر:

قتل کرنے کو کہاں زہر دیا جاتا ہے   ان دنوں بس نظر انداز کیا جاتا ہے

وہ تو اللہ دونوں جہانوں میں سرخ رو رکھے شاد صاحب کے شاگرد رشید پروفیسر مظفر حنفی کو جنھوں نے اپنی بے مثال شاگردانہ سعادت مندی کے زیر اثر اپنے استاد کے پس مرگ نہ صرف یہ کہ ان کا بیشتر بکھرا ہوا تخلیقی سرمایہ سمیٹ کر یکجا کیا۔ اسے ہزار ہا ہزار صفحات پر مشتمل کئی کتابوں میں محفوظ کیا اور ان پر بہ اصرار برصغیر کے کم و بیش تمام قابل ذکر نقادوں سے (جن میں وہ بھی شامل ہیں جو شاؔد صاحب کی منفی تنقیدوں کا ہدف بن چکے تھے) مضامین اور تبصرے لکھوا کر انھیں بھی کتابوں میں سمیٹ لیا بصورت دیگر بقول شمس الرحمٰن فاروقی:

” اگر مظفر حنفی کو حق استادی ادا کرنے کا اتنا خیال نہ ہوتا تو اردو دنیا شاد عارفی کے نام سے واقف تو رہتی لیکن اس سے زیادہ وہ کیا تھے کم لوگوں کو معلوم ہوتا۔“

فاروقی صاحب کے اس قول کو مبنی بر صداقت تسلیم کرتے ہوئے اس روشن حقیقت سے بھی صرف نظر نہیں کرنا چاہیے کہ قانون فطرت کے تحت کسی چیز کی اصلیت کو زیادہ دنوں تک چھپایا یا دبایا نہیں جا سکتا۔ قدرت اس کے اجاگر کرنے کے اسباب از خود پیدا کر دیتی ہے۔ لہٰذا شاد عارفی کی آخری عمر کے ڈیڑھ دو برس کے قلیل المدتی شاگرد مظفر حنفی کو بوجوہ ان کے فن پر ڈالے گئے ناشناسیوں کے گرد و غبار کو ہٹا کر اس کے فطری حسن و جمال، توانائی و برنائی اور تب و تاب کو اجاگر کر کے دنیا کے سامنے پیش کرنے کے لیے متعین کیا جس کا خوشگوار اور مثبت نتیجہ ہمارے سامنے ہے کہ نئی نسل کے نہ صرف شعراء بلکہ ناقدین نے بھی اسلوب شاد کو اپنی شاعری اور تنقید کی اساس بنایا۔ لہٰذا جدید شعراء کے علاوہ ناقدین کی نئی نسل میں شمیم احمد، افتخار جالب، شمس الرحمٰن فاروقی، محمود ہاشمی، وزیر آغا اور بالخصوص باقر مہدی اور وارث علوی کی تنقید میں انشائیہ نگاری کا شگفتہ اور دلکش رنگ و آہنگ بلا مبالغہ شاد عارفی کے اسلوب کا پتہ دیتا ہے۔

......☆......

www.urduchannel.in

ڈاکٹر محبوب راہی

شاد عارفی کی بازیافت

شاد نے اردو غزل کو اک نیا لہجہ دیا
ہم وہ محسن کش کہ جیتے جی انھیں دفنا دیا

مظفر حنفی کا یہ حقیقت افروز شعر کسی سربستہ راز کا انکشاف نہیں کرتا بلکہ اپنے محسنوں کو جیتے جی دفنانے کی انسانی سرشت کا دل گداز انداز میں تذکرہ کرتا ہے جو آدم تا ایں دم قدیم انسانی تاریخ کی روایت کا ایک حصہ رہی ہے۔ ہر دور میں مسلسل رونما ہونے والے ان خونچکاں واقعات کی یادیں تازہ کرتا ہے جو صدائے حق بلند کرنے والے ان مصلحین اقوام و ملل، پیغمبرانِ ادیان و مذاہب، مبلغِ دین و صداقت نیز محسنین انسانیت کو محسن کشوں کے ہاتھوں ان کی حق نوائی اور حق پرستی کی پاداش میں جیتے جی دفنائے جانے کے عبرت انگیز واقعات پر مبنی ہیں۔

شاد عارفی نے محض اردو غزل کو نہیں (جو متذکرہ بالا شعر میں محض برائے بیت استعمال ہوا ہے) بلکہ اردو نظم نثر کی کم و بیش تمام مروجہ اصناف کو نئے لب و لہجے، نئے رنگ و آہنگ اور نئے ذائقے سے روشناس کیا ہے جہاں اس روشن حقیقت کا بیشتر اربابِ نظر نے کھلے بندوں قدرے دبی ہوئی آواز اور مجہول لہجے میں اقبال و اعتراف کیا ہے۔ اس کرب ناک سچائی سے بھی کوئی انکار کی جسارت نہیں کر سکے گا کہ محسن کش ارباب اردو نے شاد مرحوم کو محض جیتے جی دفنا دینے پر ہی بس نہیں کیا بلکہ پس مرگ بھی ان کے منفرد، معتبر اور موقر تخلیقی

کارناموں کے قابلِ قدر سرمائے کو ناشناسی کے گرد و غبار کی دبیز تہوں میں تاریخ شعر و ادب کے صفحات سے معدوم کر دینے کی شعوری سازشیں کی ہیں۔ یہ ناقابلِ تردید حقیقت ہے کہ اگر شادؔ عارفی کو اپنی زندگی کے آخری ایام میں مظفرؔ حنفی جیسا سرتا ایثار اور سعادت مندی و جاں نثاری کی ایک بے مثال اور روشن علامت بن جانے والا شاگرد نہ مل جاتا تو شادؔ کے مخالفین اور بدخواہوں نے انھیں جیتے جی دفنا دینے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی تھی۔ میری اس صداقت بیانی کو محض غالب کی طرفداری بالفاظ دگر حنفی صاحب سے عقیدتمندانہ وابستگی پر محمول نہ کیا جائے کہ اپنے استاد کو حیات تابندہ و پائندہ عطا کرنے کے لیے موصوف کی بے مثال مخلصانہ کاوشوں کے اعتراف کے دستاویزی ثبوت دنیائے نقد و بصیرت کے کئی ثقہ حضرات کی تحریروں سے پیش کر سکتا ہوں۔ مثلاً شمس الرحمٰن فاروقی اس بات کے معترف ہیں کہ:

''اگر مظفر حنفی کو حق استادی ادا کرنے کا اتنا خیال نہ ہوتا تو اردو دنیا شادؔ عارفی کے نام سے تو واقف رہتی لیکن اس سے زیادہ وہ کیا تھے لوگوں کو معلوم نہ ہوتا۔''

مظفر حنفی کی مرتبہ ۸۵۲ صفحات ضخامت پر مشتمل ''ایک تھا شاعر'' کے پیش نظر شادؔ عارفی کی خوش بختی پر اظہار رشک فرماتے ہوئے فاروقی صاحب لکھتے ہیں:

''شادؔ عارفی کو خراج عقیدت پیش کرنے کی غرض سے مرتب کی گئی آٹھ سو پچاس صفحات کی اس کتاب کو دیکھ کر کہنا پڑتا ہے کہ خدا شادؔ عارفی جیسا استاد اور مظفرؔ جیسا شاگرد سب کو نصیب کرے۔''

شادؔ عارفی کی اس خوش بختی اور مظفر حنفی کی سعادتمندی کو بڑھاپے کی اولاد کی طرح آخری عمر کا شاگرد ہونے کی دلچسپ تعبیر فرماتے ہوئے فاروقی صاحب لکھتے ہیں:

''مظفر حنفی شادؔ عارفی کے آخری عمر کے شاگردوں میں سے تھے جس طرح بڑھاپے کی اولاد سب کو عزیز ہوتی ہے اسی طرح مظفر حنفی بھی شادؔ صاحب کو بہت عزیز تھے۔''

www.urduchannel.in

دنیائے نقد و بصیرت کے ۵۲ ثقہ ارباب قلم کے رشحات قلم سے مزین مظفر حنفی کی شاگردانہ سعادتمندی کی بے مثال دستاویز ''ایک تھا شاعر'' کی ساڑھے آٹھ سو صفحات کی ضخامت اچھے اچھوں کے لیے مرعوبیت آمیز تاثر انگیزی کا باعث ہے۔ بقول محمد احسن فاروقی:

''ایک تھا شاعر'' کے شاعر شادؔ عارفی کے فن اور شخصیت پر اتنی ضخیم کتاب دیکھ کر مجھ پر بڑا رعب پڑا اور میں واقعی مرعوب ہو گیا۔ مظفر حنفی صاحب نے اپنے استاد کے لیے ایک مستقل یادگار بنادی ہے...... حنفی صاحب کی یہ کتاب ایک مثال سامنے لاتی ہے جس پر اس دور میں چلنے کی ضرورت ہے۔''

متذکرہ مضامین کی یکجائی کو آل احمد سرور نے شادؔ صاحب کے تئیں مظفر حنفی کی عقیدت سے تعبیر کرتے ہوئے لکھا ہے:

''مظفر حنفی کو شادؔ سے بڑی عقیدت ہے اور انھوں نے بڑی کد و کاوش سے ان کے متعلق بہت سے مضامین جمع کیے ہیں۔''

مظفر حنفی کے استاد معروف ادیب و محقق مرحوم عبدالقوی دسنوی مظفر حنفی کی شاگردی کو شادؔ کی خوش نصیبی قرار دیتے ہیں:

''یہ شادؔ عارفی کی خوش نصیبی ہے کہ ڈاکٹر مظفر حنفی جیسا شاگرد کی صورت میں شیدائی مل گیا جس نے ان کی بکھری ہوئی شاعری اور نثری سرمائے کو نہایت محنت سے جمع کر کے مختلف وقتوں میں کتابی شکل میں شائع کر دیا۔''

مظفر حنفی کے اس سعادتمندانہ کارنامے کو اپنی قسم کی پہلی مثال قرار دیتے ہوئے مدیر شاعر اعجاز صدیقی رقم طراز ہیں:

''یہ شاید پہلی مثال ہے کہ کسی شاعر کی موت کے تھوڑے ہی دن بعد اس کے فن اور شخصیت پر ایک قابلِ لحاظ و مطالعہ کتاب منظرِ عام پر آئی ہے۔''

سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے اعجاز صدیقی فرماتے ہیں:

''اپنے استاد سے غیر معمولی عقیدت اور احساس فرض نے مظفر حنفی سے یہ کارنامہ انجام دلایا ہے۔''

مزید فرماتے ہیں:

''......مظفر حنفی نے اچھا کیا کہ یہ کتاب مرتب کر دی ورنہ کون شادؔ کو یاد کرتا اور مرحوم کی طرزِ فکر کی داد دیتا۔''

آگے چل کر اعجاز صاحب نے یہ بھی لکھا ہے کہ:

''مظفر حنفی نے بہت سے اہلِ قلم کو دعوت نگارش دی اور خوشی کی بات ہے کہ کسی سے اجمال کے ساتھ اور کسی سے تفصیل سے لکھوانے میں کامیاب ہو گئے۔''

قلیل المدتی عرصۂ شاگردی میں اپنے ان دیکھے استاد کو ان کے شایانِ شان مقام و مرتبہ دلانے میں مظفر حنفی کی کامیابی کا اعتراف کرتے ہوئے جے کرشن چودھری رقمطراز ہیں:

''شادؔ عارفی کو اپنی زندگی میں ناقدر شناسی کا شکوہ بجا طور پر رہا لیکن موت کے بعد کسی شاعر یا ادیب کو بہت کم ایسے سعادت مند شاگرد یا مداح نصیب ہوئے ہوں گے جو ان کی موت کے تھوڑے ہی عرصے کے اندر ان کی شخصیت اور فن پر اتنی ضخیم کتاب مرتب کر کے شائع کر دیں، مظفر حنفی شادؔ مرحوم کے آخری شاگرد ہیں ان کو استاد سے ملاقات کی سعادت بھی نصیب نہ ہوئی لیکن انھوں نے اس کتاب کے ذریعے اپنے استاد کو اردو شعر و ادب میں شایانِ شان مقام دلانے کے لیے جو کوشش کی ہے وہ ہر لحاظ سے قابلِ تحسین ہے۔''

پروفیسر احتشام حسین مظفر حنفی کے جذبۂ سعادتمندی کی انتہا کو استاد پرستی سے تعبیر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''خوش قسمتی سے انھیں مظفر حنفی جیسے شاگرد نصیب ہوئے ہیں جو استاد پرستی کی حد تک وہ سارا رطب و یابس جمع کر رہے ہیں جو شادؔ عارفی سے منسوب کیا جا سکتا ہے۔''

www.urduchannel.in

شادؔ عارفی کے تئیں مظفر حنفی کی عقیدت مندی کو شاد کی خوش نصیبی سے موسوم کرتے ہوئے علقمہ شبلی نے لکھا ہے:

''شادؔ عارفی بہت خوش نصیب ہیں جنھیں مظفر جیسا عقیدت مند ملا جن کی کاوشوں سے ان کی وفات کے چند سال کے اندر ہی ان کے فکر و فن کا بھرپور اعتراف کیا گیا۔''

پروفیسر گوپی چند نارنگ ''ایک تھا شاعر'' اور کلیات شادؔ عارفی کی ترتیب و تدوین کے ضمن میں لکھتے ہیں:

''ڈاکٹر مظفر حنفی نے جو شادؔ عارفی کے شاگرد رہے ہیں، 'ایک تھا شاعر' اور 'کلیاتِ شادؔ عارفی' مرتب و مدون کر کے شادؔ عارفی کی ہمہ جہت تخلیقی شخصیت کے نقوش کو بڑی حد تک واضح کر دیا تھا۔''

مظفر صاحب کی تحقیقی کتاب 'شاد عارفی شخصیت اور فن' کو ایک اہم شاعر سے تنقیدی انصاف کی اچھی مثال تسلیم کرتے ہوئے نارنگ صاحب نے لکھا ہے:

''شاد عارفی شخصیت اور فن ڈاکٹر مظفر حنفی کی یہ کتاب ایک اہم شاعر سے تنقیدی انصاف کی اچھی مثال پیش کرتی ہے۔''

شادؔ کے نامور شاگرد مظفر حنفی کے استاد بھائی خلیل الرحمٰن اعظمی 'ایک تھا شاعر' کو ایک بھرپور کتاب قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

''مظفر حنفی نے اتنی مکمل اور بھرپور کتاب شائع کر کے اردو کے ایک اہم اور قابل قدر شاعر کے متعلق اتنا اچھا اور قیمتی مواد فراہم کر دیا ہے کہ اس کی جتنی بھی داد دی جائے کم ہے۔''

شمس الرحمٰن فاروقی 'ایک تھا شاعر' کو ایک قابل قدر اور اہم تاریخی دستاویز سے تعبیر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''ایک تھا شاعر، شاد عارفی کے ظاہر و باطن کی عبرتناک ادبی حیثیت سے قابلِ قدر اور تاریخی حیثیت سے اہم دستاویز ہے۔''

سلسلہ کلام کو جاری رکھتے ہوئے اس کارنامے کو فاروقی صاحب مظفر حنفی کے لیے قابلِ مبارک باد ٹھہراتے ہیں بقول ان کے:

''مظفر حنفی اور کچھ نہیں تو محض اس لیے لائق مبارک باد ہیں کہ شاد عارفی کی مطبوعہ وغیر مطبوعہ تحریریں کونے کھتوں سے نکال کر ہمارے سامنے لا رہے ہیں۔''

وہاب اشرفی اس کام کی اہمیت کا اعتراف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''مظفر حنفی اس سلسلے میں جو کام کر رہے ہیں ان کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔''

شاد عارفی کے ہم وطن اور معروف قلم کار امتیاز علی عرشی 'ایک تھا شاعر' کے سلسلے میں شاد کے تئیں اپنی کوتاہیوں پر اظہار ندامت کرتے ہوئے مظفر حنفی کا شکریہ ادا کرتے ہیں۔ لکھتے ہیں:

''مظفر حنفی ہم سب کے شکریے کے مستحق ہیں کہ انھوں نے شاد عارفی کے فن اور شخصیت پر ایسی دستاویز مرتب کر کے وہ کام انجام دیا ہے جس میں ہمیں پیش پیش رہنا چاہیے تھا۔''

جب کہ شاد کے ایک اور معروف شاگرد مسعود اشعر اسے تمام شاگردانِ شاد کے بدعملیوں اور ناشروں کی بے انصافیوں کے قرض کی ادائیگی سے تعبیر کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

''شاد عارفی پر یہ کتاب ترتیب دے کر اور اسے شائع کر کے مرتب اور ناشر نے دراصل ان کے تمام شاگردوں کی بدعملیوں اور تمام ناشروں کی بے انصافیوں کا قرض اتار دیا ہے۔''

میکش اکبرآبادی اس کارنامے کی انجام دہی پر مظفر حنفی کو اربابِ علم و ادب کے شکریے کا مستحق قرار دیتے ہوئے فرماتے ہیں:

''مظفر حنفی صاحب اربابِ علم و ادب کے شکریے کے مستحق ہیں کہ انھوں نے شاد عارفی کی شخصیت اور فن کو روشناس کرایا۔ کاش یہ کوشش

www.urduchannel.in

شاد صاحب کی زندگی میں ہوئی ہوتی۔''

صفِ اول کے نقاد مسعود حسین خاں نے مظفر حنفی کے اس تاریخ ساز کارنامے کو شاد کی دریافت یا بازیافت قرار دیتے ہوئے لکھا ہے:

''ہر زبان کی تاریخ ادب میں چند شاعر اور فن کار ایسے بھی ہوتے ہیں جن کی خود ان کے عہد میں دریافت یا بازیافت کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ وہ اپنے عہد کے تنقیدی شعور کو چونکاتے ہیں لیکن بوجوہ شدت و کثرت سے اپنی جانب متوجہ نہیں کر پاتے تا آں کہ کوئی صاحبِ قلم ان کے شہ پاروں کے بکھرے ہوئے پھولوں کا ڈھیر ناقدین ادب کے سامنے نہ لگا دے۔''

سابقہ سطور میں مظفر حنفی، شاگرد کے بکھرے ہوئے گلہائے تخلیق کے ڈھیر ناقدین ادب کے سامنے لگا دینے کے کئی صداقت نامے پیش کیے جا چکے ہیں۔ مسعود حسین خاں صاحب نے شاد عارفی شخصیت اور فن میں شامل اپنے پیش لفظ میں اس مقالے کی اہمیت و افادیت کو اجاگر کرتے ہوئے تحریر فرمایا ہے:

''اس مقالے کی اشاعت کے بعد اہلِ نظر دیکھیں گے کہ ابھی چند دہے قبل ہمارے درمیان سے جو سخنور خاموشی سے اٹھ گیا ہے اس کی شخصیت اور فن دونوں کس قدر منفرد تھے۔ وہ تمام عمر دارالسرور میں مقیم رہا لیکن اس کے حصے میں لذت خمار نہ آئی۔ اس کی زندگی مسلسل دیوانے کا خواب رہی۔ وہ ہمیشہ محروم رہ کر جیا لیکن اپنی فنکارانہ انفرادیت کا سودا نہ کیا۔ نامساعد حالات کو اس نے فن کے ذریعے گوارا بنا لیا۔ اس کی غیور وخوددار انفرادیت نے کبھی ان سے پیار کیا کبھی ان پر تلوار بن کر ٹوٹ پڑا لیکن ہار نہ مانی اور مانی تو اس طرح کہ اس کی شکست کی آواز گلبانگ شعر بن گئی۔''

سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے خاں صاحب نے اس تصنیف کو حنفی صاحب کا حاصل عمر قرار دیا ہے۔ لکھتے ہیں:

''میں سمجھتا ہوں یہ تصنیف کئی لحاظ سے ڈاکٹر مظفر حنفی کا حاصل عمر ہے۔

اسے قلم بند کر کے انھوں نے ایک ایسی ادبی شخصیت کو پھر سے تولا ہے جسے ناقد (رے) پاسنگ سمجھ بیٹھے تھے۔ اردو شعر و نثر کے ایک ایسے اسلوب سے روشناس کرایا ہے جو اس صدی کا سب سے زیادہ چونکا دینے والا اسلوب ہے۔ ایک ایسی ادبی شخصیت کے نقوش کو ابھارا ہے جو مجبور ہے، مغلوب نہیں اس لیے کہ وہ زمانے سے ہمدردی کا طالب نہیں۔''

اور حرف آخر کے تحت خاں صاحب نے نتیجہ برآمد کیا ہے کہ:

''غالباً یہ مقالہ ڈاکٹر مظفر حنفی کے لیے وجہ تسلی بھی ہوگا اس لیے کہ شاؔد عارفی کو ان سے بہتر سوانح نگار اور ناقد اور انھیں شاؔد عارفی سے بہتر ممدوح نہیں مل سکتا تھا۔''

عنبر شمیم مدیر 'دستک' کولکاتا نے مظفر صاحب کو شاگرد غالب مولانا حالی سے مماثل قرار دیتے ہوئے لکھا ہے:

''شاؔد ایک خوش نصیب شاعر تھے جنھیں مظفر حنفی جیسا شاگرد مل گیا۔ غالب کے عہد میں غالب کو بھی حسبِ مرتبہ قدر و منزلت نہیں ملی تھی جس کے وہ حقدار تھے مگر حالی نے یادگار غالب لکھ کر غالب کو امر کر دیا اسی طرح پروفیسر مظفر حنفی لائق ستائش ہیں کہ انھوں نے حاؔلی کی روایت کو آگے بڑھایا۔''

متذکرہ رائیں بیشتر 'ایک تھا شاعر' اور 'شاؔد عارفی شخصیت اور فن' پر موصولہ ہیں جب کہ مظفر حنفی نے شاد سے متعلق آٹھ ضخیم کتابیں شائع کی ہیں جن میں سے بیشتر کا تذکرہ حنفی صاحب کے شفیق استاد پروفیسر عبدالقوی دسنوی نے اس طرح کیا ہے:

''اس متبرک رشتہ کا نتیجہ ہے کہ مظفر حنفی نے اپنے استاد کی تخلیقات ''نثر و غزل دستہ''، ''ایک تھا شاعر''، ''شوخیِ تحریر''، ''شاؔد عارفی کی غزلیں'' اور ''کلیات شاؔد عارفی'' کے ناموں سے کتابی صورت میں شائع کی ہیں اور ان کو اپنی تحقیق کا موضوع بنا کر ''شاؔد عارفی شخصیت اور فن'' پر پی ایچ ڈی کی سند حاصل کی ہے۔ بلاشبہ یہ مظفر حنفی کے لیے اپنے استاد سے بے انتہا محبت اور عقیدت ہی کا نتیجہ ہے کہ انھوں نے نہ صرف سنجیدہ ہو کر نہایت محنت، خلوص اور جذبۂ احترام کے ساتھ اپنے استاد کی ایک ایک چیز تلاش کی اور انھیں نہایت سلیقے سے ترتیب دے کر پیش کرنے میں کامیابی حاصل کی بلکہ ان کی شخصیت کا بھرپور تعارف کرانے اور اردو ادب میں ان کو صحیح مقام دلانے میں نمایاں حصہ لیا۔''

حالانکہ شاؔد عارفی کی بازیافت کا یہ عظیم القدر کارنامہ مدتوں جذبہ کوہکنی کے زیر اثر تن تنہا مظفر حنفی نے انجام دیا ہے۔ شاعر شاہنامہ اسلام ابوالاثر حفیؔظ جالندھری نہ جانے کس بنا پر اس کارنامے میں حنفی صاحب کے حلقہ احباب کو بھی شامل کیا ہے۔ بقول ان کے:

''اس امر کی جس قدر تحسین کروں کم ہے کہ مظفر حنفی اور ان کے حلقۂ احباب نے شاؔد عارفی کے اس برج کو توڑ ڈالا ہے جس سے باہر شاؔد کی آواز سنائی نہیں دیتی ہے۔''

جہاں تک اس عظیم الشان کارنامے کی تکمیل میں مظفر حنفی کے حلقۂ احباب بشمول شاگردان شاؔد کی معاونت کا معاملہ ہے اس داستانِ المناک کے دل گداز پہلو کا اندازہ مظفر حنفی کے اس اقتباس سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے:

''میرے علاوہ مرحوم کے اور کئی شاگرد ہیں۔ مشہور و معروف بھی اور گمنام بھی مجھے کسی کے خلوص پر شبہ نہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس کتاب کے سلسلے میں باوجود پیہم التجاؤں کے ان میں سے سوائے سلطان اشرف اور برادرم فضا کوثری کے کسی کا بھی شمہ برابر عملی تعاون مجھے حاصل نہیں رہا۔''

مزید ایک جگہ لکھا ہے:

''یقین کیجیے کئی کرم فرماؤں نے تو مسلسل ڈھائی سال تک خطوط لکھنے کے باوجود جواب دینا بھی گوارا نہیں کیا۔''

صورت حال کا دلخراش پہلو یہ کہ شاؔد کے ایک نامور شاگرد اکبر علی خاں (عرشی زادہ) مدیر نگار رام پور نے نگار کا شاؔد نمبر نکالنے کے لیے مظفر حنفی سے نہایت کاوش و جستجو کے

www.urduchannel.in

نتیجے میں حاصل شدہ مواد حاصل کر کے نہ تو شاؔد نمبر شائع کیا اور نہ ہی تمام تر مواد حنفی صاحب کو لوٹایا بقول حنفی صاحب:

''بعد از خرابی بسیار واپس کیا بھی تو معلوم ہوا کہ شاؔد مرحوم کے بے شمار خطوط اور ان سے متعلق کئی اہم مضامین سرے سے غائب ہیں اور بیشتر مضامین کے درمیانی صفحات بھی نہیں ہیں۔ میں نے دوبارہ مرکھپ کر اس منتشر مواد کو ترتیب دیا۔ لوگوں سے نئے مضامین لکھوا کر کتاب کے کھانچے پر کیے اور کسی طرح دسمبر ۷۶ء میں ایک تھا شاعر منظرِ عام پر آ گئی۔''

امجد اسلام امجد مظفر حنفی کے جذبۂ سعادتمندی پر اظہارِ حیرت کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''آج کل نوجوان لوگ شعر کی اٹکل ہوتے ہی پہلا کام یہ کرتے ہیں کہ ہر اس شخص کو رد کرتے ہیں جس سے انھوں نے کچھ نہ کچھ سیکھا ہو۔ ایسے عالم میں مظفر حنفی جیسے لوگوں کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ نہ صرف وہ شاؔد عارفی کی شاگردی کا اعلان کرتے ہیں بلکہ اس پر اصرار بھی کرتے ہیں کہ انھیں شاؔد کا شاگرد سمجھا جائے۔''

مستزاد یہ کہ محض اصرار پر ہی بس نہیں کرتے بلکہ آج دنیائے ادب میں ایک مقام، اعتبار و امتیاز پر فائز ہونے کے باوجود گلزار جاوید ایڈیٹر 'چہار سُو' کو ایک انٹرویو کے جواب میں نہایت انبساط و افتخار کے ساتھ اس امر کا اعلان و اعتراف کرتے ہیں کہ:

''ان کی تحریروں سے آج تک سیکھتا رہتا ہوں، جو کچھ ہوں ان کی جوتیوں کے طفیل ہوں۔''

سیلابی دھاروں کی سی تخلیقی روانی اور سدا بہار ذہنی و فکری شادابی کا نتیجہ جمع شدہ شاؔد عارفی کے سمندر کی طرح وسیع و عریض، عمیق و بسیط اور بے کراں سرمایہ تخلیق سے ان کی حیات مستعار میں ۴۶ء میں محض ان کی نظموں کا ایک مختصر سا مجموعہ 'سماج' رشید احمد مخمور کے ہاتھوں شائع ہو کر نایاب ہو جانا، بعد ازاں اسی میں معمولی سا انتخاب کرتے ہوئے ۵۶ء میں انجمن ترقی اردو کا اس کی اشاعت پر اکتفا کر لینا جن اسباب و عوامل کی نشان دہی کرتا

www.urduchannel.in

ہے ان کا اندازہ ایک تھا شاعر کے اولیں صفحات پر مظفر حنفی کے اس معنی خیز اور دلدوز انتساب سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے:

''استاد مرحوم کے نام!
جنھیں ہم نے اور اس زہر آلود معاشرے نے مل کر گھٹ گھٹ کر مرنے پر مجبور کر دیا لیکن جن کے مصرعے آج بھی سانس لے رہے ہیں جن کا فن و ادب اور بھی زیادہ پھیل کر زندہ ہے اور جیتا رہے گا طلسم ہوشربا کے اس جادوگر کی طرح جو ایک بار قتل ہو کر ہزار بار جنم لیتا ہے۔''

شاد عارفی کو زندہ در گور کرنے میں بنیادی طور پر جن محرکات کی کارفرمائی شامل رہی ہے ان میں بیشتر مرحوم کے مزاج کی تلخی، ترشی، درشتگی، انانیت، خودداری، غیرت مندی، مصلحت ناشناسی، کھرا پن، غیر مصلحت پسندانہ حق گوئی، بے خوفی و بیبا کی وغیرہ کا ردعمل ہے۔ جس کی تفصیل کا نہ تو یہ موقع ہے نہ محل اور جو شاؔد سے متعلق مظفر حنفی کی مرتبہ ہزار ہا ہزار صفحات پر مشتمل کتابوں میں بے کم و کاست درج ہیں تاہم موضوع کی مناسبت سے چند حقائق کا مختصراً عرض کر دینا ضروری سمجھتا ہوں۔

ایسا بھی نہیں کہ شاؔد عارفی کو یکسر نظر انداز یا رد ہی کر دیا گیا ہو۔ دنیائے ادب کی برگزیدہ ہستیوں نے مرحوم کی تخلیقی انفرادیتوں کا کھل کر اعتراف کیا ہے۔ مظفر حنفی کی مرتبہ ''ایک تھا شاعر'' اور ''شاؔد عارفی ایک مطالعہ'' میں شامل دنیائے شعر و ادب کے نام وروں کے مضامین اس کے شاہد ہیں جن میں چند سرفہرست نام ہیں نیاز فتح پوری، آل احمد سرور، ظ۔ انصاری، محمد حسن، احتشام حسین، گیان چند جین، سردار جعفری، احمد ندیم قاسمی، کوثر چاندپوری، ماہر القادری، سلام مچھلی شہری، نشور واحدی، مجروح سلطانپوری، ناصر کاظمی، صہبا لکھنوی، عرش ملسیانی، شہرت بخاری، ندا فاضلی، شفا گوالیاری، عابد رضا بیدار وغیرہ جن حضرات نے محض خطوط کے ذریعے شاؔد کے تخلیقی وجود کی برتری کو تسلیم کیا ہے ان میں نجم آفندی، سجاد ظہیر، فیض احمد فیض، عبد الماجد دریابادی، نور الحسن ہاشمی، نازش پرتاپ گڑھی، رضا نقوی راہیؔ اور مہدی نظمی شامل ہیں۔ چند اقتباسات دیکھیے:

’’میں شاد کے کلام کا دل سے معترف ہوں۔ (فیض احمد فیضؔ)

’’شاد اپنی زندگی میں جس توجہ کے مستحق تھے وہ انھیں نہیں مل سکی۔‘‘ (علی سردار جعفری)

’’شادؔ کی گمنامی جگر کی شہرت سے بڑا ہولناک حادثہ ہے۔ (راہیؔ معصوم رضا)

’’یقیناً شادؔ عارفی موجودہ دور کے اہم ترین ادیبوں میں سے تھے۔ (سجاد ظہیر)

اسی ضمن میں شادؔ عارفی کی تحریروں سے ان کی غیر مصلحت پسندانہ صاف گوئی، بے خوفی اور صداقت پسندی کی چند مثالیں ملاحظہ کیجیے:

’’میں انتہا پسند واقع ہوا ہوں۔‘‘

’’برہنہ اطوار کی مذمت میں برہنہ تلوار بن جاتا ہوں۔‘‘

’’میں اس لیے مطعون ہوں کہ حکومتوں کے عیب گنواتا ہوں۔‘‘

’’طنز میرا فن ہے اس لیے میں اس سے باز نہیں رہ سکتا۔ ہر جھول پر ٹوکنا اپنا فرض سمجھتا ہوں چاہے وہ لباس ہو، انجمن ہو، حکومت ہو۔‘‘

’’خیر تم لوگوں نے بیچ میں پڑ کر معاملہ طے کروا دیا۔ اچھا ہوا ورنہ میں آلِ احمد سرور کے خلاف بہت زہر اگلنے والا تھا۔‘‘

’’جگر کے ہاں خامیوں کی بھرمار ہے اسی لیے وہ بیچارہ کسی بھی مشاعرے میں مجھ سے آنکھ چار نہ کر سکا، میری تواضع میں لگا رہا۔‘‘

’’اثر لکھنوی مجھے جانتے ہیں۔ فراق بھی مجھے پہچانتا ہے معمولی لوگوں کا ذکر نہیں۔‘‘

’’نیاز فتح پوری کے بارے میں:

’’اس کم بخت کو براہ راست جو میں نے لکھا تھا، اس نے بھی کوئی جواب نہیں دیا۔ جواب دے بھی کیا سکتا تھا۔ (جاہل کہیں کا) بنتا ہے قابل، مجھے تو اس کی وہ وہ کمزوریاں معلوم ہیں کہ گھوم جائے گا۔‘‘

’’ڈاکٹر سید عبداللہ کا نام محل نظر رہا کیونکہ یہ تو بہت ریزہ چیں بلکہ عبادت بریلوی قسم کا ناقد ہے۔ ابھی تخلیق کراچی کے تبصرے کے ذیل میں میں نے اس کی اتنی غلطیاں گنائی کہ گھوم ہی تو جائے گا۔‘‘

www.urduchannel.in

’’مرزا ادیب مدیر ’ادب لطیف‘ کو میں اچھا آدمی سمجھتا تھا مگر نہایت سیاسی یعنی مکار آدمی ثابت ہوا۔‘‘

’’طرفداران نیاز برافروختہ نہ ہوں بلکہ ٹھنڈے دل سے یہ دیکھیں کہ میں نے غلط گرفت کی ہے یا صحیح اگر وہ واقعی ٹھکانے کے اعتراض ہوں تو مجھے دعا میں یاد رکھیں اور اپنی غلطیاں درست کر لیں اور ایسے استاد سے ہوشیار رہیں جو کاروانِ ادب کو غلط راستے پر لے جا رہا ہے۔‘‘

’’مجروح سلطانپوری فنی مرتبے میں کتنے سربلند ہیں یہ میرے شاگردوں کے ذمے ہے ہاں بنّے بھائی یا سردار جعفری جوابی مضمون لکھتے تو برابر کی چوٹیں رہتیں۔ مجروح سلطانپوری سے کہاں الجھوں گا۔‘‘

’’جگر کے یہاں لفظی و معنوی سبھی جھول ملتے ہیں۔ جوش کا کیا حال بنا زندگی میں یہ بیچارہ تو تباہ ہو گیا۔ آج اس کے ہوا خواہ ہی اسے برا کہہ رہے ہیں۔‘‘

’’روش صدیقی اور عدم تو ٹھیک ہیں مگر نشور واحدی اور جذبی دونوں کافی غلط ہیں۔ ان کے اندازِ کلام سے بچو۔‘‘

’’میں تو ایک سیدھا سادا پٹھان شاعر ہوں لگی لپٹی مجھے قطعاً نہیں آتی اس وجہ سے اکثر منافق مجھے خلوص کا فریب دے چکے ہیں اور اب بھی دے بھاگتے ہیں۔‘‘

آسمانِ عصر پر مثل مہر و ماہ جگمگاتے ان مشاہیر کے تعلق سے ایسی تلخ و ترش واشگاف اور بیباکانہ جسارتوں کا جو ردعمل ہونا تھا وہ شادؔ کے ساتھ مخاصمانہ رویّے اپناتے ہوئے انھیں نظرانداز یا غرق کر دینے کی صورت میں ظاہر ہو کر رہا۔

معروف شاعر و نقاد اختر انصاری نے شادؔ سے بے توجہی کی ایک وجہ بیان کی ہے، لکھتے ہیں:

’’شادؔ عارفی بھی ان شاعروں میں ہیں جو درجہ اول کے شاعر ہوتے

ہوئے بھی نقادوں کی نگاہِ التفات سے محروم ہیں صرف اس لیے کہ اب تک کسی بڑے نقاد نے اپنے اشاروں پر چلنے والے دوسرے نقادوں کو ان کی طرف متوجہ نہیں کیا۔ ان کا قصور صرف اس قدر ہے کہ وہ شاعری کرنے کے ساتھ ساتھ پروپیگنڈہ کرنا نہیں جانتے۔''

شاؔد کی مجاہدانہ بیباکی اور غیر مصلحت پسندانہ حق گوئی کی مثالیں ان کے چند مبارزت طلب جنگجویانہ اشعار کے وسیلے سے ملاحظہ کیجیے:

ہم سے اس قسم کی امید نہ رکھے دنیا
ہم کسی شخص کی تعریف تو کرتے ہی نہیں

....

تلخیِ گفتار کی تائید میں خطرہ ہے شاد
لکھ رہا ہے مجھ پر ہر نقادِ فن ڈرتا ہوا

....

غالب کے شعر نام سے مرے سنا کے دیکھ
پھر اعتراض ناقدِ فن آزما کے دیکھ

....

یہ فن طنز مرے حق میں در حقیقت شاؔد
بہت بڑا المیہ ہے اختصار کے ساتھ

....

یہی ہے شاؔد میں سب سے بڑا عیب
وہی لکھتا ہے جو کچھ دیکھتا ہے

انجام کار صداقت بیانی کا شاؔد عارفی کا یہ عیب تو انھیں اپنی ذلت و پستی کا احساس دلانے پر منتج ہوا۔ بقول ان ہی کے:

''مجھے اپنے بارے میں شدت سے محسوس ہو رہا ہے کہ اپنی روایات خود اعتمادی اور خودی سے بیزار ہو کر ذلیل ہونے کی حد تک ہو چکا ہوں۔''

میرے دعوے کو حنفی صاحب کے تئیں میری جذباتی وابستگی، ذہنی ہم آہنگی اور طبعی

www.urduchannel.in

مناسبت پر محمول کرتے ہوئے باطل قرار نہ دیا جائے جس کی تائید و تصدیق میں طنز و دشنام کے تیر جھیلتے ہوئے دنیا بھر کے معتبر اور موقر صاحب الرائے حضرات کی گرانقدر آراء پیش کر چکا ہوں جو کہ ان کے استاد شاؔد عارفی کی جہانِ ادب میں بازیافت کر کے انھیں حیاتِ نو عطا کرنے کے ضمن میں دی گئی ہیں اور جو شاگردانہ سعادتمندی کے اعتبار سے اردو شعر و ادب کی تاریخ میں مظفر حنفی کو بے مثال، بے نظیر، لاثانی اور یکتائے روزگار قرار دیتی ہیں۔ تاریخ ادب اردو میں قبل ازیں اپنے استادوں کے نامکمل کام کو شرمندہ تکمیل کرتے ہوئے انھیں حیات تازہ عطا کرنے کی دو مثالیں موجود ہیں، ایک حالؔی جنھوں نے محض یادگار غالب لکھ کر غالبؔ کو اسم بامسمیٰ غالب کر دیا۔ دوسرے علامہ سید سلیمان ندوی جنھوں نے بعد از وفات شبلی نعمانی کی نامکمل سیرت النبی پایۂ تکمیل کو پہنچا کر اپنی سعادتمندی کی ایک روشن مثال قائم کی لیکن مظفر حنفی کی طول طویل اور مثبت خدمات کے مقابلے میں یہ دونوں سعادتمندیاں معیار و مقدار بہر اعتبار بہت کم ٹھہرتی ہیں۔ شاؔد عارفی کے ہمہ جہت بحرِ ذخار سرمایۂ تخلیق سے ان کی حیات میں محض ایک مختصر سے مجموعہ ''سماج'' کا شائع ہو پانا اور ان کے انتقال کے فوراً بعد اس کمی یا محرومی کے ازالے کے لیے وسائل کے فقدان، حالات کی نامساعدت اور مخالفین کی ریشہ دوانیوں کے باوجود محض شدید جذباتی وابستگی کے زیر اثر قلیل ترین مدت میں جا بجا بکھرے ہوئے اور ان فن پاروں کو سمیٹ کر، کتابت، طباعت اور اشاعت کے دشوار گزار اور صبر آزما مراحل سے گزارتے ہوئے ساڑھے تین ہزار صفحات پر محیط آٹھ ضخیم کتابوں ''ایک تھا شاعر''، ''نثر و غزلدستہ''، ''کلیات شاؔد عارفی''، ''شاد عارفی کی غزلیں''، ''شوخیِ تحریر''، ''شاد عارفی: شخصیت اور فن''، ''شاؔد عارفی ایک مطالعہ''، ''مضامین و مکاتیب شاؔد عارفی''، ''شاؔد عارفی (مونولاگ)'' اور ''شاد عارفی فن اور فنکار'' کا منظرِ عام پر لے آنا اور وہ بھی اپنی بے پناہ تخلیقی و تصنیفی مصروفیات سے نبرد آزما ہوتے ہوئے۔ اس پر مستزاد اس پیرانہ سالی میں شاؔد عارفی کی پچاسویں برسی کے موقع پر پھر ایک بار شاد عارفی کے نام کی گونج برپا کرنا۔ اس سلسلے کو ایک بے نظیر سلسلہ ثابت کرتے ہیں۔

......☆......

ڈاکٹر محبوب راہیؔ

شادؔ عارفی کی شاعری میں سماجی مقصدیت

خالق کائنات نے کوئی بھی شے بلا مقصد و مدعا عالم وجود میں نہیں لائی ہے۔ چھوٹی بڑی، معمولی غیر معمولی، جاندار بے جان ہر چیز کا کوئی نہ کوئی مصرف ضرور ہے۔ بقول شاعر: ''نہیں ہے چیز نکمی کوئی زمانے میں''۔ ہر چیز کسی نہ کسی صورت میں، کسی نہ کسی کے لیے یقیناً افادیت بخش ہے۔ پھر وہ خس وخاشاک یا ذرّۂ خاک ہی کیوں نہ ہو:

قسمت کیا ہر چیز کو قسام ازل نے
جو شخص بھی جس چیز کے قابل نظر آیا

پھر بھلا اشرف المخلوقات حضرتِ انسان کا وجود بے مقصد کیونکر ہوتا کہ کائنات عالم میں جس درجہ مقام افضلیت و برتری اسے حاصل ہے خالق حقیقی کے پیش نظر اتنا ہی اعلیٰ و ارفع مقصد و مدعا اسے وجود عطا کرنے کا بھی ہے۔ لہٰذا اپنے نمائندے، نبیؐ برحق پر نازل اپنی کتاب حکمت میں اس نے جنّوں اور انسانوں کا مقصدِ تخلیق اس کی عبادت اور اطاعت و فرماں برداری قرار دیا ہے اور ان کی فرماں برداری کو ان کے عالم میں انتخاب اور ممتاز و ممیّز ہونے کا موجب قرار دیا ہے کہ وہ معاشرے میں بساط بھر خیر کو غالب اور شر کو مغلوب یا رفع دفع کرنے کے لیے ہمہ وقت کوشاں رہتے ہیں۔ اسی اعتبار سے فلاح انسانیت کے لیے صالحین و مجاہدین کی ایک ایسی جمعیت کا وجود بہر صورت لازمی قرار دیا ہے لہٰذا یہ لوگ جہاں

www.urduchannel.in

کہیں برائی پاتے ہیں حتی المقدور بزور بازو اس کا قلع قمع کر دیتے ہیں۔ بصورتِ دگر اس کے برا ہونے کا ببانگ دہل اظہار و اعلان کرتے ہیں یا پھر ایمان کے آخری درجے کی حفاظت کے لیے دل میں اسے بُرا ضرور تصور کرتے ہیں۔ قطع نظر ان گمراہوں کے جو اوہام و بے یقینی کی تیرہ و تاریک اور گمراہ کن وادیوں میں بھٹکتے رہتے ہیں اور انجام کار یقین کی روشنی کا سراغ نہ پانے پر خدا کے وجود ہی سے منحرف ہو بیٹھتے ہیں، بیشتر شعراء کا شمار جمعیت الصالحین میں ہوتا ہے کہ وہ متذکرہ بالا قانون فطرت پر عمل پیرا رہتے ہوئے حق و صداقت کی تبلیغ و تشہیر اور کفر و باطل سے معرکہ آرائی کے ذریعے اپنے مقصد تخلیق شعر اور نظریہ فکر و فن پر استقامت کے ساتھ کاربند رہتے ہیں اور اس طرح مشیت کے مطلوبہ مقصد کی تکمیل کے لیے اپنی تخلیقی صلاحیتیں وقف کیے رہتے ہیں۔ غالباً اسی لیے علامہ اقبال کی پیامیہ شاعری کے پیش نظر کسی نے کہا ہے کہ عقیدہ گنجائش دیتا تو ہم اقبال کی پیغمبر عصر قرار دیتے۔ لیکن اقبال کی مقصدیت کا دائرہ محض ایک مخصوص طرز فکر کے تحت راست بیانیہ اور ناصحانہ انداز کے مسئلے مسائل و موضوعات کی تنگنائیوں میں محدود ہو کر رہ جاتا ہے۔ یہی مقصد و مدعائے شاعری حالیؔ نے بھی اختیار کیا جن کے موضوعات اپنی فوری اثر پذیری کے باوصف اقبالؔ کے مقابلے میں بیحد سکڑے سمٹے ہوئے اور متعین و محدود ہیں۔ سماجی موضوعات کی کثرت، رنگا رنگی، پہلوداری اور تنوع کے اعتبار سے اکبر الہ آبادی کے ہاں نسبتاً زیادہ وسعت نظر آتی ہے لیکن ایک تو ان کے ہاں طنز کے ساتھ ظرافت کی بہتات طنز کی نشتریت کو کم اور لہجے کی کاٹ کو کند کر دیتی ہے جو بات کو ٹھیک دل کی گہرائیوں میں اتر کر چبھن اور دیرپا تاثر پذیری کو کم اور کبھی کبھی یکسر ختم کر دینے کا سبب ہوتی ہے۔ دوسرے ان کے ہاں جذبے میں خلوص کی کمی بھی متوقع اثرات ضائع کر دینے کا موجب ہوتی ہے۔ اکبر کے طنز کا ہدف بیشتر مغربی تہذیب بالفاظ دگر انگریزیت رہا جب کہ وہ اسی انگریز حکومت کے ودیعت کردہ عہدہ جلیلہ پر فائز رہ کر زندگی کے عیش بھوگتے رہے۔ اپنے بیٹے کو انگریزی تعلیم کے حصول کے لیے انگلینڈ بھیجا۔ علاوہ ازیں اپنی نظم، بلوہ کانپور میں بعض قابل اعتراض اشعار پر باز پرس کیے جانے پر حکومتِ انگلشیہ سے معذرت خواہی بھی کر لی۔ فکر و فن میں یہ مصلحت پسندانہ

لچک قول وعمل میں تضاد پیدا کر کے اسے بے رنگ و بے اثر کر دیتی ہے۔

اس تناظر میں شاعری کے وسیلے سے سماجی مقصدیت کی آفاقیت، وسعت اور گہرائی کا مواد و متن اور موضوعات کے پیشِ نظر منصفانہ جائزہ لیا جائے تو شاؔد عارفی کو اردو شاعری میں بہر اعتبار سب سے زیادہ فوقیت اور برتری حاصل ہے کہ انھوں نے حق کی بلندی و برتری کے اعلیٰ وارفع مقصد کے حصول کے لیے باطل سے نبرد آزمائی کے معاملے میں فکر وفن کی عظیم تر روایات سے کسی طرح کا سمجھوتا یا مصلحت آمیزی قطعاً گوارا نہیں کی۔ بقول انھیں کے:

عظمتِ فن کی روایات کو مرنے نہ دیا
شعر سے بچ کے کوئی ظلم گزرنے نہ دیا

جب شعر گوئی کا بنیادی مقصد ہی عظمتِ فن کی روایات کا تحفظ کرتے ہوئے ہر ظلم پر گرفت متعین کر لیا گیا ہو تو ظاہر ہے مروجہ مظالم کے چہروں سے نقاب کشائی کے لیے خلاف مصلحت اظہار واقعہ بھی لازمی ٹھہرا۔ لہٰذا فرماتے ہیں:

بیان کی صداقتوں کو نذر مصلحت نہ کر
وہی تو گفتنی ہے اصل میں جو گفتنی نہیں

ظلم کے خلاف اعلانِ جہاد کرتے ہوئے سچائی کو مصلحت کی بھینٹ نہ چڑھا کر ان کہی کہہ جانا یوں بھی ضروری ہے کہ حقیقت حال چھپانے سے شعر سے برجستگی جاتی رہتی ہے:

وہیں سے شعر میں برجستگی نہیں رہتی
جہاں سے حال چھپانے کی بات کرتا ہوں

اظہارِ حقیقت کے لیے طنز کی تلخی میں بیان کی لطافت اور شگفتگی کی متوازن آمیزش کو شاؔد عارفی غزل کی جان قرار دیتے ہیں:

صداقتوں کی تلخیوں کے ساتھ شاؔد عارفی
لطافتِ بیان واقعہ غزل کی جان ہے

اس لیے قول وفعل میں یکسانیت کے ثبوت کی فراہمی نیز اپنے نظریہ فن سے مکمل

www.urduchannel.in

وابستگی ہی کو شاؔد نے بہر صورت اپنا مقصدِ شاعری متعین کیا ہے:

یہی ہے شاؔد میں سب سے بڑا عیب
وہی لکھتا ہے جو کچھ دیکھتا ہے

اس بظاہر بالکل سادہ اور مختصر شعر کے وسیلے سے شاؔد عارفی نے اپنے تخلیقی شعور، اس کے رنگ و آہنگ، لب و لہجے، مزاج و معیار متن و موضوعات، مقاصد و مطالبات اور نظریات و رجحانات گویا کہ تمام تر شعری کائنات کا خلاصہ پیش کر دیا ہے۔ جو کچھ دیکھنا اس پر کسی قسم کا پردہ نہ ڈالتے ہوئے یا اس پر پڑے ہوئے مہین یا دبیز پردے چاک کرتے ہوئے ناگفتنی سچائیوں کو عریاں کر کے دنیا کے روبرو من وعن پیش کر دینا منافقتوں اور مصلحتوں کے اس دور میں اس سے بڑا عیب یا جرم بلکہ ناقابلِ معافی جرم اور کیا ہو سکتا ہے اور ظاہر ہے جرم اگر ہے تو اس کی پاداش بھی بھگتنی لازمی ہی ٹھہری، آیئے پہلے دیکھتے ہیں جو دیکھنے وہی لکھنے یعنی ناگفتنی کو گفتنی بنا کر پیش کر دینے کا جرم شاؔد عارفی سے کن کن صورتوں میں سرزد ہوا ہے۔

برے حالات میں اپنے گندم نما جو فروش دوست کی ابن الوقتی اور طوطا چشمی کا رویہ اختیار کرنے پر اسے آئینہ دکھلاتے ہیں:

بیکسی میں سابقہ پڑنے پہ اندازہ ہوا
آپ کو میں دوست سمجھا تھا بڑا دھوکا ہوا

ہتھیلی میں چاند دکھلانے کے فریب کارانہ سیاسی وعدوں پر:

خشک لب کھیتوں کو پانی چاہیے
کیا کریں گے ابر گوہر بار کا

جوئے مٹکے کلب چلانے والوں، رشوت خوروں، بدعنوانی، بے ایمانی، ملاوٹ وغیرہ فریب دہی اور دھوکے بازی کے مجرمانہ طریقوں سے حاصل شدہ دولت سے پر شکوہ عمارتیں بنا کر ان کے صدر دروازوں پر جلی حروف میں 'ھٰذا من فضل ربی' لکھا دیکھ کر شاؔد صاحب کے اس طنز کا لطف اٹھایئے:

ناجائز پیسے کی اجلی تعمیروں کے ماتھے پر
آپ نے لکھا دیکھا ہوگا، یہ سب فضل باری ہے

مشینوں کی روز افزوں ترقی پر اقبال نے ''احساسِ مروت کو کچل دیتے ہیں حالات'' کہتے ہوئے اظہار حیرت کرتے ہوئے یہ بھی کہا تھا کہ ''محو حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی'' جبکہ شاد نے کچھ اس طرح تکنیکی الفاظ میں خدشہ ظاہر کیا ہے:

کہیں رہ نہ جائے مشینوں کی دنیا
کہیں آدمی آ نہ جائے کمی میں

نہ جانے عصر نو کی انٹرنیٹ ٹیکنالوجی کی کرشماتی ترقیات پر ان حضرات کا کیا تبصرہ ہوتا۔ خیر عدلیہ کی غیر منصفانہ حد تک مشکوک کارگزاری پر شاد عارفی کا طنز ملاحظہ کیجیے:

دیکھ لینا کہ ہر ستم کا نام
عدل ہوگا کسی زمانے میں

اور اس کارگزاری کا بین ثبوت شاد عارفی کے مخصوص مکالماتی لہجے میں اس شعر میں ملاحظہ کیجیے:

اگر ہمارا یقین نہیں ہے تو آیئے آپ کو گنا دیں
بہار میں جن کے آشیانے لٹے ہیں وہ اپنے ہاتھ اٹھا دیں

فرقہ وارانہ آگ کو ہوا دے کر اس پر اپنی سیاسی روٹیاں سینکنے والوں کے بارے میں شاد کی رائے دیکھیے:

سلجھانے کی بات بنا کر
ڈاڑھی چوٹی میں الجھا دی

عوام کو فروعی تنازعات میں الجھا کر بنیادی مسائل سے ان کی توجہ ہٹانے کی شعوری کوشش پر یہ تبصرہ ملاحظہ کیجیے:

کیا تعجب ہے کہ تیشوں کی طرف بڑھ جائیں
لوگ ہاتھوں کو سوالوں سے جو مہلت دیں گے

www.urduchannel.in

اور ملک کے فرقہ پرستانہ، غیر مساویانہ اور ظالمانہ سیاسی، معاشی اور سماجی حالات پر اپنے طنزیہ اشعار کے وسیلے سے شاد عارفی کے یہ ناقابلِ تردید تبصرے بھی ملاحظہ فرمایئے:

جب چلی اپنوں کی گردن پر چلی
چوم لوں منہ آپ کی تلوار کا

....

بے کسی جب فروغ پائے گی
ظلم کی بوٹیاں چبا لے گی

....

مگر یہاں تو جل رہا ہے آدمی سے آدمی
سنا یہ تھا چراغ سے چراغ جلتے آئے ہیں

....

یہ اندھیرا کوتوالی کے قریب
شاد صاحب ہم تو لٹ کر رہ گئے

....

میں اپنے لفظ واپس لے رہا ہوں
یہ رہزن تھا میں سمجھا رہنما ہے

....

میں تو چٹنی سے کھا رہا ہوں شاد
دال بٹتی ہے جیل خانے میں

بے اصول، غیر معتدل، لا ابالی پن میں من مانی زندگی گزارنے والوں پر شاد صاحب کا یہ طنز دیکھیے:

آپ کے تیور بتاتے ہیں برا مت مانیے
آپ سے کوئی اصولی کام ہونے سے رہا

شاد عارفی کو رام پور کے آمرانہ ماحول میں ان کی حق گوئی و بیباکی پر جس سیاسی جبر کا سامنا کرنا پڑا اس کا اندازہ ان کے محض اس شعر سے لگایا جا سکتا ہے:

ذہنوں سے رعونت کا جنازہ نہیں جاتا
شاعر کو ڈراتے ہیں نواز نہیں جاتا

اورتقلیدیوں کی روایتی شاعری کو بے وقت کی راگنی قرار دیتے ہوئے شاؔد صاحب کا یہ تبصرہ:

غمِ زندگی شاؔد لرزاں ہے لیکن
محبت پہ اصرار ہے شاعری میں

شاد صاحب خامیوں، کجیوں اور بیماریوں پر محض طنز کر کے ہی نہیں رہ جاتے، ان کے شافی اور تیر بہدف علاج بھی ان کے پاس ہیں لہٰذا شاعری کے تعلق سے ان کا یہ حکیمانہ مشورہ ہے کہ:

اب ہمیں حسن کا معیار بدلنا ہوگا
فن کو سومیل کی رفتار سے چلنا ہوگا

سیاسی، سماجی اور معاشرتی امراض کے لیے بھی کئی نسخے ان کے پاس ہیں۔ لہٰذا ان کی تجاویز ہیں کہ:

ایسے قدم اٹھا جو نہ بہکیں کسی طرف
وہ انقلاب لا جو مقدر بنا سکے

....

ہونا پڑے گا قائلِ تعمیر عہدِ نو
جس دن غریب درخورِ املاک ہو گئے

....

ساقیِ محفل کا ہونا چاہیے یہ فرض بھی
کس کے ساغر میں نہیں ہے کس کے پیمانے میں ہے

....

تو پھر اے ساتھیو یہ طے رہا نا!
کہیں بھی راہ میں منزل نہ ہوگی

....

www.urduchannel.in

دلچسپیِ چمن کا جہاں تک سوال ہے
کانٹے بھی چاہتے ہیں نسیمِ سحر چلے

....

تو دیکھنا جو ہم کو نظم اہتمام مل گیا
ادھر نگاہ تشنہ لب اٹھی کہ جام مل گیا

غزل کو موضوعات کی تنگنائیوں اور تراکیب ولفظیات کے تنگ وتاریک حصار سے نکال کر تر وتازہ ہوائیں صحت مند کشادہ فضائیں اور نو بہ نو آفاقی وسعتیں فراہم کرنے والے اس نوع کے شگفتہ وشاداب اور نمکین اشعار کی شاؔد عارفی کی غزلیہ شاعری میں بہتات ہے بلکہ اسے ان کے تخلیقی مزاج کی بنیادی شناخت کا وسیلہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا۔ پیش کردہ اشعار بطور پیش نمونہ از مشتے خروارے کی مصداق ہیں جن کے لب و لہجے، رنگ و آہنگ، استعاراتی اور علامتی اظہار نیز عصری حسیت اور سماجی معنویت سے موسوم پیش آئند جدیدیت کی بنیادیں استوار کی گئیں لیکن انتہا پسند جدیدیوں نے اس سے خارجیت کو یکسر خارج کر کے یگانہ مشن کی تقلید میں محض تنہائی کے کرب کی گہرائیوں میں اترنے اور ذات کے المیہ کے اردگرد طواف کرنے والی داخلیت میں محصور کر کے رکھ دیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ مسلسل حبس اور گھٹن کے باعث یہ نام نہاد جدیدیت جلد ہی دم توڑ کر تاریخ کے صفحات پر محفوظ ہو گئی۔ برخلاف اس کے شاؔد عارفی کی زندگی کے روزمرہ معمولات اور معاملات کے ترجمان درپیش انسانی ضروریات اور سیاسی، سماجی ومعاشی تقاضوں سے راست آنکھیں چار کرنے والے بنیادی مسائل سے نبرد آزما کھلی ڈلی اور کشادہ فضاؤں کی پروردہ روزمرہ مستعمل لفظیات اور مانوس تراکیب کے تانوں بانوں سے بنی دلکش موضوعات سے معمور کسی مخصوص تحریکی لیبل یا نظریاتی شناخت سے مبرا ہمیشہ زندہ و پائندہ اور لازوال رہنے والے انسانی جذبات واحساسات کی ترجمان شاعری کو مشعل راہ بنا کر پیش روشعرا کی نئی نسل نے اپنی لافانی جدیدیت کی راہیں متعین کی ہیں اور کامرانی کی منزلوں کی جانب اپنی پیش رفت جاری وساری رکھے ہوئے ہیں۔

بات چل رہی تھی شاؔد عارفی کی غزلیہ شاعری کے وسیلے سے سماجی مقصدیت کے حصول کی۔ فنی اصولوں کی پابندیاں اور تکنیکی جکڑ بندیوں کی بنا پر جس میں کھل کھیلنے کی گنجائش کم کم ہے اس لیے غالب کو وسعت بیاں کے لیے غزل کی تنگنائیوں سے باہر کچھ اور کی تلاش تھی کہ مطالبات زندگی کے اعتبار سے موضوعات کی وسعت تنگنائے غزل سے نکل کر وسیع تر فضاؤں کی متقاضی ہوتی ہے جو نظم کی لامحدود وسعتوں ہی میں پنپ سکتے ہیں اس کی کشادہ اور شاداب زمینوں میں برگ و بار لا سکتے ہیں جن میں شاؔد عارفی کے طائرِ تخیل نے دور دور تک خوب خوب اڑانیں بھری ہیں اور ایسے ایسے منفرد بے مثال مضامین نو بہ نو کے انکشاف کیے ہیں کہ داد ہی دیتے بنتی ہے۔ شاؔد نے اپنی نظمیہ شاعری میں ان موضوعات کو بھی نہایت شگفتگی اور دلکشی کے پیرائے میں برتا ہے جو شاعری میں شجر ممنوعہ کا درجہ رکھتے تھے۔

شاد عارفی کی نظم نگاری کا میدان بہت کشادہ ہے۔ ان کے شعری سرمائے میں موضوعات کے اعتبار سے منظریہ اور عشقیہ نظمیں بھی بہ اعتبار معیار و مقدار وافر تعداد میں ملتی ہیں، جن کا ذخیرہ قابلِ صد افتخار نہ سہی قابلِ اطمینان اور لائق توجہ ضرور ہے، لیکن یہاں ہمارا مطمح نظر شاؔد کی نظموں ہی کی روشنی میں تلاش کی جا سکتی ہے جو بلحاظ معیار تو برتر بہتر اور بے مثال ہیں ہی مقدار کے اعتبار سے بھی انھیں عددی برتری حاصل ہے جو ان کے کلام کی کل تعداد کا تہائی یعنی کم و بیش ایک سو ہیں۔

شاؔد عارفی نے اپنی نظموں کے ذریعے اصلاح معاشرہ کا فریضہ مجاہدانہ انداز میں انجام دیا ہے۔ معاشرے کے جسم پر گلے سڑے، متعفن پھوڑوں اور بے ہنگم زخموں پر ماہر جراح کی طرح نشتر زنی کر کے اس سے فاسد مواد نکال باہر کرنے کے لیے انھوں نے طنز کے تیز دھار دار نشتروں سے کام لیا ہے۔ ان کا طنز معاشرے میں مروجہ ہر برائی، ہر جھول، ہر زخم اور ہر چھوٹے بڑے پھوڑے پھنسی پر کاری جراحت کرتا ہے پھر وہ ارباب اقتدار کا دربار شاہی ہو، بازار ہاٹ، محلے گلیاں ہوں، مذہبی خانقاہیں ہوں، فرسودہ رسوم و رواج ہوں، انسان کی وحشت و درندگی ہو، روایت کی اندھی تقلید ہو، رشوت خوری اور بدعنوانی ہو،

www.urduchannel.in

نام نہاد وطن پرستوں کی دشمنی ہو، جنسی بے راہروی ہو، فیشن پرستانہ بے حیائی ہو، فرقہ پرستی ہو، مذہبی منافرت ہو، عالی مرتبتوں کی ذلت و پستی ہو، قوم پرستوں کی قوم فروشی ہو، سماجی عدم مساوات ہو معاشرتی ناہمواری ہو غرضیکہ شاؔد صاحب نے رام پور کے جاگیردارانہ ماحول میں پروردہ کم و بیش ہر اس خام پہلو سے اپنی سخت ناپسندیدگی، بیزاری اور ناگواری و نفرت کا اظہار کرتے ہوئے ان پر اپنے طنزیہ اشعار سے نشتر زنی کی ہے جن کی وجہ سے تمام معاشرتی نظام بد ہیئت کوڑھ زدہ اور مفلوج ہو کر رہ گیا تھا۔

زندگی کا ہر پہلو ہر چھوٹا بڑا مسئلہ ان کی نظم کا موضوع بن جاتا ہے کہ ان کے خیال کے مطابق کوئی موضوع یا کوئی مسئلہ شاعرانہ نہیں ہوتا اسے شعر بنانا شاعر کا اپنا کام ہے جو اس کی تخلیقی صلاحیتوں پر منحصر ہے۔ شاؔد صاحب کے پاس مسائل کے ساتھ ساتھ نت نئے موضوعات بھی بکثرت ہیں لہٰذا انھوں نے ایسے ایسے منفرد اور اچھوتے موضوعات پر نظمیں تخلیق کی ہیں جن تک عام شعرا کے ذہن کی رسائی ممکن نہیں بطور مثال چند عنوانات پیش کرنا چاہوں گا جن سے شاؔد عافی کے موضوعات کی وسعت رنگارنگی، ہمہ گیریت، تخلیقی انفرادیت اور تنوع کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے: اندھیر نگری، رسمی قید خانے، مغرب زدگی، ساس اور بہو، زن مرید شوہر، نمائش نمبر ا تا ۴، مرے محلے کے دو گھرانے، مرے پڑوس میں کچی شراب بکتی ہے، ان اونچے اونچے محلوں میں، ابھی جبل پور جل رہا ہے، یہ عبادت یہ رسوم، گویم مشکل وگر نہ گویم مشکل وغیرہ۔ ان کے علاوہ آپ کی تعریف، اس مستقل عنوان کے تحت کئی ٹائپ کے کرداروں کو بیحد دلچسپ اور مضحکہ خیز خاکے شاؔد نے کھینچے ہیں۔ کئی کئی مصرعوں کے طول طویل بندوں پر مشتمل کئی کئی صفحات پر محیط ان نظموں سے مثالیں پیش کرنے کی مضمون کا اختصار اجازت نہیں دیتا تاہم ان حالات کا مختصر خاکہ پیش کرنا غیر محل نہ ہوگا جو شاؔد عارفی کی طنزیہ شاعری کا محرک ہوئے۔ یہاں ان کی غزل کا ایک شعر پھر سے دہرا رہا ہوں:

بیکسوں پر ظلم ڈھا کر ناز فرمایا گیا
طنز کی جانب میں خود آیا نہیں لایا گیا

رام پور کے گھٹن زدہ اور متعفن ماحول میں شاؔد عارفی کی زندگی کے شب و روز جس

طرح گزرے اس کا اندازہ انھیں کے اس شعر سے بآسانی لگایا جا سکتا ہے جس کے ذریعے انھوں نے ریاست سے ٹکرانے کی پاداش میں دس سال ملازمت سے معطل رہنے، پراویڈنٹ فنڈ بحکم سرکار ضبط کر لیے جانے، والدہ کی پینشن بند کر دیے جانے کے بعد پانچ سال تک ان کے ساتھ فاقے کرتے کرتے مر جانے، گھر نیچ کر ان کی تجہیز و تدفین کرنے کے بعد در بدر مارے مارے پھرتے ہوئے تیرہ مکان تبدیل کرنے، چودھویں مکان کی چھت چھلنی کی طرح ہونے کی وجہ سے دن میں دھوپ رات میں اوس، بارش اور گرمی سب جھیلتے رہنے کا ذکر نہایت درد انگیز اور متاثر کن الفاظ میں کیا ہے۔ جن کی وجہ سے بقول ظ۔ انصاری مرحوم عمر بھر حضرت ایوب کی طرح زخموں کے کیڑے چن چن کر اپنا گوشت انھیں کھلاتے رہے اور تمام تر مصلحتوں کو بالائے طاق رکھ کر اصلاحِ معاشرہ کی خاطر باطل قوتوں کے خلاف اعلانِ بغاوت کرتے رہے جس کا انجام ظاہر ہے وہی ہوا جو ابتدائے آفرینش سے علمبردارانِ حق اور مصلحین وقت کا ہوتا آیا ہے۔ مظفر حنفی نے ۸؍ فروری ۱۹۶۴ء کی تپتی ہوئی دوپہر کے دلدوز سانحے کی منظر کشی کرتے ہوئے عابد رضا بیدار کے مضمون ’شاد عارفی ایک تاثر‘ سے یہ اختتامی جملے نقل کیے ہیں۔

’’کس کا انتقال ہو گیا بھائی‘‘ دس پندرہ آدمیوں کی انتہائی مختصر جمعیت کے ساتھ جنازہ جاتے دیکھ کر ایک راہرو نے از راہ ترحم پوچھا۔

’’شاد عارفی کا‘‘ ان میں سے ایک نے جواب دیا۔

اور پوچھنے والا سوالیہ علامت بن گیا!

’’کون شاد عارفی‘‘؟

’’شاعر تھے بھئی ایک!......‘‘

اور یہ شاعر مزار شاہ ولی اللہ (رام پور) کے احاطے میں شاہ صاحب کی تربت سے بائیں طرف آٹھ دس قدم کے فاصلے پر سپردِ خاک کر دیا گیا۔ (انا للہ وانا الیہ راجعون)۔

’’حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا۔‘‘

......☆......

ڈاکٹر محبوب راہی

ایک بے نظیر سلسلہ

بادی النظر میں یہ سلسلہ منفرد طنز نگار شاعر شاد عارفی اور عصر حاضر کے صاحبِ طرز شاعر و ادیب اور نقاد پروفیسر مظفر حنفی کے مابین استادی شاگردی کے مقدس رشتے سے متعلق ہے لیکن ویسا معمولی، روایتی یا رسمی سلسلہ نہیں جیسے کہ بالعموم ہوا کرتے ہیں بلکہ اپنے آپ میں بہر پہلو عجیب و غریب، غیر مختتم، لامتناہی اور ناقابلِ یقین کہ تاریخ ادب میں اس کی دوسری نظیر دشوار ہی نہیں ناممکن ہے۔ پس از سبق استاد کو شاگرد کے بل پیش کیے جانے والے احسان ناشناسی، ابن الوقتی اور خود غرضی کے اس دور میں ایسا رشتہ تو کم از کم میں نے کہیں دیکھا نہ کبھی سنا۔

اردو شعر و ادب کی تاریخ کے اوراق غالبؔ اور شبلی نعمانی کے شاگردوں حالیؔ اور سید سلیمان ندوی کے اپنے استادوں کے نامکمل چھوڑے ہوئے کاموں کے تکمیلیت آشنا کرنے کے سعادتمندانہ تذکروں سے روشن ہیں جب کہ یہ تاریخ ساز کارنامے محض یادگارِ غالب (حالیؔ) اور سیرت النبیؐ (سید سلیمان ندوی) کی تکمیل تک محیط و محدود ہیں لیکن بیسویں صدی کی پانچویں دہائی میں اردو کی شعری و ادبی دنیا میں استاد شاگرد کی ایک ایسی جوڑی کا وجود ملتا ہے جس کی کوئی دوسری نظیر موجودہ اردو ہی کیا دنیا کی کسی بھی زبان کے ادب میں شاید و باید ہی پائی جاتی ہو۔ جن کے نام نامی اپنے منفرد کارناموں کے وسیلے سے مثل آفتاب و ماہتاب روشن ہیں۔ عصری افق ادب پر اپنی تب و تاب بکھیرنے والے یہ مہر و ماہ

www.urduchannel.in

شاؔد عارفی اور مظفرؔ حنفی ہیں۔ خاکسار اپنی مبالغہ آرائیوں کے لیے خاصا بدنام ہے تاہم حقائق جاننے سے قبل براہِ کرم میرے دعووں میں مبالغہ کے پہلو تلاش کرنے کی زحمت نہ فرمائیں تو عرض کروں کہ مجھے بتائیے کوئی ایسی مثال کہ ایک شاگرد جس نے محض ڈیڑھ برس اپنے کسی ان دیکھے استاد سے اپنی محض چند غزلوں پر بذریعہ ڈاک اصلاح حاصل کی ہو اور جس سے بالمشافہ ملاقات تو کجا جس کی دید کی سعادت بھی اسے حاصل نہ ہوئی ہو اپنے اس چند روزہ استاد کے انتقال کے بعد وہ تمام عمر اس سے اپنی شاگردانہ وابستگی برقرار رکھتے ہوئے اس کی ہزار ہا ہزار صفحات پر محیط تصانیف کے منظرِ عام پر لانے پر اپنی تمام تر توانائیاں اور صلاحیتیں صرف کر دے۔ اس ضمن میں مظفر حنفی کی بے مثال سعادت مندانہ ایثار اور جذبہ عقیدت کی شدت کی تفصیلات پیش کرنے سے قبل موصوف کے شاگردی اختیار کرنے کے بیحد دلچسپ اور خوشگوار حادثے کی حکایت لطیف ولذیذ ملاحظہ کیجیے۔

مظفر حنفی نے ۱۹۵۹ء میں مدھیہ پردیش کے شہر کھنڈوہ سے ایک خالص ادبی رسالہ ماہنامہ ''نئے چراغ'' جاری کیا اور حسبِ دستور ادارے کے لیٹر پیڈ پر شاد عارفی کو اپنا کلام بھیجنے کے لیے لکھا جس کی پیشانی پر رسالے کے نام کی مناسبت سے چھپا تھا ''نئے چراغ جلاؤ کہ روشنی کم ہے۔''

شاؔد عارفی نے اپنے مختصر سے رسمی خط کے ساتھ جو غزل برائے اشاعت ارسال کی وہ مطلع تا مقطع رسالے کے موٹو ''نئے چراغ جلاؤ کہ روشنی کم ہے'' کے بخیے ادھیڑ دینے کے مترادف تھی جس کا مطلع اور مقطع اس طرح ہے:

گھروں کو آگ لگاؤ کہ روشنی کم ہے
یہیں سے بات بناؤ کہ روشنی کم ہے
یہ شاعرانِ غلط بیں کہیں گے اک دن شاؔد
ہمیں چراغ دکھاؤ کہ روشنی کم ہے

ادارہ 'نئے چراغ' کے دیگر اراکین کی برہمی سے بے نیاز مظفر حنفی نے نہ صرف یہ کہ یہ غزل نئے چراغ کے اگلے شمارے میں باہتمام شامل اشاعت کی بلکہ دو تین برس بعد

www.urduchannel.in

غیر مصلحت پسندانہ صاف گوئی اور جرأت مندانہ بیباکی کے معاملے میں ذہنی ہم آہنگی اور طبعی مناسبت کی بنا پر شاؔد صاحب کی خدمت میں زانوئے تلمذ تہہ کرنے کی درخواست بھی پیش کر دی۔ بے روزگاری کی بنا پر شاعری ہی شاؔد صاحب کا واحد ذریعہ روزگار تھا لہٰذا استادی شاگردی کی تاریخ میں اپنی نوعیت کی یہ بیحد دلچسپ حکایت بیان کرتے ہوئے شمس الرحمٰن فاروقی لکھتے ہیں:

''شاعری ہی شاؔد صاحب کا ذریعہ معاش تھی اس لیے وہ شاعری کے درخواست دہندہ کو ''انجمن ارباب ادب'' کا رکن بننے کی شرط پیش کرتے تھے جس کی شرائط رکنیت کی رو سے تھوڑی سی رقم سالانہ اور کچھ فیس داخلہ پیش کرنا ہوتی تھی۔ شاؔد صاحب کی مالی حالت ان دنوں کچھ زیادہ ہی خراب تھی لیکن مظفر حنفی نے اپنی مالی مشکلات کا ذکر کیا اور یہ بھی لکھا کہ اگر شاؔد صاحب بوجہ عدم ادائیگی فیس داخلہ وغیرہ انھیں شاگردی میں قبول نہ کریں گے تو وہ نوح ناروی یا ابراحسنی گنوری کے شاگرد ہو جائیں گے اور اس حقیقت کی تشہیر بھی کریں گے۔ شاؔد صاحب بڑوں بڑوں کو خاطر میں نہ لاتے تھے لیکن انھوں نے اپنے جواب میں اس تہدید کا کوئی ذکر نہ کیا بلکہ انتہائی محبت سے مظفر حنفی کو شاگرد بنانا قبول کیا اور ساری رقمیں معاف کر دیں۔'' (تبصرہ ''ایک تھا شاعر''، مشمولہ 'شب خون' الٰہ آباد، ص ۷۶)

مظفر حنفی نے اکتوبر ۱۹۶۲ء تا جنوری ۱۹۶۴ء محض سولہ مہینوں کی قلیل مدت میں شاؔد صاحب سے اپنی محض ڈیڑھ سو کے قریب غزلوں پر بذریعہ ڈاک اصلاح لی۔ اس قلیل ترین عرصہ شاگردی میں اپنے مزاجی ٹیڑھ کی بنا پر تو شاؔد صاحب کو متعینہ فیس رکنیت کی معمولی سی رقم ادا نہیں کی لیکن اپنے اس جز وقتی اور قلیل مدتی استاد کے انتقال سے تا حال نصف صدی سے زائد مدت بیت رہی ہے کہ موصوف کی کوئی سال کوئی مہینہ کوئی ہفتہ اور کوئی دن ایسا نہیں گزرا کہ انھوں نے شاؔد صاحب کو دنیا ادب میں حیات جاوید عطا کرنے کے لیے دامے، درمے، قدمے، سخنے کچھ نہ کچھ کیا نہ ہو۔ اس والہانہ شیفتگی، جذباتی

عقیدت اور سرفروشانہ وارفتگی کی کوئی حد و انتہا ہے کہ زندگی کے پچاس برس مسلسل حق شاگردی ادا کرتے رہنے پر بھی جذبہ عقیدت کی حرارت میں ذرا سی کمی واقع نہیں ہوئی اور اسی ۸۰ برس کی اس کبرسنی میں بھی شادؔ عارفی کی پچاسویں برسی منانے کے لیے مسلسل صور پھونکتے رہے۔ اس سلسلے میں خاکسار کو بھی کئی بار شادؔ صاحب پر مضامین لکھنے اور اخبارات و رسائل میں چھپوانے کے لیے فون پر مسلسل ہدایات دیتے رہے۔ نیز دیگر قلم کار احباب اور مدیران رسائل و جرائد کو بھی شادؔ صاحب پر خصوصی نمبر، گوشے نکلوانے کے لیے تحریک دلاتے رہے۔ بقول فیروز مظفر:

> ”شادؔ عارفی نے اکتوبر ۶۲ء تا جنوری ۶۴ء میرے پاپا (والد محترم مظفر حنفی) کی تقریباً ڈیڑھ سو غزلوں پر اصلاح دی تھی حق شاگردی ادا کرنے کے لیے تا حال وہ شادؔ عارفی سے متعلق نو کتابیں لکھ چکے ہیں۔ ان کے انتقال کے بعد پاپا (مظفر حنفی صاحب) نے نہ صرف کلیات شادؔ عارفی اور حیات شادؔ عارفی کی اشاعت کا بندوبست کیا بلکہ تابڑ توڑ سات آٹھ کتابیں اپنے استاد کے فن اور شخصیت کے بارے میں شائع کیں۔ شادؔ کی وفات کے چند سال بعد ہی ان کی حیات و خدمات پر پی ایچ ڈی کے لیے مقالہ لکھا جو مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کے وسیلے سے منظر عام پر آیا۔ حال ہی میں کلکتہ یونیورسٹی نے ان کے مکاتیب پر تحقیقی کام کے لیے یاسمین اختر کو ڈاکٹریٹ تفویض کی ہے۔“

مظفر حنفی صاحب اسی پر بس کرتے تو کافی ہی نہیں بلکہ بہت زیادہ یعنی تاریخ ادب میں بہر اعتبار غیر معمولی، بے نظیر اور فقید المثال کارنامہ قرار پاتا لیکن اتنے پر بھی اپنے استاد کے تئیں موصوف کے جذبہ عقیدت کی سیری نہیں ہوئی لہٰذا آئے دن یاد شاد کو تازہ بہ تازہ رکھنے کے لیے کچھ نہ کچھ کرتے رہنے کے بعد ۸ فروری ۲۰۱۴ء کو شادؔ صاحب کی یوم وفات کے سلسلے میں پچاسویں برسی منانے کے لیے متعلقین کو مسلسل مہمیز کرتے رہے جس کے نتیجے میں ہندوستان بھر کے معروف رسائل و جرائد مثلاً: کتاب نما (دہلی)، ایوانِ اردو (دہلی)،

www.urduchannel.in

سب رس (حیدرآباد)، کاروانِ ادب (بھوپال)، اسباق (پونے)، شگوفہ (حیدرآباد)، احساس (حیدرآباد)، اردو (اورنگ آباد)، ادبی محاذ (کٹک)، اردو دنیا (دہلی)، فکر و تحقیق (دہلی)، بیباک (مالیگاؤں)، ادبی گزٹ (مئو ناتھ بھنجن)، تمثیل (ممبئی)، کاوش (سہارن پور)، تمہید (کڈپہ)، رنگ (سیجوا) وغیرہ نیز اخبارات: انقلاب، اردو ٹائمز، راشٹریہ سہارا، آبشار، آزاد ہند، اخبارِ مشرق، صحافت، سالار، سیاست جدید، اودھنامہ، صدائے اردو، ہلچل، اورنگ آباد ٹائمز کے علاوہ بیرون ملک کے رسائل: ’پرواز‘ لندن اور ’روشنائی‘ کراچی میں شادؔ عارفی کی حیات شخصیت اور فن پر خاص نمبر اور خصوصی گوشے نیز مختلف مضامین کی مسلسل اشاعتوں کے سلسلے جاری و ساری رہنے سے سال بھر دنیائے ادب میں شاد عارفی کا نام گونجتا رہا۔ علاوہ ازیں این سی پی یو ایل نے شادؔ پر حنفی صاحب کا مونوگراف بھی شائع کیا اور ان کی مرتب کردہ کتب ”منتخبات شاد عارفی“ اور ”مکاتیب و مضامینِ شاد عارفی“ منظرِ عام پر آئیں، نیز فیروز مظفر کے ذریعے شادؔ صاحب کی شعری کلیات کی تدوین نو میں حنفی صاحب کے منہمک ہونے کی نوید بھی ملی ہے۔

اپنے استاد کے تئیں اس والہانہ انہاک سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ حنفی صاحب نہ صرف اپنی حیات مستعار کے آخری لمحات تک اس سلسلے کو جاری و ساری رکھنے کا عزم بالجزم رکھتے ہیں بلکہ اپنے فرزند سعادت مند، کئی کتابوں کے مرتب فیروز مظفر کو بھی اس سلسلے کو دیر تک اور دور تک جاری رکھنے کے لیے آمادہ کر چکے ہیں جس کا ثبوت فیروز کی مرتبہ ساڑھے پانچ سو صفحات سے زائد ضخامت پر مشتمل خوبصورت کتاب ”شاد عارفی: حیات و جہات“ ہے جس میں شادؔ صاحب کی حیات کے عبرت انگیز اور سبق آموز پہلوؤں نیز منفرد فنی جہتوں پر ۳۸ مشاہیر ارباب قلم کے مضامین اور ۲۳ یگانہ روزگار حاملان نقد و بصیرت کے گرانقدر تاثرات کے شمولیت اس کتاب کو سلسلہ شادیات میں ایک منفرد اضافہ قرار دیتی ہے۔ فیروز مظفر شادؔ عارفی کے تئیں اپنے والد کی جذباتی عقیدت کے ساتھ اپنی بھی گہری دلچسپی کا اعتراف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

’’کبرسنی میں زیادہ کام کرتے ہوئے پاپا کی صحت اکثر بگڑ جاتی ہے اور آنکھوں پر بھی بوجھ پڑتا ہے مزید برآں شآد عارفی کی شخصیت اور کلام سے مجھے بھی عقیدت مندانہ محبت ہے اس لیے میں نے پاپا کی اجازت سے ’شآد عارفی : حیات و جہات‘ کا بیڑہ اٹھایا اور ان کی رہنمائی اور سرپرستی میں اس کام کو مکمل کیا۔‘‘ (عرض مرتب)

مظفر حنفی کی انتھک جد و جہد اور مسلسل کاوشوں کے نتیجے میں شآد عارفی کے انتقال کے بعد ان کا منتشر تخلیقی مواد ہند و پاک کے تمام رسائل و جرائد کے علاوہ ہزار ہا ہزار صفحات پر مشتمل جن ضخیم کتابوں میں محفوظ ہو کر کتب خانوں کی زینت بنا دی ہے ان میں ’’شآد عارفی: شخصیت اور فن‘‘، ’’شاد عارفی: فن اور فن کار‘‘، ’’ایک تھا شاعر‘‘، ’’نثر و غزل دستہ‘‘ ’’شوخیِ تحریر‘‘، ’’شاد عارفی کی غزلیں‘‘، ’’کلیات شآد عارفی‘‘، ’’شاد عارفی ایک مطالعہ‘‘، ’’مضامین و مکاتیب شآد عارفی‘‘ م ’’منتخباتِ شاد عارفی‘‘، ’’کلیاتِ شاد (تدوین نو)‘‘ اس کے علاوہ فیروز مظفر کی کاوش ’’شاد عارفی : حیات و جہات‘‘ کو بھی ان کے نامہ اعمال میں شامل کیا جائے تو یہ مقدار تیرہ تک پہنچتی ہے اور یہ کتابیں بھی محض تعداد شاری میں اضافے کی غرض سے مہین اور سقیم کتابچوں یا پمفلیٹوں کی صورت میں نہیں بلکہ اس قدر ضخیم اور لحیم شحیم کہ چار چار اور پانچ پانچ سو صفحات سے کم ہرگز نہیں۔ اس طرح یہ مقدار ہزاہا ہزار صفحات تک جا پہنچی ہے۔

اپنے استاد کی زندگی میں اصلاح کلام کی فیس تک ادا نہ کر پانے والے عسرت و تنگدستی کا شکار مظفر حنفی نے محض تین برس کی قلیل ترین مدت میں ہند و پاک کے ۵۳ صفِ اول کے قلم کاروں سے شآد عارفی پر مضامین لکھوا کر انھیں ساڑھے آٹھ سو صفحات کی ضخیم کتاب میں محفوظ کر دینے کے لیے اپنا کس قدر خون پسینہ صرف کیا ہوگا جب کہ آج کل کی طرح کمپوزنگ اور پرنٹنگ وغیرہ کی اس درجہ سہولتیں بھی میسر نہیں تھیں کہ ہر گلی محلے میں ہرا یرا غیرا پلک جھپکتے کتاب چھپوا کر بغلیں بجاتا پھر رہا ہے۔ اس عظیم منصوبے کی تکمیل میں مواد کی فراہمی کے لیے حنفی صاحب کو کیسے کیسے صبر آزما مراحل سے گزرنا پڑا اس کا اندازہ ان کے

www.urduchannel.in

اس جملے سے لگایا جا سکتا ہے:

’’یقین کیجیے کئی کرم فرماؤں نے تو مسلسل ڈھائی سال تک خط لکھنے کے باوجود جواب دینا بھی گوارا نہ فرمایا۔‘‘ (کچھ اس کتاب کے بارے میں۔ ایک تھا شاعر) شآد صاحب کے تعلق سے مظفر حنفی کی شدید جذباتیت کا اندازہ ’ایک تھا شاعر‘ کے اس کربناک انتساب سے بھی لگایا جا سکتا ہے:

’’استاد مرحوم کے نام...... جنھیں ہم نے اور اس زہر آلود معاشرے نے مل کر گھٹ گھٹ کر مرنے پر مجبور کر دیا لیکن جن کے مصرعے آج بھی سانس لے رہے ہیں جن کا فن و ادب اور بھی زیادہ پھیل کر زندہ ہے اور جیتا رہے گا، طلسم ہوشربا کے اس جادوگر کی طرح جو ایک بار قتل ہو کر ہزار بار جنم لیتا ہے۔‘‘

’’ایک تھا شاعر‘‘ کے معیار و وقار کا اندازہ ان عصر ساز ارباب قلم کی فہرست سے لگایا جا سکتا ہے جن کے نگارشات اس کتاب میں شامل ہیں۔ چند قابلِ ذکر نام ہیں: نیاز فتح پوری، آل احمد سرور، ظ۔ انصاری، محمد حسن، سید احتشام حسین، گیان چند، سردار جعفری، احمد ندیم قاسمی، کوثر چاند پوری، ماہر القادری، سلام مچھلی شہری، نشور واحدی، گوپال متل، مجروح سلطان پوری، ناصر کاظمی، صہبا لکھنوی، عرش ملسیانی، سلیمان اریب، شہرت بخاری، ندا فاضلی، شفا گوالیاری، اکبر علی خاں عرشی زادہ وغیرہ۔ اپنے استاد کے تئیں مظفر حنفی کی پر خلوص اور سعادتمندانہ کاوشوں کی اہمیت و افادیت کا تمام ناقدین نے کھل کر اعتراف کیا۔ مثلاً شمس الرحمٰن فاروقی ایک تھا شاعر پر تبصرہ کرتے ہوئے شب خون اگست ۶۸ء کے شمارے میں لکھتے ہیں:

’’شآد عارفی چالیس برس تک اردو ادب کو مالا مال کرتے رہے لیکن ان پر ڈھنگ کی کوئی کتاب یا مضمون لکھا جانا تو کجا ان کا کوئی باقاعدہ مجموعہ بھی مرتب نہ ہو سکا۔ اگر مظفر حنفی کو حق شاگردی ادا کرنے کا اتنا خیال نہ ہوتا تو اردو دنیا شآد عارفی کے نام سے تو واقف رہتی لیکن اس سے زیادہ وہ کیا

تھے،کم لوگوں کو معلوم ہوتا۔''

پروفیسر سید احتشام حسین حنفی صاحب کی اس جذباتی عقیدت کو استاد پرستی سے موسوم کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''خوش بختی سے انھیں مظفر حنفی جیسے شاگرد نصیب ہوئے ہیں جو استاد پرستی کی حد تک وہ سارا رطب و یابس جمع کر رہے ہیں جو شاد عارفی سے منسوب کیا جا سکتا ہے۔''

(تبصرہ ایک تھا شاعر اور نثر و غزل دستہ' شاہکار' الہ آباد، جون ۱۹۶۸ء)

ماہنامہ 'سیپ' کراچی شمارہ اگست ۱۹۶۸ء میں 'ایک تھا شاعر' پر تبصرہ کرتے ہوئے محمد احسن فاروقی اپنے مرعوب کن تاثر کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ایک تھا شاعر کے شاعر شاد عارفی اور ان کے فن اور شخصیت پر اتنی ضخیم کتاب دیکھ کر مجھ پر بڑا رعب پڑا اور میں واقعی مرعوب ہو گیا۔ کتاب میں کثرت سے چھوٹی بڑی رائیں جمع کر دی گئی ہیں۔ شاد عارفی صاحب کے خطوط بھی دیے گئے ہیں اور اس طرح مظفر حنفی نے اپنے استاد کے لیے ایک مستقل یادگار بنا ڈالی ہے۔ ان کے مقاصد میں خلوص ہے اور یہ کتاب ان کو ضرور پورا کرے گی۔''

جبکہ خلیل الرحمٰن اعظمی کی رائے میں:

''مظفر حنفی نے اپنی بھرپور اور مکمل کتاب شائع کر کے اردو کے ایک اہم اور قابل قدر شاعر کے متعلق اتنا اچھا اور قیمتی مواد فراہم کر دیا ہے کہ اس کی جتنی داد دی جائے کم ہے۔''

(ایک تھا شاعر، تبصرہ 'ہماری زبان' علی گڑھ، ۱۵؍اگست ۱۹۶۸ء)

اس تعلق سے مزید چند معتبر اور موقر آراء ملاحظہ کیجیے:

''مظفر حنفی کو شاد سے بڑی عقیدت ہے اور انھوں نے بڑی کاوش سے ان کے تعلق سے بہت سے مضامین جمع کیے ہیں۔'' (آل احمد سرور)

www.urduchannel.in

''شاد عارفی کی انفرادیت کو سمجھنے کے لیے اور بیسویں صدی کی اردو شاعری میں ان کا درجہ متعین کرنے کے لیے اس کتاب کا مطالعہ یقیناً مفید ہوگا۔'' (ہماری زبان علی گڑھ ۱۸؍اپریل، ۱۹۶۸ء)

''یہ شاید پہلی مثال ہے کہ کسی کی موت کے تھوڑے ہی دن بعد اس کے فن اور شخصیت پر ایک قابلِ لحاظ و مطالعہ کتاب منظر عام پر آئی ہے۔''

(اعجاز صدیقی، تبصرہ 'ایک تھا شاعر' مشمولہ 'شاعر' ممبئی)

''مظفر حنفی اور کچھ نہیں تو اسی لائق مبارکباد ہیں کہ شاد عارفی کی مطبوعہ اور غیر مطبوعہ تحریریں کونے کھتوں سے نکال کر ہمارے سامنے لا رہے ہیں۔''

(شمس الرحمٰن فاروقی، تبصرہ 'نثر و غزل دستہ' شب خون، الہ آباد، جولائی ۱۹۶۹ء)

لیکن ان مطبوعہ اور غیر مطبوعہ تحریروں کو کونے کھتوں سے نکال لانا جوئے شیر لانے سے کسی طرح کم نہ تھا۔ ان دشوار گزار مراحل کا ذکر سابقہ صفحات میں حنفی صاحب کی چند تحریروں کے حوالے سے کر چکا ہوں۔ مزید چند شواہد ملاحظہ فرمائیے۔ حنفی صاحب لکھتے ہیں:

''میرے علاوہ مرحوم کے اور کئی شاگرد ہیں۔ مشہور و معروف بھی اور گمنام بھی، مجھے کسی کے خلوص پر شبہ نہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس کتاب کے سلسلے میں باوجود پیہم التجاؤں کے ان میں سے سوائے بھائی سلطان اشرف اور برادرم فضا کوثری کے کسی کا بھی شمہ برابر تعاون مجھے حاصل نہیں ہوا۔'' (ایک تھا شاعر، ص ۵)

محض اسی پر بس نہیں ہوا۔ اس داستان دل سوز کا یہ حوصلہ شکن اور جگر خراش پہلو بھی ملاحظہ کیجیے۔ بڑی کد و کاوش اور مسلسل تلاش و جستجو کے نتیجے میں شاد صاحب سے متعلق موصولہ بے شمار خطوط اور مضامین ماہنامہ نگار رام پور کے مدیر (اکبر علی خاں عرشی زادہ) کی درخواست پر شاد نمبر نکلوانے کی غرض سے مظفر صاحب نے ان کے حوالے کیے لیکن نہ تو شاد نمبر شائع ہوا اور نہ ہی مواد حنفی صاحب کو لوٹایا گیا۔ داستان ہذا کا یہ عبرتناک باب بھی مظفر صاحب ہی کی زبانی ملاحظہ کیجیے:

''۱۹۶۴ء کے اواخر میں انھوں نے میرا فراہم کردہ کچھ مواد واپس کیا تو معلوم ہوا کہ شادؔ مرحوم کے بے شمار خطوط اور ان سے متعلق کئی اہم مضامین سرے سے غائب ہیں اور بیشتر مضامین کے درمیانی صفحات بھی نہیں ہیں۔ میں نے دوبارہ مرکھپ کر اس منتشر مواد کو ترتیب دیا۔ لوگوں سے نئے مضامین لکھا کر کھانچے پر کیے اور کسی طرح دسمبر ۱۹۶۷ء میں ایک تھا شاعر منظرِ عام پر آ گئی۔''

مزید ملاحظہ کیجیے، لکھتے ہیں:

''جن لوگوں کے پاس ان کی قلمی بیاضیں محفوظ ہیں وہ نامعلوم مصلحتوں کی بنا پر انھیں شائع کرنا مناسب نہیں سمجھتے۔ راقم الحروف نے ۱۹۶۴ء سے آج تک ان اصحاب کو مسلسل خطوط لکھ کر درخواست کی اور رام پور جا کر ملتجی ہوا لیکن کسی قسم کا تعاون نہیں ملا۔ قلمی بیاضوں کی نقل تو درکنار انھیں دیکھنے کا موقع بھی نہیں دیا گیا۔ نثر و غزلدستہ، شوخیٔ تحریر اور شاد عارفی کی غزلیں کے لیے مواد حاصل کرنے میں راقم الحروف کو سابقہ دس برسوں تک مسلسل ان رسالوں کی ورق گردانی کرنی پڑی جن کا سلسلہ ۱۹۱۷ء سے ۱۹۶۴ء تک پھیلا ہوا ہے۔'' (تعارف، کلیات شاد عارفی)

یہ خونچکاں تفصیلات شادؔ صاحب کی محض ابتدائی ایک دو کتابوں کے مواد کی فراہمی کے ضمن میں ہیں جس کی تکمیل کے لیے سخت آزمائشوں کے خارزاروں سے گزر کر مسلسل احساس کے تلوے لہولہان کرنے کے باوجود مظفر صاحب کا جوش عقیدت دودھ کے ابال کی طرح ٹھنڈا ہو کر بیٹھ نہیں گیا، بلکہ بارہ تیرہ کتابوں کی تکمیل کے علاوہ شادؔ عارفی کو جہانِ شعر و ادب میں مقام ابدیت عطا کرنے کے لیے عمر بھر ہنگامہ آرائیاں جاری رکھنے کے بعد اس کبرسنی میں بھی جس جوانمردانہ جوش و خروش کا مظاہرہ فرما رہے ہیں کم از کم تاریخِ ادب میں تو اس کی دوسری نظیر نہیں ملتی۔ متذکرہ بالا کے ماسوا ان دنوں ملک بھر میں جا بجا شاد عارفی سے متعلق جتنے چھوٹے بڑے سمینار منعقد کیے جا رہے ہیں بلا مبالغہ سارا کچھ حنفی صاحب کی

کاوشوں کا نتیجہ ہے۔ شادؔ عارفی سے اپنے فکری رجحان کی مناسبت تخلیقی نظریے کی ہم آہنگی لہجہ و آہنگ کی ہم رنگی نیز ذہنی و جذباتی وابستگی کی بنا پر ان کی شاگردی اختیار کرتے ہوئے حنفی صاحب نے شعوری طور پر استاد کے اتباع میں ان کے لب و لہجے اور رنگ و آہنگ کی پیروی میں شعر گوئی کی شروعات کی جس کا کھلے بندوں اعتراف بھی اپنے کئی اشعار کے وسیلے سے کیا۔ چند مثالیں ملاحظہ کیجیے:

ہے شادؔ عارفی سے مظفر کا سلسلہ
اشعار سان چڑھ کے بہت تیز ہو گئے

....

اوروں سے تقابل نہ کرو ہے مری توہین
ہاں شادؔ و مظفر میں، کجا شادؔ کجا میں

لیکن کچھ عرصے بعد مظفر صاحب نے شادؔ عارفی کے رنگ سے اپنا منفرد رنگ برآمد کرنے کے لیے عصریت، تجریدیت، علامت نگاری، پیکر تراشی اور داخلی کیفیات کی آمیزش سے ایک نئی آواز اور نئے لہجے کو اپنی منفرد تخلیقی شناخت کا وسیلہ بنا لیا۔ لیکن شادؔ صاحب کے تئیں جو عقیدت ان کی روح کی گہرائیوں میں رچ بس گئی تھی باوجود شعر و ادب کے مختلف میدانوں میں اپنے کثیر الجہات کارناموں کی بنا پر دنیائے ادب کی چند منتخب روزگار ہستیوں میں شمار ہونے کے اور مقدار و معیار ہر اعتبار ہر میدان میں اپنے استاد پر واضح فوقیت اور برتری رکھنے کے باوجود اپنے خیال ''کجا شادؔ کجا میں'' کو عقیدہ بنائے ہوئے ہیں اور اپنے ڈیڑھ سالہ استاد کے انتقال کے پچاس برس بعد بھی ان کی یادوں کو زندہ و تابندہ رکھے ہوئے ہیں۔ ورنہ اس دور ناپرساں میں کون کس کو یاد رکھتا ہے۔ اور وہ بھی اس تام جھام اور شان و اہتمام کے ساتھ۔ لہٰذا ایک بار پھر اپنا دعویٰ دہراتے ہوئے اپنی بات ختم کرتا ہوں کہ دنیائے شعر و ادب میں شادؔ عارفی اور مظفرؔ حنفی جیسی استادی شاگردی کی نظیر ملنی دشوار ہی نہیں ناممکن ہے اور اگر ہو تو کوئی مجھے بتائے......؟

............☆............

www.urduchannel.in

پروفیسر زینت اللہ جاوید

شاد کی شعری معنویت

جدید دور کے تناظر میں

شاد عارفی اپنے لب ولہجہ اور انفرادی اسلوب کے باعث اردو دنیا میں ایک جانا پہچانا نام ہے۔ انھوں نے غزلیں بھی کہی ہیں، نظمیں، رباعیات اور قطعات بھی اور یہ تمام اصنافِ شاعری پروفیسر مظفر حنفی کی مرتب کردہ کتاب ’کلیات شاد عارفی‘ میں موجود ہیں۔ شاد کی مکمل شاعری پہ اظہارِ خیال کے لیے طویل مقالہ کی ضرورت ہے، راقم الحروف نے اس مضمون میں جدید دور کے تناظر میں ’شاد کی شعری معنویت‘ ایک مخصوص نقطۂ نظر سے ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے۔

شاد کی شاعری کی مختلف جہات ہیں۔ ان میں عشقیہ جہت بھی ہے، سیاسی بھی اور حقیقی نفسیات کا بھی انعکاس ہے۔ بقول مظفر حنفی شاد عارفی کے ساتھ ’عشق کا حادثہ ان کی سولہ سال کی عمر میں پیش آیا‘ جس کا زمانہ تقریباً دس برسوں پر محیط ہے۔ عشق کو حادثہ اس لیے کہا گیا کہ شاد کی محبوبہ کی شادی ہوگئی تھی۔ نا یافت کے اس درد وکرب کے باعث ان کے ذہن پر بہت برا اثر ہوا اور تین سال تک ان پہ دیوانگی طاری رہی، لیکن وقت کے ساتھ ان کی غزلوں میں سنجیدگی آتی چلی گئی۔ اپنے معاملاتِ عشق کو شاد نے شعری پیکر میں ڈھالا اور زندگی کے آخری لمحات تک وہ غزل کہتے رہے۔ شاد نے اپنے معاشقہ کا اعتراف ان الفاظ میں کیا ہے:

دس پانچ برس حضرتِ حالی کی طرح شاد
مجھ کو بھی جنونِ لب و رخسار رہا ہے

www.urduchannel.in

شاد کی غزل گوئی ۴۶۔۴۷ برسوں کے شعری سفر پر مشتمل ہے لیکن یہ تمام عرصہ محض عشق ومحبت ہی کے موضوع کے لیے مختص نہیں رہا بلکہ بیرونی عوامل کے زیرِ اثر ان کی شاعری میں وہ نمایاں تبدیلی آئی جس کی نمایاں خصوصیت ان کا اسلوبِ بیان اور زبان میں تلخی وترشی نیز طنز کی نشتریت ہے اور ان کی شاعری کا فوکس حالاتِ حاضرہ کی ستم رانیوں پر رہا اور انھوں نے فیض کے الفاظ میں ع ’جو کوئے یار سے نکلے تو سوئے دار چلے‘ کے مصداق زمانے کی ستم رانیوں اور ستم گروں کو ہدفِ تنقید بنانا شروع کیا۔

خوش نما غزلیں جو شاعر صرف عریانی کریں
کس طرح ظاہر زمانے کی ستم رانی کریں
میں تخئیلی نخلستان میں آنکھیں بند کیے بیٹھا رہوں
میری مستقبل اندیشی منزل منزل گھوم رہی ہے

دل میں انسانیت کی تڑپ رکھنے والا شخص خود کو زندانِ عشق میں کب تک گرفتار رکھ سکتا تھا؟ مستقبل اندیشی اس کی گہری سوچ بنتی چلی گئی اور اس کی شاعری میں جلالی کیفیت جمالی کیفیت پر غالب آگئی۔

جلال کو بھی وقت نے سمو دیا ہے شعر میں
غزل کا مطمحِ نظر جمال ہی نہیں رہا

اس جلال کا نتیجہ یہ نکلا کہ حق گوئی و بے باکی شاعر کے کلام کی نمایاں خصوصیت بن گئی۔ شاد کی شاعری میں ایک ابھرتی ہوئی تازہ دم ذہانت کے نقوش ابھر آئے، ایسی ذہانت جو مزاج اور مشاہدے کی صلاحیت سے معمور تھی۔ شاد درباری شاعر نہیں تھے، وہ خوشامد پسند نہیں تھے کہ شاہوں کی خوشامد کر کے حقائق کی شکل وصورت کو مسخ کر کے شاہوں کو خوش کر سکیں۔ وہ تو ادب کے توسط سے ادب میں ایسی تاریخ مرتب کر رہے تھے جو ہر زمانے میں حق گوئی کا ثبوت دے سکے۔

پڑھے تاریخِ ادب ہم کو وہ کہنا ہوگا
جو غزل شاعرِ دربار نہیں کہہ سکتے

شادؔ خوددار انسان تھے، اپنی خودداری کو برقرار رکھنے کے لیے انھیں کسی بھی قسم کی نوازشیں قبول نہیں تھیں۔ ان کے خیال میں اگر کوئی شخص حد سے زیادہ نوازتا ہے تو پھر انسان اپنے آپ کا نہیں رہتا بلکہ اپنی خودی اور اپنا تشخص بیچ کر مجہول انسان بن جاتا ہے۔

فریبِ نظم ادب سے کمایئے دولت
کسی رئیس کے قدموں پہ جا کے سر رکھیے

سچ اور کھری بات چھپائی نہیں جاتی
ہاں ہم سے غلط بات پہ جی ہاں نہیں ہوتا

وہ ذلیل اور برخود غلط انسانوں کو کبھی پسند نہیں کرتے تھے اور نہ غلط بندگی میں ان کا ایمان تھا۔ وہ غریبوں اور بے کسوں کے حق میں آواز اٹھانے والے شاعر تھے اور آواز اٹھاتے رہے۔ ظلم و تعصب اور غیر مساوی انصاف کو اپنی شاعری کا ہدف ملامت بناتے رہے۔ چونکہ اظہار شاعری میں تھا اس لیے رنگیں نوائی کے ساتھ شعلہ بیانی بھی ان میں در آئی جو آخری وقت تک قائم رہی۔ ان کے ذہنِ رسا میں روشنی اس شدت سے تھی کہ آتش نوائی ختم ہو بھی نہیں سکتی تھی۔

سوچتا ہوں جو اندھیروں کے خلاف
ذہن میں شمس و قمر بنتے ہیں

عتاب کی نگاہ سے جھلک رہی ہیں شوخیاں
کسی بھی فن میں ہو مگر کمال بھی تو چاہیے

شادؔ عارفی نے سیاست اور سیاسی رہنماؤں پر سخت الفاظ میں تنقید کی ہے، ان کی شاعری کا یہی وہ رنگ ہے جس میں تلخ کلامی اپنی انتہا پر پہنچی ہوئی نظر آتی ہے۔ ان کے خیال میں سیاست ایک تماشہ بن کر رہ گئی ہے اور اس تماشہ میں ان کا وجود محض تماش بیں کا نہیں بلکہ وہ اپنے ہاتھ میں قلم لیے کہیں نہ کہیں سرگرم عمل بھی ہیں اور قلم بھی وہ جسے تلوار بننے میں کچھ دیر بھی نہیں لگتی اس لیے کہ ان کے یہاں شاعری کا معیار ہی یہی ہے:

www.urduchannel.in

جس کی تخلیق کو تلوار نہیں کہہ سکتے
ہم اسے شاعرِ معیار نہیں کہہ سکتے

شادؔ کا مشہور زمانہ شعر ہے:

ہمارے ہاں کی سیاست کا حال مت پوچھو
گھری ہوئی ہے طوائف تماش بینوں میں

سیاست کے موضوع پر ان کے کچھ اور اشعار ملاحظہ فرمائیں جن میں گندم نما جَو فروش کو بے نقاب کرنے کی بات کہی گئی ہے لیکن اس سے کیا ہوتا ہے جن کے پاس ہر موقعہ و محل کے لیے ہر قسم کی نقاب موجود ہو انھیں آپ کیسے پہچان سکیں گے جو اپنے تعصب اور قوت کے بل بوتے پر کمزوروں اور بے کسوں کو ظلم و بربریت کا نشانہ بناتے ہیں:

جس کی لاٹھی اسی کی بھینس ہے آج
کیا اسی کو کہیں گے جنتا راج

بھاؤ انعام دعا بھیک گریباں خنجر!
آج ہر ہاتھ کسی کام سے وابستہ ہے

جلوسِ رہبرِ ملت نہ سمجھو
سیاست کا جنازہ جا رہا ہے

اگر جَو بیچنے والوں کے چہرے لکھ لیے جائیں
ہمارے ملک سے گندم نمائی ختم ہو جائے

سرشتِ میر کارواں بھرے گی روپ دفعتاً
تم اس سے مطمئن رہو نقاب ان کے پاس ہے

اب میں جس شعر کو پیش کر رہا ہوں لگتا ہے شادؔ عارفی ہمارے ہی دور میں ہمارے ہی آس پاس بیٹھے ہوئے ہیں اور ان لوگوں کو بے نقاب کر رہے ہیں جو پسِ پردہ کٹھ پتلیوں

کو نچاتے رہتے ہیں:

معلّمانِ نظمِ نو ہیں پیش رو کی راہ پر
جو اس کے پاس ہے وہی نصاب ان کے پاس ہے

انسانیت پسند شاعر انسان اور اس کی معاشرت و سماجیات کا بغور مطالعہ کرتا ہے، فکر وتمدن کی ہر جہت کو اپنا موضوع بناتا ہے۔ وہ ادب کے توسط سے تمام استحصالی قوتوں کے انسداد کے لیے برسرِ پیکار رہتا ہے، اس کے اسلوب میں انقلاب آفریں تصورات اور احتجاجی کردار نمایاں ہوتا ہے۔ اپنے عہد اور زمانے کی آگہی کی جامعیت شاؔد کے ان اشعار سے ہویدا ہے:

عہدِ ظلم و آزادی میں ذوق و شوق برابر دیکھا
اس نے میری گردن دیکھی میں نے اس کا خنجر دیکھا

تم کہاں تک عدل خواہوں کے اڑا سکتے ہو سر
آدمی جب تک ہے یہ دیوانہ پن باقی بھی ہے

آج کتنے ہی ایسے معصوم پرندے ہیں جنھیں محض شک کے نام پر قیدِ قفس کی صعوبتیں جھیلنی پڑ رہی ہیں اور منصفوں کے فیصلے آنے تک اپنی عمرِ عزیز کا ایک بہترین حصہ تاریکیوں میں گزار رہے ہیں اور پھر ایک طویل عرصہ کے بعد فیصلہ یہ ہوتا ہے کہ کوئی ثبوت نہ ملنے کے باعث انھیں رہا کیا جاتا ہے۔ شاؔد نے ایسے ہی موقع پر طنز سے لبریز لہجہ میں کہا تھا:

یہ آپ کی زبان سے کیا سن رہے ہیں ہم
ہم بے قصور لائقِ جرم و سزا نہ تھے

ہم نے میدانِ سخن مارے ہیں
تم نے یارانِ وطن مارے ہیں
ہر ستم گر نے غلط معنی میں
حامیِ دار و رسن مارے ہیں

www.urduchannel.in

شاؔد کے سینے میں ایک ایسا دھڑکتا ہوا دل تھا جو انسانوں کے دکھ درد اور ان کی پریشاں حالی سے معمور تھا، بے کسوں اور مجبوروں کا حامی تھا۔ دورِ حاضر کا شاعر و ادیب بے چارہ خود ہی موجودہ زندگی کی زیادتیوں کا شکار ہے اور اس کی لپیٹ میں آکر کچھ ایسا بن گیا جیسا ہم اسے دیکھتے ہیں:

بے کسوں پر ظلم ڈھا کر ناز فرمایا گیا
طنز کی جانب میں خود آیا نہیں لایا گیا

جہاں لوگ ہمارے ساتھ غیر انسانی سلوک کرتے ہوں، زندگی کے خارجی پہلو ہماری روحانیت، اخلاقیت اور ارتقاء کی راہیں مسدود کرتے ہیں، دنیا میں وفا نام کی کوئی چیز نہ رہ جائے، کوئی بھروسہ، اعتقاد یا احساسِ عزت باقی نہ رہے اور یہ کہ انسانیت پر سے انسان کا اعتماد متزلزل ہو جائے تو آپ کس قسم کی شاعری کریں گے؟ جب دل درد والم میں ڈوب رہا ہو تو کیا آپ کو پپیہے کی آواز کانوں میں رس گھولتی ہوئی محسوس ہوگی ممکن ہے کچھ فن کاروں کے یہاں ایسا ہوتا ہو لیکن شاؔد کے ساتھ ایسا نہیں ہوتا:

ان غم کی گھٹاؤں میں پپیہے کی صدا پر
محسوس یہ ہوتا ہے کہ جھک مار رہا ہے

یہ جھنجھلاہٹ، یہ اندازِ گفتگو یہ تلخ لہجہ کچھ یوں ہی شوقیہ نہیں آجاتا۔ کسی کے ساتھ کچھ ایسا ہو جاتا ہے جب انسانی ذہن پریشانی میں مبتلا ہو کر اس قسم کے اندازِ تخاطب پر اُتر آتا ہے مزید برآں اس بگڑے ماحول کو سنوارنے کی قدرت رکھتے ہوئے بھی وہ دخل اندازی نہیں کر سکتا تو اس لہجہ کو اختیار کر لیتا ہے۔

اے کاش آپ ہم کو وہاں تک ستا سکیں
پوچھے جو کوئی حال تو آنسو بہا سکیں

پھول کھلتے ہوئے دیکھے ہیں سدا خاروں میں
ہم غریبوں کی بڑی بات ہے سرکاروں میں

امارت پُر فریب قسمت کا اتنا پرچار کر چکی ہے
غریب بے چارا آج تک وجہِ بد نصیبی نہیں سمجھتا

جو پیش آئیں غریبوں سے انکسار کے ساتھ
تو ہم کو ضد بھی نہیں اہلِ اقتدار کے ساتھ

فن کار چونکہ اپنی فنی تخلیقات کو اپنے نفس مسیحائی سے زندگی بخشتا ہے اس لیے جیسی اس کی شخصیت ہوگی اسی نوعیت کی اس کی فنی تخلیقات ہوں گی۔ انسانی شخصیت کی نشو و نما میں اندرونی اور بیرونی عوامل کارفرما رہتے ہیں ممکن ہے بیرونی عوامل میں اختلاف و تضاد پایا جاتا ہو اس لیے انسانی شخصیت بھی ایک دوسرے سے مختلف ہوتی ہے۔ کوئی فن کار ماحول سے سمجھوتہ کر لیتا ہے ع 'زمانہ با تو نہ سازد تو با زمانہ بساز' لیکن کوئی اس ماحول کے خلاف تنقید کرتے ہوئے اس سے نبرد آزما ہو جاتا ہے ع 'زمانہ با تو نہ سازد تو با زمانہ ستیز' اور اس طرح اپنی ادبی کاوشوں اور تنقیدی صلاحیتوں سے ماحول کو ادبی سطح پر بدلنے کی کوشش کرتا ہے۔ ظاہر ہے یہ تبدیلی محض فرد واحد کے بس کی بات نہیں ہوتی اس لیے وہ اپنی ادبی کاوشوں سے عوام میں بیداری کی لہر پیدا کرتا ہے، انھیں زندگی اور ماحول کے تضادات سے واقف کراتا ہے۔ شاؔد نے کبھی باطل کے سامنے سر نہیں جھکایا۔ اس نے فن تخلیق کیا اور وہ بھی حقیقت کے ساتھ اس لیے کہ فن بغیر حقیقت کے باطل ہو جاتا ہے یعنی وہ ایسی قدروں کا حامل ہو جاتا ہے جو باطل کو مزید باطل اور مضرت رساں بنا دیتا ہے۔ وہ مثبت یا ایجابی قدر ہی ہوتی ہے جو حقیقت کی افادیت و ثبات کی آئینہ دار ہے جب کہ منفی قدریں ہمیں برے آدمیوں میں زندگی گزارنے کی عادی بنا دیتی ہیں اور ایک حقیقت پسند شاعر کبھی یہ برداشت ہی نہیں کر سکتا کہ وہ ایسے ماحول میں سانس لیتا رہے جہاں دیگر اور برائیوں کے ساتھ ظلم و جبر کا بھی دور دورہ ہو۔ اس لیے وہ احتجاجی لب و لہجہ اختیار کر لیتا ہے اور تخلیقی کرب سے گزرتے ہوئے اس مقام پر پہنچ جاتا ہے جہاں اس نوع کے اشعار وجود میں آتے ہیں:

www.urduchannel.in

تمھیں رہبر سمجھنا پڑ گیا ہے
ہماری بے بسی کی انتہا ہے

مدح خوانی کے وظیفے جو ہوئے ہیں منظور!
اس کا مطلب ہے کہ جھوٹوں کو فضیلت دیں گے

موسمِ گل کا دلاتا ہے یقیں
باغباں کی یہ سیاست کیا کریں

تفتیشِ حال موسمِ گل کو چلے ہیں آپ
اب جب کہ آشیاں خس و خاشاک ہو گئے

آگ دے کے گلشن کو بھس میں ڈال کر چنگی
پہلے کیا ہوا پوچھوں پھر برا ہوا کہہ دوں

اُدھر منہ پھیر کے ہنسنے لگو گے
اِدھر منہ دیکھ کر روتے ہو یارو

رہبرانِ ملک و قوم پہ شاؔد نے بے شمار اشعار کہے ہیں اس موضوع پر حوالہ میں اشعار زیادہ ہو رہے ہیں پھر بھی ان دو شعروں کو بھی ملاحظہ کیجیے جن کے بغیر راقم الحروف کا یہ دعویٰ غلط ثابت ہوگا کہ شاؔد عارفی آج کا زندہ شاعر ہے:

غضب کے تیور بنا کے آتا ہے نرم لہجے میں بولتا ہے
نظر کو کڑوی شراب دیتا ہے شہد کانوں میں گھولتا ہے

تو جس لباس پہ اترا رہا ہے اے کم ظرف
اگر کہے تو ابھی اس کفن پہ چوٹ کروں

شاؔد عارفی نے اپنی شاعری میں ظالم و جابر لوگوں کی اذیت کوشی کو اپنے شعری

موضوعات میں نمایاں حیثیت دی ہے لیکن ان کی تخلیقات کے مطالعہ سے یہ بات بھی ظاہر ہوتی ہے کہ ان کے شعری کردار کی نظر میں اذیت کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ وہ شکست کے لیے نہیں بنا ہے، وہ ہلاک تو ہوسکتا ہے لیکن مات نہیں کھا سکتا۔ اس کی بقا کے امکانات اس کے عزم و حوصلے میں پوشیدہ ہیں۔ وہ کوئی گونگا بیل تو ہے نہیں جو مذبح یعنی ذبیحہ خانہ کے باہر اپنے انجام سے بے خبر جگالی کرتا رہے! شاؔد کا شعری کردار حالات کے سامنے ہتھیار نہیں ڈالتا، اوچھے پن یا گراوٹ سے ہاتھ نہیں ملاتا، لیکن اس میں اتنی قوت نہیں کہ اس پر فتح یاب ہوسکے، دردناک گرہ پڑ جاتی ہے، سلجھتی نہیں، جس کے نتیجہ میں شاؔد کی شاعری میں تلخ کلامی اور احتجاجی لب و لہجہ غالب آجاتا ہے:

ہر اک ہم قدم ہمارے حافظہ میں درج ہے
مغالطہ نہ دیجیے کہ زحمتِ سفر گئی

تاریخ اپنے آپ کو دہرائے گی ضرور
ظالم ترا سلوک ترے روبرو نہ آئے

اپنے نشیمنوں میں دورانِ برق و باراں
کانپو تو بزدلی ہے سنبھلو تو حوصلہ ہے

مستقبل روشن تر کہیے
لیکن آنکھ ملا کر کہیے

قوم کے نام یہ جرأت مندی کا پیغام شاؔد کی شاعری میں جا بجا دیکھا جا سکتا ہے۔ آنے والی دنیا اپنا اگلا ورق کھول رہی ہے جس کی تحریر خود ایسے دانشوروں کے خلاف جا سکتی ہے جو اپنے آپ کو ملک و قوم کے محافظ اور رہبر کہلاتے ہیں۔

متذکرہ فکری جہت اور اشعار کے حوالہ جات سے یہ اندازہ لگانا غلط ہوگا کہ شاؔد عارفی پر اسی نوع کے اشعار تخلیق کرنے کا رجحان غالب ہے، غالب ہے اور یقیناً غالب

www.urduchannel.in

ہے لیکن اس کے پس منظر میں شاؔد کا وہ جذبۂ حب الوطنی ہے جو اسے بے قرار رکھتا ہے۔ شاؔد نے اپنے وطن سے بے انتہا محبت کی ہے، وہ اس کی فلاح و بہبودی چاہتے ہیں۔ وطن میں امن ہو، بھائی چارا ہو، دوستی ہو، محبت ہو، مساوات ہو، سب کو آزادی ملے، اہلِ وطن ایک دوسرے کی طرف خلوص کا ہاتھ بڑھائیں، وطن کو ترقی کی راہ پر گامزن کریں، دنیا کے دیگر ممالک کے مقابلہ میں برتری کا احساس پیدا کیں، ان کی غلامی سے اپنے ملک کو بچائے رکھیں، لیکن افسوس اس محبّ وطن کو یہ سب کچھ دیکھنا نصیب نہیں ہوا۔ انھیں جو تکلیف ہے، بے چینی ہے، پل پل کی بے قراری و اضطراب ہے اسی باعث ہے۔ شاؔد کی شاعری میں یہ کیفیت بہت عیاں ہے کہ وطن کو اہلِ وطن نہیں رہبرانِ قوم و وطن بربادی کی طرف لے جا رہے ہیں۔ سیاست کے بازی گروں کو شاؔد نے اسی لیے طنز کا نشانہ بنایا ہے۔ کبھی پستی کو بلندی کہہ کر طنز کیا، کبھی ظلمت کو نور کہہ کر تضحیک کی، کبھی گل کو خار کہا، کبھی قفس کو نشیمن، کبھی رہبر کو رہزن کہا، تو کبھی دوست کو دشمن، اپنے اسی طرز سے شاؔد نے ان لوگوں کے ضمیر کو زندہ کرنے کی کوشش کی لیکن رائگاں! اس کے برعکس شاؔد جیسے وطن سے محبت کرنے والے لوگوں کے پیر کے نیچے سے زمین کھینچنے کی کوشش کی گئی، انھیں موردِ الزام ٹھہرایا۔ شاؔد کو اس بات کا احساس تھا اور افسوس بھی:

ہم نہیں ہیں جاں نثار ملک و ملت ہائے ہائے
آپ کی اس ندرتِ الزام نے چونکا دیا

در گلشن پہ قفس ایجاد و
راستہ بند ہے یہ لکھوا دو

اگر چمن سے نکال دو گے چمن سے باہر گزار لیں گے
چمن کہا یہ نہیں کہا ہے وطن سے باہر گزار لیں گے
وہ جن کی آب و ہوائے گنگ و جمن میں نشو و نما ہوئی ہے
وہ کس طرح سرزمینِ گنگ و جمن سے باہر گزار لیں گے

گنگ وجمن کی آب وہوا میں پرورش پانے والا یہ شاعر اپنے وطن کے لیے امن و آشتی کے پیغام کے ساتھ اہلِ وطن کو اس بات سے بھی چوکنا کر دیتا ہے کہ:

قائم نہیں ہے نظم چمن جاگتے رہو
احمد ہو تم کہ رام چرن جاگتے رہو

جہاں تک شاؔد عارفی کی طرز شاعری کا سوال ہے شاؔد نے یقیناً اصطلاحی معنوں میں گل وبلبل کی شاعری کی ہے جنھیں آپ ہم پیش پا افتادہ مضامین کہہ سکتے ہیں لیکن فرق اسلوب بیان سے پیدا ہوتا ہے اس نوع کی شاعری میں روزمرہ کی باتوں سے جدت پسند فن کار ایک نئی جان ڈال دیتا ہے تو یہ شاعری قدیم ہونے کے باوجود عصر حاضر کے تناظر میں جدید ہوتی ہے۔ شاؔد کے اشعار پرانے ہونے کے باوجود آج کے حالات کی مکمل طور پر عکاسی کرتے ہیں۔ آج ہم جن سیاسی حالات سے گزر رہے ہیں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ شاؔد عارفی آج کے دور میں بھی زندہ ہیں اور رفتار زمانہ کو دیکھتے ہوئے تمام واقعات کی منظرکشی کرتے ہوئے ہمیں دعوت نظارہ دے رہے ہیں، اس معنی میں ان کی شاعری محض روایتی یا ماضی کی شاعری نہیں یا صرف تاریخ کا حصہ نہیں بلکہ عصری تناظر میں بھی تخلیقی شعور کا بیّن ثبوت ہے:

بار ہا سامنے کی باتوں سے جان پڑتی ہے شاعری میں
وہ کون سے پیش پا مضامیں ہیں جن پہ میری نظر نہیں ہے

......☆......

www.urduchannel.in

ڈاکٹر سید صفدر

زبر استاد: شاد عارفی کی نظم نگاری

شاؔد عارفی نظم نگاری کے ایک نئے اسلوب کا موجد بھی ہے اور خاتم بھی۔ شاؔد رنگ ان کے بعد کسی نے اختیار کیا نہ کوئی اسے نبھانے پر قادر تھا۔

شاؔد عارفی نے شعرگوئی کا آغاز کیا تو ان کے سامنے قصیدہ، مرثیہ، مثنوی، نظم جدید، فطرت نگاری، اصلاح پسندی اور ترقی پسندی کی بساط بچھی ہوئی تھی۔ شاؔد کی جدّت پسند طبیعت اور خود پرستی نے رائج الوقت اصناف اور اسالیب کو مسترد کر دیا۔ زبر استاد۔ شاؔد عارفی نے اپنی زمین اور اپنے آسمان بنائے۔ اپنے گل بوٹے کھلائے اور اپنے چاند ستارے ٹانکے۔

انھوں نے نہ پامال اصناف میں طبع آزمائی کی اور نہ روندی ہوئی شعری زبان برتنے میں دلچسپی لی۔ حیرت انگیز طور پر شاؔد نے نیا شعری محاورہ خلق کیا۔ شاؔد کی کاریگری کا سراغ ڈھونڈیں تو ہماری تلاش اردو کے پہلے عوامی شاعر نظیر اکبرآبادؔی کے در قلندری پر پہنچتی ہے۔ یہ دونوں قلندر نہ فلسفی ہیں نہ مفکر نہ ناصح ہیں نہ محتسب نہ صوفی ہیں نہ مصلح۔ ان کے پیش نظر نہ فکر دنیا ہے نہ فکر عقبیٰ نہ نفسیاتی الجھنیں ہیں نہ زندہ باد مردہ باد کے نعرے۔ ان کا حال مدّتوں پہلے غالبؔ نے یوں رقم کیا ہے۔

دیر نہیں حرم نہیں در نہیں آستاں نہیں
بیٹھے ہیں رہ گذر پہ ہم کوئی اٹھائے کیوں

کرشن چندر کے سامنے دو فرلانگ لمبی سڑک بچھی ہوئی تھی۔ نظیؔر اور شاؔد کے سامنے جیتا جاگتا سماج ہے۔ عام آدمی کی مصروفیتیں ہیں۔ دنیا کا نظام جاری ہے۔ نظیؔر اور شاؔد کے

قلم جاری زندگی کی بھلی بُری تصویریں پیش کر رہے ہیں۔ زندگی کے جو رنگ ڈھنگ ہیں ان کے بیان کے لیے عام بول چال کی زبان کو شعری آہنگ میں ڈھالنے کا فنکارانہ کارنامہ، یہ دو شعرا پیش کر رہے ہیں۔نظیر کی طرح شاد عارفی کا قلم .C.C.T.V کیمرے کی مثال ہے۔اسے جس زاویے پر قائم کر دیں ادھر کی ہنستی بولتی متحرک تصویریں بنتی جا رہی ہیں۔ہاں نظیر اور شاد کے ہاں دیکھنے کے زاویے مختلف ہیں۔

نظیر کے ہاں دھوم دھڑکا، موج مستی، جوش وخروش، ہنسنا، گانا کھانا، کھیل تماشہ، کھانا پینا وغیرہ، زندگی کے روشن پہلو منعکس ہو رہے ہیں۔وہ دکھ بھری دنیا سے زندگی کا رس کشید کر رہے ہیں۔غریب عوام نظیر کے ہاں خیر کے پتلے ہیں۔یہ جہدِ حیات میں جبر حیات پر فتح مندانہ یلغار کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ان کے جیب میں نہ بہت پیسے ہیں نہ ہاتھوں میں تر نوالے۔مگر وہ ذرّے کو ہیرا اور شبنم کو موتی بنانے کے تخلیقی عمل میں مصروف ہیں۔ہمارے میلے ٹھیلے ہیں، تیج تہوار ہیں، موسموں کے الٹ پھیر ہیں، رنگ برنگے پھول پھل ہیں، ترکاریاں ہیں، ناچ گانے ہیں اور سب سے بڑھ کر زندگی کرنے کا حوصلہ ہے۔

شاد عارفی بھی کچھ اسی طرح کا دعویٰ کرتے ہیں۔وہ اپنی خودنوشت کے ایک باب 'زبر استاد' میں رقم طراز ہیں:

''میں راستہ چلنے میں اِدھر اُدھر کے مناظرِ نظر انداز کرنا پسند نہیں کرتا کیونکہ میں چاہتا ہوں کہ جس منظر اور مشاہدے میں کچھ تفریح کچھ رنگینی حیات پائی جائے وہ کسی نظم، غزل، قطع یا رُباعی میں سمو کر، ناظرین کے حوالے کردی جائے کہ وہ ان کی امانت ہے۔''

(زبر استاد، مشمولہ اندھیر نگری، لاہور، ۱۹۶۷ء ص:۹)

اب ذرا شاد عارفی کی نظموں کے عنوانات پر نظر ڈالیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے زبر استاد بھی نظیر کے قبیلے کے آدمی ہیں۔شاد عارفی کی نظموں کے انتخاب اندھیر نگری سے میں نے یہ عنوانات لیے ہیں۔جسے نیا ادارہ لاہور نے ۱۹۶۷ء میں شائع کیا ہے۔ملاحظہ فرمائیں:
شادی کے بعد، دسہرہ اشنان، فلمی محبت، شوفر، نمائش، بیٹے کی شادی، نوروز، گنگا

www.urduchannel.in

اشنان، دیوالی، مہترانی، کشمیری بھکارن، سالی، بسنت، مال روڈ، مال زادیاں اور دلال، ملازمہ، مرید کی بیوی، وہ کافرہ، جنسِ جمیل، وغیرہ۔

مگر نظموں سے بالمشافہ ملاقات کیجیے تو معلوم ہوتا ہے کہ شاد کی دنیا میں اندھیرا ہی اندھیرا ہے۔مجھے تو لگتا ہے کہ .C.C.T.V کیمرہ شاد کی نظموں کے مطالعے کے نتیجے میں ایجاد کیا گیا ہے۔آج .C.C.T.V کیمرے، گناہوں کی گواہی دیتے ہیں۔شاد عارفی بھی ہماری زندگی کے منفی پہلوؤں کو اپنے کیمرہ قلم میں محفوظ کرتے چلتے ہیں۔شاد عارفی نے اپنے کیمرے، ایسے مقامات پر نصب کیے ہیں جہاں کچھ سب ٹھیک نہیں ہے۔وہ ہماری مکاریوں، بدکاریوں غلط کاریوں اور بدمعاشیوں کے دستاویزی ثبوت پیش کر رہے ہیں۔' اندھیر نگری' کا ناشر اپنے نوٹ میں رقم طراز ہے:

''شاد عارفی کا یہی کمال ہے کہ اس نے ہم کو ہماری ریاکاری، بدچلنی اور خودغرضی سمیت بے پردہ کر دیا ہے۔''

(اندھیر نگری، لاہور ۱۹۶۷ء، سرورق:۲)

چند مثالیں نظموں سے ملاحظہ فرمائیں:

جمگھٹ میں انتخاب بھی جنس فضول بھی
شمشاد نو نہال بھی بوڑھے ببول بھی
ہر طرح کی مثال زمانے کے واسطے
(دسہرا اشنان)

کھٹ کھٹ/کون؟ صبیحہ!/کیسے؟ یوں ہی کوئی کام نہیں/
پچھلی رات بھیانک گرج/کیا کچھ ہوا انجام/نہیں!/
میرا ذمہ/میں آئی ہوں/تم پر کچھ الزام نہیں (شوفر)

ہمارے محلے کی یہ اپسرائیں — نہ کمروں پہ بیٹھیں نہ ناچے نہ گائیں
مگر شوہروں سے زیادہ کمائیں — نمائش میں مانگے کی موٹر پہ آئیں
پڑا علم و حکمت کا بازار مندا — طبابت سے بہتر ہے عورات کا دھندا
(نمائش)

جی نہیں ان کو مبارک ہو جو جاتی ہیں وہاں　　غیر مردوں میں نقابیں جو اٹھاتی ہیں وہاں
اپنے جوبن کو تماشہ جو بناتی ہیں وہاں　　کیا سند ہے کہ نہ ہوتا ہو جھمیلا کوئی

(نصف بہتر)

جہاں نظیؔر کے ہاں زندگی کے مثبت پہلوؤں کی بہار ہے، وہیں شاؔد عارفی کا سارا زورِ قلم منفی رویوں کی پردہ دری میں صرف ہو رہا ہے۔ میں نے دانستاً کم فحش مثالیں درج کی ہیں۔ شاؔد کا موضوعِ سخن یا تو معاشرے کی جنسی نا آسودگی کا بیان ہے یا خود شاعر کی جنسی نا آسودگی کا مظہر ہے۔ شاد کا اندازِ سخن بے رحمانہ ہے۔ شاد اپنے مزاج کی نشاندہی یوں کرتے ہیں:

''میں انتہا پسند واقع ہوا ہوں۔''

(زہر استاد، اندھیر نگری، لاہور، ۱۹۶۷ء، ص:۱۰)

اپنے حافظے کی کمزوری پر اظہار خیال کرتے ہیں ہوئے فرماتے ہیں:

''کئی ماہرین نفسیات نے بتایا کہ یہ تمہارے کثرت مطالعہ کا نتیجہ ہے، لیکن میں کہتا ہوں کہ یہ نتیجہ ہے، محنت زیادہ آرام کم، غیر متوازن غذا اور حالات کا۔''　　(زہر استاد، اندھیر نگری، لاہور، ۱۹۶۷ء ص:۱۲)

ماہرین نفسیات کی جن آراء کو شاد نے رد کر دیا وہ یہ ہیں کہ:

''......ایک ڈاکٹر نے دو معاشقوں میں ناکامی کے سر یہ بیماری تھوپ دی۔ دوسرے صاحب نے اس کمزوری کو ناکردہ گناہوں کی حسرت کی دار پر محمول کیا ہے۔ تیسرے صاحب کی رائے ہے کہ یہ چالیس برس تک شادی نہ کرنے کا بھگتوان ہے......اس لیے بوفساد کی آتی ہے بند پانی میں۔''

شاد نے یہ باتیں حافظے کی کمزوری کے ذیل میں لکھی ہیں۔ مگر ہم سمجھتے ہیں کہ یہ اسباب انتخاب موضوعِ سخن کے باب میں کہی گئی ہوں گی۔ یا اب ہم وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ شاد کی جنس زدگی، ان کی جنسی نا آسودگی کا نتیجہ ہے۔

شاد عارفی کی نظموں میں ہمیں وہ عنصر نہیں ملتا جسے شمس الرحمٰن فاروقی جدلیاتی لفظ کہتے ہیں۔ یعنی ان کا کلام تشبیہ، استعارہ، علامت، وغیرہ سے تقریباً عاری ہے۔ شاعری، مرکب تجربے کا اظہار ہے تو یہ چیز شاد عارفی کے ہاں تقریباً مفقود ہے۔ ان کے کلام میں خال خال ہیں ایسے مصرعے ملتے ہیں:

www.urduchannel.in

شادی ایسا باغ ہے جس میں بلبل ہے صیاد نہیں

شاد کی شاعری اکہرا بیان ہے، منظوم بیانات سے عبارت ہے۔ ان کی شاعری کا سماجی سروکار اتنا ہے کہ وہ معاشرے کو پاک صاف دیکھنا چاہتے ہیں۔ شاید اسے کچھ لوگ اصلاحی نقطۂ نظر سے تعبیر کریں۔ مگر شاد کا سارا زورِ بیان کیڑے نکالنے میں صرف ہوتا ہے۔ یہ رویّہ شاید کسی زمانے میں پسندیدہ نہیں رہا ہے۔ شاید یہ آدمی کی جبلت ہے کہ وہ کسی کو ممنوعہ علاقے میں دیکھ کر طنز کرتا ہے۔ بقول غالب:

کہاں مے خانے کا دروازہ غالب اور کہاں واعظ
پر اتنا جانتے ہیں کل وہ جاتا تھا کہ ہم نکلے

شاید اسی لیے ہم، شاد عارفی کو پڑھتے اور محظوظ ہوتے ہیں کہ وہ ہمیں ممنوعہ علاقوں کی سیر کراتے ہیں شاد کے ساتھ ہم بھی پارسا بن کر عشرت گاہوں میں جھانکتے اور لطف اندوز ہوتے ہیں۔ بقول شاد:

نمائش پہ اس بار بھی میرے شاگرد و احباب کچھ تبصرہ چاہتے ہیں
حیا خوردہ و فحش غزلوں کی بابت نیا رخ نیا زاویہ چاہتے ہیں
جو ہیں صرف کانوں میں کہنے کی باتیں بہ بانگ دہل برملا چاہتے ہیں

فنی نقطۂ نظر سے غور کریں تو ذیل کی باتیں کہا جا سکتی ہیں۔

۱)　شاد عارفی کو زبان و بیان پر زبردست قدرت حاصل ہے۔ نظم کے موضوع سے مناسبت رکھنے والے الفاظ کا دریا بہتا چلا آتا ہے۔ روایتی شعری محاورے سے اکتائے ہوئے قاری کو شاد کے ہاں بالکل نیا شعری محاورہ کھلی اور صاف ہوا میں لے آتا ہے۔ یہاں ایک بالکل نئی زمین، نیا آسمان، نیا منظر نامہ دامن کشِ دل ہوتا ہے۔ نیا شعری محاورہ، آسانی سے قابو میں نہیں آتا۔ موضوع اور زبان میں یک جائی بآسانی قائم نہیں ہوتی۔ شاد کے ہاں موضوعِ سخن، زبان اور اندازِ بیان میں زبردست یکجائی، نظم میں فنّی حسن کی بحالی کا سبب بنتے ہیں۔ یہاں زاہدانہ مزاج بھی کہہ اٹھتا ہے کہ......

''کلام کا فحش ہونا کوئی عیب نہیں۔''

۲) شمس الرحمٰن فاروقی نے تقلیل الفاظ کو شاعری کا خاص تفاعل بتایا ہے۔ ہم اسے شعر کا وصف خاص بھی کہہ سکتے ہیں۔ اس باب میں پوری اردو شاعری میں کوئی شاد عارفی کا ثانی نہیں ہے۔ وہ ایک مصرع میں ایک پیراگراف یا چند مکالمے، نظم کر دیتے ہیں۔ نظم 'شوفر' اِس مصرع سے شروع ہوتی ہے:

کھٹ! کھٹ! کون؟ صبیحہ! کیسے؟ یوں ہی کوئی کام نہیں

ان دس الفاظ میں، دس سے زیادہ جملے سمو دیے گئے ہیں۔ اسکی نثر کریں تو ایک پیراگراف میں جاتا ہے۔ چند اور مصرعے ملاحظہ فرمائیے۔ نظم بہتان کا پہلا شعر ہے:

ابھی شوروم جس نے چھوڑا ہے
شعر ہے بہترین جوڑا ہے

مصرع ثانی میں صرف پانچ لفظوں میں کتنی بڑی بات سمیٹ لی گئی ہے۔ شعر کے دو مصرع ہوتے ہیں۔ دونوں مصرعے ہم وزن ہوتے ہیں دونوں آپس میں معنوی ربط رکھتے ہیں۔ ایک دوسرے کی تکمیل کرتے ہیں۔ انھیں پڑھ کر زبان سے واہ نکل جاتی ہے وغیرہ وغیرہ۔ صرف دو لفظ شعر ہے، کہہ کر ایک پورا پیراگراف سمیٹ لیا گیا ہے۔

نمائش کا ایک پورا منظر ایک مصرع میں ملاحظہ فرمائیں:

یہ پیاسا وہ پانی حیا کچھ نہیں

اب آپ ہی اس کی نثر کیجئے اور داد دیجئے، تقلیل الفاظ اور زور بیان کی۔

۳) تیسری خوبی جو شاد کے یہاں فوراً متوجہ کرتی ہے وہ الفاظ کا دروبست ہے۔ پوری نظم میں ایک بھرتی کا لفظ نہیں ملتا۔ آپ ایک لفظ کو مصرع سے ہٹا نہیں سکتے۔ حشو وزوائد کہیں نام کو نظر نہیں آتے۔ شاعری میں عروضی پابندیاں ہوتی ہیں مگر شاعر کہیں عجز شاعرانہ کا شکار نہیں ہوتا۔

۴) عروضی اعتبار سے نہایت رواں دواں مصرعے نظم کرنا شاد عارفی کا کمال ہے۔ ان کے ہاں حروف علّت بھی کہیں دب کر بات نہیں کرتے۔ ہر مصرع، اپنی آن بان اور شان سے اپنے آہنگ کا اظہار کرتا ہے۔ پھر قافیہ کی مجبوری بھی کہیں پاؤں نہیں

www.urduchannel.in

پکڑتی۔ کہیں بیان لڑکھڑاتا نہیں ہے۔ یہ دیکھئے، نظم 'واپسی' میں پلیٹ فارم کی منظر کشی اور اپنی کیفیت کو کسی خوبصورتی سے نظم کیا ہے۔

کچھ تو میل نے میری ضد میں اپنی چال گھٹالی ہے
کچھ اسٹیشن پر پہلے سے آکر آفت ڈھالی ہے
جس ہرنی نے وحشت کم کی اس سے آنکھ لڑالی ہے
جانے والی پارسلوں کی ہر دفتی پڑھ ڈالی ہے
پھر بھی چہرے پر سرخی ہے دل الجھن سے خالی ہے
آج سفر سے وہ طنازہ واپس آنے والی ہے

ان مصرعوں میں بحر کی خوش آہنگی ہی نہیں، حرف وصوت کا آہنگ بھی دامنِ دل کھینچتا ہے۔ مصرع ہی نہیں لفظ بلکہ حروف صحیح اور حروف علّت بھی اپنا آہنگ لیے مصرعوں میں نغمگی اور لے کا حسن بڑھاتے ہیں۔

۵) شآد عارفی اور نظیر کو پڑھ کر میں اکثر سوچتا ہوں کہ نظم میں زور بیان، الفاظ کا دروبست، قافیہ کی خوش آہنگی کے بل پر راست بیانی، (تشبیہ، استعارہ، علامت وغیرہ کے بغیر بھی) حسن شعر کی تخلیق کر سکتی ہے۔ ہم ایسی نظموں کو منظوم بیان کہہ کر مسترد نہیں کر سکتے پھوہڑ شاعر، تک بندی کر کے واقعی تک بند محض ثابت ہوتا ہے، مگر اچھا فنکار منظوم بیانات میں بھی شعری حسن پیدا کر سکتا ہے۔ یہی شآد عارفی اور نظیر کا کمال ہے۔

شآد عارفی نے ہیئت کے تجربے بھی کیے ہیں۔ ان کی نظموں کے بند زیادہ تر تین مصرعوں پر مشتمل ہوتے ہیں۔ بعض نظموں میں بندوں میں مصرعوں کی تعداد کم وبیش بھی رکھی ہے۔ یہ ہیئتی تبدیلیاں نئے پن کا احساس جگاتی ہے۔ انھوں نے قطع اور رباعی کے روایتی فارم بھی برتے ہیں۔ مگر عصری تناظر میں کچھ نیا کر دکھانے کی خواہش اور کوشش قابل داد ہے۔ افق کے اس پار یکھنے کی ہر کوشش قابل داد ہوتی ہے۔

............☆............

ڈاکٹر ممتاز الحق

نئی غزل کے پیش رو

فانیؔ، اصغرؔ، حسرتؔ اور جگرؔ کو نئی غزل کا پیش رو کہا جاتا ہے۔ آزادی کے بعد جگرؔ تقریباً دس سال زندہ رہے۔ مگر حسرتؔ کا انتقال جلد ہی ہو گیا۔ کہا جاتا ہے کہ حسرتؔ نے غزل کا احیا کیا اور اسی بنا پر انھیں امام المتغزلین کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو حسرتؔ، جگرؔ، فانیؔ اور اصغرؔ میں سے کسی نے غزل کے روایتی فرسودہ ڈھانچہ کو نہیں توڑا۔ ان لوگوں نے لفظی و معنوی سطح پر کسی نئے تجربے کو راہ نہیں دی۔ بنے بنائے رموز و علائم کو ہی برتا اور غزل کسی نئی بلندی سے آشنا نہ ہو سکی جیسا کہ اسی دور میں اقبالؔ نے کیا تھا بقول ڈاکٹر مظفر حنفی:

''..........فانیؔ، حسرتؔ، اصغرؔ، جگرؔ وغیرہ غزل کو نئی تب و تاب دینے کی کوشش کر رہے تھے، لیکن دیرینہ روایات کی پاسداری بھی پوری احتیاط کے ساتھ کی جا رہی تھی۔

..........یقیناً یہ شعرا میرؔ، سوداؔ، مصحفیؔ اور آتشؔ وغیرہ کی کلاسیکیت کو بیسویں صدی میں دوبارہ زندہ اور متحرک کرنے کی کوشش کر رہے تھے ہر چند کہ ہمارے بیشتر نقادوں نے ان کے دور کو غزل کی تجدید و احیا کا دور قرار دے کر انھیں اپنے عہد کی غزل کے چار ستونوں کی حیثیت دی ہے، لیکن حق تو یہ ہے کہ ان کی مجموعی کاوشوں کو بھی جاں بلب بیمار کے سنبھالے

www.urduchannel.in

سے زیادہ اہمیت نہیں دینی چاہیے۔''(۱)

اس بحث سے قطع نظر کہ حسرتؔ کی غزلیں تخلیق کے اعلیٰ معیار پر پوری اترتی ہیں یا نہیں، ان کی غزلوں میں کچھ ایسی انفرادیت ضرور ہے جو انھیں اپنے دور سے الگ کرتی ہے اور مستقبل کی غزلوں پر ان کے عکس دیکھے جا سکتے ہیں۔ اول تو ان کے یہاں عشق ارضی سطح پر ہوتا ہے دوئم اردو غزل میں معشوق پہلی بار اپنا وجود رکھتا ہے تیسرے حسرتؔ کے یہاں عشق کا بیان براہ راست ہوتا ہے۔ حسرتؔ عشقیہ جذبات کو چھپانے یا اس پر شرمانے کی ضرورت محسوس نہیں کرتے۔

ہاں اس بات پر البتہ حیرت ہوتی ہے کہ حسرتؔ جیسا شخص جو سرتا پا سیاست میں ڈوبا رہتا ہے غزل میں اس کی سیاسی زندگی نمودار نہیں ہوتی۔ حالانکہ اس دور میں جگرؔ جیسا غیر سیاسی آدمی بھی خالص تغزل چھوڑ دیتا ہے اور ماحول سے مجبور ہو کر سیاسی و سماجی حالات کو اپنی غزلوں میں زیادہ سے زیادہ جگہ دینے لگتا ہے۔ پھر بھی کوئی بھی غزل گو اس دور میں ایسا نظر نہیں آتا جس نے غزل کے محدود دائرہ سے نکلنے کی کوشش کی ہو۔ اول ہیئت سب کے لیے رکاوٹ بنتی ہے ردیف قافیے کی پابندی کے ساتھ غزل کا سانچا، اتنا چھوٹا ہو جاتا ہے کہ بات کرنی مشکل ہو جائے۔ اب شاعر رموز و علائم کی تلاش میں نکلتا ہے اور اشاراتی زبان کا استعمال ناگزیر ہو جاتا ہے پھر وہی گل اور وہی بلبل، وہی صیاد اور وہی آشیانہ...... غزل کے روایتی جال سے بچ کر نکل جانا بڑا مشکل ہے۔ جدید غزل سے بحث کرتے ہوئے پروفیسر احتشام حسین نے غزل کی اسی خصوصیت کو بتایا ہے۔

''..........احساس کی کیفیاتی تبدیلی جو نئے عہد کے تقاضوں کے لحاظ سے فطری ہے، جدت اور شخصی ایج، ایجاد کی خواہش اور کوشش جو ہر فنکار میں پائی جاتی ہے (کامیاب نہ ہونے کی بات اور ہے) غزلوں میں بھی ظاہر ہوتی ہے لیکن اس کا مرکزی اور بنیادی نقطہ وہی رہتا ہے جو غزل کی روایت نے بنا لیا ہے اور ہر غزل گو آج بھی پلٹ پلٹ کر اسی جگہ آ جاتا ہے۔''(۲)

شمس الرحمٰن فاروقی نے غزل کی خوبصورتی کا اعتراف کیا ہے مگر ساتھ ہی وہ لکھتے ہیں:

''............خارجی حیثیت سے دیکھیے تو غزل کے بعد آنے والے قافیہ و ردیف غیر متوقع پیکر کی نفی کرتے ہیں اور داخلی حیثیت سے غزل کا صدیوں پرانا ضمیر نئے سے نئے شاعر کے ذہن میں ابال لائے بغیر دم نہیں لیتا۔''(۳)

غزل کی اس خصوصیت کی وجہ سے مختلف دور کے شعرا کے کلام میں بڑی یکسانیت ملتی ہے اور بیسویں صدی کے انقلابی دور کے شاعر بھی کچھ معنوں میں روایتی ہی رہتے ہیں وہ بھی غزل کی حد بندیوں کو توڑ کر باہر نہیں نکل پاتے۔ بیسویں صدی کے نصف اول کے تمام شعراء (اقبال کو چھوڑ کر) حسن وعشق کے روایتی مضمون اور اسی کے متعلقات پر ہی زیادہ زور صرف کرتے ہیں۔ غزل میں ایک خاص طرح کی نزاکت داخلیت، سوز وگداز پر اس حد تک زور دیا جاتا ہے کہ بعض موضوعات شجر ممنوعہ کی حیثیت اختیار کر لیتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بقول پروفیسر احتشام حسین ان کے عصری تقاضے بھی الگ ہوتے ہیں اور وہ جدّت اور ایجاد کی خواہش بھی رکھتے ہیں اور کوشش بھی کرتے ہیں اس کے باوجود ان کی غزل عصری مسائل اور سیاسی وسماجی حالات سے میل نہیں کھاتی۔

یہی وہ حقائق تھے جنھوں نے حالؔی، جوشؔ، عظمت اللہ، نظم طباطبائی، عندلیب شادانی اور کلیم الدین احمد جیسے کئی غزل کے معترضین پیدا کر دیے پھر بھی غزل کے سارے جغادری نقاد اپنے رویوں میں تبدیلی نہ لائے۔ دراصل لوگوں نے کبھی ان اعتراضات کو سنجیدگی سے نہیں لیا اور یہ سمجھ لیا کہ غزل کی دنیا جن بندھے ٹکے موضوعات تک محدود ہے اس میں ترمیم نہیں کی جاسکتی۔ اس لیے جب کسی نے کبھی راستے سے ہٹی ہوئی کوئی غزل پیش کرنے کی ہمت بھی کی تو لوگوں نے اس کی حوصلہ شکنی کی اور کبھی بھی اسے اچھا نہیں سمجھا۔

اس دور میں غزل کے چند ایسے شاعر نمودار ہوئے جن کی آواز دور سے پہچانی

www.urduchannel.in

جاسکتی تھی بقول شمس الرحمٰن فاروقی:

''یگانہؔ، فراقؔ اور شادؔ عارفی نے اپنی اپنی انفرادیت کو زیادہ استقلال بخشا انھوں نے غزل کے سرمائے سے ایسے الفاظ کم کرنے کی کوشش کی جو اردو غزل کی دونوں روایتوں میں مشترک تھے۔ جنھیں ترقی پسندوں نے بھی مسترد نہیں کیا تھا، لیکن جو اپنی معنویت کھو چکے تھے انھوں نے شاعرانہ موضوعات کی کچھ عمارت ڈھا دی اور یہ دکھایا کہ خلّاقانہ ذہن کے لیے ہر موضوع شعر کا موضوع بن سکتا ہے۔''(۴)

یہ آوازیں گزشتہ آوازوں سے کس طرح مختلف تھیں، عمیق حنفی نے اپنے مزاج کی تشکیل میں ان آوازوں کا کردار بیان کرتے ہوئے اپنے مضمون ''ایسے لوگ کہاں ہوتے ہیں'' بشمولہ ''ایک تھا شاعر'' میں لکھا ہے:

''............میں نے جب اردو شاعری کا مطالعہ سنجیدگی اور سوجھ بوجھ کے ساتھ شروع کیا تو یگانہؔ اور شادؔ عارفی ہی نے مجھے اردو شاعری بالخصوص غزل کی شاعری میں جدّت، بغاوت، تجربے اور ندرت کے امکانات کا قائل کیا اور وہ غزل جو کوٹھوں اور خانقاہوں اور درباروں کی رونق تھی پہلی بار ایک گھریلو مگر سوشل، زندہ دل، حاضر دماغ، حاضر جواب، ذی فہم، ذی علم، ذہین اور باشعور خاتون نظر آئی۔ یگانہؔ اور شادؔ عارفی کی شاعری کا تیکھا پن، تیور لہجہ، ان کی حق گوئی اور بیباکی، سماجی شعور، بات سے بات پیدا کرنے کا شوخ انداز اور حقائق سے پردہ اٹھانے کی شاعرانہ ادا مجھے بہت مزیدار معلوم ہوتی تھی اور جتنا غور کرتا تھا لطف بڑھتا جاتا تھا جدت کی راہ پر لگانے میں پہلا دھکا انھیں دو شاعروں کی شاعری نے مجھے دیا۔''(۵)

عمیق حنفی کی طرح دوسرے کئی شعرا نے یگانہؔ اور شادؔ عارفی سے اثر قبول کرنے کا اعتراف کیا ہے کچھ نقادوں نے یگانہؔ اور شادؔ کے ساتھ فراقؔ کا نام بھی ان شاعروں میں

شامل کیا ہے جن کی کاوشوں سے نئی غزل کی روایت آگے بڑھی۔ فراؔق کی غزل کے جائزہ لینے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا مجموعی آہنگ روایتی اور حسن وعشق کے دائرے میں محدود ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اپنے عہد کے دوسرے غزل کے شعرا کے مقابلے میں ان کے یہاں زیادہ تنوع، وسعت اور گہرائی ہے مگر جہاں تک غزل کے جدید رجحانات کی نشو ونما کا سوال ہے اس میں فراؔق کی غزل کا ہاتھ بہت زیادہ نہیں کہا جا سکتا۔ نئی غزل میں عہدِ جدید کی جو کشمکش اور نفسیاتی پیچیدگیاں ملتی ہیں،، ان پر فراؔق کی غزلوں کا اثر دیکھا جا سکتا ہے مگر غزل کے روایتی اشارات، زبان، لہجہ اور اسلوب وغیرہ کے لحاظ سے فراؔق کی غزلوں میں کوئی ایسی بات نہیں ملتی جس کا اثر نئی غزل نے قبول کیا ہو۔

شدید داخلیت کی وجہ سے غزل میں انفعالیت اور قنوطی لَے تیز ہوتی جا رہی تھی۔ دوسری جانب لکھنوی شاعری کے زیر اثر جو خارجیت اور جنسی لذت پرستی کا رجحان بڑھ رہا تھا اس سے غزل میں غیر صحت مند عناصر کافی آ گئے تھے۔ اس صورتِ حال سے نکلنے کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ کیوں کہ جیسا اوپر عرض کیا جا چکا ہے، غزل کی ہیئت اور اس کی روایت کسی نئے تجربے کی اجازت نہیں دیتی تھی۔ بیسویں صدی کے نصف اول میں کچھ شعرا نے اس روش کے خلاف چلنے کی کوشش کی۔ یگاؔنہ اور شاؔد عارفی نے اس انفعالیت سے غزل کو چھٹکارا دلانے میں اہم رول ادا کیا ہے۔ خلیل الرحمٰن اعظمی لکھتے ہیں:

> ’’بعض شعرا کا خیال تھا کہ غزل ضرورت سے زیادہ داخلی ہو جانے کی وجہ سے انفعالیت کا شکار ہو گئی ہے اس لیے اسے مردانہ لہجہ اور صلابت عطا کرنے کے لیے خارجیت کو بھی ایک حد تک اپنانا چاہیے۔ یگاؔنہ اور شاؔد عارفی نے اس عنصر کو ایک بار پھر اپنی غزل میں جگہ دی۔ یگاؔنہ اور شاؔد دونوں زبان وفن پر بڑی قدرت رکھتے تھے اور ان کی یہاں ایک طرح کی تلخی اور طنزیاتی روح ان کے مزاج کا فطری عنصر معلوم ہوتی ہے اس لیے انھوں نے اس خارجیت سے خاص کام لیا۔‘‘ (۶)

یگانہ اور شاؔد عارفی کے مردانہ لہجے نے غزل میں ایک نئی روح پھونکی اور اسے اپنے

www.urduchannel.in

ماحول اور معاشرہ سے ہم آہنگ کیا۔ دونوں نے غزل کی روایت سے بغاوت کی اسے زندگی کی حرکت اور توانائی سے آشنا کیا اور مصنوعی اور بے جان فضا سے چھٹکارا دلایا۔ نئی غزل کو جہاں تک متاثر کرنے کا سوال ہے اس پر یگاؔنہ کے اثرات سے انکار نہیں کیا جا سکتا مگر یگاؔنہ نئے ذہن کا زیادہ دور تک ساتھ نہ دے سکے۔ غزل کو ماحول اور معاشرہ سے ہم آہنگ کرنے کے سلسلے میں شاؔد عارفی کا کارنامہ یگاؔنہ کے مقابلے میں کہیں زیادہ ہے۔ شاؔد عافی کی غزل خیالات کے لحاظ سے بھی، لہجے اور اسلوب کے لحاظ سے بھی اپنے پیشرو شعراء کی غزل سے کافی مختلف تھی۔ شاؔد عارفی نے اپنی غزل میں غیر رسمی اور بے تکلفی کی فضا پیدا کی اور اسے عام بول چال کی زبان سے قریب کیا اس کے اثرات نئی غزل پر کافی دور تک دیکھے جا سکتے ہیں۔ شاؔد عارفی نے نئی غزل کو کس طرح متاثر کیا اس کا اعتراف نقادوں اور شاعروں نے کھلے ذہن سے کیا ہے۔ ڈاکٹر مظفر حنفی لکھتے ہیں:

> ’’شاؔد عارفی کے بعد آنے والی شاعروں کی پوری نئی نسل نے ان سے اثر قبول کیا ہے اور یہ سعادت ان کے دو ایک معاصروں کی ہی نصیب ہوئی ہے۔‘‘ (۷)

شمس الرحمٰن فاروقی:

> ’’شاؔد عارفی بہرحال ایک عہد ساز شاعر تھے، ان کے بعد آنے والے ہر شاعر بالخصوص نئی غزل کے ہر شاعر نے ان سے اکتسابِ فیض کیا ہے۔‘‘ (۸)

وہ (شب خون) کے ایک دوسرے شمارے میں لکھتے ہیں:

> ’’شاؔد کی طنزیہ غزل ہی نے جدید غزل کی راہ ہموار کی۔‘‘ (۹)

ماہنامہ کتاب میں وہاب اشرفی نے لکھا ہے:

> ’’شاؔد عارفی کی کھردری طنز نگاری موجودہ دور کے احساس اور طرز احساس کی نمائندگی کرتی ہے۔‘‘ (۱۰)

پاکستانی نقاد ڈاکٹر حنیف فوق نے شاؔد کی طنزیہ شاعری کے متعلق لکھا ہے:

"شاد عارفی کے اثرات صرف مظفر حنفی کے یہاں ہی نہیں (کہ وہ شاد کے شاگرد ہیں) بلکہ سلیم احمد اور مظفر علی سید کی غزلوں میں دیکھے جا سکتے ہیں اگرچہ مظفر حنفی نے سماجی طنز کو دوسروں کے مقابلے میں زیادہ صفائی سے پیش کیا ہے لیکن شاد عارفی کے اشعار میں جو نکیلی معنی خیزی اور دھار جیسی کیفیت ہے وہ ان میں سے کسی کے یہاں نہیں ملتی۔" (۱۱)

خلیل الرحمٰن اعظمی نے بھی نئی غزل پر شاد کے اثرات کی نشاندہی کی ہے وہ لکھتے ہیں:

"ہمارے جدید غزل گویوں میں سلیم احمد اور ظفر اقبال نے یگانہ اور شاد کی خصوصیت کو اپنانے کی کوشش کی ہے۔" (۱۲)

خلیل الرحمٰن اعظمی نے ہماری زبان میں بھی لکھا:

"برہمی اور تلخی کی یہ لے اب نئی غزل میں اور بھی اونچی ہوتی جا رہی ہے آج کی غزل نہ عاشقانہ ہے نہ ماہرانہ اور نہ ہی اس طرح کی فاسقانہ جو داغ اور میر کے اثر سے ہمارے یہاں رائج ہوئی تھی، بلکہ یہ غزل اپنے زمانے میں آگہی اور بصیرت اور آج کے انسان کی مضطرب اور بے قرار روح کو پیش کرتی ہے اگر آج کی نئی غزل کا تفصیلی مطالعہ کیا جائے تو اندازہ ہو سکتا ہے کہ اس پر شاد عارفی کا اثر بھی خاصا نمایاں ہے۔" (۱۳)

اپنی ابتدائی دور کی شاعری کے متعلق شاد عارفی فرماتے ہیں:

"جوانی میں شاعری کا وہی رنگ تھا جو اس زمانے میں چالو تھا، مگر میں نے اس وقت بھی رقیب و قیب کی جھنجھٹ کبھی مول نہیں لی اور قریب قریب وہ انداز بیان بھی چھوڑ دیا جو اس وقت رائج تھا۔" (۱۴)

شاد عارفی کی شاعری کی ابتدا جیسا کہ انھوں نے فرمایا ہے روایتی طرز کی شاعری سے ہوئی، مگر اس دور کی ان کی عاشقانہ غزلیں بھی اپنا ایک قطعی مختلف گھریلو حسن لے کر سامنے آتی ہیں اور غزل کی پرانی روایات کی جگہ نئی روایات قائم کرتی ہیں ان کی اس دور کی

www.urduchannel.in

غزلیں بھی مواد اور اسلوب ہر دو لحاظ سے منفرد ہیں۔

شاد عارفی کے زمانے میں گھسی پٹی علامات سے مزین جو رسمی شاعری ہو رہی تھی اس سے دامن بچانا آسان نہیں تھا۔ ان کی شاعری کا رُخ کس طرح بدلا وہ رقم طراز ہیں:

"عربی ادب سے واسطہ پڑنے پر معلوم ہوا کہ غالب، میر، سودا، حالی، اکبر، جرأت اور ڈاکٹر اقبال سے ہٹ کر اردو ادب میں دھول اُڑتی ہے۔ واقعیت کا فقدان طبیعت پر کھلنے لگا اس لیے اب جو چل مرے خامہ بسم اللہ کہہ کر اپنے لیے نئی راہ نکالی تو ثابت ہوا کہ خوب صورتی کے ساتھ واقعیت کو مصور کرنا آسان کام نہیں۔ مگر ڈھونڈنے سے خدا ملتا ہے۔" (۱۵)

غزل کو رسمی مضامین اور اسلوب سے چھٹکارا دلانے کے لیے پہلا قدم واقعیت نگاری کا تھا مگر یہ کام آسان نہیں۔ برہنہ گفتاری سے شاعری کا وقار کم ہوتا ہے۔ بعض مرتبہ لکھنؤ کی خارجیت اپنا جلوہ دکھا جاتی ہے اور کبھی حالی کا سپاٹ انداز بیاں غزل کو بے لطف بنا دیتا ہے۔ ایسے میں شاد کے لیے بھی یہ کام بڑے خطرے کا تھا مگر شاد اجتہادی ذہن کے مالک تھے۔ وہ گل و بلبل کی بے جان شاعری سے مطمئن نہیں ہو سکتے تھے اس لیے وہ نئے راستے پر چل پڑے۔

ان کی غزلیں روایتی عاشقانہ غزلوں کے برعکس ایک مختلف گھریلو حسن رکھتی ہیں۔ بیسویں صدی کے ہندوستانی مسلم متوسط طبقے کے عاشق و معشوق کی نفسیاتی کیفیتوں کی عکاسی ان غزلوں میں جس طور پر ہوتی ہے اس دور کے کسی شاعر سے نہ ہو سکی ہے۔ شاد کے یہاں عاشق و معشوق ایک دم بدلے ہوئے نظر آتے ہیں۔ روایتی عشق کا یہ انداز کہ محبوب ظالم ہے ستم پیشہ ہے اس کے باوجود اس کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنا آدابِ عشق میں شامل ہے مگر شاد کے یہاں غالب کی خودداری ملتی ہے۔ غزل کا عاشق وفا کا امتحان دیتا ہے مگر شاد محبوب کا امتحان لیتے ہیں۔ شاد کی غزلوں میں آتش کا شوخ لہجہ، احساس کی گرمی، جسم کی آنچ، حسن کی چلتی پھرتی تصویر اور عشق کی حقیقی کیفیات بھی ملتی ہیں۔ ان غزلوں میں

واقعیت، خلوص اور بے جھپک قسم کا طرز اور بے تکلفی کی فضا اسے رسمی غزل سے الگ منفرد رنگ عطا کرتی ہے۔

دیر سے پہنچنے پر بحث تو ہوئی لیکن
اس کی بے قراری کو حسبِ مدعا پایا
....
کہتے ہیں پوچھا گیا جب چھپ کے رونے کا سبب
دردِ دل کا کام اس نے دردِ سر سے لے لیا
....
سانولا رنگ کشیدہ قامت
نہ پری ہے نہ کوئی حور ہے وہ
....
بھرا گھر جس کی شوخی اور طرّاری کا قائل ہے
مجھے دیکھا کہ اس پر ہو گئی سنجیدگی طاری
....
مسکرا دیں گے مرا نام کوئی لے دیکھے
وہ کسی فکر میں بیٹھے ہوں کسی کام میں ہوں

حسن وشوق کے یہ سادہ واقعات زندگی کی حرارت سے بھرپور ہیں روایتی غزل میں شاعر کی زندگی اور اس کے ذاتی تجربات کی گرمی کچھ اس درجہ جامد ہو جاتی ہے کہ اس کا پتہ نہیں چل پاتا۔ پہلی بار حسرتؔ کے یہاں اس گرمی کا کچھ اندازہ ہوا تھا، مگر حسرتؔ بھی اگلی نسل کو زیادہ متاثر نہ کر سکے۔ ڈاکٹر مظفؔر حنفی اس کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''امام کے لیے مقلدین ضروری ہوتے ہیں، لیکن نگاہِ غور بیں سے حسرتؔ کے فوراً بعد آنے والی نسل کا جائزہ لیجیے تو پتہ چلتا ہے کہ کلام حسرتؔ نے اس حد تک اگلی نسل کو متاثر نہیں کیا جتنا کہ شادؔ عارفی کی شاعری نے نئی نسل پر اپنا اثر قائم کیا۔''(۱۶)

حسرتؔ اور شادؔ کی عاشقانہ غزلوں میں بڑا فرق بھی ہے۔ حسرتؔ کا عشق سیدھے

www.urduchannel.in

سادے آدمی کا عشق ہے اسی طرح ان کی محبوبہ میں بھی کوئی خاص کشش یا شوخی نہیں نظر آتی۔ حسرت کے اندازِ بیاں اور اسلوب میں بھی کوئی ندرت نظر نہیں آتی اور ان کے یہاں عاشق و معشوق کے نفسیاتی تجزیے بھی نہیں ملتے۔ اس کے بر خلاف شادؔ کی غزلوں میں جو عاشق یا معشوق نمودار ہوتا ہے وہ عام غزل کے عاشق یا معشوق سے بڑی حد تک مختلف اور منفرد ہے۔ ان کے یہاں حسن و عشق کی پیچیدہ کیفیات اور نفسیات کا بیان بڑے منفرد انداز سے کیا گیا ہے۔ آل احمد سرور نے ان کی شاعری کے اس پہلو کو اجاگر کرتے ہوئے لکھا ہے:

''شاد کے یہاں صرف سماج کی خرابیوں پر طنز ہی نہیں ہے محبت اور نفسیات انسانی کی سچی تصویریں بھی ہیں اور انھیں ایک ایسے تیور اور بانکپن سے پیش کیا گیا ہے کہ فوراً ذہن پر نقش ہو جاتی ہیں۔''(۱۷)

شادؔ عارفی کا کہنا ہے کہ جن شاعروں کے پاس اپنا کوئی تجربہ نہیں وہ دوسروں کے تجربات کی عکاسی کرتے ہیں اور اس لیے ان کے یہاں بناوٹ اور تصنع ملتا ہے۔ اس میں تجربے کی گرمی اور احساس کی صداقت نہیں ہوتی:

دوسروں کے واقعاتِ عشق اپناتے ہیں وہ
جن سخن سازوں کی اپنی داستاں کوئی نہیں

شادؔ کے پاس عشق کا حقیقی تجربہ بھی تھا اور سب سے بڑی بات یہ تھی کہ وہ ایک فنکار کی طرح سچ کو سچ کہنے کا حوصلہ بھی رکھتے تھے۔ ان کی محبوبہ ایک زندہ دل، حاضر دماغ، با شعور اور چنچل شخصیت کی مالک ہے۔ عام طور پر اردو غزل مثالی حسن کا نمونہ پیش کرنے پر اکتفا کرتی ہے۔ معشوق کا کردار یہاں پورے طور پر نمایاں نہیں ہونے پاتا مگر شادؔ کے یہاں حسن کی بڑی واضح اور منفرد تصویر ملتی ہے:

دیکھ کر مجھ کو مسکرا دیں آپ
اس قدر احتیاط کافی ہے

تو وہ انداز جیسے میرا گھر پڑتا ہو رستے میں
پئے اظہار ہمدردی وہ جب تشریف لائے ہیں

....

بھولی سی ہم مکتب کوئی کوئی سہیلی خالہ زاد
ان کے ہاتھوں خط بھجواتے میں ڈرتا ہوں لیکن وہ

....

کام کی شے ہیں کروٹن کے یہ گملے اے شاد
وہ نہ دیکھے مجھے میں اس کا نظارا کر لوں

....

لکھ کر میرا نام اے شاد
اس نے بھیجا ہے رومال

....

بدلی ایسی زلف کی لٹ میں شامل کر کے الجھن کوئی
میری خاطر ناپ رہا ہے بال سکھانے آنگن کوئی

....

شاد کے ان اشعار میں زندگی کے چلتے پھرتے نقش نظر آتے ہیں۔ عام بات کو نئے زاویے سے کہنے میں انھیں کمال حاصل ہے۔ ان کے یہاں محاکات، معاملہ بندی، واقعہ نگاری سبھی کچھ ہے مگر نئے انداز کے ساتھ۔ ایسے لفظ جن کا غزل میں استعمال کرنا ممکن نہ تھا (کروٹن کے گملے، آنگن ناپنا، دُلائی، الغرضی، پے چل، ناخن کاٹنا، بابو جی، ڈاک وغیرہ) شاد نے بڑی بے تکلفی سے انھیں اپنی غزلوں میں برتا ہے۔ ان کی یہی بے تکلفی، لفظوں کے ساتھ جمہوری برتاؤ، غیر انفعالی کیفیت، غزل میں ایسے مضامین برتنا جواب تک ممنوع تھے وغیرہ کے گہرے اثرات نئی غزل پر دیکھے جاسکتے ہیں:

سوتے ہی اپنے بستر پر
میں ہوتا ہوں اس کے گھر پر

....

www.urduchannel.in

ذرا خاموش رہنے دے کہ ذہنی طور پر ہمدم
ابھی واپس نہیں آیا ہوں میں اس کے شبستاں سے

....

جیسے کسی حسین کے ہونٹوں پہ سرد آہ
پھولوں کی پتیوں پہ کرشمے ہوا کے دیکھ

....

دلنوازی جو بھرے گھر میں نہیں بن پڑتی
رُخ محبوب پہ گیسو ہی بکھر پڑتا ہے

شاد عارفی کی عشقیہ غزلیں ہوں یا طنزیہ شاعری، جو بات انھیں سب سے منفرد مقام عطا کرتی ہے وہ ان کا لہجہ ہے۔ ان کی غزلوں کا حقیقی لطف اسی وقت اٹھایا جاسکتا ہے جب انھیں خاص لہجے میں پڑھا جائے۔ اکثر وہ مکالماتی انداز بھی اپناتے ہیں وہ بیک وقت استعجابیہ، استہزائیہ یا استفہامیہ لہجہ اختیار کر سکتے ہیں:

ڈاک سے بھیجی خوشبو والے خط پر خط آئے تو اک دن
پوچھے گا خط لانے والا، بابو جی یہ کس کا خط ہے

....

حسیں ہو تم، آپ کی بلا سے، پری ہو تم، آپ کی دعا سے
جواب ملتا ہے سخت لہجے میں ان سے جو بات پوچھتا ہوں

....

شاد عارفی کی عاشقانہ غزلوں کے اس بدلے ہوئے انداز کا تجزیہ کرتے ہوئے ڈاکٹر مظفر حنفی لکھتے ہیں:

''دراصل شاد عارفی نے روایتی غزل کے مروجہ رموز وعلائم سے روگردانی کرتے ہوئے غزل کی مخصوص رمزیت اور اشاریت سے دانستہ پہلوتہی برتی اور موضوع کی براہ راست ترجمانی کا فن اختیار کیا اس طرح وہ بڑی فراخ دلی کے ساتھ غزل کی مروّجہ علامتوں، تمثیلوں، کنایوں اوران سے وابستہ ذہنی متعلقات اور تصوراتی لوازمات سے دست بردار ہو گئے۔ نتیجے

کے طور ان کی غزل کسی حد تک ان لوازمات کی پیدا کردہ پہلو داری اور
اس پس منظر کے ایک حصے سے محروم بھی ہوگئی جو غزل کی روایت تمام
اشعار کو فراہم کرتی ہے۔ نیز وہ شے بھی ان کے یہاں کم نظر آتی ہے جسے
اساتذہ خالص تغزل کا نام دیتے ہیں۔‘‘(۱۸)

ان کی عشقیہ غزل میں جنسیت اور ارضیت کے باوجود ہوسنا کی نہیں ملتی ساتھ ہی وہ ستم پیشہ معشوق کے سامنے سرِ تسلیم بھی خم نہیں کرتے۔ ان کی محبت میں خودداری ہے وقار ہے:

ذکر قرب دوست ہی میرے لیے کافی ہے شادؔ
جب کہ ارباب غزل کہتے وہ ہم آغوش تھا

....

یہ گدگدانا یہ بوسۂ لب اسی کا ردِ عمل سمجھیے
ابھی جو ارشاد ہو رہا تھا کہ ہم سے کیوں کوئی بولتا ہے

....

جھٹک کے ہاتھ سے دامن کو جانے والے
ترے خیال کا دامن بھی چھوڑتا ہوں میں

....

اپنی اس دور کی شاعری کو شادؔ نے ریشمین شاعری اور اس دور کو ’جنون لب ورخسار‘ کا دور کہا ہے۔ ڈاکٹر مظفر حنفی کا خیال ہے کہ یہ دور تقریباً ۱۹۴۲ء تک چلا اس کے بعد شادؔ عارفی شعلہ بیانی کے دور میں داخل ہوتے ہیں۔ طنز کی جانب وہ کیسے آئے دیکھیں:

بے کسوں پر ظلم ڈھا کر ناز فرمایا گیا
طنز کی جانب میں خود آیا نہیں لایا گیا

شادؔ عارفی کی طنزیہ غزلوں میں ناآسودگی اور بیزاری ناموافق حالات کی پیدا کردہ ہے۔ شادؔ عارفی نے ہمیشہ اینٹ کا جواب پتھر سے دیا۔ وہ زندگی کے مقابلے میں پینترہ بدل کر کھڑے ہوگئے۔ انھوں نے نہ صرف اپنے قلم کو ڈھال بنالیا بلکہ اس سے تلوار کا کام بھی لیا:

اس نے جب سو تیر چلائے
میں نے ایک غزل چپکا دی

www.urduchannel.in

میں دنیا پر طنز کروں گا
دنیا میرے کیوں درپے ہو

ڈاکٹر مظفر حنفی نے لکھا ہے:

’’تابڑ توڑ مشکلات کے پہاڑ شادؔ عارفی پر ٹوٹے تو غالبؔ کی طرح آباواجداد کی سپہ گری پر ناز کرنے والا یہ پٹھان شاعر بھی لچکنے کی جگہ اپنی انا کو بلند کرتا چلا گیا اور اپنے قلم، زبان اور طرزِ بیان سے تیغ جوہر دار کا کام لے کر مخالف اور منفی قوتوں پر طنز کے بے محابا وار کرنے لگا۔‘‘(۱۹)

اردو میں طنز و مزاح کا چلن عام رہا مگر خالص طنزیہ شاعری کم ملتی ہے ڈاکٹر مظفر حنفی نے شادؔ کا مقابلہ ماضی اور حال کے تمام طنز و مزاح کے شاعروں سے کر کے یہ فیصلہ کیا ہے:

’’بحیثیت مجموعی اردو کے کسی شاعر کو ان معنوں میں طنز نگار قرار نہیں دیا جا سکتا جن معنوں میں شادؔ نے کلیتاً طنز گوئی شعار کی اور اس کو اپنا فن قرار دیا۔‘‘(۲۰)

شادؔ عارفی نے طنزیہ اسلوب شعوری طور پر اختیار کیا تھا اس کی تائید ان کے اشعار سے ہوتی ہے:

بیان کی صداقتوں کو نذر مصلحت نہ کر
وہی تو گفتنی ہے اصل میں، جو گفتنی نہیں

....

جہاں تک ہماری غزل جائے گی
تغزل کے معنی بدل جائے گی

....

وہیں سے شعر میں برجستگی نہیں رہتی
جہاں سے حال چھپانے کی بات کرتا ہوں

جس طرح شادؔ کی عشقیہ شاعری حقیقت پر مبنی ہے اسی طرح ان کی طنزیہ شاعری میں بھی ان کی زندگی کے نجی تجربے ملتے ہیں یہاں انھوں نے اپنے تجربات کو عمومیت کا

رنگ عطا کیا ہے یہ ان کی بڑی خوبی ہے۔ ان کے مزاج کے خلاف اگر کوئی بات ہوتی ہے تو وہ خاموش نہیں رہ سکتے۔ اس لیے شاؔد کا طنز حد درجہ بھرپور اور شدید ہوتا ہے۔

بے کسی میں سابقہ پڑنے پر اندازہ ہوا
آپ کو میں دوست سمجھا تھا بہت دھوکا ہوا

....

میں اپنے لفظ واپس لے رہا ہوں
یہ رہزن تھا میں سمجھا رہنما ہے

....

زندگی پر دلیر ہیں وہ لوگ
مقبروں سے جو لے رہے ہیں خراج

....

جب چلی اپنوں کی گردن پر چلی
چوم لوں منہ آپ کی تلوار کا

....

کہنے والوں نے کہا ظلِ الٰہی جن کو
ہم انھیں سایۂ دیوار نہیں کہہ سکتے

شاؔد عارفی زندگی بھر سماج کے اس تضاد سے نبرد آزما رہے دوسری سمت ادب و شاعری میں جاگیردارانہ نظام کی جو خرابیاں جڑ پکڑ چکی تھیں شاؔد نے ان کے خلاف بھی علمِ بغاوت بلند کیا۔ یہی سبب ہے ان کے یہاں صرف خیالات میں تبدیلی کا احساس نہیں ہوتا ہے زبان اور اظہارِ بیان بھی کافی بدلا ہوا ہے اب تک جو خیال اور موضوع شاعری، خاص طور پر غزل کے لیے شجر ممنوعہ کی حیثیت رکھتے تھے شاؔد نے انھیں برتا۔ اسی طرح بول چال کے جو الفاظ غزل کے منافی سمجھے جاتے تھے انھیں بھی شاؔد نے اپنی شاعری میں جگہ جگہ استعمال کیا۔ ظ۔ انصاری نے لکھا ہے:

''جن خوبیوں سے ان کے یہاں نئے پن کا احساس ہوتا ہے وہ صرف خیالات کی تازگی نہیں بلکہ الفاظ وتراکیب سے ان کا جمہوری برتاؤ بھی

www.urduchannel.in

ہے۔''(۲۱)

جس کی لاٹھی اس کی بھینس ہے آج
کیا اسی کو کہیں گے جنتا راج

....

سینک سکتے ہیں آپ بھی آنکھیں
جل رہے ہیں نشیمنوں کے الاؤ

....

تک رہے ہیں بعض احمق آج تک
آسرا گرتی ہوئی دیوار کا

....

غریبی جن کے لتّے لے گئی تا حد عریانی
جو میں ان عصمتوں کو سیم تن کہہ دوں تو کیا ہوگا

مواد اور اسلوب دونوں لحاظ سے شاؔد عارفی نے اپنی غزل میں جو تبدیلی پیدا کی اس کے اثرات نئی غزل پر دیکھے جا سکتے ہیں۔

......☆......

حوالے

(۱) شاد عارفی شخصیت اور فن: ڈاکٹر مظفر حنفی، ص ۸۶
(۲) جدید غزل چند اشارے: احتشام حسین ('فنون' غزل نمبر) ص ۲۵
(۳) مضطرب لمحوں کا سفر: شمس الرحمٰن فاروقی، خشت دیوار: زبیر رضوی۔ ص ۸۳
(۴) ہندوستان میں نئی غزل: شمس الرحمٰن فاروقی ('فنون' لاہور، جدید غزل نمبر حصہ اول) ص ۱۳۶۔۱۳۴
(۵) ایک تھا شاعر: شاد عارفی فن اور شخصیت، مرتب: مظفر حنفی۔ ص ۲۲۶۔۲۲۵
(۶) جدید غزل: خلیل الرحمٰن اعظمی ('فنون' لاہور جدید غزل نمبر حصہ اول) ص ۷۲
(۷) شاد عارفی: شخصیت اور فن، مظفر حنفی، ص ۳۷۸
(۸) ماہنامہ 'شب خون' الہ آباد، اگست ۱۹۶۹ء، ص ۷۷

(۹) ماہنامہ ’شب خون، الہ آباد، جولائی ۱۹۶۹ء، ص ۷۷

(۱۰) ماہنامہ ’کتاب‘ لکھنؤ فروری ۱۹۷۰ء، ص ۷۳

(۱۱) ’فنون‘ لاہور۔ جدید غزل نمبر، ص۱۱۶

(۱۲) ’فنون‘ لاہور۔ جدید غزل نمبر حصہ اول ص۷۳

(۱۳) ہفت روزہ ’ہماری زبان‘ علی گڑھ، ۱۸اگست ۱۹۶۸ء، ص۹

(۱۴) پیش لفظ ’رخ وگیسو‘: شاد عارفی (نثر وغزلدستہ: مرتبہ: مظفر حنفی) ص۱۴

(۱۵) سفینہ چاہیے: شاؔد عارفی (مرتبہ سلطان اشرف) ص۱۵

(۱۶) شاد عارفی: شخصیت اور فن: ڈاکٹر مظفر حنفی، ص۹۰

(۱۷) میرا صفحہ: آل احمد سرور (ہفت روزہ ’ہماری زبان‘ علی گڑھ ۱۸/اپریل ۱۹۶۸ء) ص۱۲

(۱۸) شاد عارفی: شخصیت اور فن: ڈاکٹر مظفر حنفی، ص۹۹

(۱۹) شاد عارفی: شخصیت اور فن: ڈاکٹر مظفر حنفی، ص۱۱۵

(۲۰) شاد عارفی: شخصیت اور فن: ڈاکٹر مظفر حنفی، ص۱۳۲۔۱۳۳

(۲۱) ایک تھا شاعر: مرتب ڈاکٹر مظفر حنفی، ۱۹۶۷ء۔ ص۳۴

www.urduchannel.in

ڈاکٹر نصرت جہاں

شاؔد عارفی

(پیدائش: ۱۹۰۰ء۔ وفات: ۱۹۶۴ء)

شاؔد عارفی کی ترقی پسندی دوسرے ترقی پسند شعراء کی طرح باضابطہ اور نظریاتی حصار میں مقید نہیں ہے ان کی ترقی پسندی خودرو تھی۔ انھیں اشتراکیت سے لگاؤ ضرور تھا مگر وہ اس کی خباثتوں سے متنفر تھے۔ انھوں نے راہی عارفی کے نام ایک مکتوب میں خود ہی لکھا ہے:

’’کمیونزم کے اندر بہترین اسلامی تصورات لے کر اس میں کچھ خباثتیں شامل کرلی ہیں۔‘‘

شاؔد ہر چند کہ نماز روزہ کے ایسے پابند نہ تھے مگر کٹر حنفی مسلمان تھے اور اس کا اعتراف بھی انھوں نے خود نیاز فتح پوری کے نام ایک خط میں کیا ہے:

’’رامپور کے بیشتر جاہل پٹھانوں کی طرح کٹر حنفی ہوں۔‘‘

یہاں جاہل پٹھان فخریہ لکھا گیا ہے۔ شاؔد کو اس بات پر بڑا ناز تھا کہ وہ باپ اور ماں دونوں رشتوں سے کھرے افغانی ہیں اور یہ بھی کہ ان کے ساتھ چچا اب بھی افغانستان میں رہتے ہیں لہٰذا ان کے مزاج کا اکھڑپن، معمولی وغیر معمولی باتوں پر ان کا خوش یا خفا ہو جانا بالکل نسلی اور وہبی معاملہ تھا۔ چنانچہ تمام عمر ترقی پسندوں اور غیر ترقی پسندوں سے ان کا جھگڑا برقرار رہا۔

شاد کے تعلق سے مظفر حنفی اور مظہر امام دونوں کو ناقدین ادب سے یہ شکایت ہے کہ شاؔد پر منصفانہ نگاہ نہیں ڈالی گئی اور ان کے مرتبۂ شاعری کے تعین میں ناانصافی کی گئی ہے، لیکن اس خیال کو بہت حد تک درست نہیں مانا جا سکتا کیوں کہ مظفر حنفی نے اپنی کتاب ''شاد عارفی : شخصیت اور فن'' میں درجنوں نامور نقادوں، محققوں، شاعروں اور مدیروں کے نام گنوائے ہیں جن میں سجاد ظہیر، ظ۔ انصاری، مجروح سلطان پوری، احتشام حسین، مجنوں گورکھپوری، کلیم الدین احمد، فراق گورکھپوری، اختر انصاری، معین احسن جذبی، جیسے ترقی پسندوں اور جوش ملیح آبادی، محی الدین قادری زور، نیاز فتح پوری، رشید احمد صدیقی، اثر لکھنوی، حامد حسن قادری، جگر مرادآبادی، امتیاز علی خاں عرشی جیسے کلاسیکی ادب کے شیدائیوں کے علاوہ نسبتاً نئی نسل کے لوگوں میں صہبا لکھنوی، خلیل الرحمٰن اعظمی، سلیمان اریب، جون ایلیا، سلیم احمد اور سلیم الرحمٰن جیسے لوگوں کی ایک طویل فہرست ہے جن سے شاد عارفی کے قریبی تعلقات رہے ہیں۔ یہاں یہ نکتہ ذہن نشین رہے تو اچھا ہے کہ شعر وادب میں تعین قدر کے پس پردہ ایک قدر وہ بھی ہوتی ہے جس کی تعریف یا جس کا تعین بہت دشوار ہے۔ بقول خلیل الرحمٰن اعظمی:

''اردو کے چند اہم اور بڑے شعراء کی طرح شاد عارفی بھی کلیات کے شاعر تھے اور ان کے فن کا دائرہ اس قدر وسیع ہے کہ جب تک سارا کلام سامنے نہ ہو ان پر تنقید و تبصرے کا حق ادا نہیں ہوتا ہے اور نہ ان کے موضوعات اور اسالیب کے ساتھ پورا انصاف کیا جا سکتا ہے۔''

ویسے حتی الامکان ڈاکٹر مظفر حنفی نے اپنے قابل قدر استاد شاؔد عارفی کا شناخت نامہ مہیا کرنے کی بھرپور کوشش کی ہے۔ انھوں نے شاؔد کے بارے میں لکھتے ہوئے درست کہا ہے:

''شاؔد عارفی چومکھے فن کار تھے۔ ان کی طبع رواں، نظم و نثر، تخلیق و تنقید، سنجیدہ اور غیر ثقہ مضامین، غرض کہ کسی بھی میدان میں بند نہیں تھی۔''

اور جب طبع رواں کا یہ عالم ہو تو کسی بھی نقاد کے لیے محاکمہ بہت مشکل ہو جاتا

www.urduchannel.in

ہے۔ چنانچہ احمد ندیم قاسمی کا المیہ بھی یہی ہے کہ یہ کہنا مشکل ہے کہ ندیم بڑا شاعر ہے یا نقاد یا افسانہ نگار۔ پھر شاؔد کا اسلوب بھی وقت کے ساتھ ساتھ بدلتا رہا ہے اور اپنی بوقلمونی دکھاتا رہا ہے جس کا ذکر کرتے ہوئے انھوں نے لکھا ہے:

''میں ہر دس سال کے بعد اپنے کلام پر نظر ثانی کرتا ہوں اور شعور کی رہنمائی میں کلام کو کاٹ چھانٹ کر خوب سے خوب تر بنانے کی کوشش برابر کرتا رہتا ہوں۔''

ڈاکٹر مظفر حنفی نے شاؔد عارفی کی شاعری کو بہ اعتبار موضوعات و اسالیب دو ادوار میں تقسیم کیا ہے:

''شاد عارفی کی شاعری بہ اعتبار موضوعات و اسالیب دو ادوار میں تقسیم کی جا سکتی ہے۔ پہلا دور وہ ہے جب شاد ''ریشمیں شاعری'' کا شوق فرماتے تھے اس دور کو وہ رنگین نوائی کا دور کہتے ہیں اور دوسرے دور کو عہدِ شعلہ بیانی سے تعبیر کرتے ہیں۔''

مظفر حنفی کی اطلاع کے مطابق شاؔد کی ریشمیں شاعری کا دور ۱۹۴۱ء تک کا ہے اور ۱۹۴۲ء سے ان کی شعلہ بیانی کی ابتدا ہوتی ہے، مگر ایسا نہیں ہے کہ ان دونوں شعری رویوں کے درمیان بالکل خط تنسیخ کھینچ لیا ہو۔ شاؔد ہمیشہ اپنے کلام میں ردوبدل کرتے رہتے تھے اور شعلہ بیانی کے دور میں بھی عشقیہ اشعار سے دلچسپی رکھتے تھے۔ ایک حقیقت یہ بھی ہے کہ شاد کی شاعری میں حد درجہ تنوع ہے۔ غزل کا دائرہ بہت محدود ہے۔ یہ ایک نازک مزاج صنف سخن ہے۔ اس کی اپنی ادائیں اور تقاضے ہیں۔ ان سب پابندیوں کا خیال رکھتے ہوئے اس میں رنگا رنگی پیدا کرنا قدرتِ کلام کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ شاؔد کے یہاں یہ وصف تھا۔ انکا خزانۂ الفاظ بھی اچھا خاصا تھا۔ غزل کی بندھی ٹکی لفظیات کے پابند وہ کبھی نہیں رہے بلکہ غیر متغزلانہ الفاظ کو بھی نادر کلامی کا جوہر عطا کر دیا ہے۔ ندرتِ کلام کے وہ شیدائی تھے:

''ندرت شعر کی جان ہے۔ میں کسی بھی رنگ میں ندرت ادا کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتا۔''

مظفرحنفی شاد عارفی کی متنوع شاعری کے تعلق سے لکھتے ہیں:

’’غزل کے موضوعات کا دائرہ بے حد محدود ہے۔اس محدود اور مخصوص مزاج رکھنے والی صنف سخن میں موضوعات کا ایسا تنوع جیسا کہ شاؔد عارفی کی غزل میں ہے بہت کم شاعروں کے یہاں نظر آتا ہے۔‘‘

شاد کی عشقیہ شاعری بھی جذبے کی سچائی اور ندرت اظہار کا نمونہ ہے، وہ حسن پرست تھے:

’’میری طالب علمانہ زندگی کا وہ دور کسی بھی خوشنما جلد سے متاثر ہو جاتا تھا۔‘‘

اس زرخیزی نے ان کی عشقیہ غزلوں میں جگہ جگہ بہار دکھائی ہے۔ان کی عشقیہ شاعری جنسی لذتوں سے دور نہیں ہے، انھوں نے دو ناکام عشق کیے۔ ڈاکٹر مظفر حنفی کی اطلاع کے مطابق ایک غالباً تیرہ یا سولہ برس کی عمر میں اور ایک عنفوانِ شباب میں، دونوں ہی عشقوں میں وہ کامیاب رہے۔معشوق نے محبت کا جواب محبت سے دیا پھر بھی وہ کسی کو اپنا نہ بنا سکے کیوں کہ ان کی افغانیت نے کسی دوسرے کفو کی لڑکی کو شریکِ حیات بنانا گوارا نہیں کیا۔اس جرم میں وہ اپنے سگے بھائی کو بھی معاف نہیں کر سکے اور ان سے قطع تعلق کر لیا کیوں کہ انھوں نے اپنی دوسری شادی کسی غیر افغانی لڑکی سے رچا لی تھی۔بہر حال شاؔد عارفی کا جذبۂ عشق منہ زور تو ہے مگر وہ سطحیت اور بدمذاقی کے بھی قائل نہیں تھے۔ان کا مذاق حسن بھی نکھرا ہوا ہے:

مچل رہے ہیں لب شگفتہ پہ اس طرح بے صدا دلاسے
چمن میں جس طرح ہل رہی ہوں گلاب کی پتیاں ہوا سے

اک بھینی بے نام سی خوشبو
شامل ہے ہونٹوں کے رس میں

جیسے کسی حسین کے ہونٹوں پہ سرد آہ
پھولوں کی پتیوں پہ کرشمے ہوا کے دیکھ

www.urduchannel.in

بھاگتا ہے جیسے جنگل میں شکاری سے ہرن
وہ اِدھر در پر نظر آیا اُدھر روپوش تھا

عشقیہ اندازِ بیان میں بھی وہ دوسروں سے قدرے مختلف نظر آتے ہیں۔ان کی غزلیں دیرینہ روایات کی جگہ نئی روایات قائم کرتی ہیں جب وہ کہتے ہیں:

کہتے ہیں پوچھا گیا جب چھپ کے رونے کا سبب
دردِ دل کا کام اس نے دردِ سر سے لے لیا

جذبۂ محبت کو تیرے بے خطا پایا
میں نے جب اسے دیکھا دیکھتا ہوا پایا

بتائیں کیا کسی بت کو ہم نے کیوں چاہا
یہ فیصلہ تو ہماری نگاہ پر رکھیے

شاؔد عارفی کی عشقیہ غزلیں احتساسی اور لمسی شاعری کا خوبصورت نمونہ ہیں۔اس میں خارجیت کا رنگ بھی ہے اور لکھنؤ کی جنسیت بھی۔شاؔد کی عشقیہ شاعری سلیم احمد کے الفاظ میں ’’پورے آدمی کی داستان ہے۔‘‘

مظہر امام نے اس میں مومن کی معاملہ بندی اور ندرت بیانی بھی محسوس کی اور اہم بات یہ ہے کہ ان کی غزلوں میں فراق کی روپ والی رباعیات کی وہ فضا ملتی ہے جسے گھر آنگن کی خوشبوؤں نے پُر اثر بنا دیا ہے۔تصویریت، معاملہ بندی، واقعہ نگاری، مکالماتی برجستگی، جذباتی آسودگی اور جنسی لطافت کی رنگا رنگ پھوار نے انھیں بے حد خوش گوار اور نشاط افروز بنا دیا ہے۔

بدلی ایسی زلف کی لٹ میں شامل کر کے الجھن کوئی
میری خاطر ناپ رہا ہے، بال سکھانے، آنگن کوئی

ابھی انگڑائیاں لی جا رہی ہیں
سمجھتے ہیں ابھی دیکھا نہیں ہے

اور نامہ و پیام کے انداز میں:

بھولی سے ہم مکتب کوئی، کوئی سہیلی خالی زاد
ان کے ہاتھوں خط بھجواتے میں ڈرتا ہوں لیکن وہ

لکھ کر میرا نام اے شاؔد
اس نے بھیجا ہے رومال

ڈاک سے بھینی خوشبو والے خط پر خط آئے تو اک دن
پوچھے خط لانے والا، بابو جی! یہ خط کس کا ہے

شاؔد عارفی نے اپنی معشوقہ کا مرقع بھی پیش کیا ہے اور بڑی سادگی سے پیش کیا ہے کوئی مبالغہ نہیں ہے مگر حسن معصوم کی ایک عجیب کیفیت لیے ہوئے ہے:

سانولا رنگ کشیدہ قامت
نہ پری ہے نہ کوئی حور ہے وہ

دیکھ کر مجھ کو مسکرا دیں آپ
اس قدر احتیاط کافی ہے

وہ قریب سے گزرا بن کے صبح کا جھونکا
اس طرح کہ چپکے سے حرف مدعا کہہ دوں

حسیں ہو تم ''آپ کی بلا سے'' پری ہو تم آپ کی دعا سے
جواب ملتا ہے سخت لہجے میں ان سے جو بات پوچھتا ہوں

کبھی یہ رنگ شوخ بھی ہو جاتا ہے:

پھانس نکلوانے کی خاطر دے دیتا ہوں ہاتھ میں ہاتھ
موقع پا کر ران میں چٹکی بھر لیتا ہوں لیکن وہ

www.urduchannel.in

اور کبھی کبھی خوشگوار ذہنی تجربہ جوت جگاتا ہے:

دھیمی پے چل، بھینی خوشبو ہلکی دستک جاری ہے
یا وہ ہے یا صبح بہاراں یا ذہنی گلکاری ہے

شاد کے عشقیہ شعر میں ایک شعر ایسا بھی ہے جو بظاہر بے حد سادہ ہے مگر ایسے ذہنی تجربہ اور خواب و خیال کے رشتوں کو بیان کرتا ہے جو ہے تو بالکل عام سا تجربہ لیکن سب سے منفرد۔ ہمارے یہاں عموماً عاشقوں کو شبِ فراق میں بستر پر تارے گنتے ہوئے تو دیکھا گیا ہے لیکن شاؔد نے اس ذہنی کیفیت کو کس سادگی سے بیان کر دیا ہے، ملاحظہ ہو:

سوتے ہیں اپنے بستر پر
میں ہوتا ہوں اس کے گھر میں

یہ سچا مگر نادر تجربہ ہے بلکہ اردو کی عشقیہ شاعری کے لیے انوکھا بھی ہے۔ شاد کا یہ کہنا غلط نہیں ہے کہ وہ ندرت خیال کا خاص خیال رکھتے ہیں:

شاؔد مجھے یہ دھن رہتی ہے
اپنا نغمہ اپنی لے ہو

اپنا نغمہ اور اپنی لے کی یہ دھن شاد عارفی کی ترقی پسند تحریک سے متاثر غزل میں بھی موجود ہے مگر وہ فیض، مجاز، ساحر یا سردار کی طرح نہ تو اشتراکی تھے اور نہ ترقی پسند۔ انھوں نے انجمن ترقی پسند مصنفین کی بنیاد اپنے شہر رام پور میں ضرور رکھی تھی لیکن ترقی پسندوں کی مذہب سے بیزاری سے متنفر ہو کر بہت جلد اس سے علیحدہ بھی ہو گئے۔ نیاز فتح پوری کے نام ایک خط میں لکھا ہے:

''رام پور میں انجمن ترقی پسند مصنفین کا قیام تاباں صاحب کی معرفت میں میری نگرانی میں ہوا مگر آگے چل کر بات خدا اور مذہب کے ساتھ گستاخی تک پہنچی تو میں اور میرا منجھا ہوا شاگرد ہادی مصطفیٰ آبادی اس سے الگ ہو گئے۔''

غالباً شاد کے اس ردِعمل کے نتیجے میں کچھ لوگوں نے انھیں ففتھ کالومسٹ قرار

دے دیا تھا۔ اس ضمن میں شاد کا ایک تیکھا شعر بھی یادگار ہے:

میں فدائے پنجتن ہوں شاد، لیکن میرے دوست
اس عقیدے پر اڑے ہیں، پانچویں کالم میں ہوں

غالباً اسی واقعے کے تناظر میں سجاد ظہیر نے لکھا ہے:

''یقیناً شاد عارفی موجودہ دور کے اہم ترین ادیبوں میں سے تھے معلوم نہیں وہ کون ترقی پسند تھے جو خواہ مخواہ ان سے الجھ پڑے۔''

بقول طاہرہ اختر، بھانجی شاد عارفی:

''لڈن ماموں کٹر سنی تھے۔''

اس کے باوجود شاد کو پانچویں کالم میں شمار کرنا ترقی پسندوں کی سراسر زیادتی تھی۔ اس کا اعتراف بعد میں ترقی پسندوں نے کیا۔ سردار جعفری جیسے ترقی پسند اور اشتراکی دانشور نے مظفر حنفی کے نام ایک مکتوب میں اعتراف کیا ہے:

''وہ شخصیت جو ان کی شاعری کے پردے سے ابھرتی ہے اس میں ایک حساس انسان کے درد دل کی ساری دھڑکنیں موجود ہیں۔ بعض شاعروں کی شخصیت کے لیے ان کی شاعری ایک طرح کا حجاب بن جاتی ہے لیکن میرا خیال ہے کہ شاد کی شاعری ان کی دل نواز شخصیت کو بے نقاب کر دیتی ہے۔''

شاد عارفی اشتراکی نہیں تھے یہ طے ہے مگر وہ عوام دوست ضرور تھے۔ ظلم کے خلاف احتجاج کے قائل تھے اور مظلوموں کے لیے انصاف طلب کرتے تھے۔ انھوں نے دیسی ریاست کے خلاف عملی جنگ کی اور عتاب کے شکار بھی ہوئے اور آزادی کے بعد بھی سماجی انصاف کے حق میں ان کی آواز بلند ہوتی رہی، انھوں نے ان سیاسی رہنماؤں کی بھی خوب درگت بنائی جو اب حکومتِ وقت کا حصہ ہو چکے تھے اور کل تک جس بے انصافی، ظلم، غلامی، جبر اور تعصب و تنگ نظری کے خلاف نبرد آزما ہوئے تھے، حاکم بن کر ان سب کو مباح سمجھنے لگے تھے۔ اس تناظر میں شاد عارفی کو غیر ترقی پسند سمجھنا زیادتی اور تنگ نظری ہے جب کہ حکومتوں کی نظر میں بھی مطعون رہے۔ عبدالعلیم کے نام اپنے مکتوب میں لکھتے ہیں:

''میں اس لیے مطعون ہوں کہ حکومتوں کے عیب گنا تا ہوں۔''

شاد کا سینہ اپنوں کی نمک پاشی اور غیروں کی طعنہ زنی سے زخم زار ہو چکا تھا انھوں نے اپنے زخمی احساسات، اپنی ناراضگی، ظلم کے خلاف اپنی نفرت، عصری حالات کے لیے حقارت کو طنزیہ ترقی پسندانہ اشعار میں اس طرح پیش کیا ہے جس کی مثال کسی بھی دوسرے ترقی پسند شاعروں کے یہاں نہیں ملتی۔ سودا کے بعد یہ طنزیہ اسلوب، یہ کاٹ، یہ تیکھا پن صرف شاد کے یہاں نظر آتا ہے۔ شاد نے اپنے احتجاج کے لیے غزل کا Form اپنایا ہے اور اس طرح غزلیہ شاعری کو ایک نیا رخ، ایک نئی زبان اور ایک نئے اسلوب سے متعارف کیا ہے۔ شاد نے اس کا اعتراف کیا ہے:

بے کسوں پر ظلم ڈھا کر ناز فرمایا گیا
طنز کی جانب میں خود آیا نہیں لایا گیا

سیاسی رہنماؤں اور کرسی نشینوں پر طنز کرتے ہوئے کہتے ہیں:

ہم بیچارے کس گنتی میں، نیچی چولی، نیچی بات
اونچے شملے والے ہم پر وار کریں او چھا تو کیا

....

پوچھو تو رہنما سے یہ کون مرحلہ ہے
منزل سے قافلے کا اتنا ہی فاصلہ ہے

آل احمد سرور ان کی غزلوں کے بارے میں لکھتے ہیں:

''شاد کے یہاں صرف سماج کی خرابیوں پر طنز ہی نہیں بلکہ محبت اور نفسیات انسانی کی سچی تصویریں بھی ہیں اور انھیں ایک ایسے تیور اور بانکپن سے پیش کیا گیا ہے کہ فوراً ذہن پر نقش ہو جاتی ہیں۔ جو لوگ شاعری اور بول چال کی زبان کو ایک دوسرے سے الگ کر کے دیکھتے ہیں انھیں شاد کے کلام کا مطالعہ کرنا چاہیے۔ شاد نے بول چال کی زبان کی طاقت اور شعریت کو جس طرح اجاگر کیا اور جس طرح بقول ایذرا پاؤنڈ حقیقی نفسیات کو زبان

www.urduchannel.in

دی ہے اسے جدید اردو شاعری ہمیشہ یاد رکھے گی۔‘‘

شاد نے اکثر روایت سے الگ ہٹ کر عام تشبیہوں کے بجائے نئی تشبیہیں اور نئی تراکیب تلاش کیں۔ ان کی تشبیہیں بیشتر مرکب ہوتی ہیں جس کے سبب خیال میں وسعت اور شعر میں تہہ داری پیدا ہو جاتی ہے:

مقابل قد آدم آئینہ ہے
بڑا دلچسپ مطلع آ لڑا ہے

دل جوں ہی بیٹھنے لگا، منزلِ آرزوئے دل
محمل گرد باد سے جھانک کے مسکرا گئی

اسے نسیمِ چمن کہہ رہا ہوں میں، لیکن
کہیں نسیمِ چمن مڑ کے دیکھتی بھی ہے

یہی حال استعاروں کا بھی ہے۔ انھوں نے عشرت رفتہ، محمل گرد باد، بپاس احتیاط آرزو، ترنم صبح گلستاں، بتان کو بکو، رنگِ پشیمانی، کنگرۂ آرزو، شعر و غزل دستہ، چشم جلوہ جو، سحر سکوت فروش جیسی لاتعداد دلکش تراکیب سے اردو شاعری کے دامن کو بھرا۔ مظفر حنفی نے اپنا خیال ظاہر کرتے ہوئے لکھا ہے:

’’شاد عارفی اردو کے پہلے غزل گو ہیں جنھوں نے ہریجن الفاظ اور اچھوت خیالات کے لیے اپنے فکر و فن کے مندر کھول دیے۔ عشقیہ غزل میں منہ پر رسالہ ڈھک کر سو جانے، روایتی نامہ بر کی جگہ کسی بھولی سی ہم مکتب یا خالہ زاد سہیلی سے خط بھجوانے، بن کے لیٹی ہوئی جوانی کو گدگدانے محبوب کے کام میں مصروف ہونے کے باوجود عاشق کا نام سن کر مسکرا دینے، تکیوں سے پسینے کی بو آنے، بال سکھانے کے بہانے آنگن ناپنے اور بتانِ کوئے دوست کی کھڑکیوں سے جھول جانے کی باتیں کرنے کی جسارت ہمارے ادب میں پہلے پہل شاد عارفی نے کی ہے اور آج سے

www.urduchannel.in

تقریباً چالیس پچاس سال قبل کی ہے جب کہ عہدِ حاضر میں بھی تغزل چشیدہ بزرگوں کی پیشانی غزل میں ان باتوں کے ذکر سے شکن آلود ہو جاتی ہے۔ اسی طرح چپقلش، جوتے جھاڑ لینا، بندی، آنگن ناپنا، سانولا رنگ، بھرا گھر، ڈاک، کارن، خط لانے والا، بابو جی، بانہیں مروڑنا، روپ دھارنا، ہاری لکھنا اور اسی قبیل کے بے شمار الفاظ اور جملے شاد عارفی نے اپنی عشقیہ غزلوں میں بڑی خوبصورتی اور نفاست کے ساتھ استعمال کر کے یہ ثابت کر دیا ہے کہ اگر فن پر قدرت حاصل ہو اور فن کار کی انگلیاں الفاظ کی نبض پر ہوں تو کوئی لفظ یا جملہ غزل کے مزاج کے ناموافق نہیں ہوتا۔‘‘

ظ۔ انصاری بھی شاد کی اس فنی خوبی کا اعتراف کرتے ہیں:

’’الفاظ اور تراکیب سے ان کا جمہوری برتاؤ ہے۔ غزل کی وضع دارانہ محفل میں بھی ہر ایک گوت اور ہر ایک فیشن کے لفظ کو پاس بٹھا لیتے ہیں، نہ ناک بھوں چڑھاتے ہیں، نہ ذات برادری پوچھتے ہیں۔ کتنے ایسے غزل گو ہیں جو شاد عارفی کی طرح دعویٰ کر سکیں کہ ان کی غزل جدید نظم کے لب و لہجے سے اس قدر قریب ہے۔ شاد کی غزل ہمارے تازہ واردانِ بساط کو جرأت دلاتی ہے اور لفظوں کے انتخاب سے رواداری نہیں بے باکی کا سبق دیتی ہے۔‘‘

شاد نے پرانے لفظوں کو نئی فضا اور نئے مفاہیم عطا کیے۔ ان کے ہاں عشق کے تاثرات اور واردات قلب کے اظہار میں ایک طرح کی ندرت ہے:

لرز رہا تھا میں کہیں کھٹک نہ جائے انجمن
وہ انجمن میں آج اس قدر بچا بچا رہا

بتائیں کیا کسی بت کو ہم نے کیوں چاہا
یہ فیصلہ تو ہماری نگاہ پر رکھیے

جیسے کسی حسین کے ہونٹوں پہ سرد آہ
پھولوں کی پتیوں پہ کرشمے ہوا کے دیکھ

دھیمی پے چال، بھینی خوشبو، ہلکی دستک جاری ہے
یا وہ ہے یا صبح بہاراں یا ذہنی گل کاری ہے

انھوں نے محاوروں کو بھی نرالے انداز میں پیش کیا ہے:

میں تو چٹنی سے کھا رہا ہوں شاؔد
دال بٹتی ہے، جیل خانے میں

مگر یہاں تو جل رہا ہے آدمی سے آدمی
سنا یہ تھا چراغ سے چراغ جلتے آئے ہیں

چور کی داڑھی میں تنکے کا منظر اکثر دیکھا
میرے رہزن کے فقرے پر راہنما نے مڑ کر دیکھا

آنکھوں والوں میں ہو سکتا تھا کانا راجا تو کیا
لیکن جب بلی کے بھاگوں ٹوٹ پڑے چھینکا تو کیا

شاؔد عارفی کی ۱۹۴۲ء کے بعد کی تمام غزلیں طنز کی بنیاد پر کھڑی ہیں، سماجی بے اعتدالیاں ہیں، زمانے کی بے اعتنائی ہے اور زندگی کی کڑی مسافت نے ان کے اندر تلخی پیدا کر دی ہے۔ ان کی غزلیں بڑی حد تک ان کی وارداتِ دل کی ترجمان ہیں:

میں دنیا پر طنز کروں گا
دنیا میرے کیوں در پے ہو

شاؔد نے اپنی غزلوں کو تلخ حقیقت، سماجی ناانصافی اور مسائلِ حیات کو طنزیہ انداز میں پیش کر کے اسے روایتی غزلوں سے الگ روپ عطا کیا۔ مظفر حنفی ان کی طنزیہ شاعری سے متعلق لکھتے ہیں:

www.urduchannel.in

”اپنی طنزیہ غزلوں میں وہ ایک غیر رومانی شاعر ہیں۔ خارج سے مواد لے کر اسے تجربات و جذبات کی بھٹی میں پکاتے ہیں اور طنزیہ مزاج کے سانچے میں ڈھال کر شعری پیکر عطا کر دیتے ہیں، اس طرح ان کا ہر ایک شعر ایک گونہ انفرادیت کا حامل ہو جاتا ہے۔“

اسے جس حال میں سجدہ کیا ہے
اسے اللہ بہتر جانتا ہے

اب ہم کو یہ شعور بھی آساں نہیں رہا
گردن نہیں رہی کہ گریباں نہیں رہا

اگر کسی کو خانماں خراب دیکھتا ہوں میں
تو اپنی زندگی کو بے نقاب دیکھتا ہوں

پئے تحسین وطن طنز ہمارا فن ہے
ہم کسی خانماں برانداز سے ڈرتے ہی نہیں

دل میں لہو کہاں تھا کہ اک تیر آ لگا
فاقے سے تھا غریب کہ مہمان آ گیا

شاؔد نے عصری حسیت کے ہر اس پہلو پر طنز کیا جس پر قلم اٹھانے کی اکثر شعراء ہمت نہیں کر پاتے:

کاروبارِ قفس اب یہاں آ گیا
یہ فلاں چل بسا وہ فلاں آ گیا

ناجائز پیسے کی اجلی تعمیروں کے ماتھے پر
آپ نے لکھا دیکھا ہوگا یہ سب فضلِ باری ہے

دیکھ لینا کہ ہر ستم کا نام
عدل ہوگا کسی زمانے میں

شادؔ عارفی نے صرف ذات یا سماج پر طنز نہیں کیا بلکہ انھوں نے ایک تیر سے کئی شکار کیے۔ انھوں نے جنسی بے راہ روی، آزادی کا مصرفِ بیجا، احباب کی منافقانہ سازشوں، خوشامد، دفتری ذہنیت، مذہبی ڈھونگ، ادب کے نام پر بے ادبی، مغربی طرز کی بے جا تقلید، غرض کہ زندگی کا کوئی بھی پہلو ان کے طنز کی زد سے بچ نہ سکا۔
مظفر حنفی کا خیال ہے:

’’شادؔ عارفی کی طنز چومکھی ہے۔ ان کی کمان کے چلے سے بیک وقت بہت سے تیر ایک ساتھ پر جوڑ کر نکلتے ہیں اور ایک ایک تیر کئی شکار کرتا ہے۔ ان کے آس پاس پھیلی ہوئی زندگی کا کوئی جھول، کوئی رخنہ اور کوئی ناہمواری ایسی نہیں ہے جس تک ان کی نگاہِ دور بیں نہ پہنچی ہو۔ سماجی عدم توازن، اقدار کا انتشار، مفلسی، اقربا نوازی، چور بازاری، فقدانِ تربیت، سماج کے تخریب کار عناصر، متوسط طبقے کی بوالعجبی، سرمایہ داروں کا جبر، آرام پسندی و سہل انکاری، صبر و تحمل کا غلط مفہوم، نفسیاتی کمزوریاں، خوشامد، داؤ پیچ، غلامی کے مہلک اثرات، دفتری ذہنیت، مکر و فریب کی فروانی، اہلِ اقتدار کی ہوسناکی، احباب کی منافقانہ سازشیں، جھوٹ، ناانصافی، ظلم، جہالت، بغض، کینہ پروری، جنسی بے راہ روی، آزادی کا غلط مصرف، سادہ لوح عوام کی تباہ حالی، رشوت خوری، فرقہ پرستی، مذہبی ڈھونگ، ادب کے نام پر بے ادبی، خودغرضی، غرض کہ کسی بھی کج روی کا کوئی بھی پہلو شادؔ عارفی کی زد سے بچ نہیں سکا۔‘‘

شادؔ کی زندگی کا زیادہ تر حصہ جاگیر دارانہ ماحول میں گزرا، لہٰذا اس ماحول کی تمام تر غلاظتیں ان کی نظروں کے سامنے رہیں اور جب اپنے چاروں طرف راہبروں کی راہ زنی، لوٹ کھسوٹ، جائز و ناجائز دولت کمانے کی ہوس، جمہوریت کے نام پر کہیں بھی جمہوریت

www.urduchannel.in

کا سرِ عام قتل دیکھتے ہیں تو ان سب کے خلاف ان کے اندر نفرت کی آگ بھڑک اٹھتی ہے اور ان کے یہاں احتجاج کا آہنگ بلند ہو جاتا ہے:

اگر ہمارا یقیں نہیں ہے تو آیئے آپ کو گنا دیں
بہار میں جن کے آشیانے لٹے ہیں وہ اپنے ہاتھ اُٹھا دیں

خشک لب کھیتوں کو پانی چاہیے
کیا کریں گے ابر گوہر بار کا

بے کسی جب فروغ پا لے گی
ظلم کی بوٹیاں چبا لے گی

ناجائز پیسے کی اجلی تعمیروں کے ماتھے پر
آپ نے لکھا دیکھا ہوگا یہ سب فضلِ باری ہے

ساقیِ محفل کا ہونا چاہیے یہ فرض بھی
کس کے ساغر میں نہیں ہے کس کے پیمانے میں ہے

شادؔ کی طنزیہ غزل گوئی کے لفظیات صاف بتاتے ہیں کہ اسے روایتی متغزلانہ لفظیات کے میزان پر نہیں تولا جا سکتا ہے۔ یہ ایک نئی شعریات اور نئی جمالیات وضع کرتی ہیں۔ شادؔ نے روایتی تغزل کا جگہ جگہ مذاق اڑایا ہے۔ یہاں تک شراب و شاہد والی غزلوں کو بزمِ عیش میں ننگی ناچنے والی طوائف تک کہہ دیا ہے:

وہ جو ننگی ناچتی رہتی ہے بزمِ عیش میں
اس غزل کا شاد کیا؟ ماحول بھی قائل نہیں

غمِ زندگی شادؔ لرزاں ہے لیکن
محبت یہ اصرار ہے شاعری میں

شراب وشاہد کے تذکرے ان سے چھین لیجے تو کیا کریں گے
شراب وشاہد کے تذکروں تک ہی جن کی جادو بیانیاں ہیں

جلال کو بھی وقت نے سمو دیا ہے شعر میں
غزل کا مطمحِ نظر جمال ہی نہیں رہا

اب ہمیں حسن کا معیار بدلنا ہوگا
فن کو سو میل کی رفتار سے چلنا ہوگا

برجستگی کے سب وہ دبے چھپے لفظوں میں نہیں بلکہ بانگِ دہل اعلان کرتے ہیں مگر طنزیہ شاعری میں بھی میٹھا طنز، ہلکا نشتر سہتی ترشیاں، کتنی خوش ذائقہ ہوتی ہیں خوب جانتے ہیں:

جیسے میٹھا طنز، ہلکا نشہ، سہتی ترشیاں
سادہ سادہ کہہ گزرتا ہوں، کہے جانے کی بات

اور جب کبھی وہ اس ہنر سے کام لیتے ہیں تو اردو کی طنزیہ شاعری کا گراف اوپر اٹھ جاتا ہے چند اشعار پیشِ نظر ہیں:

اکثر میری محرومی ساقی پہ نہیں کھلتی
اکثر میرے حصے کی پی جاتا ہے پیمانہ

جب چلی اپنوں کی گردن پر چلی
چوم لوں منہ آپ کی تلوار کا

جامِ بلور ہو کہ شیشۂ مئے
وقت کے پتھروں سے ڈرتے ہیں

ہر غلط بات پر بھی ہاتھ اٹھاؤ
یہ نمائندگی نہیں، شرماؤ

www.urduchannel.in

ہم غلط رنگ میں اشعار نہیں کہہ سکتے
یعنی بے مقصد و معیار نہیں کہہ سکتے

کہیں جھپٹ نہ پڑیں دن میں مشعلیں لے کر
عوام کو نہ سجھاؤ کہ روشنی کم ہے

درِ گلشن پہ قفس ایجاد
''راستہ بند ہے'' یہ لکھوا دو

اصطلاحاً برے کو بھلا کہہ دیا
یعنی گالی نہ دی رہنما کہہ دیا

ڈاکٹر عابد رضا، شاد کی طنزیہ شاعری سے متعلق لکھتے ہیں:

''اردو میں صرف یہی ایک شاعر ہے جس نے طنز کو (ظرافت، مزاح، ہجو، پھکڑ وغیرہ کے ماہر تو بہت مل جائیں گے) اور صرف طنز کو اپنا فن بنا لیا ہے۔ تیکھا، کڑوا کسیلا، صاف وشفاف اندازِ سخن اس خلوص اور خوبی کے ساتھ ہمارے یہاں نہ شاد سے پہلے کسی کے حصے میں آیا ہے نہ ان کے ہم عصروں میں۔''

انھوں نے عام ترقی پسندوں کی طرح اپنی شاعری کا دائرہ سیاست تک محدود نہیں رکھا بلکہ اسے زندگی کی وسعتوں سے روشناس کرایا۔ عصری تقاضوں اور سیاسی تبدیلیوں نے ان کے خیالات میں جو تبدیلیاں پیدا کیں اس کا برملا اظہار کرتے ہوئے کہتے ہیں:

اک انقلاب دیکھ رہا ہوں چمن چمن
میری نظر جہاں ہیں، تمھاری نظر نہیں

ایسے قدم اٹھا جو نہ بہکیں کسی طرف
وہ انقلاب لا جو مقدر بنا سکیں

مجھے بھی شادؔ ریشمین شاعری سے شوق تھا
مگر وہ عمر سرخوشی کی تھی یہ آگہی کی ہے

شباب وخلوت کی بات اچھی تو ہے مگر آج کل نہ کہیے
غزل برائے حیات لکھیے غزل برائے غزل نہ کہیے

اس عہد کے تمام ذی فہم اور وطن دوستوں کی نظر میں تقسیم ملک ایک ایسا سانحہ ہے جس کی تلافی ممکن نہیں ہے۔ عہد پرست سیاست دانوں نے ہندو مسلم منافرت کی اس آگ کو اور ہوا دی اور دلوں کے درمیان دیوار بلند کر دی۔ شادؔ نے ان تمام حقائق کو بے حجابانہ بیان کیا ہے:

آئی نہ مغرب کے قدموں میں سیاست گھوم کے
ہو گئے آخر کو دو ٹکڑے وطن مرحوم کے

آگے آگے آشیانے خار وخس چنتے چلے
پیچھے پیچھے تختِ طاؤس بہار آتا گیا

شاد نے غزل کے روایتی لفظوں مثلاً بہار، خزاں، نشیمن، قفس، گل چیں، چمن، شمع، پروانہ، صنم خانہ، ساحل وغیرہ کو نئے مفاہیم ومطالب سے آگاہ کیا:

گل چیں کو شگوفوں کو تجارت سے غرض ہے
اندھوں کے لیے جلوۂ جاناں نہیں ہوتا

کرم موج بہ ساحل کو گوارا کر لوں
جی میں آتی ہے کہ کشتی سے کنارا کر لوں
یہ اور بات ہے کہ قفس جھیل جائیں ہم
ممکن نہیں، قفس کو نشیمن بنا سکیں

www.urduchannel.in

شادؔ کی غزلیں اس قسم کی غزلوں سے قدرے مختلف ہیں جو اس دور میں رائج تھیں، موضوعات، احساسات اور اندازِ فکر میں بھی خاصا فرق ہے:

یہاں چراغ تلے لوٹ ہے اندھیرا ہے
کہاں چراغ جلانے کی بات کرتا ہوں

ہم کہ ہیں تازہ واردانِ قفس
اور صیاد کہہ رہا ہے کہ گاؤ

صرف اپنوں کے تقرر کا ارادہ ہوگا
اور اخبار میں اعلانِ ضرورت دیں گے

زندگی کی تلخ حقیقتوں اور ذات کے کرب کو انھوں نے اس انداز میں پیش کیا ہے کہ اس میں ہمہ گیریت پیدا ہوگئی ہے اور آپ بیتی جگ بیتی بن گئی ہے۔ خلیل الرحمٰن اعظمی نے ان کی شاعری پر اپنا نظریہ پیش کرتے ہوئے لکھا ہے:

> ''انھوں نے زندگی میں جو دکھ جھیلے ہیں ان کا براہ راست بیان نہیں کیا ہے بلکہ اسے اس طرح پیش کیا ہے کہ اس میں ایک عمومیت اور ہمہ گیری پیدا ہوگئی ہے۔ ان معنوں میں شادؔ کو صحیح معنوں میں موجودہ دور کا عوامی شاعر کہا جا سکتا ہے۔''

شادؔ کے کلام میں داخلیت کے ساتھ ساتھ خارجیت کا عنصر نمایاں ہے۔ انھوں نے اپنی ذاتی زندگی کی تلخیوں کو حالاتِ زمانہ کی عکاسی اور ترجمانی کے لیے وقف کر دیا۔ مسائلِ حیات کی عکاسی ہو، انسانی دکھ درد کا احساس یا پھر اخلاقی قدروں کا لحاظ، شادؔ نے انھیں اپنے شعری سانچوں میں ڈھال کر ایک نئی تازگی عطا کی۔ انھوں نے روایت سے انحراف نہیں کیا بلکہ اسی روایت کو اپنی ڈھال بنا کر ذات اور کائنات کے مسائل کو باغیانہ لب ولہجہ

میں پیش کیا۔شاؔد کی غزلوں میں کہیں کہیں آتش کی سی خارجیت کا پہلو نظر آتا ہے جہاں بے باکی، بے تکلفی اور سپاہیانہ بانکپن موجود ہے۔

شاؔد عارفی کے یہاں حسن وعشق کی پیچیدہ کیفیات بھی سہل انداز میں پیش کی گئی ہیں ان کا رومان حسرت کے رومان سے میلوں آگے ہے۔ان کی محبوبہ گھریلو عورت ہونے کے باوجود ذی فہم، باشعور، چنچل اور زندہ دل ہے:

اے تو کہ شرارت سے نہیں پاؤں زمیں پر
تھوڑی سی عنایت بھی کسی خاک نشیں پر

دیکھ کر ہم کو مسکرادیں آپ
اس قدر احتیاط کافی ہے

لکھ کر میرا نام اے شاؔد
اس نے بھیجا ہے رومال

بھاگتا ہے جیسے جنگل میں شکاری سے ہرن
وہ اِدھر در پر نظر آیا اُدھر روپوش تھا

شاؔد عارفی کی غزلوں میں راست اظہارِ بیان کے سبب تغزل کے عنصر کا فقدان ہے۔ڈاکٹر مظفر حنفی اس کا سبب بتاتے ہیں:

''شاؔد عارفی نے روایتی غزل کے مروجہ علائم ورموز سے روگردانی کرتے ہوئے غزل کی مخصوص رمزیت اور اشاریت سے دانستہ پہلو تہی برتی اور موضوع کی براہ راست ترجمانی کا فن اختیار کیا۔اس طرح وہ بڑی فراخ دلی کے ساتھ غزل کی مروجہ علامتوں، تمثیلوں، کنایوں اور ان کے ساتھ وابستہ ذہنی متعلقات اور تصوراتی لوازمات سے دست بردار ہوگئے۔ نتیجے کے طور پر ان کی غزل کسی حد تک ان کے لوازمات کی پیدا کردہ پہلوداری

www.urduchannel.in

اور اس کے پس منظر کے ایک حصے سے محروم بھی ہوگئی جو غزل کی روایت عام اشعار کو فراہم کرتی ہے۔نیز وہ شے بھی ان کے ہاں کم کم نظر آتی ہے جسے اساتذہ خالص تغزل کا نام دیتے ہیں۔''

راست اظہارِ بیان ترقی پسندوں کا اسلوب تھا لیکن شاد عارفی ترقی پسند تحریک سے وابستہ نہ تھے اس کے باوجود ترقی پسند خیالات سے ان کی غزلیں بھری پڑی ہیں مگر مذہب بیزاری اور پروپیگنڈے سے دور ہیں اور یہ شاؔد عارفی کے فن کا کمال ہے کہ انھوں نے اپنی شاعری کو پروپیگنڈا نہیں بننے دیا۔فنی بے راہ روی اور اشتہاری ادب کے وہ قائل نہیں۔وہ ''ادب برائے زندگی'' کے ہمنوا ہیں لیکن اشتراکی نظریہ حیات کے حامی نہیں۔خلیل الرحمٰن اعظمی کا خیال ہے:

''انھوں نے عام ترقی پسندوں کی طرح اپنی ترقی پسندی کا دائرہ محض سیاست تک محدود نہیں رکھا بلکہ زمانہ اور زندگی کی وسعتوں کو قریب سے دیکھنے اور اسے برتنے کی کوشش کی ہے۔وہ بہت سے سیاسی معاملات میں ترقی پسند مصنفین کی پالیسی سے مطمئن نہیں ہیں لیکن انھوں نے اپنے آپ کو ہمیشہ ترقی پسند سمجھا اور اپنی شاعری کا رشتہ آنے والے زمانے سے جوڑنے کی کوشش کی۔''

ہر چند کہ شاؔد باقاعدہ اور مسلمہ ترقی پسند نہیں ہیں لیکن ان کے بیشتر اشعار مسلمہ ترقی پسند شاعروں کے مقابلے میں زیادہ ترقی پسندانہ ہیں۔ترقی پسند خیالات کے حامل یہ اشعار ملاحظہ فرمائیں:

ساتھ آنا ہے تو لہروں کے تھپیڑے مت گن
موج سے لطف اٹھانا ہے تو ساحل سے اٹھا

جو کانٹوں پہ الزام دھرنے چلے ہوں
انھیں اپنے دامن بچانے کہاں تھے

خواص پڑ کے سو رہے، عوام اٹھ کے چل پڑے
جلے چراغ بجھ گئے، بجھے چراغ جل پڑے

کاروانِ عہدِ نو کے ساتھ چلنا ہے ہمیں
بندہ پرور آپ تکمیل تن آسانی کریں

بحیثیت مجموعی شآد عارفی کی شاعری محض ریشمیں شاعری نہیں بلکہ سماجی بے اعتدالی، جاگیرداری کا جبر، اہلِ اقتدار کی ہوسناکی، جمہوریت کا غلط مفہوم، عوام کی بدحالی، اور ترقی پسندوں کے غلط نظریات پر براہِ راست طنز ہے مگر یہ طنز عجب لطف پیدا کرتے ہیں اور ان کی مقبولیت کے ضامن بنتے ہیں۔ ان کی غزلوں میں وہ تیکھا پن ہے جو دوسرے ترقی پسند شعرا کے یہاں خال خال نظر آتا ہے۔ شآد کے بارے میں آل احمد سرور نے بجا فرمایا ہے:

''شآد کے یہاں صرف سماج کی خرابیوں پر طنز ہی نہیں ہے بلکہ محبت اور نفسیاتِ انسانی کی سچی تصویریں بھی ہیں اور انھیں ایک ایسے تیور اور بانکپن سے پیش کیا گیا ہے کہ فوراً ذہن پر نقش ہو جاتی ہیں۔ جو لوگ شاعری اور بول چال کی زبان کو ایک دوسرے سے الگ کر کے دیکھتے ہیں انھیں شآد کے کلام کا مطالعہ کرنا چاہیے۔ شآد نے بول چال کی زبان کی طاقت اور شعریت کو جس طرح اجاگر کیا اور جس طرح بقول ایذرا پاؤنڈ حقیقی نفسیات کو زبان دی ہے، اسے جدید اردو شاعری ہمیشہ یاد رکھے گی۔''

......☆......

پروفیسر محفوظ الحسن

شآد عارفی کی غزل گوئی......ایک طائرانہ نظر

www.urduchannel.in

شاد عارفی کو میں نہیں جانتا ہوں۔ شاد عارفی کو میں جانتا ہوں۔ آپ کو دونوں باتیں متضاد معلوم ہوں گی۔ شآد عارفی کا پورا نام کیا ہے؟ وہ کب اور کہاں پیدا ہوئے ان کی تعلیم کیا تھی، ان کی زندگی کے ایام کہاں اور کیسے گزرے، ان کے والدین کا کیا نام تھا، ان باتوں کا مجھے کوئی علم نہیں، اور اس لاعلمی پر مجھے کوئی ندامت بھی نہیں، کہ ہر شخص ہر بڑے چھوٹے شاعر کے بارے میں پوری معلومات رکھے یہ کوئی ضروری نہیں۔ اور مجھے اپنی اس لاعلمی اور کم علمی کا اعتراف ہے، مگر میں شآد عارفی کو جانتا بھی ہوں، ان کے مختلف کلام کے حوالے سے مختلف مضامین میں ان کے حوالے کے ذریعے۔ میں پھر یہ اعتراف کرلوں کہ چند غزلوں یا دیگر اصناف کو پڑھ کر اگر کوئی یہ کہے کہ اس نے اس شاعر کو پورا پورا پڑھ لیا ہے تو اس کی عقل پر ماتم کرنے کے سوا اور کیا چارہ ہے۔ لہٰذا میں اگر یہ کہوں کہ میں نے شاد عارفی کو پڑھنے کی طرح نہیں پڑھا ہے تو کوئی تعجب نہیں ہونا چاہیے۔

ایک دن ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی کا فون آیا، انھوں نے فون پر مجھے بڑے خلوص اور اعتماد کے ساتھ کہا کہ ''آپ کو شآد عارفی کی شاعری پر کچھ لکھنا ہے'' میں نے ان سے کہا کہ ''بھائی میں نے شاد عارفی کو نہیں پڑھا ہے'' تو ان کا جواب تھا ''میں پڑھوا دوں گا۔''

تین چار دن ہوئے کہ انھوں نے اپنی دو کتابیں اور کلیات شاؔد عارفی مرتبہ ڈاکٹر مظفر حنفی کے چند اوراق (غزلوں) کی فوٹو کاپی بھیج دی اور یہ ہدایت بھی کہ جلد از جلد لکھ کر بھیج دیجیے۔ وہ کئی بار ایسا کر چکے ہیں اور جب جب وہ ایسا کرتے ہیں مجھے سعدی کا یہ شعر یاد آجاتا ہے:

درمیانِ قعر دریا تختہ بندم کردہ ای
باز می گوئی کہ دامن تر مکن ہشیار باش

اب جب کہ پھر انھوں نے تختہ بند کر کے دریا کے بیچوں بیچ چھوڑ دیا ہے تو میں ''چل مرے خامہ بسم اللہ'' کہہ کر اپنا دامن تر ہونے سے بچانے کی احتیاط کے ساتھ دوسرے کنارے تک پہنچنے کی کوشش کرتا ہوں۔ اس اعتراف کے ساتھ کہ میں شاد عارفی کے فکر و فن کے ساتھ انصاف شاید نہ کر سکوں مگر آبگینوں کو ٹھیس نہ لگے اس کا بھی خیال رکھتے ہوئے کہ چند غزلوں کی روشنی میں جو کچھ اور جتنا کچھ میں شاؔد کو سمجھ سکا ہوں اس کو حیطۂ تحریر میں لانے کی جسارت کر رہا ہوں۔ اگر معیار پر پورا نہ اتر سکوں تو اس کے لیے معذرت خواہ ہوں۔

اردو تنقید کا حال کچھ عجیب ہے۔ یہاں کتابیں سونگھ کر تبصرے لکھے جاتے ہیں اور لفافہ دیکھ کر خط کا مضمون بھانپ لینے والوں کی کمی نہیں ہے۔ میری عادت یہ ہے کہ میں بغیر پڑھے نہ تو تبصرہ کرتا ہوں اور نہ ہی کوئی مضمون لکھتا ہوں۔ مگر اس کو کیا کہا جائے کہ بیس پچیس غزلوں کی روشنی میں شاد عارفی کی شاعری پر مجھے لکھنا پڑ رہا ہے۔ مرسلہ غزلوں کے مطالعہ کے بعد میں شاؔد کے تعلق سے جو رائے قائم کر سکا ہوں ممکن ہے اس میں پوری کی پوری صداقت آپ کو نہ ملے تو آپ مجھے معاف فرمائیں گے۔

(۱) شاؔد عارفی اپنے ڈھنگ کے نرالے شاعر ہیں۔ ان کے لہجے میں تیکھا پن ہے اور طنز کی زیریں لہریں۔ کہیں کہیں پہ بہت نمایاں بھی ہے۔

(۲) صحیح الفاظ کا صحیح انتخاب اور ان کا برمحل اور موزوں استعمال اور ترتیب اور رکھ رکھاؤ اتنا منظّم ہے کہ کوئی لفظ اِدھر سے اُدھر ہوا اور معنی خبط ربط ہوا۔

www.urduchannel.in

(۳) شاد عارفی کی غزلوں میں اس عہد کے سیاسی حالات کی تصویر دیکھی جا سکتی ہے، شاؔد عارفی کو آزاد ہندوستان سے جو توقعات تھیں وہ پوری نہیں ہوئیں۔ آزادی کا جو خواب دیکھا اور دکھایا گیا تھا اس کی تعبیر وہ بالکل نہیں نکلی جس کی امید کی جاتی تھی یا کی گئی تھی۔ اس عہد کی سیاست کے نشیب و فراز اور اس کی شطرنجی چالوں اور اس کے بچھائے جال سے وہ نہ صرف بخوبی واقف و آگاہ ہیں بلکہ بسا اوقات انھوں نے ان کی پردہ دری بھی کی ہے۔

(۴) آزادی کا خونچکاں ہونا اور آزاد ہندوستان میں اقلیت کے تئیں نفرت کا احساس اور ان سے وفاداری کا ثبوت طلب کرنا۔ وغیرہ محسوسات ان کی غزلوں میں بہت واضح اور نمایاں ہیں۔ سیاست دانوں کا عوامی اور ملکی مفاد کو نظر انداز کرنا اور محض نجی اور وقتی فائدے کے لیے عوام الناس کو مختلف خانوں مین تقسیم کر کے اپنا الّو سیدھا کرنے کا عملی رویہ شاد کو پسند نہیں تھا چنانچہ اپنی غزلوں میں انھوں نے رہبرانِ قوم کے اس رویہ کے خلاف کہیں پردوں میں اور بعض اوقات واضح الفاظ میں اپنی ناراضگی کا اظہار کیا ہے۔ ان کی غزلوں میں جو تیکھا پن، نشتریت اور تلخی ہے وہ محض لہجے اور اندازِ بیان ہی کی نہیں ہے بلکہ ان کے دل کا درد ہے جو اس انداز میں اُمڈا نظر آتا ہے۔

(۵) شاد کا ذہنی شعور بالیدہ اور سیاسی شعور اتنا بیدار اور ان کا دل اتنا حساس تھا کہ وہ اس وقت کے ہندوستان کو تو دیکھ ہی رہے تھے آئندہ کا ہندوستان اور عالمی پیمانے پر کھیلے جانے والے ڈرامے کی آہٹ بھی وہ محسوس کر رہے تھے۔ ان کی غزلوں میں آج کی آہٹ بھی سنائی دیتی ہے اور یہ انھیں ایک بڑا شاعر بناتی ہے۔

(۶) ان کی غزلوں میں ان کی ذاتی زندگی کی ناکامیاں، مایوسیاں، اداسیاں، رنج و غم اور نارسائی کی پہچان بڑی آسانی سے ہو جاتی ہے۔ ان کی ناآسودہ زندگی اور ایک سچے عاشق کی حسرتوں کی داستان بھی ان کی غزلیں سناتی ہیں۔ یہاں یہ بات بھی ذہن نشیں رہے کہ ان کی غزلوں میں کوئی شعر مجھے ایسا نہیں ملا جس سے یہ اندازہ ہو کہ ان کا عشق موقع پرستی یا ہوسناکی کی علامت ہے۔ ان کی غزلیں پاکیزہ عشق

کے محتاط انداز و اظہار کی کہانیاں کہتی ہیں۔ان کا عشق سچا ہے اور ان کی غزلیں ان ہی سچے جذبات و احساسات کی ترجمان ہیں۔ان میں مشرقی روایات کا احترام بھی ہے۔شاد کو اپنے معشوق کی رسوائی ہرگز گوارہ نہیں ہے۔ان کا محبوب کوئی آسمانی حور نہیں وہ حسن و جمال کا مجسمہ بھی نہیں مگر اس میں ایک بلا کی کشش ہے۔ اس کا سانولا پن اور اس کی کشیدہ قامتی اور اس کی سادگی شاد کو بے چین کیے دیتی ہے۔اس کی شوخی میں معصومیت ہے اور اس کی دوشیزگی میں الھڑ پن بھی ہے۔وہ حسرت کی طرح اپنے محبوب سے ننگے پاؤں دھوپ میں چھت پر تو نہیں ملتے مگر چھپتے چھپاتے ملتے ضرور ہیں وہ آنکھوں آنکھوں میں باتیں بھی کرتے ہیں اور وسائل کا بھی استعمال کرتے ہیں۔مگر ہمیشہ لیے دیے انداز میں شرافت اور تہذیب کی چلمن کے سہارے، بے باکانہ اور ببانگ دہل اس کا اعلان تو نہیں کرتے ہیں مگر اشاروں اشاروں میں اپنی بات ضرور کہہ جاتے ہیں۔انھیں اپنے آزاد ہونے اور محبوب کے مجبور ہونے کا بھی احساس ہے۔

(۷) شاد نے اپنے عشقیہ جذبات کی ادائیگی میں فطری انداز اپنایا ہے اور سادہ الفاظ میں نہایت سادگی کے ساتھ اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ان کی اس قسم کی غزلوں کا انداز انھیں قدیم شعری روایت کے قریب تر کر دیتا ہے۔

(۸) شاد مئے عشرت سے محروم رہے ہیں ان کے جامِ زندگی میں اس کا عمل دخل بالکل نہیں رہا ہے۔اس کے باوجود ہمیشہ ان کے چہرے پر مسکراہٹ کھیلتی رہی ہے۔ ان کا دعویٰ ہے کہ مسکرانا ان کی فطرت میں شامل ہے اور جس کی فطرت میں مسکراہٹ ہو وہ تو رونے سے رہا۔

(۹) شاد کسی کی زندگی بنانے کے لیے خود کو قربان ہی نہیں کرتے بلکہ وہ مشورہ بھی دیتے ہیں۔ان کا خیال ہے کہ انسان کو شمع صفت ہونا چاہیے، خود کو مٹنے کی پروا کیے بغیر دوسروں کے کام آنا ہی دلیل انسانیت ہے اور آدمیت یہی تقاضہ کرتی ہے۔ درسِ عزم و عمل اور اخلاقیات بھی ان کی غزلوں میں ہے۔

(۱۰) شاد غزل میں تجربات کے حامی ہیں ان کے خیال میں اگر غزل نے چولا نہیں بدلا

www.urduchannel.in

تو پھر متاعِ عہدِ مستقبل نہیں ہو سکتی۔وہ اپنے وقت سے آگے تھے۔وہ یہ سمجھ رہے تھے کہ ایک ایسا وقت بھی مستقبل کی کوکھ سے نمودار ہوگا جو غزل کے آہنگ اور مزاج کو بدلنے کا تقاضا کرے گا تو کیوں نہ ابھی سے اس کی تیاری کر لی جائے۔انھوں نے اپنی غزلوں میں لہجے کی حد تک تو ضرور بدلاؤ لانے کی کوشش کی ہے البتہ غزل کا مزاج آہنگ اور لہجہ بھی بیسویں صدی کی تیسری چوتھی دہائی سے بدلتا دکھائی دینے لگا تھا۔آج تو غزل نئی شان آن بان کے ساتھ جلوہ گری کر رہی ہے۔میں نے جن نکات کی نشان دہی کی ہے میں چاہتا ہوں کہ اب ان کے چند اشعار آپ کو سنا دوں تا کہ میری بات کی توثیق ان کی غزلوں کے اشعار سے ہو جائے۔تو ملاحظہ ہوں چند مختلف اشعار:

مئے عشرت ، مئے عشرت کے بندو   ہمارے جام میں شامل نہ ہوگی

دوسرے شاعر جہاں روتے ہیں میں ہنستا ہوں شادؔ
مسکرانا جس کی فطرت ہو وہ رونے سے رہا

غزل چولا نہ بدلے گی اگر شادؔ   متاعِ عہدِ مستقبل نہ ہوگی

اگر کسی کو خانماں خراب دیکھتا ہوں میں
تو اپنی زندگی کو بے نقاب دیکھتا ہوں میں

جناب شادؔ باغبان منتخب کے بھیس میں
نظامِ نو کا جرم انتخاب دیکھتا ہوں میں

بہار آنے کے بعد جن کا چمن کا پھیرا نہیں ہوا ہے
وہ کہہ رہے ہیں خزاں کا سایہ ابھی گھنیرا نہیں ہوا ہے

چمن کے چہرے پہ یہ خراشیں، انھیں شگوفے کہیں کہ لاشیں
بہار نے مشقِ ناز کی ہے، خزاں کا پھیرا نہیں ہوا ہے

میکدے میں اور سب کچھ ہے مگر   صرف ساقی کا سلوک اچھا نہیں

سب سے اونچی شاخ پر تازہ گلاب   جیسے کوئی ماہ پارہ بام پر

یہ جنونِ آرزو یہ آگہی   کارواں احمق نکما راہبر

غریب و بے کس ہر اک ستم پر نہ کیوں دعائیں ہزار دیں گے
اگر وہ ایسا نہیں کریں گے تو آپ گردن نہ مار دیں گے

سانولا رنگ، کشیدہ قامت   نہ پری ہے نہ کوئی حور ہے وہ
میں تو غزلیں کہہ کر دل بہلا لیتا ہوں لیکن وہ
شہرِ سخن میں بدنامی سے بے پروا ہوں لیکن وہ

دیکھ کر مجھ کو مسکرا دیں آپ   اس قدر احتیاط کافی ہے

گلستانوں سے اٹھ رہا ہے دھواں   دیر کیا ہے بہار آنے میں

دیکھ لینا کہ ہر ستم کا نام   عدل ہوگا کسی زمانے میں
شمع بجھتی ہے روشنی دے کر   جان دے زندگی بنانے میں

شوق بے حد میں بھی مجھ کو عقل کا توڑا نہیں   آستانِ یار سے ٹکرا کے سر پھوڑا نہیں

شادؔ غیر ممکن ہے شکوۂ بتاں مجھ سے   میں نے جس سے الفت کی اس کو باوفا پایا

اگر چمن سے نکال دو گے چمن سے باہر گزار لیں گے
چمن کہا یہ نہیں کہا ہے وطن سے باہر گزار لیں گے
وہ جن کی آب و ہوائے گنگ و جمن میں نشو و نما ہوئی ہو
وہ کس طرح سرزمین گنگ و جمن سے باہر گزار لیں گے

www.urduchannel.in

انتظار تھا ہم کو خوش نما بہاروں کا   یہ قصور کیا کم ہے ہم قصورواروں کا
ایک روز کھو دے گا اعتماد ذاتی بھی   آسرا تکا جس نے دوسرے سہاروں کا
جس کو دولت پر غرہ ہے پھرتا ہے جو شان بنائے
آنکھیں کھولے دنیا دیکھے اپنے کو انسان بنائے

بجھ نہ پائے چراغِ عزم و عمل   اشہبِ فکر تیز گام کرو

میں نے جن دس نکات کی نشان دہی کی ہے مندرجہ بالا اشعار میں ان کی ایک ہلکی جھلک آپ کو ضرور ملی ہوگی۔ مندرجہ بالا اشعار میں آپ کو کچھ نادر تشبیہات بھی نظر آئیں گی اور وطن عزیز کی محبت بھی۔ اظہار کا بے پناہ سلیقہ اور دوٹوک بات بہ انداز شاعرانہ لہجہ تیکھا اور کہیں کہیں تلخی سے بھرا۔ یہ شاعری، سیاست، سماج، معاشرت، ملک اور قوم کا آئینہ بھی ہے اور رہبران ملک و قوم کو آئینہ بھی دکھاتی ہے جیسا چہرہ ہے ویسا دکھائی دے تو شادؔ کا کیا قصور؟

شاد عارفی اردو شاعری کی تاریخ کے ایک ایسے شاعر ہیں جن کی نئی آواز کی گونج دیر تک اور دور تک سنائی دیتی ہے اور دیتی رہے گی۔

......☆......

ڈاکٹر فراز حامدی

شاد عارفی کا رنگِ غزل

''اردو ادب کی مختلف اصنافِ سخن میں شاد عارفی نے جو کارنامے انجام دیے ہیں اور اوراضافے کیے ہیں ان کی نوعیت، انفرادیت، افادیت اور مقدار کو ذہن میں رکھیے تو شاد کے یہاں میدانی دریا کا سا پھیلاؤ اور پہاڑی ندی کا زور شور نظر آتا ہے۔ وہ بیک وقت بڑے اور اہم غزل گو، منفرد کالم نگار، البیلے نقاد اور صاحبِ طرز مکتوب نویس ہیں۔ اردو ادب میں شاد عارفی کی طرح کسی ایک ہی فنکار نے اتنی بڑی تعداد میں ایسی اعلیٰ غزلوں، بلند پایہ نظموں، تخلیقی تنقیدوں اور ادبی مکتوبات کا اضافہ نہیں کیا۔ ایک اچھے اور بڑے فنکار کی طرح شاد کا فن بھی تہہ بہ تہہ اور پہلو دار ہے جسے کسی ایک صنفِ سخن میں قید نہیں کیا جا سکتا۔''

یہ کہنا ہے عصرِ حاضر کے معتبر غزل گو شاعر اور مستند نقاد جناب ڈاکٹر مظفر حنفی کا۔ اہلِ نظر جانتے ہیں کہ ڈاکٹر مظفر حنفی اپنی کاٹ دار اور پہلو دار غزلوں کی وجہ سے تمام اردو دنیا میں نمایاں مقام رکھتے ہیں اور یہ مقام انھوں نے شاد عارفی کے طرزِ کلام سے پایا ہے۔ شاد عارفی کی مجموعی ادبی حیثیت سے قطع نظر اگر صرف ان کی غزلوں کا ہی جائزہ لیا جائے تو ہمیں ایک نئے اور انوکھے ذائقے سے روشناس کرائیں گی اور گل و بلبل کی داستانوں اور شمع و پروانہ کی روایتی کہانیوں سے کہیں دور لے جائیں گی۔ شاد عارفی ایک حقیقت پسند شاعر تھے اور

www.urduchannel.in

حقیقت پسندی فنکار کو بہت بے باک اور واشگاف بنا دیتی ہے۔ وہ جو کچھ کہتا ہے اس میں تلخی گھول دیتا ہے اور پڑھنے والے کے دل کو کچوکتا ہے۔ شاد نے اپنے غزلیاتی کلام سے بہت سوں کو شاد کیا ہے تو بہت سے ناشاد بھی ہوئے ہیں۔ انھوں نے خود ایک جگہ کہا ہے:

مجھے اے شاد ان رجعت پسندوں سے کیا لینا
کرے گی یاد مستقبل کی تہذیبِ جواں مجھ کو

غزل بڑی کافر ادا صنفِ سخن ہے۔ اس نے عشوہ طرازیوں سے بڑے بڑے شعراء کو ناکوں چنے چبوائے ہیں۔ میر اور غالب سے لے کر مومن و داغ تک ہر ایک استادِ سخن نے اسے اپنے اندازِ سخن سے لبھانے کی کوشش کی ہے اور اسے رام کرنے میں کامیاب بھی ہوئے ہیں، مگر یہ اپنی مستانہ چال سے ایک ہی ڈگر پر چلتی رہی۔ حسرت موہانی ایسے غزل گو شاعر ہیں جنھوں نے غزل کو روایتی پگڈنڈی سے ہٹا کر نئی شاہراہ پر گامزن کیا اور اس کو تصنع اور مبالغے کی جکڑ بندیوں سے باہر نکالا۔ شاد عارفی بھی ایسے مجتہد شاعر ہیں جنھوں نے فارمولا ٹائپ شاعری سے ہمیشہ اپنا دامن بچایا اور اپنے لیے ایک انفرادی راہ اختیار کی۔ ان کا رنگِ غزل میر و غالب کے اندازِ بیان سے کہیں الگ ہے اور ان کا لب و لہجہ مومن و داغ سے کہیں جداگانہ ہے۔ قاری کو چونکانے والا اور مبہوت کر دینے والا اندازِ بیان، خالص طنزیہ بیان خالص طنزیہ اردو شاعری کو شاد عارفی کی ہی دین ہے۔ ان کے اشعار تیر و نشتر کی طرح دل میں چبھتے ہیں اور کچھ سوچنے پر مجبور کر دیتے ہیں۔ مثلاً:

عمر بکر کی شرارتوں پر جو زید کو بزم سے اٹھا دیں
بتائیے ان کی اس روش پر جو سر نہ پیٹیں تو مسکرا دیں

آ گیا وقت کہ وہ گھبرا کر   پھول کو سرخ ستارا سمجھیں

اگر یہ وارفتگی عشق صنم نہیں ہے تو اور کیا ہے
برہمنوں کی اجارہ داری یہ عذر کرتا ہوں میں خدا سے

اگر ہم اردو شاعری کے سرمایہ کو کھنگالیں تو نامور شعراء کی غزلوں میں چیدہ چیدہ

اشعار ''طنز'' پر مشتمل بھی مل جائیں گے مگر شاؔد عارفی کی خصوصیت یہ کہ انھوں نے طنز کو بطور اندازِ بیان اور رنگِ سخن نہیں اپنایا ہے بلکہ طنز کو اپنا فن اور معیارِ سخن بنا کر شاعری کی ہے اور غزلیہ اشعار کہے ہیں۔ جس طرح یگانہ چنگیزی کا لب ولہجہ ان کی بیباکانہ طرز ادا اور گونجیلی آواز دور سے پہچانی جاسکتی ہے۔ اسی طرح شاد عارفی کی غزلیہ شاعری بھی اپنی پہچان خود بتا دیتی ہے۔ وہ رودادِ عشق کا بیان ہو کہ حقائق پر مبنی واقعات کا اظہار، سماجی ومعاشرتی پہلوؤں کی عکاسی ہو کہ سیاسی ریشہ دوانیوں کی کیفیت نگاری، ہر موضوع کو انھوں نے طنز کے تیر سے ہدفِ ملامت بنایا ہے۔ جلے کٹے انداز میں وہ باتیں منصۂ شہود پر آ گئی ہیں جو ان کے دل کے آتش فشاں میں لاوے کی طرح بھبھک رہی تھیں۔ ذیل کے اشعار سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اس جدید رنگ نے ان میں کیا معنویاتی ابعاد پیدا کر دیے ہیں:

فاقہ کش مخلوق کی حاجت سمجھنے کے لیے
ایک دو روزے ہی رکھ لیتے جو خس خانوں میں ہیں

....

گنگا کو پوجتا ہے برہمن برا سہی
میں کیا کہوں کہ زمزم و کوثر پرست ہوں

....

غزل کہنے سے پہلے ساتھیو! یہ دیکھنا ہوگا
سخن سازوں کے نامطبوعہ دیوانوں پہ کیا گزری

....

یہ سوچتا ہوں حضرتِ زاہد کو کیا کہوں
حجرے سے آ رہی ہے شرابِ کہن کو بو

....

خودی کہ مختلف نہیں ہے اب حنائی فام سے
ملو حیا فروش سے ڈرو نمکِ حرام سے

اکثر طنز نگار شعراء میں یہ خامی در آئی ہے کہ وہ طنز کے پیرائے میں پھکڑ پن اور استہزا پر اتر آتے ہیں اور ظرافت سطحیت میں بدل جاتی ہے، مگر شاد عارفی معیارِ شاعری سے

www.urduchannel.in

نیچے نہیں اترتے ہیں۔ ان کی شعری خوبیوں میں یہ وصف اتنا نمایاں ہے کہ عشقیہ اشعار میں بھی طنز کی ایک زیریں لہر دوڑتی نظر آتی ہے۔ مکالماتی انداز اور ڈرامائی کیفیت اشعار کو اور دلچسپ بنا دیتے ہیں، مستزاد یہ کہ الفاظ پر قدرت ہونے کی وجہ سے نت نئی تراکیب کو برجستہ استعمال کر کے موشگافیاں پیدا کرتے ہیں۔ عشق اور طنز جب ہمکنار ہوں تو اس قسم کے اشعار شرابِ دوآتشہ کا کام کرتے ہیں:

جس طریقے سے جان لیں گے آپ
خون میں ہاتھ سان لیں گے آپ

....

ترے کوچے میں آ کر ہم تو آپے میں نہیں رہتے
پہنچ جائے جو تیری خلوتوں میں، وہ کہاں ہوگا

....

ظرف سے زائد کب ہوتا ہے ان سے میرا کوئی سوال
ایسا دامن پھیلاتا ہوں جس کے اندر گھیر نہیں

....

بھیگی پلکیں، بکھری زلفیں، اترا چہرہ، پھیکے ہونٹ
ان حالات میں کب تک محفل سوئے ظن سے کام نہ لے

شاؔد عارفی کی غزل کا یہ رنگ انھیں دوسرے شعراء سے جداگانہ حیثیت تو عطا کرتا ہے لیکن یہ کہنا مشکل ہے کہ انھوں نے طنزیہ روش کو کیوں اپنایا۔ وہ غلام ہندوستان میں پیدا ہوئے تھے، نظام حکومت کے سخت گیر رویے اور بابرانہ جاگیردارانہ معاشرے کی گھٹن نے شاید ان کے ذہن ودل کو متاثر کیا۔ حالات کی سنگینی اور واقعات کی بے رحمی نے انھیں کچھ زیادہ ہی حساس بنا دیا تھا اور ان کے تخلیقی سوتوں نے آتش فشاں کی صورت اختیار کر لی، انھوں نے رائج الوقت شاعری سے کنارہ کش ہو کر حقیقت آمیز شاعری کی طرف رجوع کیا۔ ظاہر ہے کہ ناقدینِ ادب کو یہ روش پسند نہیں آئی اور انھوں نے شاؔد عارفی کو ہر طرح درخورِ اعتنا کیا۔ حالانکہ شاعرانہ اعتبار سے فن کی کسوٹی پر وہ پوری طرح اترتے تھے۔ اندازہ

لگائیں کہ کیا اس انداز کی غزل کوئی اور شاعر کہہ سکتا ہے:

جب غریب جنتا نے بر بنائے آزادی، دل میں تیر کھا کھا کر سعیِ سرخ روکی ہے
کیا بتائیں ان "داتا اب رہا نہیں جاتا، آپ عیش کرتے ہیں اور قوم بھوکی ہے
جن ذلیل شرطوں پر، جن ضعیف ہاتھوں میں، دی ہوئی یہ آزادی مغربی گروکی ہے
بوجھ سب ہے چیلوں پر، ہاتھ ہے نکیلوں پر، رہنما کا مقصد ہی طائف الملوکی ہے
غیر کی عطا کردہ، حکمت و سیاست پر، ناسزا قیادت پر، قوم کٹ بھی جاتی ہے
قوم ڈٹ بھی جاتی ہے، پھر بھی آج تک ہم نے، احتیاط کی حد میں تم سے گفتگو کی ہے
ٹھوکریں ہی کھائی ہیں، راحتیں گنوائی ہیں، آنکھ دی ہے چوروں کو پونجیاں لٹائی ہیں
رہنمائے پرفن سے، رہروانِ منزل سے، جب خیال بہکا ہے، جب نگاہ چوکی ہے

دس شعر کی اس غزل میں سے راقم الحروف نے صرف چار شعر نقل کیے ہیں۔
بحرِ طویل کا استعمال دیکھیے، قافیہ ردیف کی مشکل دیکھیے، الفاظ کے ساتھ شاعر کا سلوک دیکھیے، موضوعات اور نفس مضمون کی اہمیت دیکھیے اور پھر شعری رکھ رکھاؤ کے ساتھ تلخی وترشی کا ذائقہ دیکھیے، شآد عارفی نے دل کے پھپھولے نہیں پھوڑے بلکہ چٹکیاں لی ہیں۔ طنز اتنا واشگاف بھی نہیں کہ قاری کو ناگوارِ خاطر ہو۔

اس میں کوئی دورائے نہیں کہ شآد عارفی کے رنگِ غزل نے غزل کی ایک نئی جہت روشن کی ہے۔ رجعت پسندوں نے اسے پسند نہیں کیا، مگر وہ اپنے رنگ و آہنگ پر یہ سوچ کر قائم رہے کہ:

یہ حریفانِ کم نظر اے شآد
مجھ کو اک روز مان لیں گے آپ

......☆......

فاروق جائسی

شآد عارفی: غزل اور تغزل

شاد عارفی دبستانِ رام پور کے وہ خوش قسمت شاعر ہیں جن کو مظفر حنفی، خلیل الرحمٰن اعظمی اور مسعود اشعر جیسے باصلاحیت شاعر اور نقاد شاگرد حاصل ہوئے۔ ویسے تو ان کے اہم شاگردوں کی تعداد چالیس سے بھی متجاوز بتائی جاتی ہے مگر غالب کے لیے حالی ہی کی طرح شاد عارفی کے لیے مظفر حنفی بھی بہت اہم ثابت ہوئے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ اگر پروفیسر مظفر حنفی نے شآد عارفی کی شاعری پر قلم نہ اٹھایا ہوتا تو وہ بھی دیگر بہت سے فنکاروں کی طرح وقت کے غبار میں اتنا دب جاتے کہ انھیں ڈھونڈنا مشکل ہو جاتا۔ یہ پروفیسر مظفر حنفی ہی کا جذبۂ صادق تھا جس کی وجہ سے شآد عارفی پر کم و بیش ایک درجن کتابیں اور بہت سے مؤقر مضامین شائع ہو چکے ہیں۔

حال ہی میں پروفیسر خالد محمود نے بھی شاد عارفی پر ماہنامہ 'کتاب نما' کا خصوصی نمبر شائع کیا ہے اس کی رو سے شاد عارفی صاحب پر جو متعدد کتاب شائع ہوئی ہیں ان میں درجِ ذیل کتابیں ان کے فن، شخصیت اور شاعری پر حرف آخر کا حکم رکھتی ہیں:

''شوخیِ تحریر''، ''شاد عارفی کی غزلیں''، ''اندھیر نگری''، ''سفینہ چاہیے''، ''دکھتی رگیں''، ''کلیاتِ شاد عارفی''، ''باقیاتِ شاد عارفی''، ''شاد عارفی فن اور شخصیت''۔

(مطبوعہ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ دہلی)

اس کے علاوہ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی، بھوپال یونیورسٹی، کلکتہ یونیورسٹی اور ہردوئی

www.urduchannel.in

کے ریسرچ اسکالرس ان پر مختلف زاویوں سے پی ایچ ڈی کے مقالات یا تو لکھ چکے ہیں یا اب بھی لکھنے میں منہمک ہیں۔

شاؔد عارفی کو متفقہ طور پر ایک منفرد طنز نگار شاعر کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے۔ اس نظریہ فکر کے حامی مظفر حنفی بھی ہیں اور خلیل الرحمٰن اعظمی بھی جو شاؔد صاحب کے ارشد تلامذہ میں شمار کیے جاتے ہیں۔ ان حضرات نے اس بات کا کھل کر اعتراف کیا ہے کہ شاؔد عارفی اپنے گرد اگرد سب کو واشگاف طنز کا نشانہ بنائے رکھتے تھے۔ اس طنز کے دائرہ میں سماجی بدعنوانیاں ہی نہیں نوابین اور اہل کاران سرکار بھی تھے، اس وقت کا شعری رویہ ہی نہیں ترقی پسند تحریک اور اس کے علمداران بھی تھے۔ یہی نہیں ان کا ہدف مؤقر رسائل کے مدیر بھی تھے اور اپنے وقت کے مانے ہوئے ناقد نیاز فتحپوری بھی تھے۔ نتیجہ ظاہر ہے کہ وہی ہوا جو یاس یگانہ چنگیزی کے ساتھ ہوا تھا یعنی انھیں یکسر نظر انداز کیا گیا۔

ان کی معاشی بدحالی نے انھیں اور بھی بدمزاج، بد دماغ، چڑچڑا اور غصہ ور بنا دیا تھا، چوں کہ وہ لوگوں کا دل جیتنا نہیں جانتے تھے، رواداری، انکساری اور صلح پسندی سے کوسوں دور تھے، اس لیے اس دور کے اہم ناقدین نے انھیں جان بوجھ کر نظر انداز کیا۔ میں خلیل الرحمان اعظمی کے اس جملے سے بالکل متفق ہوں کہ وہ '' طبعاً بہت معصوم اور بھولے بھالے تھے۔'' کوئی بھی انھیں آسانی سے مشتعل کر سکتا تھا جس سے وہ پھکڑ پن، مبتذل فقرے بازی اور طنزیہ اشعار موزوں کرنے میں جٹ جاتے تھے مگر اتنی ہی آسانی سے مان بھی جاتے تھے جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ دراصل ان میں قوتِ برداشت کا فقدان تھا جس کے نتیجے میں وہ مندرجہ ذیل قسم کے اشعار کہتے اور اپنی جھلاہٹ اور غصہ کو کم کرنے کی کوشش کرتے رہتے تھے:

انھیں ہمراہ لیتا جا ذرا ٹکیا بنا لینا
ارے صیاد! دو انڈے بھی رکھے ہیں نشیمن میں

غالب کے شعر نام سے میرے سنا کے دیکھ
پھر اعتراضِ ناقدِ فن آزما کے دیکھ

ہمارے ہاں کی سیاست کا حال مت پوچھو
گھری ہوئی ہے طوائف تماش بینوں میں

www.urduchannel.in

ہے تو احمق ، چونکہ عالیشان کاشانے میں ہے
اس لیے جھک مارنا بھی اس کا فرمانے میں ہے

وہ ہمیں تلقین فرماتے ہیں ایسے مشورے
جیسے اندھوں سے کہا جائے کہ '' بائیں ہاتھ کو''

کان کھا چکا ناصح، جان کھا چکا ناصح
کیا یونہی سنے جاؤں یا برا بھلا کہہ دوں

معرفت کی یہ منزل مجھ سے طے نہیں ہوگی
جو مجھے برا سمجھے، میں اسے بھلا کہہ دوں

اس میں قطعی دو رائے نہیں ہو سکتی کہ ان کے متوازن طنزیہ اشعار اپنی مثال آپ ہیں۔ اس میدان میں ان کا مرتبہ وہی ہے جو نظیر اکبرآبادی، غالب، اکبرالٰہ آبادی اور یاس یگانہ کا ہے۔ وہ سماج کی کج روی، احباب کی کج ادائی اور ارباب اقتدار کی کج کلاہی پر جو طنز کرتے ہیں اس سے سماج میں بہتری آئے نہ آئے مگر سامعین و قارئین کے لبوں پر تبسم ضرور آجاتا ہے، یہی ان کے طنزیہ اشعار کا حاصل بھی ہے اور ان کے فن کا اعتراف بھی۔ اس ضمن میں بھی چند اشعار پیش کرنا چاہتا ہوں:

یہ فنِّ طنز، مرے حق میں در حقیقت شاؔد
بہت '' بڑا المیہ'' ہے اختصار کے ساتھ

کسی رئیس کی لڑکی، کسی غریب کے ساتھ
نکاح عیب سمجھتی ہے، بھاگ سکتی ہے

آئی ہیں میرے طنز کی چھینٹیں تو سبھی پر
یہ کیا کہ فقط آپ برا مان رہے ہیں

عظمتِ فن کی روایات کو مرنے نہ دیا
شعر سے بچ کے کوئی ظلم گزرنے نہ دیا

چاپ سن کر جو ہٹا دی تھی اٹھا لا ساقی
شیخ صاحب ہیں میں سمجھا تھا مسلماں ہے کوئی

صرف اپنوں کے تقرر کا ارادہ ہوگا
اور اخبار میں اعلانِ ضرورت دیں گے

اس نے جب سو تیر چلائے
میں نے ایک غزل چپکا دی

آپ کے دل کو اذیت ہوگی — میں اگر آپ کی باتوں میں نہ آؤں

تعریف کے لہجے میں تذلیل کا پہلو ہے — جو آپ نے برتا ہے وہ 'آپ' نہیں 'تو' ہے

کچھ ناقدین نے شاد عارفی کی شاعری کے طنزیہ پہلو کو زیادہ اہمیت دی ہے۔ جب کہ شاؔد عارفی کی غزلوں میں بھرپور غنائیت اور غزلیہ شاعری کے دیگر مستحسن لوازمات کی کمی نہیں ہے۔ اس بات کی اہم ضرورت ہے کہ ان کی شاعری کا مکمل احاطہ کیا جائے اور ان کی غزلوں پر سیر حاصل گفتگو کی جائے۔ ان کے اشعار اپنے ہم عصروں کے اشعار سے نیچے نہیں رکھے جا سکتے۔ ان کے اشعار میں عمدہ اور بڑی شاعری کے وہ سارے عنصر پائے جاتے ہیں جن سے ایک شاعر بڑا اور منفرد شاعر کہلانے کا حقدار ہوتا ہے۔ ہر چند کہ شاؔد صاحب یہ اعلان کرتے ہوں کہ:

ساتھ کھیلے کی محبت بڑھ کے بن جاتی ہے عشق — اس سے زائد عشق کا اے شاؔد میں قائل نہیں

دس پانچ سال حضرتِ حالی کی طرح شاؔد — مجھ کو بھی جنونِ لب و رخسار رہا ہے

مگر ان کی شاعری میں حسن و عشق کے وہ سارے پہلو بہت روشن اور تابناک ہیں جن میں وارداتِ حسن و عشق کا بیان ہوا ہے۔ دلی جذبات و احساسات کی ترجمانی میں ان کے اشعار نہ صرف یہ کہ کامیاب ہیں بلکہ ذہن و دل کو فرحت و انبساط سے ہمکنار کرتے ہیں۔ زبان و بیان کی صفائی اور رام پور اسکول کا لہجہ بھی ان کے اشعار میں الگ تاثر پیدا کرتا ہے:

ہلال اور بدر کے تقابل نے محوِ حیرت بنا دیا ہے
وہ عید کا چاند دیکھتے ہیں، میں ان کی صورت کو دیکھتا ہوں
شراب، ساقی، صراحی، میخانہ قابلِ دید ہوں مجھے کیا
کسی کی آنکھوں کے سرخ ڈوروں سے پی کے مخمور ہو رہا ہوں
میں کیا کہوں گا وہ کیا سنیں گے، وہ کیا کہیں گے میں کیا سنوں گا
اسی تذبذب میں شاؔد میں ان کے در پہ ڈر ڈر کے جا رہا ہوں

جب وہ پاس سے گزرا مثلِ نکہتِ گلشن — جی میں آئی چپکے سے حرفِ مدعا کہہ دوں

www.urduchannel.in

شبِ مہتاب وہ پھولوں کا زیور، منتشر زلفیں — بقولِ راز داں کیا خوشنما منظر رہا ہوگا

ان کی عشقیہ شاعری میں ہوسنا کی یا ابتذال کا احساس نہیں ہوتا بلکہ ایک خاص قسم کا رکھ رکھاؤ، عزتِ نفس اور محبوب کے احترام کا جذبہ پایا جاتا ہے۔ وہ حسرت موہانی ہی کی طرح حسن کو دور سے دیکھتے ہیں اور لطف لیتے ہیں۔ انھیں تو محبوب کا تذکرہ ہی کافی ہوتا ہے، وہ غالب کی طرح ''دھول دھپا'' کے قائل ہی نہیں ہیں۔ مندرجہ ذیل اشعار میرے بیان کی تصدیق کر رہے ہیں:

احترامِ جلوہ چینی یہ بھی کچھ تھوڑا نہیں — آنکھ نے جس پھول کو دیکھا اسے توڑا نہیں

ذکرِ قربِ دوست ہی میرے لیے کافی ہے شاؔد — جب کہ اربابِ غزل کہتے وہ ہم آغوش تھا

انھوں نے ہر جگہ محبوب کی عزت کا خیال رکھا۔ اسے رسوائی سے بچانے کی ہر ممکن کوشش کی۔ بے قراری میں بھی احتیاط کا دامن نہیں چھوڑا مگر انھوں نے محبوب کے سامنے بھی اپنی پٹھانی انانیت کو سرنگوں نہیں ہونے دیا۔ عشق کے آزار، اس کی تکالیف برداشت کر لینا انھیں گوارہ ہیں مگر محبوب کے سامنے رونے گڑگڑانے کو اپنا وتیرہ بنانا انھیں منظور نہیں ہے۔ محبوب کے سامنے ان کے یہ تیور شاید شاؔد ہی کا حصہ ہیں۔ ان کے اشعار میں مکالمہ و محاکمہ کا مزہ بھی ہے، زبان کی چاشنی بھی اور روزمرہ کی برجستگی بھی:

محبت میں خودی کی موت بھی دیکھی نہ جائے گی — اگر میں بارِ خاطر ہوں تو اٹھ جاؤں ترے در سے

جھٹک کے ہاتھ سے دامن کو جانے والے، بس — ترے خیال کا دامن بھی چھوڑتا ہوں میں

کس طرف روئے سخن ہے، نام اس کا لیجیے — بن بلائے آپ کی محفل میں آتا کون ہے

آنکھوں کے پاس کوئی خزانہ تو ہے نہیں — پلکوں پہ آنسوؤں میں کہاں تک لہو نہ آئے

شاؔد عارفی کی شاعری میں غاؔلب ہی کی طرح ظرافت کا شوخ رنگ بھی نظر آتا ہے جو ان کی شاعری کی جہات میں اضافہ کا باعث بھی ہے اور قارئین کے لیے نشاط کا سامان بھی:

پھانس نکلوانے کے کارن دے دیتا ہوں ہاتھ میں ہاتھ
موقع پا کر ران میں چٹکی بھر لیتا ہوں لیکن وہ
یہ گدگدانا، یہ بوسۂ لب اسی کا ردعمل سمجھیے
ابھی جوار شاد ہو رہا تھا کہ ہم سے کیوں کوئی بولتا ہے

شاد عارفی کو اگر ہم جدید لہجے کے بنیاد گزاروں کی صفِ اول میں رکھیں تو بیجا نہ ہوگا۔ وہ بھی نظیر، غالب اور یگانہ کی طرح نئے اندازِ فکر کی تلاش میں رہتے تھے۔ عام روش سے ہٹ کر شعر کہنا ان کا طرۂ امتیاز ہے۔ مندرجہ ذیل اشعار سے ان کا ذہنی میلان صاف ظاہر ہوتا ہے۔ انھوں نے نہ صرف جدید طرزِ سخن اختیار کیا بلکہ اس کی توسیع میں قابلِ قدر کارنامہ انجام دیا ہے۔ انھوں نے خیالی اور غیر حقیقی مضامینِ شعر سے اجتناب برتنے اور اپنے اشعار کو عوام کے جذبات سے ہم آہنگ کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے:

شراب و شاہد کے تذکرے ان سے چھین لیجے تو کیا کریں گے
شراب وشاہد کے تذکروں تک ہی جن کی جادو بیانیاں ہیں

دوسروں کی داستانِ عشق اپناتے ہیں وہ
جن سخن سازوں کی اپنی داستاں کوئی نہیں

ان کے کلام سے بہترین اشعار کی بہت سی مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں جن میں ندرتِ کلام، زبان کی صفائی، خوبصورت محاورہ بندی، برجستگی، شستگی، غنائیت، لفظیات کا فصیح و برمحل استعمال اور وطن سے محبت کا عنصر، بحور کا تنوع، تابع مہمل کا استعمال اور لمبی بحور کی غزلیں دیکھی جاسکتی ہیں۔ مروجہ ارکان سے زیادہ تعداد میں ارکان کا استعمال اس شعر میں دیکھیں:

کارواں کے کاندھوں پر رہروی سے کیا حاصل، سنگِ میل گن گن کر قطعِ راہِ منزل کیا
آپ نے سیاست کی، پاؤں میں کوئی کانٹا، ہاتھ میں کوئی چھالا، خاک جستجو کی ہے

یہ ساری خصوصیات ان کی غزلوں، نظموں، رباعیات، قطعات، منظوم خاکوں (آپ کی تعریف) اور خطوط میں نظر آتی ہیں۔ ان کے کلام کا مجموعی مطالعہ کرنے کے بعد ہر صاحبِ نظر انھیں نہ صرف یہ کہ رام پور اسکول کا نمائندہ شاعر تسلیم کرے گا بلکہ انھیں اردو شاعری کے حوالے سے صنفِ اول کے شعراء میں شمار کرنے میں کوئی ہچک نہیں محسوس کرے گا۔

......☆......

ڈاکٹر افضل مصباحی

شاد عارفی کی غزل گوئی

شادؔ عارفی نے غزل گوئی کا آغاز ۱۹۱۷ء سے کیا۔ یہ سلسلہ ۱۹۶۴ء تک جاری رہا۔ ان کی آخری تخلیق کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ غزل تھی۔ تقریباً نصف صدی پر محیط ان کی غزلوں کی دنیا ایک سمندر کے مانند ہے، جس میں جتنا غوطہ لگایا جائے اتنے ہی ہیرے موتی نکلتے ہیں اور جدید اردو شاعری کو مالا مال کرتے ہیں۔ شادؔ عارفی کی غزلوں کو پڑھ کر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے جس لب ولہجہ کو اختیار کیا، وہ غزلوں کے لیے بالکل نیا تھا۔ ان کی غزلوں کی دنیا میں سچی اور سنجیدہ طنز نگاری کی بستیاں آباد ہیں۔ ان کی پوری شاعری میں بالعموم ریاکاری، چاپلوسی، داؤ پیچ، دروغ گوئی یا ملمع سازی کی دور دور تلک جھلک دکھائی نہیں دیتی۔ وہ حق بات کہتے ہیں، اسی لیے انتہائی مضبوطی کے ساتھ اپنی بات کہنے میں کامیاب نظر آتے ہیں۔ یہ سب جانتے ہیں کہ حق بات کڑوی ہوتی ہے، جو خال خال ہی لوگوں کو راس آتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انھیں کسی خاص گروہ سے منسلک کر کے دیکھنا آسان کام نہیں ہے۔ وہ ترقی پسند شاعر ضرور تھے، لیکن اس کا ڈھنڈورہ نہیں پیٹتے تھے۔ شادؔ عارفی کی بے باکی، ہمت و جرأت اور صاف گوئی نے انھیں ہم عصر ادیبوں، شاعروں اور نقادوں سے الگ تھلگ ضرور کر دیا تھا، جس کا انھیں زندگی بھر نقصان بھی اٹھانا پڑا، لیکن مخالفین کے اس رویے نے انھیں مزید مضبوط کیا اور اس مضبوطی نے جگہ جگہ انانیت اور مزاج کی تلخی کو بھی جنم دیا۔ ان تمام کے باوجود ان کی غزلوں میں زندگی کے گہرے جذبات، سماج کی سچی تصویر، سرمستی و بے خودی جیسے اوصاف نمایاں طور پر نظر آتے ہیں۔

www.urduchannel.in

سماج کی تصویر کو ان اشعار میں ملاحظہ کر سکتے ہیں:

یوں ہی آپس کے جھگڑوں کے معنی گر ہم 'حجّت' لیں گے
یارو! سنبھلو، سوچو، سمجھو، کیا انجامِ حجت ہوگا

....

جب تک نہ میکدے میں لڑا کر پییں گے جام
مل پائیں گے نہ شیخ و برہمن کبھی گلے
دنیائے بے کسی کا تمھیں تجربہ کہاں
تم کیا سمجھ سکوگے غریبوں کے مسئلے

....

سچ تو یہ ہے کہ شاؔد صاحب کی غزلوں میں جگہ جگہ سماج کی ایسی تصویر دیکھنے کو ملتی ہے جو بہت کم شاعروں کے یہاں پائی جاتی ہے۔ پروفیسر اختر انصاری دہلوی لکھتے ہیں:

''وہ شاعری کو سماج اور زندگی سے الگ نہیں سمجھتے تھے۔ شاعرانہ فکر کا مقصد ان کے نزدیک لاشعوری اور نیم شعوری جذبات کی کیچڑ اور دلدل میں غوطے لگانا نہیں، زندگی کو اعلیٰ اقدار کی روشنی میں جانچنا، پرکھنا، سجانا اور سنوارنا تھا۔''(۱)

چنانچہ ان کی غزلوں میں جا بجا یہ تصویر نظر آتی ہے، بلکہ اس وقت کے سماج اور معاشرے کو اگر کوئی سمجھنا چاہے تو شاؔد عارفی کی شاعری بہت حد تک معاون ثابت ہو سکتی ہے۔ خاص طور پر رامپور شہر کی تہذیب ان کی شاعری پر پوری طرح حاوی ہے۔ رام پور کے نوابوں کی عیش و عشرت بھری زندگی، ان کے سوچنے کا انداز، ان کا طور طریقہ، ان کے معاشرتی حالات کو اگر کوئی اچھی طرح سمجھنے کا خواہاں ہو تو شاؔد عارفی کی شاعری خواہ وہ غزل ہو یا نظم یا رباعی، ان سب کا مطالعہ کر لے، اس وقت کا پورا نقشہ سمجھ میں آ جائے گا۔ اچھے فنکار کی یہی خوبی ہوتی ہے کہ اس کا مزاج اس کی تخلیق سے ہم آہنگ ہو اور اس میں تصنع کا شائبہ تک نہ ہو، تب کہیں جا کر دل کی آواز نکلتی ہے اور اسی سے اس کی پہچان بھی ہوتی ہے۔ پروفیسر خالد محمود لکھتے ہیں:

www.urduchannel.in

''شاد صاحب کا مزاج اپنی شاعری کے مزاج سے گہری مطابقت رکھتا ہے اور پوری طرح ہم آہنگ ہے، اس لیے ان کی انفرادیت اکتسابی نہیں بالکل فطری ہے۔''(۲)

اس فطری انفرادیت کی سب سے بڑی وجہ سنی سنائی باتوں پر یقین کرنے کی بجائے آنکھوں دیکھی پر شاؔد عارفی کا بھروسہ کرنا ہے۔ ان کے کرداروں میں جیتے جاگتے لوگوں کی سچی تصویر نظر آتی ہے۔ وہ خود ایک جگہ لکھتے ہیں:

''بعض حالتوں میں مغرب زدہ خاندانوں کے برہنہ اطوار کی مذمت میں برہنہ تلوار بھی بن جاتا ہوں، یہاں یہ بات بھی بتاتا چلوں کہ میری ایسی کوئی نظم 'ہوائی' نہیں ہے۔ ہر نظم کا ماڈل میرے سامنے رہا ہے۔ شاعرانہ بناوٹ ضرور ہے، مگر نظم بے سروپا ہو، یہ تصور غلط ہوگا۔''(۳)

یہی حال ان کی غزلوں کا ہے۔ غزلوں میں بھی انھوں نے جیتے جاگتے سماج کی تصویر پیش کی ہے اور زندگی کے گہرے جذبات کا مظاہرہ کیا ہے۔ ملاحظہ فرمائیں:

تم عشرت سے فارغ ہو کر مجھ سے پوچھو، میں واقف ہوں
کس کس بیچارے کی خواہش نغموں سے محروم رہی ہے

....

اے شاؔد میں اکثر غزلوں میں، اے شاؔد میں اکثر نظموں میں
مجھ پر بھی صادق آتی ہے، ایسی جگ بیتی کہتا ہوں

مایوسی اور حسرت و یاس کے اس عالم میں امید و بیم اور رجائیت کا انداز بھی شاؔد عارفی کی غزلوں کو ایک نئی زندگی عطا کرتا ہے۔ چنانچہ غزل کا یہ شعر ملاحظہ فرمائیں:

خلوصِ عہدِ وفا سازگار آئے گا
کبھی تو مرحلۂ اعتبار آئے گا

جس انجمن میں دلوں کے قرار لٹتے ہیں
اس انجمن میں پہنچ کر قرار آئے گا

اس پوری غزل میں شادؔ صاحب نے مایوسی کا دامن چھوڑ کر آگے بڑھنے کی کوشش کی ہے، گو کہ وہ اپنے غم کو چھپا نہیں پا رہے ہیں، لیکن اس امید کے ساتھ جیے جا رہے ہیں کہ کلی کے ساتھ خاروں کو بھی آنے کی اجازت ملتی ہے۔ چنانچہ یہ اشعار کیا ہی خوب ہیں:

'نثارِ حسنِ محبت رہی ہے' دیکھو گے
کلی کے ساتھ ہی شاخوں پہ خار آئے گا

ماحول جا رہا ہے مخالف تو کیا ہوا
آثار کہہ رہے ہیں کہ آئیں گے دن بھلے

شادؔ عارفی کی غزلوں کی سب سے بڑی خصوصیت ان کا منفرد انداز ہے۔ معروف نقاد اور محقق پروفیسر مظفر حنفی لکھتے ہیں:

''وہ ایک خاص طرز کے شاعر تھے اور اردو کے معدودے چند صاحبِ اسلوب قلمکاروں میں شمار کیے جاتے ہیں۔ اپنے مخصوص لہجے کی بنا پر ان کی غزلیں اور نظمیں دور سے پہچان میں آجاتی ہیں۔'' (۴)

ایسے قلم کار کو ان کے ہم عصروں نے کس طرح کا سلوک کیا، اس کے بارے میں آپ لکھتے ہیں:

''افسوس کہ ایسے نامور اور بڑے فنکار کو اس کے مقامی ہم عصر شاعروں اور ادیبوں نے طرح طرح سے پریشان کیا، کیونکہ ان میں سے بیشتر شادؔ عارفی کی طنزیہ شاعری کے اہداف تھے۔ نتیجے کے طور پر شادؔ عارفی کو زندگی بھر عسرت اور تنگدستی کا سامنا کرنا پڑا۔'' (۵)

مجھے لگتا ہے کہ ہم عصروں کی اسی معاندانہ روش نے انھیں اونچی پرواز عطا کی اور تندیِ بادِ مخالف نے بلندی تک پہنچنے کا حوصلہ دیا۔ ان سے چپقلش رکھنے والے گمنامی کے پردے میں چھپ گئے اور شادؔ عارفی عزت و شہرت اور مقبولیت کے اعلیٰ مقام پر فائز ہو گئے۔ اچھے فنکار اور بناوٹی ڈھنڈورچی کے مابین یہی فرق ہوتا ہے۔ شادؔ صاحب کی

www.urduchannel.in

غزلوں میں ادبیت کی چاشنی، شعریت کا لطف، صناعانہ دروبست، فنکارانہ حسن، تشبیہات و استعارات اور تلمیحات کا سلیقے سے استعمال خوب دیکھنے کو ملتا ہے۔ ان کے تخیل کی بازگشت رامپور کے نوابی ماحول سے مواد حاصل کرتی ہے۔ ان کے المیہ اشعار میں جو طنز پایا جاتا ہے، وہ حساس طبیعت کو پژمردہ کر دینے کے لیے کافی ہے۔ انھوں نے سماج کی بڑھتی بے راہ روی پر جو نشتر چبھوئے ہیں، وہ تیر بن کر چھلنی کرتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ اپنے معاندین کو بھی شاد صاحب نے اپنی غزلوں میں خوب نشانہ بنایا ہے۔ اپنی طنز کے بارے میں آپ خود کہتے ہیں:

اپنی طنزوں کے بارے میں آپ سے میں یہ عرض کروں گا
آئینہ جس ہاتھ میں ہوگا اس کی حسبِ صورت ہوگا

....

کج خصلت سے 'نیک توقع' رکھنے کے یہ معنی ہوں گے
پھول نگاہوں میں کھٹکے گا، کانٹا صَرفِ زینت ہوگا

....

ان کی غزلوں کا کمال یہ بھی ہے کہ انھوں نے طنز کے لیے بھی ایسے ہی الفاظ کا استعمال کیا ہے، جو محبت کے اظہار کے لیے کیا جاتا ہے۔ جیسے الفت، محبت، تبسم، آنچل، میکش، آوازے، مسکان، گلشن، صبحِ بہاراں، گیسو، رخسار، جبیں، سرگوشی، زلف، گریبان، التفات، جام، پیام اور میکدہ وغیرہ۔ ان الفاظ کی ایسی ترتیب جو نشتر چبھونے کا کام کرے، یہ شادؔ صاحب کے یہاں بدرجۂ اتم پائی جاتی ہے۔ ان کے کلام میں برجستگی تو ایسی ہے کہ کہیں سے کہیں تک کسی رکاوٹ کا تصور بھی نہیں ہوتا ہے۔ ملاحظہ ہو:

سکوت بھی، قیام بھی لحاظِ صبح و شام بھی
اصولِ جستجو نہیں کہ چل پڑے تو چل پڑے

....

کہتا ہوں بلندی کی پستی، پستی کو بلندی کہتا ہوں
جب الٹی گنگا بہتی ہے، میں اُلٹی سیدھی کہتا ہوں

جیسا کہ میں نے تذکرہ کیا کہ اپنوں نے انھیں خوب چوٹ پہنچائی، محبت میں بھی ناکامی ہاتھ آئی، اسی لیے اس نوعیت کے اشعار آپ کے یہاں خوب ملتے ہیں:

تم کیوں چونکے، تم کو تو نہیں، اپنوں کو کہا ہے نا منصف
تم کیوں بگڑے، تم کو تو نہیں، اپنوں کو فریبی کہتا ہوں

....

مالی کے دھندلے ماتھے پر کچھ اوس دمکنے لگتی ہے
جب پھولوں کے مرجھانے کو موسم کی خرابی کہتا ہوں

شاؔد عارفی کو وطن سے بے پناہ محبت تھی۔ آزادی کے بعد جو لوگ ہندوستان چھوڑ کر ہجرت کر گئے، ان کے خلاف تو گویا آپ شمشیر برہنہ نظر آتے ہیں:

تمھاری فرزانگی سے کچھ کم نہیں ہے دیوانہ پن ہمارا
تمھیں مبارک تمھاری ہجرت، ہمیں مبارک وطن ہمارا
وطن کی اس سرزمین کو اے شاؔد کون سے دل سے چھوڑ دیں ہم
وطن کی جس سرزمیں پہ گزرا ہے دورِ دار و رسن ہمارا

عام طور پر ناقدین اس بات پر متفق نظر آتے ہیں کہ شاؔد عارفی نے غزل میں تغزل سے انحراف کیا ہے۔ ان کی غزلوں کو نثری ترکیب کے مماثل بھی قرار دیا جاتا ہے۔ راقم کے نزدیک اس کی سب سے بڑی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ انھوں نے اپنی غزلوں کے لیے عشق و عاشقی اور پیار محبت کے علاوہ جن موضوعات کا انتخاب کیا ہے، ان میں بہت ہی زیادہ تنوع پایا جاتا ہے۔ شاؔد صاحب نے تقلید کی بجائے نئی کشتی، نئی آندھی اور نیا طوفان پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان کے طنز کا جو سیلاب ہے، اس میں اس وقت کے بیشتر ناقدین معاندین چھینٹا کشی کرنے والے سب تنکوں کی مانند ادھر اُدھر بہتے نظر آتے ہیں۔ ظاہر ہے ان کی شاعری مقصدیت پر مبنی شاعری ہے، جس کے لیے انھوں نے جو زمین تیار کی ہے، وہ ان کی اپنی ہے۔ یقیناً یہ عاریتاً لینے سے ہزار درجہ بہتر ہے۔ ان کے مخاطب ہونے کا انداز جداگانہ ہے، جس میں محبوب کی جدائی میں مرتے رہنے کا غم یا اس کی وجہ سے دل پر گزرنے

www.urduchannel.in

والی کیفیت کی بجائے سماج میں پھیلی برائیوں کا سینہ چیر دینے والا ایسا نشتر پایا جاتا ہے، جو پڑھنے والوں کو سو بار سوچنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ ان کا یہ شعر اس دعوے کی صداقت پر دال ہے:

جدھر وہ کہہ دیں، ادھر کو چل دیں، اصول بدلیں روش بدل دیں
یہ ہم سے ممکن نہیں ہے اے شاؔد، ان کو یہ بدگمانیاں ہیں

آپ وہ شاعر نہیں جو پیار کی خاطر اپنے اصولوں کو بدل دیں یا محبوب کی انگلیوں کے اشارے پر ناچنے کے لیے تیار بیٹھے رہیں، بلکہ شاؔد صاحب کا ہدف تو کچھ اور ہے، جو اس سے اعلیٰ و انصب ہے۔ شاؔد صاحب کبھی کسی سے ڈرتے نہیں تھے۔ اپنے موقف پر قائم رہتے اور اس کے لیے کٹ حجتی کی بجائے حوالوں سے بحث کرتے ہیں۔ پروفیسر مظفر حنفی کی مرتب کردہ کتاب ''نثر و غزل دستہ'' (شاد عارفی کے مضامین، نظمیں اور غزلیں وغیرہ) میں شائع مضامین کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے معترضین کے اعتراضات کے جوابات میں اپنی خاصی توانائی صرف کی ہے۔ ہر سوال کا جواب جس محققانہ انداز میں دیتے ہیں، اس سے فن پر قدرت اور عروض و بلاغت کے علاوہ زبان و بیان پر ان کی دسترس کا اندازہ ہوتا ہے۔ طریقۂ استدلال مدلل اور عالمانہ ہے۔ ان کی غزلوں کو اچھی طرح سمجھنے کے لیے ان کے مضامین کا مطالعہ بھی از حد ضروری ہے، اس لیے کہ بہت سے اشعار میں انھوں نے قوسین کا استعمال کیا ہے، جس کا اشارہ سمجھنے میں ان کی تحریروں سے مدد ملتی ہے۔ پس منظر کو سمجھے بغیر جن حضرات نے ان کی شاعری پر تنقید کی ہے، وہ بری طرح غچا کھا گئے ہیں۔ ایسے ہی ایک واقعہ کا تذکرہ کرتے ہوئے شاؔد صاحب لکھتے ہیں:

''عدم واقفیت سے منسوب کر کے کہیں کا مواد کہیں نکالا گیا اور اس 'مواد' کے سلسلے میں گھٹنا مار کر آنکھ پھوڑنے کی فضول کوشش کی گئی، کی جا رہی ہے، کی جاتی رہے گی۔''(۶)

ان کا یہ اندیشہ ماضی، حال اور مستقبل تینوں کے لیے تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ ان کی غزلوں کی تفہیم میں ان ہی کی دوسری غزلیں معاون ثابت ہوتی ہیں۔ جیسے ایک شعر میں

شادؔ عارفی غزل کی جان مخصوص رمزیت اور ایمائیت کی بجائے حقیقتوں کی تلخیوں کے ساتھ لطافت بیان واقعہ کو قرار دیتے ہیں۔ جیسے:

حقیقتوں کی تلخیوں کے ساتھ شادؔ عارفی
لطافتِ بیان واقعہ غزل کی جان ہے

شادؔ عارفی کی انہی خوبیوں کی وجہ سے انھیں اکبرؔ الہ آبادی سے بڑا طنز نگار شاعر تسلیم کیا گیا اور غالبؔ کے مدمقابل کھڑا کر کے دیکھنے کی کوشش کی گئی۔ ظاہر ہے اس کی وجہ ان کی اپنی سوچ، ان کا اپنا میدانِ عمل اور ان کا اپنا انداز ہے۔ فرمان فتحپوری لکھتے ہیں:

’’مجھے اردو غزل کی پوری تاریخ میں صرف دو ہی ایسے نام نظر آتے ہیں جن کے متعلق کہا جا سکتا ہے کہ انھوں نے غزل سے با مقصد اور سنجیدہ طنز نگاری کا بھرپور کام لیا ہے۔ میری مراد مرزا نوشہ اسداللہ خاں غالبؔ اور شادؔ عارفی سے ہے۔ دونوں نسلاً پٹھان ہیں اور دونوں کو شاعری سے زیادہ آباء واجداد کے پیشۂ سپہ گری پر ناز ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ وہ اپنی زبان اور طرز بیان سے تیغ جوہردار کا کام لینے اور مدِ مقابل پر بے محابا وار کرنے سے نہیں چوکتے۔ لیکن دو باتیں شادؔ عارفی کے طنزیہ لہجے کو بالکل الگ کر دیتی ہیں ایک تو یہ کہ شعروں میں طنزیہ لہجہ غالبؔ کے اسلوب کا ایک جزو ہے اور شادؔ عارفی کے طنز کا دائرہ، انداز نظر اور موضوع ہر اعتبار سے غالبؔ کے مقابلے میں وسیع، با مقصد اور بہت واضح ہے۔‘‘(۷)

ان کی غزلوں کو اسی سوچ کے ساتھ سمجھنے کی کوشش کی جائے تو اس عظیم شاعر کی تخلیقات کو اچھی طرح سمجھا جا سکتا ہے اور نئی نسل کو ان سے استفادہ کا موقع فراہم کیا جا سکتا ہے۔

شادؔ عارفی کی غزلوں میں محاورہ، روزمرہ اور ضرب المثل کا جگہ جگہ استعمال بھی ان کی غزلوں کو انفرادی شان عطا کرتا ہے۔ ’ناچ نہ آئے آنگن ٹیڑھا‘، ’اللہ مہربان تو گدھا

www.urduchannel.in

پہلوان‘، ’گھوڑے بیچ کر سونا‘، ’چور کی داڑھی میں تنکا‘ وغیرہ کا اشعار میں استعمال اور وہ بھی پوری سلاست کے ساتھ یہ صرف اور صرف شادؔ صاحب کے حصے میں آیا ہے۔ ان کی غزلوں میں صرف طنز ہی طنز نہیں ہے، بلکہ عشقیہ رنگ بھی موجود ہے۔ محبوب سے جدائی کا غم شادؔ صاحب کو بھی ستاتا ہے اور ان کی پریشانیوں میں اضافہ کرتا ہے۔ ملاحظہ فرمائیے:

بربادیوں کو ہم نے گلے سے لگا لیا
ان کی خوشی کو اپنے موافق بنا لیا

....

حق ہے کہ ستاؤ مگر اتنا نہ ستاؤ
پڑ جائے مری آنکھ کسی اور حسیں پر

....

ہاتھ میں جام اٹھانا تو بڑی بات نہیں
کوئی پتھر کوئی کانٹا رہ منزل سے اٹھا

شادؔ عارفی نے زندگی کے جن تلخ حقائق کا مشاہدہ کیا، وہ ان کے لیے کرب انگیز تھا۔ غلام ہندوستان میں دیس واسیوں کی رسوائی، آزاد ہندوستان میں قتل و غارت گری، تقسیم وطن کے بعد بڑی تعداد میں مسلمانوں کی ہجرت، سماجی بے راہ روی، مغربی تہذیب کی طرف بڑھتا رجحان، ان کی اپنی شخصیت پر اپنوں اور غیروں کے حملے، یہ سب ایک ساتھ انھیں سہنا پڑے، جس کا اثر ان کی شاعری پر بھی پڑتا ہے:

عہدِ ظلم و آزادی میں ذوق و شوق برابر دیکھا
اس نے میری گردن دیکھی، میں نے اس کا خنجر دیکھا

برابر ہیں فغان درد و نغمہ
یہ آزادی نہیں تو اور کیا ہے

مجموعی طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ شاد صاحب کی غزلوں میں وہ تمام خصوصیات پائی

جاتی ہیں، جو کامیاب غزل گوئی کے لیے ضروری ہیں۔ طنز کے تیر چلا کر اصلاح کی کوشش، صالح اقدار، شاعرانہ صداقت، سسکتی کراہتی انسانیت کی جھلک، سماج اور معاشرے کی سچی تصویر شاؔد صاحب کی غزلوں کی نمایاں خصوصیات ہیں۔

حوالے

(۱) کتاب نما کا شاد عارفی نمبر، صفحہ:۵۴، شمارہ فروری ۲۰۱۴ء، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی

(۲) ایضاً، صفحہ:۶

(۳) سلطان اشرف۔ 'سفینہ چاہیے'، صفحہ ۱۵

(۴) کتاب نما کا شاد عارفی نمبر صفحہ:۷، شمارہ فروری ۲۰۱۴ء، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی

(۵) ایضاً صفحہ:۶

(۶) 'نثر و غزلدستہ' (شاؔد عارفی کے مضامین، نظمیں اور غزلیں وغیرہ) صفحہ ۱۹-۲۰، مرتب پروفیسر مظفر حنفی، مطبع مرکز ادب، بدھوارہ، بھوپال، نمبر ۱

(۷) کلیات شاؔد عارفی، مرتب: پروفیسر مظفر حنفی

......☆......

ڈاکٹر شریف احمد قریشی

ایک ناشاد شاعر شاؔد عارفی

www.urduchannel.in

احمد علی خاں عرف لڈّن المتخلص بہ شاؔد عارفی کی ولادت پنجاب اسٹیٹ کے لوہارو میں ۱۹۰۰ء سے ۱۹۰۳ء کے درمیان ہوئی تھی۔ ان کے والد کا اسمِ گرامی محمد عارف اللہ خاں اور والدہ کا نام خورشید بیگم تھا۔ والدہ کے مطابق ان کی پیدائش ۱۹۰۰ء میں اور والد کے مطاق ۱۹۰۳ء میں ہوئی تھی۔ وہ ۱۹۰۹ء میں اپنے والد اور نانا کے ساتھ رامپور میں آ کر مقیم ہو گئے تھے اور انھوں نے یہیں تعلیم بھی حاصل کی تھی۔ ان کا دادیہال افغانستان اور ننہال رامپور میں تھا۔ جب وہ پندرہ سال کی عمر میں میٹرک یعنی دسویں جماعت کے طالب علم تھے کہ اسی زمانے میں ان کے والد اس جہانِ فانی سے کوچ کر گئے۔ گھر کے اخراجات کے علاوہ تمام ذمہ داریاں بھی ان کے نازک شانوں پر آ گئیں۔ وہ ٹیوشن کے ذریعہ گھر کے اخراجات کے ساتھ اپنی پڑھائی کے اخراجات بھی اٹھاتے رہے۔ انھوں نے معاشی تنگی سے نجات پانے کے لیے مختلف سرکاری اور غیر سرکاری اداروں میں ملازمتیں بھی کیں مگر انھیں کہیں سکون سے رہنے نہیں دیا گیا۔

ریاست کی خامیوں، چاپلوسوں، خوشامدیوں اور درباریوں پر طنز کی پاداش میں شاؔد عارفی کو ٹیوشن اور ملازمتیں چھوڑنے پر مجبور کیا گیا۔ وہ ایک ایک دانے کے لیے محتاج ہو گئے مگر انھوں نے احمد علی خان عرف لڈّن کو شاؔد عارفی بنا کر ہی دم لیا اور ظلم، زیادتی، جبر، تشدد اور آمریت کے خلاف نہایت بے جگری سے طنز کے ایسے تیر چلائے جو سیدھے

بدخواہوں کے جگر میں پیوست ہوکر رہ گئے۔

شاؔد عارفی ساتویں جماعت سے شعر گوئی کی طرف متوجہ ہوئے۔ان کا شعر گوئی کا ذوق دھیرے دھیرے پروان چڑھتا رہا۔ بالآخر انھوں نے رام پور کے ایک استاد شاعر مولانا محمود شفقؔ رام پوری کی شاگردی اختیار کرلی اور باقاعدہ شعر کہنے لگے۔انھوں نے اپنا کچھ کلام فصاحت جنگ جلیل مانک پوری کو بھی دکھایا اور ان سے باقاعدہ اصلاح بھی لی جس کا اعتراف انھوں نے خود اپنے درج ذیل شعر میں نہایت فخریہ انداز میں کیا ہے:

اُسے اے شاؔد دنیائے ادب کی رفعتیں حاصل
''جلیل القدر'' کے قدموں پہ جس کا سر رہا ہوگا

شاؔد عارفی کا کلام مقامی اخبارات ورسائل کے علاوہ ہمایوں لاہور، انشاء کراچی، نصرت لاہور، جام نو کراچی، رومان کراچی، تخلیق دہلی، نگارش امرت سر، ساز کلکتہ، آج کل نئی دہلی، قومی زبان کراچی، مہرنیم روز کراچی، خاتونِ مشرق میرٹھ وغیرہ میں شائع ہوتا تھا۔

شاد عارفی کا پہلا مجموعۂ کلام ''سماج'' ۱۹۴۶ء میں زیورِ طبع سے آراستہ ہوا تھا۔ان کے کلام کا ایک انتخاب ۱۹۵۶ء میں انجمن ترقی اردو نے شائع کیا تھا۔اس کے بعد صولت پبلک لائبریری رام پور نے جشنِ شاؔد عارفی کے موقع پر ان کے کلام کا ایک انتخاب پیش کیا تھا۔ان کے علاوہ ان کی شاعری اور نثر نگاری کے کئی مجموعے منظر عام پر آچکے ہیں جن کے نام سفینہ چاہیے، نثر وغزل دستہ، اندھیر نگری، شوخیِ تحریر، شاد عارفی کی غزلیں اور مکتوباتِ شاؔد ہیں۔ڈاکٹر مظفر حنفی نے مارچ ۱۹۷۵ء میں 'کلیاتِ شاؔد عارفی' کے نام سے ان کا کلیات شائع کیا۔اس کے بعد انھوں نے شاؔد عارفی کی شخصیت اور فن سے متعلق ایک اہم کتاب ''ایک تھا شاعر'' کے نام سے مرتب کر کے ۱۹۶۷ء میں زیورِ طبع سے آراستہ کرائی۔

جون ایلیا مدیر انشاء کراچی کے نام ۲/جون ۱۹۶۲ء کو تحریر کیے گئے ان کے خط سے پتہ چلتا ہے کہ شاؔد عارفی عہدِ جوانی میں اپنے خاندان کی ایک دوشیزہ ص بیگم سے عشق فرمانے لگے تھے پھر مسلسل دس سال تک وادیٔ عشق کی رنگین پناہوں میں کھوئے رہے مگر بعض وجوہات اور خاندانی وقار کی بنا پر رشتۂ ازدواج میں منسلک نہ ہو سکے۔ان کی محبوبہ

www.urduchannel.in

کی شادی کسی دوسرے شخص کے ساتھ کردی گئی جس سے دل برداشتہ ہو کر انھوں نے عمر بھر شادی نہ کرنے کا فیصلہ کرڈالا۔وہ تین سال تک دیوانگی کے عالم میں اپنے نیم جاں جسم کے بار کو ڈھوتے رہے۔تین سال کے بعد پھر حضرتِ عشق نے انھیں وادیٔ حسن کی سیر کرائی اور وہ ایک ہندو لڑکی 'تارا' کے حسن پر اس قدر فریفتہ ہوئے کہ انھیں اس کے سوا کچھ سجھائی نہ دیتا تھا مگر اس عشق کا انجام بھی پہلے عشق ہی جیسا ہوا اور ہونا بھی یہی تھا۔کہنہ روایتوں، سماجی ہٹ دھرمی اور مذہبی دوریوں نے دونوں کے درمیان آہنی دیواریں کھڑی کردی تھیں جن کا مسمار کرنا عاشق ومعشوق کی بساط سے باہر تھا۔شاؔد اس انجامِ اندوہ ناک سے بے خبر نہیں تھے۔انھوں نے مزاحمت کرنے والوں، انگلیاں اٹھانے والوں اور سماج کے نام نہاد معزز حضرات کی ہٹ دھرمی کے لیے اشعار کہہ کر اپنے غم کو کچھ ہلکا کرنے کی کوشش کی ہے:

دل مل جانا کفر نہیں
ہٹ دھرمی کا نام سماج

اٹھ رہی ہیں انگلیاں ہم پر تو کوئی غم نہیں
یہ نتیجہ تھا ہمارا آپ کا سوچا ہوا

شاد عارفی شادی نہ کرنے کا عہد کر چکے تھے مگر جب ان کی والدہ بے حد نحیف و لاغر ہوگئیں اور ان کی آنکھوں کی بینائی بھی کم ہوگئی تو انھیں مجبوراً ۳۹ سال کی عمر میں شادی کرنا پڑی۔شادی کے ڈیڑھ سال کے بعد ان کی بیوی فالج کا شکار ہوکر اللہ کو پیاری ہوگئیں اور شاؔد پھر تنہا و ناشاد ہوکر رہ گئے:

ہو چکا ہے خیر سے ہُشیار تو
اپنے دشمن پر اُٹھا تلوار تو

شاؔد عارفی کا یہ پہلا شعر ہے جو انھوں نے تقریباً آٹھ سال کی عمر میں کہا تھا۔اس کے بعد وہ آٹھ نو سال تک قافیہ پیمائی کرتے کرتے سنجیدگی کے ساتھ شعر کہنے لگے لیکن ان

کے پہلے شعر جیسے تیور ان کے کلیات میں جا بجا نظر آتے ہیں جس سے ان کی افتادِ طبع اور ان کے مزاج کو بہ آسانی سمجھا جا سکتا ہے۔

شاد عارفی حالات و ماحول سے بہت جلد متاثر ہونے والے فنکار ہیں۔ وہ شعوری طور پر تغیراتِ زمانہ پر نظر رکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ حالات و ماحول کی تبدیلی کے ساتھ ان کا رنگ و آہنگ بھی تبدیل ہوتا رہا ہے۔ ان کے یہاں رنگیں نوائی بھی ہے اور شعلہ بیانی بھی۔ وہ خود کہتے ہیں:

وہ رنگیں نوائی، یہ شعلہ بیانی
کئی موڑ آئے مری شاعری میں

ان کے یہاں پائی جانے والی شعلہ بیانی کی سب سے بڑی وجہ بے باکی، جرأت مندی، حق گوئی، سخت جذباتیت اور پٹھانیت ہے۔ ان کے کلام کا ایک بڑا حصہ فوری ردِ عمل، جھنجھلاہٹ، طیش، طنز، خودداری، آن بان اور انا سے عبارت ہے۔ دراصل وہ اپنے دور کے ایک نہایت بے باک، نڈر، جرأت منداور جو منہ میں آئے کہہ گزرنے والے شاعر تھے۔

شاد عارفی کے عہد جوانی اور جوانی ڈھلنے کے بعد کے کلام میں نمایاں فرق نظر آتا ہے۔ ان کا بیشتر ابتدائی کلام روایتی، عاشقانہ، لکھنوی اور رام پوری رنگ و آہنگ سے مملو ہے۔ ان کی غزلوں میں غزل کی روایت کے اثرات تو ضرور ہیں مگر ان کے یہاں قدیم شعراء کے روایتی محبوب کے بجائے ذاتی تجربات اور ذاتی عشق کے نقوش زیادہ واضح ہیں۔ وہ جنسیت اور مادیت کے باوجود ہوسناکی کے قائل نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے بیشتر اشعار جذبۂ عشق کی پاکیزگی اور بلند کرداری کے آئینہ دار ہیں۔ ان کے نزدیک:

عشق بانہیں مروڑنے میں نہیں
شاعری پھول توڑنے میں نہیں

ساتھ کھیلے کی محبت بڑھ کے بن جاتی ہے عشق
اس سے زائد عشق کا اے شاد میں قائل نہیں

ولی کہتے ہیں:

www.urduchannel.in

خوب رو خوب کام کرتے ہیں
یک نگہ میں غلام کرتے ہیں

مگر شاد عارفی ولی کی طرح ہر خوب رو یا ہر حسین پر فریفتہ نہیں ہوتے، اُسے دل نہیں دے بیٹھتے اور نہ اُس کے غلام ہو جاتے ہیں۔ وہ حُسن کا احترام کرتے ہوئے کہتے ہیں:

احترامِ جلوہ چینی یہ بھی کچھ تھوڑا نہیں
آنکھ نے جس پھول کو دیکھا اُسے توڑا نہیں

عمر کے ساتھ تجربات کی آنچ میں تپنے کے بعد جب وہ اپنے گرد و پیش کے ماحول، سماجی مسائل اور سیاسی حالات کو اشعار کے قالب میں ڈھال کر پیش کرتے ہیں تو ان کے کلام میں انفرادیت اور تبدیلی رونما ہونے لگتی ہے جو بہت جلد ان کی پہچان بھی بن جاتی ہے اور وہ جدید اردو شعراء کی صف میں نمایاں طور پر نظر آنے لگتے ہیں۔ ان کی اس دور کی غزلیں ہوں یا نظمیں۔ رباعیات ہوں یا قطعات ان میں کسی نہ کسی زاویے سے جدت ضرور نظر آئے گی۔ وہ سماج اور معاشرہ کے مزاج داں بن کر ابھرتے ہیں۔ وہ نہ صرف نئے احساسات کے ترجمان ہیں بلکہ نئے حالات کے نبض شناس اور زندگی کے گوناں گوں مسائل کے نقاد بھی ہیں۔

انجمن ترقی پسند مصنفین کی پہلی کانفرنس میں منشی پریم چند نے اپنے خطبۂ صدارت میں ادب اور آرٹ کے تعلق سے کہا تھا کہ ''ہمیں حسن کا معیار تبدیل کرنا ہوگا۔'' بالکل اسی طرح شاد عارفی بھی ادب اورسن سے متعلق اپنے خیالات کا اظہار اس طرح کرتے ہیں:

اب ہمیں حُسن کا معیار بدلنا ہوگا
فن کو سومیل کی رفتار سے چلنا ہوگا

شاد عارفی کے نزدیک مصلحت یا حالات سے سمجھوتا کرنا عظمتِ فن کے لیے موت ہے۔ وہ قول و فعل میں یکسانیت کو شاعری کی معراج تصور کرتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ حقیقتِ حال پر پردہ ڈالنے سے شعر میں لطافت، برجستگی اور تاثیر نہیں رہتی۔ اسی لیے

انھوں نے کبھی صداقتوں اور حقائق کو سمجھوتوں اور مصلحتوں کی نذر نہیں کیا۔ جیسا کہ ان کے درج ذیل اشعار سے ظاہر ہو رہا ہے:

وہیں سے شعر میں برجستگی نہیں رہتی
جہاں سے حال چھپانے کی بات کرتا ہوں

بیان کی صداقتوں کو نذرِ مصلحت نہ کر
وہی تو گفتنی ہے۔ اصل میں جو گفتنی نہیں

یہی ہے شاؔد میں سب سے بڑا عیب
وہی لکھتا ہے جو کچھ دیکھتا ہے

دورِ جدید کے انسان کو نئی زندگی کی بے شمار الجھنوں اور نئے حالات سے دوچار ہونا پڑتا ہے جس کے سبب زندگی کے عام انداز میں تبدیلیوں کا رونما ہونا بھی ناگزیر ہے۔ شاؔد عارفی نے ان تبدیلیوں کو نہ صرف شعوری طور پر محسوس کیا بلکہ انھوں نے اپنے دور کے سیاسی، سماجی اور دیگر ہنگامی مسائل کو فلسفیانہ شاعری کے بجائے اپنے مخصوص انداز میں بڑی خوبی سے نظم کیا ہے۔ پیش ہیں چند اشعار:

یہ مدرّس ہیں کسی اسکول کے
ان کے جوتے بخیہ گر سیتے نہیں

دیکھ لینا کہ ہر ستم کے نام
عدل ہوگا کسی زمانے میں

اپنی مرضی سے تو اُگتے نہیں خود رو پودے
ہم غریبوں کا بہر حال نگہباں ہے کوئی

زرد چہروں کو تبسم نے کیا ہے رسوا
ورنہ ظاہر بھی نہ ہوتا کہ پریشاں ہے کوئی

www.urduchannel.in

صرف اپنوں کے تقرر کا ارادہ ہوگا
اور اخبار میں اعلانِ ضرورت دیں گے

زندگی پر دلیر ہیں وہ لوگ
مقبروں سے جو لے رہے ہیں خراج

آپ کی منصوبہ بندی کی طرح سرکار کو
ہم بھی کاغذ پر دکھا سکتے ہیں تعمیریں بہت

رنگ کو دھوپ کھا گئی، بو کو ہوا اڑا گئی
کہیے اس اعتبار سے آئی بہار یا گئی

یہاں چراغ تلے لوٹ ہے اندھیرا ہے
کہاں چراغ جلانے کی بات کرتا ہوں

مگر یہاں تو جل رہا ہے آدمی سے آدمی
سنا یہ تھا چراغ سے چراغ جلتے آئے ہیں

سنبھل سنبھل کے قدم بڑھاتے ہیں اس طرح مصلحت کے مارے
کہ جیسے سکّے کی طرح رستے میں کامیابی پڑی ملے گی

شاؔد عارفی ملک کے فرقہ وارانہ ماحول اور رامپور کے ظالمانہ، غیر مساویانہ نظام سے نہایت دل برداشتہ تھے۔ انھوں نے عہدِ نوابی کی زیادتیوں اور آمرانہ نظام و ماحول کی جس حق گوئی و بے باکی سے عکاسی کی ہے اس کی مثال مشکل ہی سے نظر آئے گی۔ درج ذیل اشعار سے عہدِ شاؔد عارفی میں سیاسی چال بازیوں، جبر و تشدد اور ظالمانہ حالات کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے، ملاحظہ فرمائیے:

سلجھانے کی بات بتا کر
داڑھی چوٹی میں الجھا دی

دیکھ لینا کہ ہر ستم کا نام
عدل ہوگا کسی زمانے میں

یہ اندھیرا کوتوالی کے قریب
شاؔد صاحب ہم تو لٹ کر رہ گئے

ذہنوں سے رعونت کا جنازہ نہیں جاتا
شاعر کو ڈراتے ہیں نوازا نہیں جاتا

شاؔد عارفی جس نظامِ حکومت میں سانسیں لے رہے تھے اس نظام کو انھوں نے نہ صرف بہت قریب سے محسوس کیا تھا بلکہ اس کا شکار بھی ہوئے تھے اور اسے اس قدر بھرا بھُکتا تھا کہ وہ اُسے جڑ سے ختم کرنے کے در پے ہو گئے تھے۔انھیں یقین تھا کہ ایک خوش گوار انقلاب جلد رونما ہوگا اور فرسودہ نظام کی جگہ جمہوریت کا بول بالا ہو جائے گا۔دیکھیے وہ کس یقین سے کہتے ہیں:

بے کسی جب فروغ پائے گی
ظلم کی بوٹیاں چبائے گی

یقیں کیجیے انقلاباتِ ہستی
محلات کے سائے سائے کھڑے ہیں

اک انقلاب دیکھ رہا ہوں چمن چمن
میری نظر جہاں ہے تمھاری نظر نہیں

www.urduchannel.in

جب گریباں گیر ہو جاتا ہے ٹھکرایا ہوا
سوچتا ہے تب ہر اک ظالم، ارے یہ کیا ہوا

کیا تعجب ہے کہ تیشوں کی طرف بڑھ جائیں
لوگ ہاتھوں کو سوالوں سے جو مہلت دیں گے

ستائے جو رہرو تو نہ دیجے اُسے طعنہ
یہ دیکھیے ہمت تو نہیں ہار رہا ہے

لَوٹ آئیں گے نشیمن، ٹوٹ جائیں گے قفس
ہم سے جس دن بھی ہوا کا رُخ بدلوایا گیا

عہدِ نوابی میں درباری چاپلوسیوں اور خوشامدیوں کو طرح طرح کی مراعات حاصل تھیں۔سچ کہنے اور آئینہ دکھانے والے کو اس قدر پریشان کیا جاتا تھا کہ وہ تباہ و برباد ہو جاتا تھا اور پھر کوئی شخص منہ کھولنے کی ہمت بھی نہیں کر سکتا تھا۔"سانچ کہے سو مارا جائے، جھوٹ کہے سو لڈّو کھائے" کی مثل اس وقت کے ماحول کی پوری طرح عکاس ہے۔شاؔد عارفی چوں کہ ایک نہایت بے باک، نڈر اور حق گو شاعر تھے اس لیے انھوں نے حکومتِ وقت، حاسدوں، حریفوں، بدخواہوں، موقع پرستوں اور کسی ابن الوقت کی پرواہ کیے بغیر اپنے اشعار کے ذریعے کھری کھوٹی سنانے اور سچی سچی کہنے کی اس وقت جرأت کی جس دور میں لوگوں کے منہ میں گویا زبان ہی نہیں ہوتی تھی۔وہ کہتے ہیں:

بے کسوں پر ظلم ڈھا کر ناز فرمایا گیا
طنز کی جانب میں خود آیا نہیں لایا گیا

پئے تحسینِ وطن طنز ہمارا فن ہے
ہم کسی خانہ برانداز سے ڈرتے ہی نہیں

اس نے جب سو تیر چلائے
میں نے ایک غزل چپکا دی

بننے کو تو ان کی محفل میں سب گونگے بہرے بن بیٹھے
ماتھوں پہ شکنیں پڑتی ہیں، جب سچی سچی کہتا ہوں

شادؔ افغانی الاصل ہونے کے باوجود ذاتی تفریق اور قومی برتری وکمتری کو مستحسن نہیں سمجھتے تھے۔ وہ اونچ نیچ اور بھید بھاؤ کے قائل نہیں تھے۔ ہندوؤں کی ورن ویوستھا یعنی ذاتی تفریق پر طنز کرتے ہوئے اس طرح اپدیش دیتے ہیں:

ورنوں کا وشواس ہے ''مورکھ من کی'' بھول
پھلواری کا روپ ہیں رنگ رنگ کے پھول

شودر، ویش اور چھتری رکھتے ہیں کیوں بیر
بن میں تو لڑتے نہیں پیپل، سرس، ببول

شادؔ عارفی کے یہاں غمِ جاناں بھی ہے اور غمِ دوراں بھی۔ وہ حسن کی جلوہ سامانیوں، رنگینیوں، رعنائیوں اور عشق کی سرمستیوں سے پوری طرح واقف ہیں۔ ان کی غزلیں جدید شعراء کی غزلوں کی طرح روایتی تغزل کے بجائے رومانیت اور حقیقت و واقعیت سے ہم آہنگ ہیں۔ ان کا عشق رسمی، خلائی یا تقلیدی نہیں بلکہ مجازی اور زمینی ہے۔ ان کی عشقیہ شاعری محض جذباتی نہیں بلکہ انسانی زندگی کے بنیادی حقائق کی ترجمان ہے۔ ان کے جذباتِ محبت میں رفعت و ترفع کا احساس ہوتا ہے جس میں ہوس پرستی کی لذتِ بے ثبات کا شائبہ بھی نہیں ہوسکتا۔ ان کے نزدیک محبت میں انسانی زندگی کی جذباتی اور ذہنی تہذیب انسان کو صحیح معنوں میں انسان بنا دیتی ہے اور اسے بہیمانہ تعیش پسندی اور ہوس پرستی سے نجات مل جاتی ہے۔ انھوں نے اپنے کلام میں حسن وعشق کے جن معاملات، واردات اور کیفیات کو پیش کیا ہے ان میں زندگی کے بنیادی حقائق نمایاں طور پر نظر آتے ہیں۔ ان کا عشق ایک عام انسان کے جذبات اور حرکات وسکنات کا آئینہ دار ہے جس کی

www.urduchannel.in

نمود خارجی حالات کے بغیر ممکن نہیں۔ سماجی حالات اور واقعات کا بھی ان پر اثر انداز ہونا ناگزیر ہے۔ ان کے یہاں نازِ حسن اور نیازِ عشق کی کارفرمائیاں تو ہیں مگر انھیں پیش کرنے کا انداز عمومی اور عام فہم ہے۔ ملاحظہ فرمائیں چند اشعار:

آتے ہی اپنے بستر پر
میں ہوتا ہوں اس کے گھر پر

سانولا رنگ کشیدہ قامت
نہ پری ہے نہ کوئی حور ہے وہ

گدگدائے نہ بنے، ہاتھ دبائے نہ بنے
بن کے لیٹی ہو جوانی تو جگائے نہ بنے

کیا لکھ رہے ہیں آپ مجھے دیکھ دیکھ کر
میں نے دیا جواب، غزل کہہ رہا ہوں میں

جوانی میں تکلف ہی سزا وارِ تبسم ہے
ہوا کرتی ہیں کلیاں بے حجاب آہستہ آہستہ

ہلکا سا تبسم ترے لب ہائے حسیں پر
مجبور نہ کر مجھ کو محبت کے یقیں پر

جذبۂ محبت کو تیر بے خطا پایا
میں نے جب اسے دیکھا، دیکھتا ہوا پایا

وہ دیکھتا رہا کہ میں اسی کو دیکھتا رہا
جبھی تو کہہ رہاہوں کامیاب مدعا رہا

میرے ہاں وہ اور کبھی میں اس کے گھر
اک قدم پھولوں پہ اک تلوار پر

میں اس کو دیکھ رہا ہوں اس احتیاط کے ساتھ
ابھی تو جیسے محبت کی ابتدا بھی نہیں

کام کی شے ہیں کروٹن کے یہ گملے اے شادؔ
وہ نہ دیکھے مجھے میں اس کا نظارا کر لوں

شادؔ عارفی تمام عمر ناکام و نامراد رہے۔ حالات و سماج نے نہ انھیں سکون سے جینے دیا اور نہ مرنے دیا۔ یہ حالات بڑی حد تک خود ان کے پیدا کردہ تھے۔ وہ دنیا اور سماج کو اپنے نظریے سے دیکھنے کے عادی تھے۔ وہ کسی کی تعریف و توصیف کرنے کو اپنی ہتک اور اپنی شان کے خلاف سمجھتے تھے۔ وہ خود کہتے ہیں:

ہم سے اس قسم کی امید نہ رکھے دنیا
ہم کسی شخص کی تعریف تو کرتے ہی نہیں

پیٹھ پیچھے جو کہا تھا وہ کہا منہ پر بھی
فکر فردا نے صداقت سے مکرنے نہ دیا

شادؔ عارفی کی شخصیت اور فکر و فن میں پٹھانیت کی آگ، افغانستان کی مٹی، پنجاب کے پانی اور رام پور کی ہوا کے اثرات نمایاں طور پر نظر آتے ہیں۔ ان کے مزاج میں تندی، تلخی اور درشتی شدت سے پائی جاتی تھی۔ انھیں غصہ بہت جلد آتا تھا اور وہ ذرا ذرا سی بات پر چراغ پا ہو جاتے تھے۔ اس کے علاوہ خودداری، حق گوئی اور بے باکی جیسی صفات نے انھیں کبھی کسی کے آگے دست طلب دراز کرنا تو کیا لب کشائی کی بھی اجازت نہیں دی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے کلام میں چاپلوسی اور خوشامد کے بجائے طنز، حقائق اور واقعیت کے عناصر نمایاں طور پر نظر آتے ہیں۔ ان کی بیشتر نظمیں جدید شاعری، طنز نگاری اور روز مرہ کے

www.urduchannel.in

حالات و واقعات کا بہترین نمونہ ہیں۔ ان کے یہاں اپنے عہد کے ابتر ماحول، ناانصافی، عدمِ مساوات، سماجی ناہمواریوں، طوطا چشم دوستوں، ابن الوقت افراد اور نظامِ حکومت سے سخت بیزاری نظر آتی ہے۔ وہ بطور طنز نگار اپنے مخالفین، ناپسندیدہ افراد اور خرابیِ نظام کی نکتہ چینی اور مذمت ہی نہیں کرتے بلکہ ان کے عیوب سے پردہ اٹھا کر اور انھیں برہنہ کر کے ہی دم لیتے ہیں:

ہم خدا کے ہیں وطن سرکار کا
حکم چلتا ہے مگر زردار کا

خشک لب کھیتوں کو پانی چاہیے
کیا کریں گے ابرِ گوہر بار کا

ہمارے ہاں کی سیاست کا حال مت پوچھو
گھری ہوئی ہے طوائف تماش بینوں میں

بے کسی میں سابقہ پڑنے پہ اندازہ ہوا
آپ کو میں دوست سمجھا تھا بڑا دھوکہ ہوا

میکدے میں چور دروازے بھی ہیں
آ تو جائیں شیخ کی منزل میں ہم

جس کی لاٹھی اسی کی بھینس ہے آج
کیا اسی کو کہیں گے جنتا راج

کان میں کہنے کی باتوں کا زمانہ لد گیا
نظمِ محفل جس کو سونپا ہے، وہ اس قابل بھی ہے

ہے تو احمق چوں کہ عالی شان کا شانے میں ہے
اس لیے جھک مارنا بھی اُس کا فرمانے میں ہے

چاپ سن کر جو ہٹا دی تھی اُٹھا لا ساقی
شیخ صاحب ہیں، میں سمجھا تھا مسلماں ہے کوئی

ناجائز پیسے کی اعلیٰ تعمیروں کے ماتھے پر
آپ نے لکھا دیکھا ہوگا، یہ سب فضلِ باری ہے

ان کی ایک نظم کا نام ''آپ کی تعریف'' ہے جس میں انھوں نے معاشرے میں پھیلی ہوئی عام بُرائیوں کی کھل کر عکاسی کی ہے۔ بعض محققین کے نزدیک شادؔ عارفی کی پہلی نظم کا نام 'اضطرار' ہے جو ماہنامہ 'ہمایوں' لاہور، ماہ ستمبر ۱۹۳۰ء کے شمارے میں پہلی بار شائع ہوئی تھی جس کا مطلع اور مقطع مندرج ہے:

جب سے ہے یہ دلِ بربادِ تمنا مضطر
نظر آتا ہے مجھے سارا زمانہ مضطر

شادؔ بے چین ہے دل روح کی بے تابی سے
موج مضطر نہیں، در اصل ہے دریا مضطر

رنگیلے راجا کی موت، ساس، مرے محلے کے دو گھرانوں سے ہے گناہوں کا فیض جاری، پرانا قلعہ، پرانے کوٹ، مغرب زدگی، مرے پڑوس میں کچی شراب بکتی ہے، نوکرانی، مہترانی، شوفر، شطرنج، دیہاتی لاری، ابھی جبل پور جل رہا ہے، دلال، پیرِ دہقاں جیسی نظمیں بھی طنز و حقائق کی بہترین مثالیں ہیں۔ انھوں نے رنگیلے راجا کی موت میں انانیت، جبر و تشدد، سرمایہ دارانہ نظام اور جابر حکمراں کے عبرت ناک انجام کی عکاسی کرتے ہوئے انقلاب و بغاوت کے آثار کی بھی امید کی ہے۔ رت جگا، ہلالِ عید، نفسیاتِ سرما، رسمی قید خانے، یارانِ سیاست سے، عورت، غمازہ، حریت، ہمارے نوجوان،

www.urduchannel.in

یومِ محمد علی جوہر، بھکارن اور بیوہ نہ صرف منفرد رنگ و آہنگ کی بہترین نظمیں ہیں بلکہ اپنے گرد و پیش کے ماحول کی ترجمان بھی ہیں۔ 'سماج' اور 'فسانۂ ناتمام' ایسی نظمیں ہیں جو انھوں نے اپنے دونوں عشق میں ناکام رہنے کے بعد کہی تھیں۔ دسہرا اشنان، اس کی واپسی، مفارقت، مندر جانے والی، ایفائے وعدہ، خط کی چوری اور نوروز کا شمار ان کی بہترین رومانی نظموں میں کیا جا سکتا ہے۔ نظم 'گنگا اشنان' منظر نگاری پیکر تراشی اور روانی کی بہترین مثال ہے۔ پیش ہیں چند اشعار:

وہ دوڑ رہی ہے کوئی رنگین شرارت
ہرنی ہے کہ میدان میں بھرتی ہے طرارے

بستر سے کوئی اٹھ کے نہانے کو چلی ہے
آتی ہے کوئی پھول سے چہرے کو نکھارے

وہ پھاٹ میں موجوں کے کوئی کھیل رہی ہے
وہ گھاٹ پہ بیٹھی ہے کوئی پاؤں پسارے

پانی میں اترتی ہے کوئی پاؤں جما کر
ساحل پہ ابھرتی ہے ہاتھ پسارے

پگھلے ہوئے بلور کی لہروں میں جوانی
ٹھہرے ہوئے سیماب کے پہلو میں شرارے

وہ سوریہ پوجا وہ ہری اوم کی جاپیں
زاہد بھی جو سن لے تو ہری اوم پکارے

امیجری، پیکر تراشی اور لفظی مصوری میں شادؔ عارفی کو کمال حاصل ہے۔ غزل کے بعض اشعار اور بیشتر نظموں کو پڑھ یا سن کر قاری یا سامع انھیں جذبات و احساسات اور اسی

منظرِ لطیف میں گم سا ہو جاتا ہے جس منظرِ دل کش کی عکاسی یا مصوری کی گئی ہے۔ پیش ہیں چند غزلیہ اشعار:

جیسے کسی حسین کے ہونٹوں پہ سرد آہ
پھولوں کی پتیوں پہ کرشمے ہوا کے دیکھ

شبِ مہتاب وہ پھولوں کا زیور، منتشر زلفیں
بقولِ رازداں کیا خوش نما منظر رہا ہوگا

نیچی نظریں بکھری زلفیں لٹکے آنچل شانے عریاں
حد بھر دل کش اتنے سارے انداز تمھارے کیا کم ہیں

جدت واختراع اور اچھوتے خیالات کے نمونے کے لیے ان کی ایک نظم 'ہولی' کے چند اشعار پیشِ نظر ہیں:

ماگھ سے کترا کے ساون کا مہینہ آ گیا
چیت کے ماتھے پہ ہلکا سا پسینہ آ گیا

آ گیا پنکھوں کی ٹھنڈی آرزو پر روپ بھی
نکلی ہے بازار میں چھاتا لگا کر دھوپ بھی

اب شفق مشرق سے دوڑی مَل کے چہرے پر گلال
صبح کے نیچر نے بدلے رنگ گرگٹ کی مثال

ٹین کی پچکاریاں منہ سے اگلتی تھیں شراب
عطر پاشوں کی صفوں میں تھے ہزارے فتح یاب

اک طرف تو ساریاں ڈوبی تھیں آب وتاب میں
مختلف پھولوں کی دنیا بہہ رہی تھی آب میں

www.urduchannel.in

ان کی ایک نظم کا عنوان 'مندر جانے والی' ہے جو مرقع کشی، حقیقت نگاری اور جزئیات کا بہترین نمونہ قرار دی جاسکتی ہے۔ پیش ہیں چند اشعار:

چلی ہے ساتھ وہ ہمجولیاں کو لائے ہوئے
نمودِ صبح کے تاروں کو جھلملائے ہوئے

وہی جو طرزِ تعاقب سے خوش تو ہے لیکن
مری نگاہ کی جرأت سے ہچکچائے ہوئے

رخِ صبیح پہ گلگونۂ حیا کی قسم
تجلیوں کو سمیٹے ہوئے، لجائے ہوئے

حریمِ دل میں سجائے خیالِ بت خانہ
قدم اٹھائے، سرِ بندگی جھکائے ہوئے

اٹھائے ہاتھ پہ ہلکی سی پتیلی تھالی
کمر دباؤ سے تھوڑا سا لوچ کھائے ہوئے

تِلک سے ''برہمنِ ہردوار'' پیشانی
لرز رہے ہیں مرے ادّعائے ایمانی

غزل ہو یا نظم شادؔ کسی کے مقلد نہیں۔ انھوں نے اپنے لیے خود اپنی راہ نکالی ہے۔ اپنی نظم گوئی کے متعلق وہ خود کہتے ہیں:

''میری کوئی نظم ہوائی نہیں ہے۔ ہر نظم کا ماڈل میرے سامنے رہا ہے، شاعرانہ بناوٹ ضرور ہے مگر یہ کہ نظم بے سروپا ہو یہ قطعاً غلط تصور ہوگا۔''

کلامِ شادؔ کے مطالعہ سے واضح ہے کہ وہ رجعت پسند نہیں بلکہ اپنے گرد و پیش کے ماحول کے شاعر ہیں اور ان کا یہ کہنا حق بجانب ہے کہ:

مجھے اے شاؔد ان رجعت پسندوں سے تو کیا لینا
کرے گی یاد مستقبل کی تہذیبِ جواں مجھ کو

تمام عمر ناشاد رہنے والے شاؔد عارفی کو آخر کار ۸؍فروری ۱۹۶۴ء کو فرشتۂ قضا نے ابدی نیند سلا کر شاید شادکامی سے ہم کنار کر دیا۔ شاؔد آنسو پی جانے میں بلا کی مہارت رکھتے تھے۔ وہ اپنی حیات ناآسودہ میں کبھی مسکرائے ہوں یا نہ مسکرائے ہوں مگر مسکرانے کی ایکٹنگ ضرور کرتے رہے۔ وہ کہتے ہیں:

ہر مصیبت پہ مسکراتا ہوں
شاؔد رونا مرا شعار نہیں

شاؔد کے جنازہ کو قبرستان تک پہنچانے والے افراد کی تعداد بمشکل دس پندرہ سے زیادہ نہ تھی جس کی عکاسی ڈاکٹر عابد رضا بیدؔار نے اپنے ایک مضمون 'شاؔد عارفی ایک تاثر' میں اس طرح کی ہے:

''کس کا انتقال ہو گیا بھائی؟'' دس پندرہ آدمیوں کی مختصر جمعیت کے ساتھ جنازہ جاتے دیکھ کر ایک راہ رو نے ازراہِ ترحم پوچھا۔ ''شاؔد عارفی کا۔'' ان میں سے ایک نے جواب دیا اور پوچھنے والا سوالیہ علامت بن گیا۔ ''کون شاؔد عارفی؟'' ''شاعر تھے بھئی ایک۔''

شاؔد جیسے زندہ دل اور حق گو شاعر کو زندگی بھر آلام و مصائب کا سامنا کرنا پڑا۔ ان کو طرح طرح سے ذلیل و خوار کیا گیا۔ مرنے کے بعد بھی ان کی رسوائی کرنے میں کوئی کور کسر نہ چھوڑی گئی۔ غالؔب نے شاید ایسے ہی لوگوں کے لیے کہا ہوگا:

ہوئے مر کے ہم جو رسوا، ہوئے کیوں نہ غرقِ دریا
نہ کہیں جنازہ اٹھتا نہ کہیں مزار ہوتا

......☆......

محمد اسد اللہ

شاد عارفی کی شاعری میں طنز

آبِ حیات کی ایک روایت کے مطابق مرزا غالؔب نے بہادر شاہ کے استاد ذوق کو ہاتھی پر سوار دیکھ کر کہا تھا:

ہوا ہے شہ کا مصاحب پھرے ہے اتراتا

اور جب بادشاہ کے دربار میں پیشی ہوئی تو اس طنز کا رخ اپنی ذات کی طرف پھیر کر یہ دفاعی پینترا اختیار کیا:

وگرنہ شہر میں غالؔب کی آبرو کیا ہے

حقیقت خواہ جو بھی ہو اس شعر سے مزاح نگاری کے اس اصول کی تصدیق ہوتی ہے کہ بہترین مزاح نگار وہ ہے جو اپنی ذات پر ہنس سکے اور اس انداز میں ہنسے کہ اس کا قہقہہ سماج کے لئے ایک آئینہ بن جائے۔ طنز اور مزاح اس طرح ایک دوسرے سے اس طرح باہم گتھے ہوئے ہوتے ہیں کہ ان کے درمیان حدِ فاصل قائم کرنا دشوار ہے۔ ممکن ہے کوئی فقرہ یا ظریفانہ نکتہ خندۂ دنداں نما کو تحریک دے اور ہمارا یہ بے ضرر سا عمل طنز کا تیر بن کر کسی کے سینے کو چھلنی کر دے۔ نشانہ جب تک متعین نہ ہو یا تیر نشانہ پر نہ لگے، طنز کی کاٹ مزہ نہیں دیتی۔ اپنی ذات پر طنز تو گویا خودکشی کے مترادف ہے اور طنز نگار کی حقیقی کامیابی مرنے سے زیادہ مارنے میں ہے۔ بقول ڈاکٹر وزیر آغا:

''طنز میں نشتریت کا پہلو غالب رہتا ہے اور یہ اپنے نشانۂ تمسخر کے خلاف نفرت کے جذبات کا اظہار ضرور کرتی ہے۔''

www.urduchannel.in

شاد عارفی کی شاعری کا امتیازی پہلو طنز نگاری ہے۔ وہ بنیادی طور پر طنز نگار ہیں، بلکہ شاعر بعد میں، طنز نگار پہلے ہیں۔ اس قسم کے ہر فنکار کی خصوصیت یہ ہوا کرتی ہے کہ وہ جس چیز پر نظر ڈالتا ہے اس میں دو ہی چیزیں تلاش کرتا ہے۔ ایک عیب اور دوسرے اس عیب پر طنز کرنے کا موقع۔ شاد عارفی کا ایک شعر ہے۔

تمیزِ نقدِ انجمن کچھ اس قدر نکھر گئی
جہاں جہاں بھی جھول تھے وہیں وہیں نظر گئی

شاد عارفی نے اسی قسم کے مواقع سے فائدہ اٹھایا اور طنز کی سرمایہ کاری کر کے اپنا بہترین شعری اثاثہ جمع کیا۔ طنز کی شمولیت نے ان کی غزلوں کو ایک جداگانہ اسلوب عطا کیا ہے۔ طنز کی نمکینی ہی کے سبب شاد عارفی کا رنگِ سخن اوروں سے مختلف ہے۔ ان کے ہاں کثرت سے ایسے الفاظ اور تراکیب ملتی ہیں جو غزل کے ڈکشن سے میل نہیں کھاتیں۔ مثلاً چکمہ، مکڑیوں کے جالے، چھچھوری، اوچھے، کمینہ، جے ہو، جھول، ٹخنے، ریتنا، کھردرا، یادوں کے دانت، حیا خو، جھک مارنا وغیرہ۔ اس سلسلے کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

مُصرے ہے اگر آپ برا مان نہ جائیں
اوچھوں سے کوئی کارِ نمایاں نہیں ہوتا
وہ کھردرا کلام جس کا ریتنا بھی وصف ہے
جو زیرِ بحث آ گیا تو شادؔ پر نظر گئی
ناجائز پیسے کی اجلی تعمیروں کے ماتھے پر
آپ نے لکھا دیکھا ہوگا یہ سب فضلِ باری ہے

بقول احتشام حسین:

''ظرافت کے لئے کسی حقیقت کا تصور ضروری ہے۔ شاد عارفی کے ہاں حقیقت کا تصور ہی ہے جو دین داری کے پردے میں چھپی ہوئی منافقت، بے روح مذہبیت، خود غرضی میں ملوث سیاست اور عوامی سطح پر

www.urduchannel.in

پائی جانے والی ناسمجھی کو نشانہ طنز بناتا ہے۔ اسی لئے ان کی غزلوں میں سب سے زیادہ اشعار جن دو موضوعات پر ملتے ہیں وہ ہیں۔ شیخ جیسے وہ زاہد، واعظ، شیخ حرم وغیرہ الفاظ کے ساتھ یاد کرتے ہیں۔ سیاست داں جس کے لئے، راہبر، راہنما، میرِ کارواں، راہ نمایانِ قوم اور رہبرِ ملت جیسے الفاظ لائے ہیں۔ ان دونوں میں قدرِ مشترک یہ ہے کہ دونوں ریاکاری، اپنے منصب سے وفاداری کے فقدان، خلوص کی کمی، بے روح قسم کی دین داری، منافقت، چالاکی اور ناسمجھی کے علمبردار ہیں۔

سیاست کے متعلق شاد کے چند اشعار سے ان کے طنز کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے:

ہمارے ہاں کی سیاست کا حال مت پوچھو
گھری ہوئی ہے طوائف تماش بینوں میں
جلوسِ رہبرِ ملت نہ سمجھو
سیاست کا جنازہ جا رہا ہے
ہے تو احمق چونکہ عالیشان کاشانے میں ہے
اس لئے جھک مارنا بھی اس کے فرمانے میں ہے
چور کی ڈاڑھی میں تنکے کا منظر اکثر دیکھا
میرے رہزن کے فقرے پر راہ نما نے مڑ کر دیکھا
سرشتِ میرِ کارواں بھرے گی روپ دفعتاً
تم اس سے مطمئن رہو، نقاب اس کے پاس ہے
تمہیں علم و عمل سے واسطہ کیا
سکندر بخت کے پوتے ہو یارو
سادہ دلوں نے راہ نمایانِ قوم سے
اتنے فریب کھائے کہ چالاک ہوگئے

مذہب بیزار شعراء کو اگر استثنیٰ قرار دیا جائے تو ہماری شاعری میں شیخ، ملا اور زاہد پر

طنز کے تابڑ توڑ حملے دراصل ان کے خلاف محاذ آرائی نہیں ہے بلکہ یہ اس رویے کی مذمت ہے جو اصل مذہبی قدروں کو چھوڑ کر بے جان اور بے روح قسم کی مذہبیت اور رسم و رواج کے علاوہ دغا بازی اور فریب کاری کو جنم دیتا ہے جو دین کی حقیقت سے نا آشنائی اور نا سمجھی کا نتیجہ ہے۔اس سلسلہ میں شاد کا یہ شعر ملاحظہ فرمائیں:

شیخ پر ہاتھ اٹھانے کے نہیں ہم قائل
ہاتھ اٹھانے کی جو ٹھانی ہے تو باطل سے اٹھا

اور ان ہی صالح اقدار کی جستجو شاد سے یہ شعر کہلواتی ہے۔

ہاتھ میں جام اٹھانا تو بڑی بات نہیں
کوئی پتھر کوئی کانٹا رہِ منزل سے اٹھا

اس سلسلے کے چند اشعار یہ ہیں۔

بتوں کی محبت میں شیخِ حرم تک
جبینوں پہ قشقے سجائے کھڑے ہیں
بادہ گلرنگ بھی ہے یوں تو اک خاصے کی چیز
حضرتِ زاہد مگر ساقی بھی خاص الخاص ہے

شاد عام طنز نگاروں کی طرح طنز کے نشتر کو سماجی اصلاح کے مقصد کے تحت استعمال کرتے ہیں اور ہر زندگی کے ہر اس پہلو پر اسے آزماتے ہیں جس میں انھیں خرابی نظر آتی ہے۔طنز وظرافت فنکاروں ہی کا نہیں سماج کا بھی ایک ایسا سہارا ہے جس سے ناپسندیدہ اور ناگوار سرمیوں کو روکنے کا مبارک کام انجام دیا کا تا ہے۔اس سلسلے میں ڈاکٹر وزیر آغا لکھتے ہیں۔

''ہنسی ایک ایسی لاٹھی ہے جس کی مدد سے سوسائٹی کا گلہ بان محض غیر شعوری طور پر ان تمام افراد کو ہانک کر اپنے گلّے میں دوبارہ شامل کرنے کی سعی کرتا دکھائی دیتا ہے جو کسی نہ کسی وجہ سے سوسائٹی کے گلّے سے علاحدہ ہو کر بھٹک رہے تھے۔یعنی ہنسی ایک ایسا آلہ ہے جس کے ذریعے

www.urduchannel.in

سوسائٹی ہر اس فرد سے انتقام لیتی ہے جو اس کے ضابطہ حیات سے بچ نکلنے کی سعی کرتا ہے۔سماجی لحاظ سے ہنسی کا یہ پہلو اس لئے زیادہ اہم ہے کہ اس کی بدولت سوسائٹی بیشتر بیرونی مضر اثرات سے محفوظ رہتی ہے۔

شاد کے ہاں طنز وظرافت کے استعمال کا شعوری احساس بھی موجود ہے۔

بے کسوں پر ظلم ڈھا کر ناز فرمایا گیا
طنز کی جانب میں خود آیا نہیں لایا گیا
اس انجمن سے اٹھوں گا کھری کھری کہہ کر
پھر انجمن میں نہ آنے کی بات کرتا ہوں
یہاں چراغ تلے لوٹ ہے اندھیرا ہے
کہاں چراغ جلانے کی بات کرتا ہوں

شاد کی غزلوں میں عام انسانی رویوں پر بھی طنز کے عمدہ نمونے موجود ہیں۔

بانس تیری بھینگی آنکھوں میں دیکھ رہا ہوں اور چپ ہوں
دیکھ لیا ہے تو نے میری پلکوں پر تنکا تو کیا
آغازِ مشورہ میں کہاں مر گئے تھے آپ
اب روکنے چلے ہیں قدم جب بڑھا لیا
کہیں جھپٹ نہ پڑیں دن میں مشعلیں لے کر
عوام کو نہ سجھاؤ کہ روشنی کم ہے
تو اور پوچھے میرا حال
آگ لگا پھر پانی ڈال
جوانی ہے ،دل آ جانے کے دن ہیں
عقلمندو !یہ سمجھانے کے دن ہیں !
جو چاہتے ہیں ہمیں بے قرار فرمائیں
کہیں وہ خود نہ ستارے شمار فرمائیں

شاد کی غزلوں میں شعروادب کے دگرگوں حالات اور فنکاروں کی زندگیوں میں پا
ئی جانے والی ناہمواریوں پر بھی زبردست طنز کیا گیا ہے۔مثلاً جوش ملیح آبادی پاکستان
ہجرت کرنے کے بعد متوقع پذیرائی سے محروم رہے اور اپنی پشیمانی کو اس طرح بیان کیا تھا۔

یوں کراچی میں ہوں جس طرح سے کوفہ میں حسین
سب تباہی کے ہیں آثار چنا جور گرم

اب اس پر شاد عارفی کا طنزیہ شعر ملاحظہ فرمائیں :

یہ دوسری بات ہے کہ ہجرت نہ کر کے در در کی خاک چھانے
چنے نہ بیچے گا جوشؔ کی طرح ذوقِ شعر و سخن ہمارا

اسی طرح عام شاعروں اور شاعری کے حالاتِ حاضرہ کی عکاسی اس طرح کی گئی
ہے۔

شاعر سے یوں جان بچائے پھرتے ہیں سنجیدہ لوگ
گویا اڑ کر لگنے والی شعروں کی بیماری ہے
چمن سے آج کل یوں نکہتِ معلوم غائب ہے
کہ جیسے فی زمانہ شعر سے مفہوم غائب ہے

طنز نگاری کے اہم آلات میں تحریف نگاری کو بھی خصوصی اہمیت حاصل ہے۔شاد
نے اس کا استعمال بھی عمدگی سے کیا ہے۔

خلد میں ہم ان پری زادوں سے لیں گے انتقام
اب یہ روحیں ہوں کہ حوریں ہوں جو انساں ہو گئیں
غالبؔ کے ہم بے تکے نقال شاد
مشکلیں ہم پر پڑیں کب تھیں کہ آساں ہو گئیں

شاد نے زندگی کے تمام مظاہر کو عموماً ترچھی نظروں سے ضرور دیکھا ہے۔بھلا اس
کی طنز اور شوخی سے اس کا محبوب کیسے بچ سکتا ہے۔بقول آلِ احمد سرور :

''شاد کے ہاں صرف سماجی کی خرابیوں پر طنز ہی نہیں ہے محبت اور نفسیاتِ

www.urduchannel.in

انسانی کی سچی تصویریں بھی ہیں اور انھیں ایک ایسے تیور اور بانکپن سے
پیش کیا گیا ہے کہ فوراً ذہن پر نقش ہو جاتی ہیں۔یہاں ایک بات قابلِ
ذکر ہے کہ اردو شاعری میں عام طور پر محبوب کا جو تصور ابھرتا ہے شاد
عارفی کی شوخیٔ تحریر میں اس کی تصویر بہر حال کچھ مختلف ہے۔''

آج اس کفر سراپا نے سنوارے گیسو
آج بکھرا ہوا پردہ رخِ باطل سے اٹھا
شاد غیر ممکن ہے شکوہ بتاں مجھ سے
میں نے جس سے الفت کی اس کو باوفا پایا
دیر سے پہنچنے پر بحث تو ہوئی لیکن
اس کی بے قراری کو حسبِ مدعا پایا
مشکبو زلفیں جنھیں کافر کہا جاتا رہا
عارض گل رنگ پر آ کر مسلماں ہو گئیں

شاد عارفی نے مختلف اور متنوع موضوعات کے حوالے سے اپنی نظموں اور غزلوں
میں طنز کا استعمال کیا ہے اور ان کا یہی فنکارانہ برتاؤ ان کی انفرادی شناخت کا ضامن ہے۔

............☆............

ڈاکٹر سید یحییٰ نشیط

شاؔد عارفی کی رباعیاں

رباعی ایک صنف شاعری ہے۔چار مصرعوں میں ایک مکمل خیال کواس میں ادا کیا جاتا ہے۔فنی نقطۂ نظر سے تمام اصناف شاعری میں رباعی سب سے مشکل صنف ہے۔اس لیے سیکڑوں غزل گوشعراء میں رباعی کہنے والے دو پانچ سے زیادہ دکھائی نہیں دیتے۔رباعی کے اوزان مخصوس، رباعی کے مضامین مخصوس اور بحر صرف ایک یعنی بحر ہزج۔اتنے سخت ضابطوں کے باوجود اس میں پیش کردہ خیالات طول طویل نظموں اور مثنویوں میں پیش کردہ خیالات سے اعلیٰ اور ارفع ہوتے ہیں۔فنی لحاظ سے دقیق ہونے کی وجہ سے کہنہ مشق شعراء بھی اس صنف کو چوم کر چھوڑ دیتے ہیں۔پھر بھی رباعی ہر زمانے میں مقبول و محترم رہی ہے۔تمام اصناف شاعری میں رباعی کو ایک قسم کا تقدس حاصل ہے، کیونکہ اس کے مضامین آلائشِ افکار سے پاک ،اخلاقی، مذہبی اور سبق آموز ہوتے ہیں۔ جو رباعیات شراب و شباب کے مضامین کی حامل ہوتی ہیں،ان میں بھی رکاکت اور پھکڑ پن نہیں پایا جاتا۔

رباعی عربی لفظ ’ربع‘ سے مشتق ہے۔اس کے معنی چار چار کے ہوتے ہیں۔پہلے اسے دوبیتی بھی کہا جاتا رہا،لیکن رباعی میں فکر وخیال اور موضوع ومضمون کے اعتبار سے چاروں مصرعے باہم مربوط ہوتے ہیں،اس لیے رباعی کو چار مصرعی یا دوبیتی کہنا مناسب نہیں۔پہلے اسے ترانہ بھی کہا گیا،لیکن رباعی کے بیشتر ارکان کا ترانے میں خیال رکھا نہیں جاتا،اس لیے رباعی کو ترانہ کہنا بھی غلط ہے۔رباعی کے چوبیس ارکان بحر ہزج کے ایک رکن ’مفاعیلن‘ اور اس کے نو فروعات سے تشکیل پاتے ہیں،جو درج ذیل ہیں۔ مثلاً

www.urduchannel.in

’مفاعیلن‘ ،’’قبض‘‘ کے زحاف سے ’مفاعلن‘ میں تبدیل ہوجاتا ہے۔یہی سالم رکن ’’کف‘‘ کے عمل سے ’مفاعیلُ‘ بن جاتا ہے۔’مفاعیلن‘، ’’شتر‘‘ کے عمل سے فاعلن کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔اسی طرح ان چاروں ارکان یعنی ’’مفاعیلن ،مفاعلن ،مفاعیلُ اور فاعلن کا رباعی میں ایک خاص مقام ہے۔یہ صرف ’’حشو‘‘ میں آتے ہیں ’صدر‘، ’عروض‘اور ’ضرب‘ میں ان کا استعمال نہیں ہوسکتا۔اب پانچواں رکن ’مفعولن‘ ہے یہ ’’خرم‘‘ کے زحاف سے بنتا ہے۔چھٹا ’مفعول‘ ہے۔یہ ’’خرب‘‘ کے عمل سے تشکیل پاتا ہے۔مذکورہ دونوں ارکان عروض وضرب میں نہیں آتے۔ان کے بعد ’’ہتم‘‘،’’زلل‘‘،’’جب‘‘ اور ’’بتر‘‘ زحافات سے بننے والے رباعی کے ارکان بالترتیب ’فعول‘،’فاع‘،’فَعلُ‘ اور ’فع‘ ہیں۔ان چاروں ارکان کا تعلق عروض وضرب سے ہے۔رباعی میں ارکان کی ترتیب کا بھی خیال رکھا جاتا ہے۔اس کے لیے ’’سبب پئے سبب‘‘،اور ’’وتد پئے وتد‘‘ کا کلیہ استعمال کیا جاتا ہے۔یعنی جس رکن کے آخر میں سبب (دوحرفی ٹکڑا) ہوتو اس کے بعد آنے والے رکن کا پہلا ٹکڑا سبب ہی ہوگا۔اسی طرح جس رکن کے آخر میں ’’وتد‘‘ (سہ حرفی ٹکڑا) ہوتو اس کے بعد والے رکن کا پہلا ٹکڑا وتد ہی ہونا چاہیے۔رباعی کے ان چوبیس ارکان کو خراسان کے خواجہ امام حسن قطان نے دوحصوں میں بانٹ دیا ہے،جس کی وجہ سے رباعی کے ارکان سمجھنا آسان ہوگیا ہے۔اس نے انھیں ’’اخرب‘‘ اور ’’اخرم‘‘ میں تقسیم کیا ہے۔درج ذیل میں اس کی کی ہوئی تقسیم کا خاکہ پیش کیا جارہا ہے۔

زحاف اخرب کے بارہ اوزان	زحاف اخرم کے بارہ اوزان
۱) مفعولُ مفاعِلن مفاعیلُ فعول	۱)مفعولن فاعلن مفاعیل فعول
۲)مفعولُ مفاعلن مفاعیلن فاع	۲)مفعولن فاعلن مفاعیلن فاع
۳)مفعولُ مفاعلن مفاعیلُ فَعَل	۳)مفعولن فاعلن مفاعیلُ فعل
۴)مفعولُ مفاعلن مفاعیلن فع	۴) مفعولن مفاعلن مفاعیلن فع
۵)مفعولُ مفاعیلُ مفاعیلُ فعول	۵)مفعولن مفعولُ مفاعیلُ فعول

۶)مفعولُ مفاعیلُ مفاعیلن فاع	۶)مفعولن مفعولُ مفاعیلن فاع
۷)مفعولُ مفاعیلُ مفاعیلُ فعل	۷)مفعولن مفعولُ مفاعیلُ فعل
۸)مفعولُ مفاعیلُ مفاعیلن فع	۸)مفعولن مفعولُ مفاعیلن فع
۹)مفعولُ مفاعیلن مفعولُ فعول	۹) مفعولن مفعولُ مفعول فعول
۱۰)مفعولُ مفاعیلن مفعولن فاع	۱۰)مفعولن مفعولن مفعولن فاع
۱۱)مفعولُ مفاعیلن مفعولُ فعل	۱۱) مفعوولن مفعولن مفعولُ فعل
۱۲)مفعولُ مفاعیلن مفعولن فع	۱۲)مفعولن مفعولن مفعولن فع

--------------- ---------------

انھیں اشجارِ اخرب واخرم اور دوائر اخرب واخرم بھی کہا جاتا ہے۔ان چوبیس ارکان سے بقول صاحب ’’بحر الفصاحت‘‘، نجم الغنی ۸۲۹۴۴شکلیں برآمد ہوتی ہیں۔اور صاحبِ ’’منتہی العروض‘‘ کے مطابق ان سے صحیح وزن وترتیب میں ۱۰۳۶۸ رباعیاں کہی جا سکتی ہیں۔رباعی کے ان ۲۴اوزان پر عمل تخنیق کے ذریعہ پروفیسر عنوان چشتی مرحوم نے اور بارہ ارکان کا اضافہ کیا ہے۔رباعی کی ان تمام فنی باریکیوں کے باوجود ’برائے شعر گفتن‘ ہی سہی ،رباعیاں کہی ہیں۔

عصر حاضر میں رباعی میں موضوعاتی تنوع پیدا کیا گیا ہے اور انھیں اسطوری فکر، لمسیاتی تلذذ، رنگِ جمال اور عشق کی کیفیات کے سہارے پیش کرنے کی سعی کی جا رہی ہے ۔اس وجہ سے اس کی قشف زا فضا کیف پرور بنتی جا رہی ہے۔لیکن یاد رہے کہ رباعی ہمیشہ منقّح افکار ہی کی متقاضی رہی ہے۔پاک خیالات اور مطہّر جذبات کے حامل عشقیہ مضامین رباعی میں جگہ پا سکتے ہیں۔،بشرطیکہ وہ رکیک اور فحش اور جنسی لذت یابی کے محرک نہ ہوں۔

رباعی کی اس گراں سنگی کو ہم شادؔ عارفی کی رباعیوں کی مدد سے سمجھ سکتے ہیں۔شادؔ عارفی ۱۹۰۰ء میں پنجاب کے لوہارو اسٹیٹ میں پیدا ہوئے لیکن ان کا وطن ثانی رام پور طویل قیام کی وجہ سے وطنِ اصلی بن گیا۔ان کے معاصرین میں آرزوؔ لکھنوی، فانیؔ بدایونی ،سیمابؔ اکبر آبادی، حسرتؔ موہانی، یاسؔ یگانہ چنگیزی اور جگرؔ مراد آبادی جیسے نامور شعراء

www.urduchannel.in

گزرے ہیں۔جدید غزل کے اولین نقوش جن شعراء کے کلام میں پائے جاتے ہیں، ان میں شادؔ عارفی کا شمار ہوتا ہے۔غزل میں ان کا رنگ یاسؔ یگانہ سے ملتا ہے۔ان کی منظومات میں جس طرح طنز و تلخی پائی جاتی ہے، غزلوں میں بھی بجائے شگفتگی کے کھردراپن زیادہ پایا جاتا ہے کیونکہ ان کی غزلیات میں سماجی نشیب و فراز کے احوال یاس و ناامیدی کی فضا، ادبار و نامرادی کی کیفیات اور سماجی ناہمواریوں کے کوائف حقیقت پسندانہ انداز میں بیان ہوئے ہیں۔بقول آل احمد سرور:

’’شادؔ کے یہاں صرف سماج کی خرابیوں پر طنز نہیں ہے، محبت اور نفسیاتِ انسانی کی سچی تصویریں بھی ہیں۔

اور انھیں ایک ایسے تیور اور بانکپن سے پیش کیا گیا ہے کہ فوراً ذہن پر نقش ہو جاتی ہیں۔‘‘ (’’ہماری زبان‘‘، علی گڑھ، ۱۸اپریل ۱۹۶۸ء ص ۱۱)

شادؔ عارفی نے نظموں، غزلوں کے علاوہ ’سہرے‘، رباعیات اور قطعات بھی لکھے ہیں۔پروفیسر مظفر حنفی کی مرتبہ ’’کلیاتِ شادؔ عارفی‘‘ کے تعارف میں مرتب نے ان کے ۶۱ قطعات اور ۳۲ رباعیات کی نشان دہی کی ہے ۔یہ کل میزان ترانوے ہوا۔ ان میں رباعیات اور قطعات کی سرخی کے ذیل میں ۸۹ قطعات اور رباعیات ہیں ۔۴ قطعات مختلف غزلوں کے درمیان ہیں۔مظفر حنفی کے تعارف سے یہ بات منکشف ہوتی ہے کہ شادؔ نے اپنے مجموعاتِ شاعری ’’سفینہ چاہیے‘‘، ’’غزلدستہ‘‘ اور ’’شوخیِ تحریر‘‘ میں قطعات و رباعیات یکجا کر دیئے تھے۔دراصل قطعات اور رباعیات صوری طور پر بالعموم ایک جیسے دکھائی دیتے ہیں، لیکن دونوں میں بہرحال فرق ہوتا ہی ہے۔قطعہ کسی بھی بحر و وزن میں لکھا جا سکتا ہے لیکن رباعی صرف بحر ہزج کے مخصوص زحافات ہی میں لکھی جا سکتی ہیں۔ قطعہ دو اشعار سے زیادہ میں لکھا جا سکتا ہے مگر رباعی چار مصرعوں ہی میں کہی جا سکتی ہے ۔قطعہ مسدس اور مثمن ارکان میں ہو سکتا ہے مگر رباعی کے اشعار مسدس یا مربع کے ارکان میں نہیں ہوتے۔رباعی صرف مثمن ارکان ہی میں ہو سکتی ہے یعنی ایک مصرع میں چار رکن ۔رباعی اور قطعے کے اس بنیادی فرق کو ملحوظ رکھ کر دیکھیں تو شادؔ کی بعض رباعیاں بیت

موزوں سے ہٹ جاتی ہیں۔ بعض رباعیوں میں صدر و ابتداء کے ارکان خرم وخرب کے زحافات پر پورے نہیں اترتے۔ بالخصوص شادؔ تخلص کے بعد اگر کوئی حرف صحیح آجائے تو تو رکن مفعول (وزن اخرب) یا مفعولن (وزن اخرم) مقامِ صدر و ابتداء میں وہ تخلص خارج از بحر ہو جاتا ہے۔ مثلاً۔

شاد! جو چیز فطرتاً عالی ہے
عفتِ حسن کی وہ رکھوالی ہے
جلوے ہیں گرفتِ ما سوا سے باہر
سایہ پھولوں کے رنگ سے خالی ہے

اس رباعی کے پہلے اور دوسرے مصارع کے ارکان صدر و ابتداء کے وزن پر پورے نہیں اترتے، اس لیے اسے رباعی کی بجائے قطعہ کہہ سکتے ہیں۔ لیکن ان کی بعض رباعیوں میں بحر و اوزان کا برابر خیال رکھا گیا ہے۔ مثلاً ذیل کی رباعی دیکھئے، اس میں اوزان کس خوبی سے برتے گئے ہیں۔۔

(۱)

معصیت کو نجات کہنے والے	توہین کو ذاتیات کہنے والے
مفعولن فاعلن مفاعیلن فع	مفعولُ مفاعلن مفاعیلن فع
شادؔ وہ آئینۂ حلب کی صورت	ڈرتے نہیں منہ پر بات کرنے والے

(۲)

جھوٹوں میں سچے کی بات کہنے والے	کہلاتے ہیں 'واہیات' کہنے والے
مفعولُ مفاعلن مفاعیلن فع	مفعولُ مفاعلن مفاعیلن فع
مسکراتے تھے وہ حضرتِ موسیٰ پر	فرعون کو ربّ کائنات کہنے والے
مفعولن فاعلن مفاعیلن فع	مفعولُ مفاعلن مفاعیلن فع

....

شادؔ عارفی کی رباعیات کے موضوعات اصلاحی ہیں اور ان میں قوم کے لیے

www.urduchannel.in

نصیحت اور اخلاقی درس ملتا ہے۔ ایک رباعی میں وہ ریا اور نمائش کی مذمت بڑے ڈرامائی انداز میں کرتے ہیں کہ ایک Suspence طاری ہو جاتا ہے۔

اے شخص نمائش کو اگر جائے گا	انجام بتادوں گا تو ڈر جائے گا
مفعولُ مفاعیلُ مفاعیلن فع	مفعولُ مفاعیلُ مفاعیلن فع
منزل پہ پہنچنا تو یقینی ہے مگر	دھڑ بیچ میں رہ جائے گا سر جائے گا

....

فطرت کی گود میں گھومنا شادؔ کو شہری فضا سے زیادہ پسند ہے۔ فکر معاش اور فکر دوراں سے نجات کا راستہ ان کے نزدیک فطرت کے حسین نظاروں میں کھو جانا ہے۔ جس شخص کو وہاں بھی وہ چین میسر نہ ہو تو وہ گویا فطرت کو جھٹلا رہا ہے۔ شادؔ کہتے ہیں۔

جنگل میں جو ذکر شہر دہراتا ہے
وہ سیر واسطے ہی کیوں آتا ہے
سبزے پہ کسی فکر ٹہلنے والا
سبزے کی تراوتوں کو جھٹلاتا ہے

اس رباعی کے دوسرے اور تیسرے مصرعوں میں چند صرفی و نحوی کمزوریاں در آئی ہیں۔ ''سیر واسطے'' اور ''کسی فکر ٹہلنا'' یہ صحیح زبان نہیں ہے۔ یہاں بالترتیب حرف ربط 'کے' اور حرفِ ظرف 'میں' کی کمی کھٹکتی ہے۔ شادؔ یہ اخلاقی درس بھی دیتے ہیں کہ ظلم سے دلوں پر دھاک بٹھانا ایسا ہی ہے جیسے تیل سے آگ بجھانے کا عمل۔

ظلم سے دھاک بٹھانے کا نتیجہ معلوم
کم اساسوں کو ستانے کا نتیجہ معلوم
کیا کہا جائے جہاں عقل پہ پتھر پڑ جائیں
تیل سے آگ بجھانے کا نتیجہ معلوم

ایسے کئی سماجی مسائل پر شادؔ نے خوب لکھا ہے اور ان سماجی قدروں کی نمو و نشوونما کے لیے راہِ عمل بھی سجھایا ہے۔ وہ کہتے ہیں۔

عزم محکم نہیں تو کم ہی چلوتم   مرے ساتھ دو قدم ہی چلو
عشرتیں بانٹ دو رقیبوں کو میرے   حصے میں رنج و غم ہی چلو

ظاہر ہے ایسا ایثار اور قربانی کا جذبہ نفاق و منافرت کا سد باب کر دیتا ہے اور رواداری و باہمی اخوت کو فروغ حاصل ہوتا ہے، جو اچھے اور خوش گوار سماجی ماحول کی جڑوں کو مضبوط کرنے میں معاون ثابت ہوتا ہے۔

شادؔ کی رباعیات میں صرف سماجی عوامل ہی نہیں بلکہ ان میں عشقیہ جذبات کی عکاسی بھی ہوئی ہے۔ حسن وعشق کی نازک اور ملائم کیفیات کو شاعر نے اتنی ہی نازکی اور شگفتگی وشیفتگی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ ایسی رباعیات میں وہ حسن کی دلربائی اور اس کی پر فریب اداؤں پر زیادہ توجہ دیتے ہیں۔

حسنِ رنگین قبا جو کہلاتا ہے   صدمۂ عشق کو کہاں پاتا ہے
ہاتھ کی انگلیوں پہ چھو لینے سے   تتلی کے پروں کا رنگ آجاتا ہے

شادؔ اپنی رباعیوں میں عزم وحوصلوں کی خوب باتیں کرتے ہیں۔ وہ انسان کو ہر حال میں اعتماد بحال رکھنے کا مشورہ دیتے ہیں۔ ساتھ ہی ایسے اعمال کی ترغیب بھی دیتے ہیں جن سے عاقبت سنور سکے۔ ان کے یہاں اس ضمن میں یاس کے بالمقابل آس کی زیادہ تہہ داری ہے اور قنوطیت کے ظلام کے برعکس رجائی انوار کی کثرت دکھائی دیتی ہے۔

کوششِ نامراد فریادی ہے   اعتمادِ عمل کی بربادی ہے
ہم کو احساسِ پستی و محرومی   ’’قید خانے میں ذکرِ آزادی ہے‘‘

شادؔ پند ونصائح کی باتیں کرتے تو ہیں لیکن وہ بوجھل اور قشف آمیز نہیں ہوتیں بلکہ عبرت انگیزی کے باوجود ان میں رس گھولنے والی چاشنی ہوتی ہے۔ وہ بعض مواقع پر الفاظ کا ایسا استعمال کرتے ہیں کہ بات میں بات پیدا ہو جاتی ہے۔ مثلاً وہ کہتے ہیں۔

بد ذاتوں کو فخرِ ذات کہنے والے   ہوتے ہیں گھما کے بات کہنے والے
پا کے موقع مچا رہے ہیں اندھیر   اندھے نہیں دن کو رات کہنے والے

گزشتہ سطور میں آل احمد سرور کے حوالے سے یہ بات کہی گئی تھی کہ سماج کی

www.urduchannel.in

خرابیوں پر ان کی شاعری میں طنز پایا جاتا ہے۔ یہ عنصر ان کی رباعیوں میں بھی ہم بہ آسانی دیکھ سکتے ہیں۔ انھوں نے حالیہ دور کی انا پسندی، چاپلوسی، دکھاوے کی تحسین اور جھوٹی تعریف کے چلن پر طنز کے نہایت کرارے نشتر چلائے ہیں۔

غوغائے ’منم‘ جہالتِ مطلق ہے   ’’باز گزشتِ صدائے گنبد حق ہے
جوہریؔ مجھ کو جانتا ہے ’’پتھر‘‘   میں سمجھتا ہوں جوہری ’’احمق‘‘ ہے

....

بستے بغلوں میں ہاتھ میں انٹے   راہ میں کھیلتے ہوئے لڑکے
ان کے تیور بتا رہے ہیں شاد   یہ بنیں گے وطن کے ایم۔ ایل۔ اے

غزلوں کی طرح ان کی رباعیوں میں بھی زندگی سے ان کا رشتہ حریفانہ نظر آتا ہے۔ مندرجۂ بالا میں ہم اس کی مثالیں دیکھ چکے ہیں۔ ان رباعیوں میں غمِ زندگی کی کسک، شدت سے محسوس کی جاسکتی ہے۔ شادؔ نے زمانے کی ناانصافیوں کو جس انداز میں محسوس کیا ہے انھیں غزلوں، نظموں اور رباعیات وقطعات میں پیش کر دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی غزلوں میں بھی غمِ جاناں کے برعکس غمِ دوراں ہی ابھر کر سامنے آتا ہے۔ آخر زمانے کے نشیب وفراز سے دکھ انگیخت کرتے ہوئے شادؔ ۶۴ برس کی عمر میں انتقال کر گئے۔

............☆............

خضر حیات ناگپوری

شادؔ عارفی کی غزل کا طنزیہ واحتجاجی آہنگ

ندؔا فاضلی نے شادؔ عارفی کی غزل پر اظہار خیال کرتے ہوئے شادؔ کی شاعری کو ’’نہیں‘‘ کی شاعری کہا ہے۔ ندؔا فاضلی نے بڑی ہی بلیغ اور پُر معنی بات بہت کم لفظوں میں بیان کردی ہے۔ حقیقت تو یہی ہے کہ ’’ہاں‘‘ کہنا بہت آسان ہے، ’’نہیں‘‘ کہنا بہت مشکل۔ روز مرہ کی زندگی میں ہم معمولی معمولی باتوں کے لیے ’’نہیں‘‘ کہنے میں جھجک محسوس کرتے ہیں اور اگر معاملہ سماجی روایات، معاشرتی وضع داری اور تسلیم شدہ خاندانی اقدار کا ہو تو ’’نہیں‘‘ کہنے کے لیے بڑا حوصلہ درکار ہوتا ہے۔ شادؔ عارفی نے یہ حوصلہ دکھایا۔ ’’نہیں‘‘ کہنے کی سزا بھی انہیں بھگتنی پڑی۔ افلاس، بے روزگاری، گم نامی، ناقدری، رشتہ داروں کی بے رخی اور اپنوں کی ستم رانیوں نے عمر بھر ان کا پیچھا نہ چھوڑا۔ عمر بھر وہ اپنے ماحول، اپنے عہد اور اپنے معاشرہ کی کج روی، بے اعتدالی، بے راہ روی اور بے حیائی پر طنز کے تیر برساتے رہے۔

احمد علی خاں شادؔ عارفی (لڈن خان) ۱۹۰۰ء میں پیدا ہوئے اور چونسٹھ سال کی عمر پاکر ۱۹۶۴ء میں وفات پائی۔ ڈاکٹر مظفر حنفی نے ’’کلیاتِ شادؔ عارفی‘‘ کے نام سے ان کا دست یاب کلام مرتب کر کے مارچ ۱۹۷۵ء میں شائع کروایا۔ اس مجموعہ میں شادؔ کی ۲۶۰ غزلیں، ۱۱۸ نظمیں اور ۹۳ قطعات ورباعیات کے علاوہ نعت، سلام اور چند سہرے بھی

www.urduchannel.in

شامل ہیں۔

ڈاکٹر مظفر حنفی کی تحقیق کے مطابق شادؔ عارفی نے اپنی چونسٹھ سالہ زندگی میں چھیالیس سینتالیس سال شعروسخن کی خدمت میں صرف کیے۔ گویا آزادی کے قبل تیس سال اور آزادی کے بعد کے سولہ سترہ برسوں پر ان کی شعرگوئی کا زمانہ محیط ہے۔ یہ پورا عرصہ ہندوستانی تاریخ میں زبردست تبدیلیوں اور انقلابات کا مظہر رہا ہے۔ ایک طرف اقتدار سے محرومی نے مسلم معاشرہ میں مایوسی، دل شکستگی اور محزونی ومحرومی کی ایک عام فضا پیدا کردی تھی تو دوسری جانب لسانی، تہذیبی، سماجی اور تعلیمی تغیرات نے پرانے بتوں کو مسمار کردیا تھا۔ انگریزی تہذیب کی چمک دمک نئی نسل کو اپنی طرف کھینچ رہی تھی۔

سیاسی سطح پر جو اتار چڑھاؤ ہوئے اس کے اثرات زیادہ دوررس، زیادہ ہلاکت آفریں ثابت ہوئے۔ عظیم الشان مغلیہ سلطنت جو سترھویں صدی عیسوی میں اپنے نقطۂ عروج پر تھی، اٹھارھویں صدی کے آتے آتے کچھ اس طرح روبہ زوال ہوئی کہ قوتِ عمل اور جادۂ حیات پر آگے بڑھنے، پھیلنے کی صلاحیت سے محروم ہوگئی۔ مغل دور میں صرف لال قلعہ اور تاج محل ہی تعمیر نہیں ہوئے بلکہ ایک گنگا جمنی سیکولر ہندی تہذیب کے برگ وبار بھی پھولے پھلے۔ آہستہ آہستہ سیاسی قوت کے ساتھ ساتھ اس خوب صورت تہذیب کو بھی زوال کا شکار ہونا پڑا۔ خانہ جنگی، طوائف الملوکی، عیش پرست امرا کی باہمی آویزشیں، عسکری قوت کی کمزوری اور ملک وقوم کے وسیع تر مفاد کے لیے اتحاد واتفاق کے فقدان نے سیاسی وسماجی بحران کی سی کیفیت پیدا کردی تھی۔ سلطنت اور معاشرہ کے اس بحران کا راست اثر افراد پر بھی پڑا۔ خیر وشر کی تمیز اٹھ گئی۔ چاپلوسی اور منافقت نے فرد کے کردار کو دوغلا بنادیا۔ فرد کمزور ہوا تو خاندان اور پھر معاشرہ میں بھی کمزوری در آئی۔ خیروشر کے درمیان امتیاز کرنے کی صلاحیت کمزور ہوئی تو معاشرہ میں منفی اقدار کو بڑھاوا ملا اور مثبت اقدار وفکر میں کمزوری پیدا ہونے لگی۔ شر کی طاقتیں غالب ہوئیں تو خیر کی قوتوں میں تحدید کا عمل جاری وساری ہوا۔ ہندوستانی سماج کے لیے اس کے نتائج بہت بھیانک نکلے۔ حکمراں طبقے کی قوت عمل مفلوج ہوگئی۔ عیش پرستی، گروہ بندی، خودغرضی، تنگ نظری،

چاپلوسی اور سازشانہ ذہن نے معاشرہ کو دیمک کی طرح چاٹنا شروع کر دیا۔ اوہام پرستی نے بے چینی، بے یقینی اور بے سمتی کی عام فضا پیدا کر دی۔ یہ فضا ان علاقوں میں زیادہ گہری تھی جہاں پشتینی نوابوں، راجاؤں اور جاگیرداروں نے حکومت پر قبضہ کر رکھا تھا۔ پورا معاشرہ بڑی سرعت کے ساتھ زوال پزیر تھا۔

شاؔد عارفی اسی زوال پزیر معاشرہ کے فرد تھے۔ قدرت نے انہیں حساس دل اور فکر و نظر کی گہرائی عطا کی تھی۔ مجھے ان کے ذاتی حالات سے واقفیت براہ راست تو نہیں ہے لیکن فیروز مظفر کی مرتب کردہ کتاب ''شاؔد عارفی۔ حیات و جہات'' سے جو معلومات حاصل ہوئی ہیں ان سے پتہ چلتا ہے کہ فطرت نے انہیں مصائب و آلام کی چکّی کے پاٹوں میں خوب اچھی طرح پیسا اور زندگی نے انہیں بہت کم راحت و مسرت عطا کی۔ مہندی اُسی وقت رنگ دیتی اور مہکتی ہے جب اُسے سِل پر خوب پیسا اور گھوٹا جائے۔ حساس دل انسان بھی اسی وقت اپنی صلاحیتوں کو مکمل طور پر بروئے کار لاتا ہے جب انفرادی طور پر زندگی کے دکھوں کو جھیلتا ہوا، اندھے، بہرے، گونگے معاشرہ کو دیکھتا اور ''بسر کرتا'' ہوا، نشیب و فراز حیات کی سختیوں سے گزرتا ہوا، اپنوں کی طوطا چشمی اور غیروں کی حد سے فزوں بے رخی کو سہتا ہوا وہ اپنی زندگی کے تشکیلی مراحل سے گزرتا ہے۔ شاؔد عارفی کے ساتھ یہی ہوا۔

جس دور میں شاؔد زندگی کے پست و بلند سے نبرد آزما تھے اُس دور میں زیادہ تر لوگ ''خوش باش دمے کہ زندگانی ایں است'' کی تصویر بنے پھرتے تھے۔ ؎ ہو رہے گا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا، کہہ کر تسلی خود کو اور دوسروں کو دے لیتے تھے۔ کچھ تھے جنہیں دردمند دل کی دولت ودیعت ہوئی تھی، جو دم بدم بدلتے حالات پر نظر رکھتے اور ان سے اثر بھی لیتے تھے۔ لیکن وہ بھی کچھ کرنے پر قدرت نہیں رکھتے تھے اور اسی لیے ان کے اندرون میں ایک طرح کی جھلاّہٹ، احتجاجی کیفیت اور طنز و مزاحمت کے آثار پیدا ہو گئے تھے۔

شاؔد کی شخصیت کو سمجھنے کے لیے ان عوامل کو سمجھنا ضروری ہے۔ انھوں نے جو ''نہیں'' کی شاعری کی، ضد اور مزاحمت کا رویہ اختیار کیا، طنز اور احتجاج کی صدا بلند کی، اس میں

www.urduchannel.in

متذکرہ بالا سارے اسباب نے تشکیلی کردار ادا کیا۔ خود شاؔد نے اعتراف کیا ہے کہ ابتدا میں چار پانچ سال حاؔلی کی طرح انھوں نے بھی روایتی گل و بلبل کی شاعری کی۔ لیکن جب وہ آگہی کے کرب سے گزرے تو فکرِ سخن کا پہیّہ پورے زاویۂ قائمہ پر گھوم گیا۔ ؎

مجھے بھی شاؔد ریشمیں شاعری کا شوق تھا
مگر وہ عمر سرخوشی کی تھی یہ آگہی کی ہے

آگہی کے کرب نے انھیں احتجاجی آہنگ عطا کیا۔ انھوں نے نظموں میں ہی نہیں، غزلوں میں بھی ضد، مزاحمت اور طنز کے پیرائے کو اختیار کیا۔ لفظوں کے فن کارانہ استعمال سے ان میں چھپی آگ اور نشتریت کو سامع اور قاری تک پہنچانے میں کامیابی حاصل کی۔ انھیں دربارداری، تملق و خوشامد، ظاہرداری اور خود غرضی سے حد درجہ نفور تھا۔ خود کہا ہے ؎

پڑے تاریخ ادب ہم کو وہ کہنا ہوگی
جو غزل شاعر دربار نہیں کہہ سکتے

شاؔد عارفی کو لفظ کی حرمت اور عظمت کا علم تھا۔ انھیں معلوم تھا کہ لفظ وہ بھی بتاتا اور دکھاتا ہے جو تصویر بتاتی اور دکھاتی ہے اور لفظ وہ بھی دکھاتا اور بتاتا ہے جو تصویر بتانے اور دکھانے سے قاصر رہتی ہے۔ اسی لیے انھوں نے لفظ کو خلاّقانہ مہارت کے ساتھ برتا۔ مقامی الفاظ کو بھی مہارت اور چابک دستی کے ساتھ استعمال کیا۔ انھوں نے محسوس کیا کہ ایمائیت، استعاراتی زبان اور اشارے کنائے اپنا اثر کھو چکے ہیں، اس لیے انھوں نے راست لہجہ اور طرزِ بیان اختیار کیا۔

دو سو سال قبل P.B. Shelley نے لکھا تھا کہ،

"Poets are the unacknowledged legislators of the world."

یعنی شاعر دنیا کے ایسے قانون ساز ہیں جن کی اس حیثیت کا اعتراف نہیں کیا جاتا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ باوجود اس ''بے اعترافی'' کے مزاحمت کرنے والے اور احتجاجی آہنگ رکھنے والے شاعر احتجاج کی لہریں اٹھاتے اور پھیلاتے ہیں، انقلاب کے بیج

کشتِ ذہن میں بوتے ہیں اور روزمرّہ کے واقعات پر اس طرح تبصرہ کرتے ہیں کہ انھیں آفاقیت عطا کردیتے ہیں۔ یہ شاعر حاشیے میں پڑے ہوئے کچلے اور ستم رسیدہ لوگوں کو آواز عطا کرتے ہیں۔ انقلابی جذبوں کو حیات جاودانی عطا کرتے ہیں اور سماجی تغیر کی راہیں ہموار کرتے ہیں۔ شاؔد عارفی اسی قبیلے کے شاعر تھے۔

آپ کو کتنی اذیت ہوگی
میں اگر آپ کی باتوں میں نہ آؤں

....

تمھیں رہبر سمجھنا پڑ گیا ہے
ہماری بے کسی کی انتہا ہے

....

میں اپنے لفظ واپس لے رہا ہوں
یہ رہزن تھا ، میں سمجھا رہنما ہے

مذکورہ بالا تینوں اشعار میں طنز کی کاٹ ذرا ہلکی ہے۔ لیکن یہی لہجہ مندرجہ ذیل اشعار میں بہت تیکھے اور بلند آہنگ احتجاج میں تبدیل ہوجاتا ہے۔ سننے اور پڑھنے والے ایسے اشعار کو پڑھتے اور سنتے ہیں تو تلملا اٹھتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ راست حق گوئی تلخ ہوتی ہے۔ سچ تو کڑوا ہوتا ہے۔

جب چلی اپنوں کی گردن پر چلی
چوم لوں منہ آپ کی تلوار کا

....

بعض احمق تک رہے ہیں آج تک
آسرا گرتی ہوئی دیوار کا

....

ہے تو احمق چونکہ عالہ شان کا شانے میں ہے
اس لیے جھک مارنا بھی اس کا فرمانے میں ہے

....

اصطلاحاً برے کو بھلا کہہ دیا
یعنی گالی نہ دی رہنما کہہ دیا

شاؔد نے باوجود احتجاجی آہنگ اور طنز یہ لہجے کے ندرت ادا اور لطافت بیان کو مجروح نہیں کیا ہے۔ خود کہا ہے۔

صداقتوں کی تلخیوں کے ساتھ شاؔد عارفی
لطافتِ بیانِ واقعہ غزل کی جان ہے

انھیں عظمت فن کی روایتوں کا پاس رہا ہے۔ لیکن کبھی کبھی لہجہ کی تلخی حد سے بڑھ جاتی ہے اور تیر کی طرح دل میں ترازو ہوجاتی ہے۔

ان کی مدّاح اس زمانے میں
جیسے کتّے قصائی خانے میں

....

ہم خدا کے ہیں وطن سرکار کا
حکم چلتا ہے مگر زردار کا

....

زندگی پر دلیر ہیں وہ لوگ
مقبروں سے جو لے رہے ہیں خراج

....

صرف اپنوں کے تقرر کا ارادہ ہوگا
اور اخبار میں اعلان ضرورت دیں گے

....

ہر غلط بات پر بھی ہاتھ اٹھاؤ[
یہ نمائندگی نہیں شرماؤ

....

تمھیں علم و عمل سے واسطہ کیا
''سکندر بخت کے پوتے ہو'' یارو

....

www.urduchannel.in

جس کا ہر قہقہہ حماقت ہے
لوگ ان مسخروں سے ڈرتے ہیں

....

یہ نرالی طرز استدلال یہ جمہوریت
خون کے دھبّے بتاتے ہیں کہ یہ قاتل نہیں

شاؔد نے سیاست دانوں کے کھوکھلے پن، ریاکاری اور غیر اخلاقی حرکتوں پر طنز کے تیر برسائے تو دوسری طرف انھوں نے ادبی دنیا میں ''دبنگوں'' کے نازیبا رویوں پر بھرپور تنقید کی ہے اور ان کی خوشامد خوری، موقع پرستی اور غیر ادبی رویوں کی خوب خوب پردہ دری کی ہے۔ مندرجہ ذیل اشعار دیکھیے۔

ان ماہرانِ شعروادب نے جناب شاؔد
عریانیِ غزل کا کبھی جائزہ لیا

....

کُل شہر سخنور ہے تو کیا عرض کیا جائے
ایک ایک سے بڑھ کر ہے تو کیا عرض کیا جائے

....

جناب شاؔد یہ چربے اتارنے والے
ہماری طرح مضامیں شکار فرمائیں

....

شاؔد وہ لوگ بہرحال بڑے شاعر ہیں
جن کو قانون میں آتا ہے غزل خواں ہونا

....

ہمارے حق میں علاّمہ ہے اے شاد
جو ناقد چیل کو کہہ ہما ہے

....

'فن پناہو' تم نے اپنا، قوم کا احباب کا
فائدہ جس میں نہیں وہ علم حاصل کیوں کیا

(شاؔد نے رجعت پسند شاعروں کو 'فن پناہو' کہا ہے)

www.urduchannel.in

ایک رنگ آتا ہے، ایک رنگ جاتا ہے
مصلحت پرستوں کی شاعری عبوری ہے

شعر کہتے ہیں افیون کھا کر
شاعرِ ''عندلیب و قفس'' بھی

....

بڑھیا شاعر بھی دیکھے ہیں
کھٹیا شعروسخن کے عادی

....

شاد کا لہجہ، ان کا رنگ تغزل، ان کا آہنگ شعری طنز و احتجاج سے عبارت ہے۔ خود ان کا تخلص ان کی زندگی پر گہرے طنز کی حیثیت رکھتا ہے۔ عمر بھر ناشاد و نامراد زندگی بسر کرنے والا شاعر شاؔد تخلص رکھتا ہے۔

دوسرے شاعر جہاں روتے ہیں میں ہنستا ہوں شاؔد
مسکرانا جس کی فطرت ہو وہ رونے سے رہا

تاریخ کے ہر دور میں کم ظرفوں، بے راہ رووں، ریاکاروں، منافقوں اور خوشامد خوروں کا بول بالا رہا ہے۔ اہلِ کمال ناقدری کا رونا روتے رہے ہیں۔ دنیا شاید اسی طرح چلتی ہے کہ۔

اسپ تازی شدہ مجروح بزیر پالاں
طوق زریں ہمہ درگردنِ خرمی بینم

شاؔد کے ساتھ بھی ایسا ہوا تو کیا تعجب اور اگر ایسا نہ ہوتا تو شاؔد، شاد نہ بنتے۔ رام پور کے شاعروں کے جمّ غفیر کے ایک فرد ہوتے جن کا نام بھی آج کوئی نہیں جانتا۔ بقول ندا فاضلی ''شاؔد زندہ حال کے باشعور شاعر ہیں، ان کا فن زندہ لمحوں کا اعلان نامہ ہے''۔ اور یہ ''اعلان نامہ'' غزل کے لیے نئے دروازے وا کرتا ہے۔ دنیائے ادب کے وہ ایک ایسے ''قانون ساز'' تھے جن کا اعتراف نہیں کیا گیا لیکن انھوں نے غزل کے روایتی لب ولہجہ کو

ایک ہی جھٹکے میں تبدیلی کی لذت سے آشنا کر دیا۔ انھوں نے غزل کو ''متاعِ عہد مستقبل'' بنانے کے لیے اس کا ''چولا'' بدلنے کی بات کی۔ انھیں یقین تھا کہ ؎

کریں گی شاؔد مجھے یاد کل نئی قدریں
جو آج رسم و رواجِ کہن پہ چوٹ کروں

شاؔد درحقیقت اپنے دور کے اینگری ینگ مین Angry Young Man تھے۔ وہ پورے عرفان و شعور کے ساتھ ادب و معاشرہ کی برائیوں کے خلاف چوطرفہ وار کرتے رہے اس یقین کے ساتھ ؎

وہ ہوں گے شاد پشیمان ایک دن جن کو
مرا کلام گزرتا ہے ناگوار ابھی

............☆............

نذیر فتحپوری

شاد عارفی کے ''غزل گاؤں'' سے کچھ منظر

بات شاؔد عارفی کی ہو اور غزل کے حوالے سے ہو تو نہ ذہن ساتھ دیتا ہے نہ قلم۔ ایسے میں کاغذ کی بساط ہی کیا۔ کاغذ تو ہے ہی پیدائشی کورا کنوارہ۔ اَن لکھا اور اَن پڑھا ہے۔ جن اربابِ نقد و نظر نے غزل کی تنقید لکھی ہے وہ بھی شاد عارفی کے ''غزل گاؤں'' سے گزرتے وقت آنکھوں پر پٹی باندھ لیتے ہیں یا کن انکھیوں سے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے فوراً یوں گزر جاتے ہیں جیسے کوئی انھیں دیکھ نہ لے۔ کچھ جدید غزل کے ناقد ایسے بھی ہیں جو دانستہ یہ گاؤں دیکھنا نہیں چاہتے یا سرے سے یہ گاؤں ان کے ذہن میں موجود ہی نہیں ہوتا، لیکن اس سے گاؤں کی اہمیت ختم نہیں ہو جاتی۔ جس گاؤں کی عمارتیں اپنی ہی بناؤں پر ایستادہ ہوں وہ گاؤں ہر طرح کی آندھی، طوفان اور زلزلے کے بعد بھی متزلزل نہیں ہوتا۔ نہ اس کا پلستر اکھڑتا ہے نہ دیواروں میں شگاف پڑتے ہیں۔ حتیٰ کہ کسی عمارت کا کنگورا بھی نہیں گرتا۔ ایسے ہی ''غزل گاؤں'' کے دیدار کرنے کا شرف آج مجھے حاصل ہو رہا ہے۔ یہ ''شاد عارفی کا غزل گاؤں'' ہے بقول مظفر حنفی:

''شاؔد صاحب کا خیال تھا کہ ان کا کلام نقد و نظر کے بس کا نہیں۔''

یہی وجہ ہے کہ خود مظفر حنفی نے شاؔد عارفی کے ''غزل گاؤں'' سے گزرتے وقت اپنی تیسری آنکھ جسے نقد و نظر کی آنکھ کہا جاتا ہے، بند رکھی، جس کا اعتراف وہ خود کرتے ہیں:

''اور میں نہیں چاہتا کہ جس کتاب کا مصنف یہ بات کہتا ہوا اس کا مرتب ہی اس پر نقد و نظر کی جرأت کرے۔'' (نثر و غزل دستہ: صفحہ نمبر ۸)

www.urduchannel.in

مظفر حنفی آگے اجازت دیتے ہوئے رقمطراز ہیں:

''یہ کام آپ کا ہے کہ میرے نمک مرچ لگائے بغیر براہِ راست فنکار کے متعلق اپنی رائے قائم کریں۔''

مظفر حنفی کے اس اجازت نامے سے حوصلہ پا کر مجھ ایسا غیر ناقد قسم کا قلم کار بھی شاد کے ''غزل گاؤں'' کا ''ادبی دیدار'' کرنے کے لیے ہمت جٹا بیٹھا، کیوں کہ دنیا میں جرأت و ہمت کی قیمت ہے میرے پاس جو جرأت و ہمت تھی اسے برادرم محبوب راہی نے مہمیز کیا اور ایسی ایڑ لگائی کہ میرا ''اسپ مطالعہ'' ایک ہی جست میں شاد عارفی کے ''غزل گاؤں'' کے بیچوں بیچ جا کر رکا۔ جہاں ایک بینر ایک بڑے چوراہے پر آویزاں تھا، جس پر شاد عارفی کا ایک شعر جلی حرفوں میں لکھا تھا:

حقیقتوں کی تلخیوں کے ساتھ شاد عارفی
لطافت بیانِ واقعہ غزل کی ہے

(نثر و غزل دستہ: صفحہ نمبر ۲۹۰)

اور اس طرح مجھے اس گاؤں کی سیر کا زاویہ مل گیا۔ یہ سچ ہے کہ شعر رہنمائی کرتا ہے۔ یہ حافظ شیرازی کا دیوان تو نہ تھا کہ میں فال لیتا، لیکن اشارہ تو بہر حال سمجھ ہی گیا تھا کہ شاد عارفی چاہتے ہیں کہ لاکھ ان کی غزلوں میں تلخی سہی، لاکھ سفاکیِ حالات کا نوحہ سہی، لاکھ ان کے شعر زہر میں بجھے ہوئے تیر کی مانند سہی، لیکن ان اشعار کی تہہ میں پوشیدہ لطافتِ بیان پر غور و خوض کرنا ضروری ہے۔ تو ملاحظہ کر لیں پہلی غزل کا چھٹا شعر۔ میں نے تو اس میں لطیف اشارہ محسوس کیا ہے:

صدا لگاؤ کہ آنکھیں عجیب نعمت ہیں
انھیں یقین دلاؤ کہ روشنی کم ہے

یعنی جب آنکھوں جیسی نعمت کے چراغ لرز رہے ہوں تو دنیا کا چہرہ صاف دکھائی نہیں دیتا۔ منظر دھندلا جاتے ہیں۔ سائے ایک دوسرے میں مدغم ہو جاتے ہیں۔ آنکھوں میں اگر بھرپور روشنی ہو تو سارا منظر روشن دکھائی دیتا ہے۔

لطافتِ بیان کی مکمل تشریح ممکن نہیں۔ ظاہر ہے کسی چیز میں کسی کو لطف آتا ہے، کسی

www.urduchannel.in

اور کو اس چیز میں قطعی لطف نہیں آتا۔ مجھے ان اشعار میں بھی لطف کا احساس ہوا:

لا اے ساقی، تیری جے ہو   کوئی بھی پینے کی شے ہو

اور دنیا پر یہ لطیف طنز جس کے لیے شاد عارفی مشہور ہیں:

میں دنیا پر طنز کروں گا   دنیا میرے کیوں در پے ہو

شاد عارفی نے خود اعتراف کیا ہے کہ وہ منظروں سے لطف اندوز ہونے کو ترجیح دیتے ہیں، لکھتے ہیں:

''میں رستے میں اِدھر اُدھر کے مناظر نظر انداز کرنا پسند نہیں کرتا کیوں کہ میں چاہتا ہوں کہ جس منظر اور مشاہدے میں کچھ تفریح ہو، کچھ رنگینیِ حیات پائی جائے وہ کسی نظم، غزل، قطعے یا رباعی میں سمو کر ناظرین کے حوالے کر دی جائے کہ وہ ان کی امانت ہے۔'' (نثر و غزل دستہ: صفحہ ۴۶۰)

ایک منظر جو واقعی لطفِ بیان کی بھرپور عکاسی کرتا ہے:

مہکتی چاندنی شب بھر جگا کر   چمکتی دھوپ میں سوتے ہو یارو
نظر آتے ہیں جب چہروں پہ دھبے   تو پشتِ آئینہ دھوتے ہو یارو
یہی ہے سعیِ نا مشکور مہمل   کہ دو پاتے ہو سَو کھوتے ہو یارو

شوخی اور شرارتوں کے اظہار میں لطافتِ بیان کا عنصر ایک فطری شاعر کے لیے بہت سہل ہوتا ہے۔ شاد عارفی کے ''غزل گاؤں'' میں ایسے منظر قدم قدم پر نہ سہی لیکن طویل فاصلوں کے بعد بھی صاف نظر آ جاتے ہیں۔ مثلاً

ہم خوبیِ تقدیر سے جس روز بھی جائیں
اس در پہ اسی روز نگہباں نہیں ہوتا
گل چیں کو شگوفوں کی تجارت سے غرض ہے
اندھوں کے لیے جلوۂ جاناں نہیں ہوتا

اپنی غزل کے ذریعے شاد عارفی منظر کو تصویر بنانے کے ہنر میں جس مشاقی کا مظاہرہ کرتے ہیں اس سے ان کی بے پناہ فنی چابک دستی کا پتہ چلتا ہے۔ یہ منظر تصور میں

تصویر بنا کر ملاحظہ کریں اور اس میں پوشیدہ لطافتِ بیان سے بھی لطف اندوز ہوں:

میری اعلیٰ ظرفی ''میرے چہرے پر تحریر'' نہ پا کر
ساقی نے گہری نظروں سے مجھ کو دیکھا، ساغر دیکھا

اور ایک منظر۔ دو حصوں میں منقسم، دن اور رات۔ اندھیرا اور اجالا۔ ایک پجاری دوسری دھنی۔ ایک ذرہ دوسرا استارہ۔ اس پر شاؔد عارفی کی طنزیہ ملامت اور فطری لطافت ملاحظہ کریں:

ہم اجالوں کے پجاری، تم اندھیروں کے دھنی
دن میں ذرّے جگمگاتے ہیں، ستارے رات کو

اور ایک منظر ایک طنز، ایک لطیف اشارہ:

وہ ہمیں تلقین فرماتے ہیں ایسے مشورے
جیسے اندھوں سے کہا جائے کہ ''بائیں ہات کو''

اور پھر ایک منظر اسی غزل کے بطن سے نمودار ہوتا ہوا تغزل کی بھینی بھینی خوشبو کا آئینہ، محسوسات کی گہرائیوں سے نمو پایا ہوا خوبصورت احساس:

ان لبوں پر مسکراہٹ زلف لہرانے کے بعد
گلستاں میں پھول کھلتے ہیں ہمیشہ رات کو

تشبیہات کی اپنی کائنات ہوتی ہے۔ تمثیلات و استعارے کی اپنی الگ دنیا ہوتی ہے اور غزل کا اپنا گاؤں۔ شاؔد عارفی کے اس ''غزل گاؤں'' میں جگہ جگہ تشبیہات اور تمثیلات اور استعاروں کے ''گل بوٹے'' کھلے ہیں۔ اسی غزل کا ایک اور شعر:

گیت، افسانہ، کہانی، داستاں، نغمہ، غزل
سیکڑوں سانچوں میں ڈھالا ہے غمِ حالات کو

ویسے شاؔد عارفی پر بہت سے الزام سننے میں آتے ہیں۔ کہتے ہیں جنسی ناآسودگی کا اظہار ان کے یہاں کثرت سے پایا جاتا ہے۔ طنز کے تیر وہ پوری تخلیقی قوت سے چلاتے ہیں۔ سیاست پر راست وار کرتے ہیں۔ سماج پر یلغار کرتے ہیں۔ روایتی تہذیب و تمدن کے پرخچے اڑاتے نظر آتے ہیں۔ لیکن مجھے تو ان کے ''غزل گاؤں'' کی سیر کرتے وقت

www.urduchannel.in

ایسا ناپسندیدہ کوئی منظر دکھائی نہیں دیا۔ یا ممکن ہے نظر آیا بھی ہوگا تو کن انکھیوں سے ان ناپسندیدہ مناظر کو دیکھتے ہوئے میں گزر گیا ہوں گا۔ یہی وجہ ہے کہ ایسی غزلوں پر میری آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں:

غم نہیں مانتا، شراب تو لاؤ — ورنہ اے زاہدو! علاج بتاؤ
بد مزاجی کو معتبر نہ بناؤ — بزم سے ہم کو مسکرا کے اٹھاؤ
عہدِ حاضر کی روشنی پہ نہ جاؤ — جب ستارے بجھیں، چراغ جلاؤ
سینک سکتے ہیں آپ بھی آنکھیں — جل رہے ہیں نشیمنوں کے الاؤ
میری تنقید عہدِ حاضر سے — ہو اگر متفق تو ہاتھ اٹھاؤ

مجھے نہیں معلوم کہ شاؔد عارفی کی عہدِ حاضر پر تنقید سے متفق ہو کر کتنوں نے ہاتھ اٹھائے، لیکن میں تو پہلے ہی مطالعہ میں ایک نہیں اپنے دونوں ہاتھ اٹھا رہا ہوں اور شاؔد عارفی کی فکری اور فنی معراج کی گواہی دیتا ہوں، کیوں کہ:

شاؔد ضعیف العمر ہے لیکن اس کے شعر جواں ہوتے ہیں
ایسے لوگ کہاں ملتے ہیں، ایسے لوگ کہاں ہوتے ہیں
زاہدِ میخانہ کی راتوں پر آجائے نہ حرف
لوگ سمجھتے ہیں کعبے میں لیکن آپ یہاں ہوتے ہیں
چند بڑے لوگوں سے مل کر میں نے یہ محسوس کیا ہے
اپنی بابت نا اہلوں کو کیا دلچسپ گماں ہوتے ہیں

میں اعتراف کرتا ہوں کہ میں شاؔد عارفی کے ''غزل گاؤں'' کی پوری طرح سیر نہ کر سکا۔ ابھی بہت سے پر لطف منظر دیکھنے سے میری آنکھیں محروم ہیں، لیکن یہ محرومی مجھے عزیز ہے، بلکہ عزیز تر ہے، کیوں کہ محرومی کا یہی احساس مستقبل میں فرصت سے اس ''غزل گاؤں'' کی سیر حاصل منظر کشائی کے باب وا کرے گا۔ اس کا یقین ہے اور اس یقین کے ساتھ اجازت!

......☆......

ڈاکٹر امام اعظم

نئی غزل کا معمار: شاد عارفی

عہدِ غالبؔ کے تقریباً سو سال بعد سیاسی، معاشی اور تہذیبی حالات بدلے تو اردو غزل نے بھی کروٹ بدلی۔ ایسے حالات میں جن شعراء نے غزل کے موضوع و مواد اور اسلوب و لہجہ کے روایتی دائرہ کو پھلانگنے میں اہم کردار ادا کیا ان میں شادؔ عارفی کا نام قابلِ ذکر ہے۔ شادؔ عارفی اپنے منفرد رنگ و آہنگ اور نئے فکری اور لفظیاتی نظام کے نظم و بست کے لیے اردو ادب میں اپنی ایک الگ پہچان رکھتے ہیں۔ یگانہ چنگیزی کی طرح انھوں نے بھی اپنے لیے ایک علیحدہ راہ اختیار کی تھی۔ بقول شمس الرحمٰن فاروقی:

> ''یگانہ، فراق اور شاد عارفی نے اپنی اپنی انفرادیت کو زیادہ استقلال بخشا۔ انھوں نے غزل کے سرمائے سے ایسے الفاظ کم کرنے کی کوشش کی جو اردو غزل کی دونوں روایتوں میں مشترک تھے جنھیں ترقی پسندوں نے بھی مسترد نہیں کیا تھا لیکن جو اپنی معنویت کھو چکے تھے۔ انھوں نے شاعرانہ موضوعات کی کچی عمارت ڈھا دی اور یہ دکھایا کہ خلاقانہ ذہن کے لیے ہر موضوع شعر کا موضوع بن سکتا ہے۔''

(مضمون ''ہندوستان میں نئی غزل''، ''رسالہ فنون'' لاہور، جدید غزل نمبر)

شادؔ عارفی کی تخلیقی اپج کا تیور ان کے اندازِ بیان میں مضمر ہے۔ وہ روایتی الفاظ کی معنویت کو نیا رنگ و آہنگ دینے کا ہنر جانتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں:

www.urduchannel.in

سینک سکتے ہیں آپ بھی آنکھیں
جل رہے ہیں نشیمنوں کے الاؤ

آدمی کو آدمی مصروف بہکانے میں ہے
یہ قباحت ہے جو ذہنی انقلاب آنے میں ہے

اہلِ ظاہر نے وہ بدنام کیا ہے اے شادؔ
داڑھیاں جن کے نہ ہوں گی وہ مسلماں ہوں گے

نا خدا، راہ نما، برہمن و شیخ و مغاں
ہے کوئی روپ جو رہزن نے نہ دھارا ہوگا

یہ ہیں شادؔ عارفی کے کلام کی اوریجنلٹی کا تیور کہ انھوں نے اپنے اردگرد کے ماحول کو جس روپ میں دیکھا اسے ویسا ہی نظم کر دیا لیکن روزمرہ کے مشاہدات و تجربات کا اظہار روزمرہ کی زبان میں اس طرح برتا کہ وہ بظاہر کھلم کھلا اظہار معلوم ہوتا ہے مگر جذبِ دروں سے معمور شعری تجربے کی ندرت کا غماز ہے۔ شاعر خواہ کوئی بھی تجربہ کرے، کوئی بھی شعری طریق بروئے کار لائے اگر اس کے تخلیقی عمل میں وہ تپش نہیں جو دلوں کو گرما دے اور احساس کو منور کر دے تو قابلِ توجہ نہیں ہوتا۔ بات سامنے کی کیوں نہ ہو، اگر شاعر اسے سلیقے اور ہنرمندی کے ساتھ کہتا ہے تو وہ فن پارہ بن کر قاری کے دل کو چھو لیتا ہے اور یہ فن بڑے مشق و مزاولت کے بعد ہی حاصل ہوتا ہے۔ شادؔ عارفی اردو کے واحد شاعر ہیں جو ہمارے بالکل سامنے کی بات کو نئی لفظیات اور تراکیب کے ذریعے پیش کرنے کا ہنر جانتے ہیں جو اپنی تازگی، تاثیر اور منفرد رنگ و آہنگ رکھتی ہے۔

روزمرہ بول چال اور محاوروں کا برتاؤ کلاسیکل شعراء کی روایت رہی ہے مگر شادؔ عارفی کے یہاں ان کے برتاؤ میں تتبع کا شائبہ تک نہیں ملتا بلکہ وہ نئی معنویت کے ساتھ جلوہ گر ہیں۔ مثلاً:

یہاں چراغ تلے لوٹ ہے اندھیرا ہے
کہاں چراغ جلانے کی بات کرتا ہوں

مگر یہاں تو جل رہا ہے آدمی سے آدمی
سنا تھا یہ چراغ جلتے آئے ہیں

دل کو دل سے راہ، کی بابت میں ایمان سے کہہ سکتا ہوں
اس کوچے سے میں جب گزرا اس کو دروازے پر دیکھا

یہ انداز اور لب ولہجہ اردو شاعری کی مروجہ روایت سے بالکل الگ ہے۔ اس ضمن میں پروفیسر آل احمد سرورؔ نے مضمون ''میرا صفحہ'' مطبوعہ ہفتہ وار ہماری زبان، علی گڑھ ۸/اپریل ۱۹۶۸ء میں لکھا ہے:

''جو لوگ شاعری اور بول چال کی زبان کو ایک دوسرے سے الگ کر کے دیکھتے ہیں انھیں شادؔ کے کلام کا مطالعہ کرنا چاہیے۔ شادؔ نے بول چال کی زبان کی طاقت اور شعریت کو جس طرح اجاگر کیا ہے اور جس طرح بقول ایذرا پاؤنڈ ''حقیقی نفسیات'' کو زبان دی ہے، اسے جدید اردو شاعری ہمیشہ یاد رکھے گی۔''

تاہم بعضوں نے نظیرؔ اکبر آبادی کی طرح ان کے بھی اس شعری رویے پر عمومیت اور اور پھکڑ پن کا ٹھپہ لگانے کی سعی کی ہے اور واقعہ بھی ہے کہ کہیں کہیں ان کے ہاتھ سے شعری اقدار کا دامن چھوٹتا نظر آتا ہے، مگر تخلیقی عمل اور کچھ نیا کرنے کے عزم میں ایسا ہوتا ہی ہے۔ یگانہ چنگیزی اور غالب کے یہاں بھی ایسی مثالیں ہیں، اس سے عمومی طور پر نہ غزل کا فن مجروح ہوتا ہے اور نہ شاعر کی عظمت پر حرف آتا ہے بلکہ علاقائی لمس کی وجہ سے زبان میں ایک خاص قسم کا لطف اور دلکشی پیدا ہوگئی ہے۔

www.urduchannel.in

تشبیہ کو ایک شعری وسیلے کے طور پر استعارے سے کم اہم گردانا جاتا ہے لیکن شادؔ عارفی نے اپنی تشبیہات کو ندرت عطا کر کے ان کی دلکشی اور اہمیت کو دوچند کر دیا ہے۔ مثلاً:

سب سے اونچی شاخ پر تازہ گلاب
جیسے کوئی ماہ پارہ بام پر

سالونی چنچل گھٹا برسات کی
جیسے دوشیزہ کوئی دیہات کی

اسے نسیمِ چمن کہہ رہا ہوں میں لیکن
کہیں نسیمِ چمن مڑ کے دیکھتی بھی ہے

قصرِ آزادی تصور کر رہے تھے جس کو ہم
ایک ٹوٹے مقبرے کی طرح ویرانے میں ہے

اس قسم کی لاتعداد نادر اور انوکھی تشبیہات اپنے مناسب موقع ومحل پر شاد عارفی کے یہاں اس طرح برتی گئی ہیں کہ اپنے سیاق وسباق سے ہٹ کر ان تشبیہوں کا حسن زائل ہوتا نظر آتا ہے۔ اسی طرح حسین وشگفتہ استعاروں کا بھی یہی حال ہے کہ حیرت انگیز نئی تراکیب سے بار بار معانقہ ہوتا ہے۔ اس سلسلے میں ظ۔ انصاری کی رائے بڑی صائب معلوم ہوتی ہے کہ:

''الفاظ اور تراکیب سے ان کا برتاؤ جمہوری ہے۔ غزل کی وضعدارانہ محفل میں بھی ہر ایک گوت اور ہر ایک فیشن کے الفاظ کو پاس بٹھا لیتے ہیں، نہ ناک بھوں چڑھاتے ہیں نہ ذات برادری پوچھتے ہیں۔ کتنے ایسے غزل گو ہیں جو شادؔ عارفی کی طرح دعویٰ کر سکیں کہ ان کی غزل جدید نظم کے لب ولہجے سے اس قدر قریب ہے۔''

(''شادعارفی کی شاعری اور شخصیت'' ماہنامہ صبا، حیدرآباد، اکتوبر ۱۹۶۴ء)

شاؔد عارفی کی غزلیں حسن و عشق کی کیفیات و واردات کے اظہار میں بھی دیرینہ روایاتِ غزل کی جگہ نئی روایت قائم کرتی ہیں اور مواد و اسلوب ہر دو لحاظ سے منفرد نظر آتی ہیں بقول پروفیسر مظفر حنفی:

''شادعارفی نئی بات کہتے ہیں یا عام سی بات کو اس زاویے سے کہتے ہیں کہ وہ نئی ہو جاتی ہے۔ انھوں نے پرانے لفظوں کو نئی فضا اور معنویت بخشی۔ یہی نہیں ان عشقیہ غزلوں میں محاکات، معاملہ بندی اور واقعہ نگاری ایک ایسے انوکھے انداز سے کی گئی ہے جو ان سے قبل ناپید تھا بلکہ وہ عشق کے تاثرات اور وارداتِ قلب کو بھی اسی ندرت ادا کے ساتھ بیان کرنے کی قدرت رکھتے ہیں۔ انھوں نے اپنے موضوعات کو ادراک و احساس کا لمس بھی دیا۔''

بایں صورت ان کی غزل میں حلاوت اور جذباتی آسودگی بڑھ گئی ہے۔ مثلاً:

ابھی انگڑائیاں لی جا رہی ہیں
سمجھتے ہیں ابھی دیکھا نہیں ہے

میرے یاں وہ اور کبھی میں اس کے گھر
اک قدم پھولوں پہ اک تلوار پر

خوشنما پھولوں کو چھونا کفر تھا میرے لیے
گدگدا سکتا تھا ورنہ بارہا پہلوئے دوست

نگاہِ اشتیاق میں وہ زلف و رخ کے زاویے
کبھی سلام ہو گیا، کبھی پیام مل گیا

www.urduchannel.in

اسی نوع کی فطری سادگی، شوخی، لہجے کا انوکھاپن، طرفہ کاری، خوشگوار سا کھردراپن، واقعیت، خلوص، بے جھجک مکالماتی طرز اور ابلاغ کے براہ راست انداز سے شاؔد کا منفرد اسلوب اور مخصوص رنگ و آہنگ مرتب ہوتا ہے جنھیں ٹی ایس ایلیٹ نے حقیقی شاعری کا جزو اعظم قرار دیا ہے۔ اس طور سے شاؔد عارفی نے حقیقی شاعری کی روایت قائم کرنے کی قابلِ قدر سعی کی ہے۔ تقریباً ایک صدی قبل غزل کے مروجہ رموز و علائم، تشبیہوں، کنایوں اور ان کے ساتھ وابستہ ذہنی متعلقات و تصوراتی لوازمات سے شاؔد عافی نے دانستہ پہلوتہی کر کے بے شمار اچھوت الفاظ اور تغزل چشیدہ بزرگوں کے مطابق مبتذل خیالات کو اپنی عشقیہ شاعری میں نہایت خوبصورتی سے اور نفاست کے ساتھ استعمال کر کے ثابت کر دیا کہ اگر فن پر قدرت ہو اور فنکار کی انگلیاں الفاظ کی نبض پر ہوں تو کوئی لفظ یا جملہ غزل کے مزاج کے ناموافق نہیں ہوتا۔ اس سے یہ تو ہوا کہ عام لوگوں کو شاؔد عارفی کی شاعری آج بھی نئی لگتی ہے۔ ان کے درج ذیل شعر سے اپنی بات ختم کرتا ہوں:

ذرا خاموش رہنے دے کہ ذہنی طور پر ہمدم
ابھی واپس نہیں آیا ہوں میں اس کی شبستان سے

......☆......

سعدیہ پروین

شادؔ عارفی کی غزل گوئی: اجمالی جائزہ

تاریخ میں ایسے لوگوں کی شخصیت اظہر من الشّمس ہے جنھوں نے اپنی انفرادی سوچ وفکر کا اظہار اپنے عہد کے تقاضوں کے خلاف جا کر کیا اور ان کے عہد میں ان کی کوئی قدر و قیمت نہیں رہی۔ لیکن امتداد زمانہ نے انھیں لوگوں کو اہم مقام عطا کیا اور وہ آنے والے زمانوں میں سب سے اہم اور اپنے انداز واسلوب کے سب سے انوکھے فن کار تسلیم کیے گئے۔

اردو ادب میں نظیرؔ اکبر آبادی کو ان کی انفرادی فکر اور فطری تخلیقیت کے اظہار کی وجہ سے اس وقت کے استاذۂ فن نے عوامی شاعر کہہ کر رد کر دیا۔ اسی طرح غالب کو ان کے فلسفیانہ تصورات آفاقی فکری وژن، انوکھے انداز اور تخلیقی تنوع کے باعث کبھی مشکل پسند اور کبھی ان کے کلام کو بے معنی کہہ کر فراموش کیا گیا، لیکن آنے والی نسلوں نے انھیں شعرا کی تخلیقات میں اپنے عہد کے مسائل اور جذبات کی جھلکیاں محسوس کیں اور انھیں اپنے اسلوب کے سب سے بڑے اہم شاعر کے روپ میں تسلیم بھی کیا۔

شاد عارفی بھی اردو میں ایک ایسے ہی انوکھے اسلوب اور انفرادی فکر واحساس کے اظہار کے شاعر کا نام ہے جسے اس کے زمانے میں خاطر خواہ پذیرائی نصیب نہیں ہوسکی۔ لیکن اس کے باوجود شادؔ عارفی کی بے نیازی اور تلون مزاجی نے ایسے مواقع کی پرواہ کیے بغیر اپنے فن کی آبیاری کی اور ادب میں اپنے لہجے کے منفرد شاعر قرار پائے۔ شادؔ عارفی

www.urduchannel.in

نے اپنے زمانے کے مروجہ اسلوب سے الگ ہٹ کر اپنے لہجے اور آواز کو نئی شان عطا کی:

شادؔ مجھے یہ دھن رہتی ہے
اپنا نغمہ اپنی لے ہو

ہر چند کہ یہ انفرادیت صرف شادؔ عارفی کا ہی خاصہ نہیں بلکہ اردو کے ہر بڑے شاعر کا اپنا لہجہ اور اسلوب ہے لیکن شادؔ عارفی نے الفاظ، تشبیہات و استعارات کے لیے کوئی مخصوص پیمانہ متعین نہیں کیا اور نہ وہ کسی تحریک ہی سے وابستہ رہے بلکہ ان کے سوچنے اور کہنے کے نرالے ڈھنگ کے سبب وہ انفرادی مقام حاصل کر سکے۔ انھیں جو محسوس ہوا اسے اپنے ڈھنگ اور انداز میں پیش بھی کیا۔

شادؔ عارفی ادب برائے زندگی کے قائل تھے۔ اپنے ماحول کے داخلی اور خارجی عوامل کی تصویر کشی ان کی شاعری کا طرۂ امتیاز قرار پایا۔ ملک کے سیاسی اور معاشرتی نظام نے ان کے احساس کو اس قدر مجروح کر دیا کہ جس کی وجہ سے ان کے لہجے میں طنز کے نشتر اور تیز ابیت پیدا ہوگئی۔ شادؔ جس زمانے میں شاعری کر رہے تھے اس وقت ملک کی آزادی کی جد و جہد کے زیر اثر انقلاب آفریں نغمات فضا میں گونج رہے تھے، لیکن انھوں نے صرف جذباتیت سے مملو انقلاب کے نعرے نہیں لگائے بلکہ اس جذبے کو خلوص کی آگ میں تپا کر پیش کیا۔ معاشرے اور سیاسی نظام سے وہ متنفر تھے اور انسان کی خوش حالی اور مساوات کے لیے انھوں نے آنے والے انقلاب کو محسوس کر لیا تھا:

یقیں کیجیے انقلابات ہستی محلات کے سائے سائے کھڑے ہیں

سیاسی اقتدار رکھنے والوں کو کس تنبیہ اور طنز کے ساتھ مخاطب کرتے ہیں:

جھپٹ پڑیں نہ کہیں دن میں مشعلیں لے کر عوام کو نہ سمجھاؤ کہ روشنی کم ہے

جنابِ شیخ سیاست کے پھیر میں پڑ کر بتانِ دیر کو پروردگار کہتے ہیں

شاد عارفی کی غزلوں میں والہانہ عشق ومحبت کی کیفیات کا اظہار بہت ہی کم ہے، لیکن ایک طالب علم ہونے کی حیثیت سے میں محسوس کرتی ہوں کہ انھوں نے اپنے ابتدائی دور کے کلام میں جو عشقیہ تجربات نظم کیے ہیں اس میں بھی ان کی انفرادیت کی جھلک موجود

ہے۔اردوغزل میں عشق ومحبت کے مروجہ تخیلات اوراحساسات کے اظہار کی توقع یوں بھی شادصاحب جیسے حقیقت پسند شاعر سے بے سود ہے۔لیکن ایسانہیں ہے کہ انھوں نے بالکل ہی ان خیالات سے دامن بچایا ہو، وہ خود کہتے ہیں:

دو چار برس حضرتِ حالؔی کی طرح شاؔد
مجھ کو بھی جنونِ لب و رخسار رہا ہے

مثال کے طور پر مزید کچھ شعر پیش کرتی ہوں:

گدگدائے نہ بنے ہاتھ دبائے نہ بنے
بن کے کے لیٹی ہو جوانی تو جگائے نہ بنے
....
چھپ چھپ کے جو مصروفِ دعا میرے لیے ہے
شاید وہ بت ہوش رہا میرے لیے ہے
....
دل کو دل کی راہ کی بابت میں ایمان سے کہتا ہوں
اس کوچے سے میں جب گزرا اس کو دروازے پر دیکھا
....
خود بینی کا حق ہے لیکن ہٹ دھرمی سے کام نہ لے
اے کترا کر جانے والے کوئی دامن تھام نہ لے

جیسا کہ میں عرض کر چکی ہوں شاؔد عارفی کے یہاں حسن وعشق کی واردات کے موضوعات بہت کم ہیں، کیوں کہ وہ ایک حقیقت پسند شاعر تھے۔ان کی زندگی میں نامرادیاں اور تلخیاں اس درجہ سموئی ہوئی تھیں کہ رومان کے لیے کوئی گنجائش باقی نہیں تھی۔ وہ حقیقی زندگی کی تلخ سچائیوں اور حالت کی پیچیدگیوں کے اظہار کے شاعر تھے۔

شاؔد حسن وعشق پر بھی تھی کبھی میری نظر، اک زمانہ تھا مگر
آج میری ہر غزل وابستۂ حالات ہے، سوچنے کی بات ہے

حالاں کہ شاؔد نے نظمیں بھی کہی ہیں لیکن وہ سہی معنوں میں غزل کے شاعر تھے۔

www.urduchannel.in

غزل جیسی نرم ونازک اظہار کی صنف میں انھوں نے اپنے تلخ تجربات کو پیش کیا اور اس طرح اردوغزل کو بے باک اور کھردرے لہجے سے آشنا کیا۔جس زمانے میں شاؔد نے غزلیں کہیں اس وقت سماجی، معاشرتی اور سیاسی بحران و بدنظمی کے لیے شعراء نے نظم کو اظہار کا وسیلہ بنایا لیکن اس کے برخلاف شاد صاحب نے غزل ہی میں اپنے تجربات کو پیش کیا ہے:

تائیدِ غزل کے بارے میں دو چار اشارے کیا کم ہیں
نو لمبی لمبی نظموں سے نو شعر ہمارے کیا کم ہیں

شاؔد عارفی کے مزاج میں غصہ، جھنجلاہٹ اور ایک طرح کی بیزاری کا رویہ موجود تھا۔اس کی خاص وجہ یہ تھی کہ وہ معاصر صورتِ حال سے سخت بیزار تھے اور انھیں چیزوں نے ان کے اندر کڑواہٹ اور غصہ بھر دیا تھا۔یہیں سے ان کے اندر کا فن کار تیر ونشتر کے ساتھ سامنے آتا ہے۔انھوں نے اپنی روزمرہ کی زندگی اور سماج میں بسنے والے نام نہاد بڑے لوگوں، پارساؤں اور سیاست دانوں پر بھرپور طنز کیے ہیں اور ایسے زبردست اشعار کی تخلیق کی جو ضرب المثل ہو چکے ہیں:

ہمارے ہاں کی سیاست کا حال مت پوچھو
گھری ہوئی ہے طوائف تماش بینوں میں
....
ہم خدا کے ہیں وطن سرکار کا
حکم چلتا ہے مگر زردار کا
....
ہے تو احمق چونکہ عالیشان کاشانے میں ہے
اس لیے جھک مارنا بھی اس کا فرمانے میں ہے
....
جب چلی اپنوں کی گردن پر چلی
چوم لوں منہ آپ کی تلوار کا

چاپ سن کر جو ہٹا دی تھی اٹھا لا ساقی
شیخ صاحب ہیں، میں سمجھا تھا مسلماں ہے کوئی

شآد صاحب کو ان کی حیات میں وہ مقام نہیں مل سکا جس کے وہ حقدار تھے۔اس کی وجہ کچھ تو ان کا مزاج بھی تھا اور طبیعت کی بے نیازی بھی، وہ بے باک اور حق گو شاعر تھے اور کسی کی جھوٹی تعریف کرنا کسرِشان سمجھتے تھے۔

ہم سے اس قسم کی امید نہ رکھے دنیا
ہم کسی شخص کی تعریف تو کرتے ہی نہیں

انھیں اپنے لہجے اور اسلوب پر اعتماد و اطمینان تھا اس لیے کہ یہاں امید کی کرن پھوٹتی ہے:

ہماری غزلوں ہمارے شعروں سے تم کو یہ آگہی ملے گی
کہاں کہاں کارواں لٹے ہیں کہاں کہاں روشنی ملے گی

مندرجہ بالا سطور میں شاد عارفی کی غزلوں کا اجمالی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ ہر چند کہ یہ ان کی تخلیقی جہات کا پوری طرح احاطہ نہیں کرتیں، لیکن میں یہ بات پورے وثوق سے کہہ سکتی ہوں کہ ان کے اسلوب اور لہجے نے اردو غزل کو ایک نئے انداز سے آشنا کیا ہے اور آنے والا وقت ان کی تخلیقات کو زیادہ معنی خیز اور دیرپا اثرات کا حامل ثابت کرے گا کیوں کہ وہ اپنے عہد کے رمز شناس تھے اسی لیے کہا تھا:

جہاں جہاں غم دوران پہ گفتگو نہ ہوئی
وہاں وہاں مرے شعروں کی آبرو نہ ہوئی

......☆......

امتیاز احمد راشد

شآد عارفی: ایک عہد ساز شخصیت

ہر عہد میں اس فرش گیتی پر کچھ ایسی نابغۂ روزگار شخصیتیں پیدا ہوتی رہی ہیں جن کے علمی و ادبی کارناموں، ان کی گراں قدر خدمات سے نہ صرف تاریخ کے اوراق روشن ہیں بلکہ ہر دور میں نئی نسلیں بھی ان کے روشن اور تابناک پہلوؤں سے فیض حاصل کرتی ہیں۔ایسی ہی یگانہ شخصیتوں میں دبستان رام پور کی ایک عظیم المرتبت شخصیت استاذِ سخن جناب شآد عارفی کی ہے جنھوں نے اپنے احساسات و جذبات اور مشاہدات و تجربات کو فکری خلوص کی دھیمی دھیمی آنچ پر تپا کر شعری پیکر میں اس طرح ڈھالا ہے کہ ان کی شاعری میں فنی اور جمالیاتی پہلو بالکل واضح نظر آتے ہیں۔

اردو زبان و ادب کی تاریخ میں ایسی بھی شخصیتیں گزری ہیں جن کی زندگی میں وہ خاطر خواہ پذیرائی نہیں ہوئی جس کے وہ مستحق تھے۔اپنی بات کی توثیق کے لیے دو اہم اور نامور شعراء کی مثالیں پیش کرتا ہوں۔ مرزا اسداللہ خان غالبؔ کے ہم عصر شعراء میں جو شہرت و عزت اور مرتبت شیخ محمد ابراہیم ذوقؔ کو ان کی حیات میں ملی، وہ کسی کے حصے میں نہیں آئی لیکن وقت کی رفتار کے ساتھ ساتھ غالبؔ کی وفات کے بعد، ناقدین اور دانشورانِ فکر و فن کے سامنے جب غالبؔ کے فکری شہ پارے کی پرتیں کھلنے لگیں اور ان سے بخوبی واقف ہونے لگے تو وہ اپنے معاصرین میں سب سے بلند اور ممتاز نظر آنے لگے۔حتیٰ کہ سب پر غالب ہو گئے۔اسی طرح دنیائے اردو ادب کے سب سے

www.urduchannel.in

پہلے نظم گو عوامی شاعر نظیؔر اکبر آبادی کے ساتھ بھی یہ سانحہ پیش آیا تھا۔ان کے عہد میں بھی شعراء و ادباء ان کی شاعری کو نا قابلِ اعتنا سمجھتے تھے۔ ان کے معاصرین نے ان کی شاعری کو نہ جانے کیا کیا نام دے رکھا تھا۔لیکن بعد از مرگ، نظیؔر اکبر آبادی کو جو شہرتِ دوام حاصل ہوئی وہ دوسرے شعراء کو نصیب نہیں ہوئی۔ یہاں تک کہ معدودے چند کو چھوڑ کر لوگ ان کے ہم عصر شعراء و ادباء کے نام تک سے واقف نہیں جبکہ فی زمانہ مذکورہ شعراء کی شاعری کے ہر گوشے پر مسلسل کچھ نہ کچھ تحقیق کی جا رہی ہے۔ یہ ادبی چپقلش اور ادبی عصبیت ہر زمانے میں رہی ہے لیکن ہیرا جوہری سے اپنی حقیقت اور اہمیت منوا ہی لیتا ہے۔ دیر سے ہی سہی وقت اسے وہ قدر و منزلت اور مقام میسر کرا دیتا ہے اور رفتہ رفتہ اس کا فن، اس کی تخلیق کا جادو سر چڑھ کر بولتا ہوا نظر آتا ہے۔ بجنسہٖ یہی حادثہ جناب شاؔد عارفی کے ساتھ ہوا۔ موصوف کو ان کی حق گوئی و بے باکی، خودداری اور طبیعت کی بے نیازی نے جھوٹی اور وقتی شہرت و تعریف سے کوسوں دور رکھا۔ اس معاملے میں ان کی غیور اور حساس طبیعت ہمیشہ مانع رہی۔ اس لیے حیات میں انھیں وہ مقام نہیں مل سکا جس کے وہ حق دار تھے اور اپنے معاصرین غزل گو شعراء خصوصاً یگانہ چنگیزی، حسرؔت موہانی، فاؔنی، جگؔر مرادآبادی، فراؔق گورکھ پوری کے مابین منفرد ہونے کے باوجود گمنامی کے گوشے میں رہے۔ یہ تو قربان جایئے موصوف کے تقریباً چالیس ارشد تلامذہ میں دنیائے اردو ادب کے عالمی شہرت یافتہ نقاد و محقق محمد ابو المظفر بن عبد القدوس المتخلص ڈاکٹر مظفر حنفی صاحب، سابق پروفیسر آف اقبال چیئر، کلکتہ یونیورسٹی کا جنھوں نے اپنے ادبی استاد محترم جناب شاؔد عارفی کے فنی شہ پاروں پر ۱۹۷۴ء میں، پروفیسر عبدالقوی دسنوی کی نگرانی میں بھوپال یونیورسٹی سے تحقیقی مقالہ ''شاد عارفی۔ فن اور شخصیت'' پر ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی اور اپنے استاذِ گرامی کا ازسرِ نو عہد ساز اور قد آور شخصیتوں کے مابین نہ صرف لوہا منوایا بلکہ ان کے ادبی گوشوں کے مختلف پرتوں کو بھی اجاگر کیا۔ ورنہ اردو دنیا اس منفرد و نادر روزگار شاعر کو فراموش کر چکی ہوتی۔ میں اس ضمن میں ان کے گراں مایہ کارہائے نمایاں پر تہہ دل سے مبارک باد پیش کرتے

ہوئے ان کی اس کاوش کو پر خلوص سلام پیش کرتا ہوں۔

انصاف کی رو سے دیکھا جائے تو شاؔد عارفی سچ مچ قادر الکلام، صاحبِ طرز اور مجتہد شاعر تھے۔ نت نئی تراکیب کے برجستہ استعمال، محاوروں اور نئی تشبیہات سے موصوف نے اپنی فکری کاوش کو شعری شہ پارے میں جو بوقلمونی وسعتیں پیدا کی ہیں وہ بہت کم شعراء کے حصے میں آئی ہے۔ غزل گوئی کے ساتھ ساتھ وہ ایک منفرد کالم نویس اور صاحبِ طرز مکتوب نگار بھی تھے۔ ان کی نظموں خصوصاً 'ساس'، 'عورت'، 'رنگیلے راجہ کی موت'، 'پرانا کوٹ'، 'پرانا قلعہ'، 'میرے پڑوس میں کچی شراب بکتی ہے' وغیرہ میں ایک نیا اسلوب ایک الگ لہجے کا تنوع ملتا ہے۔ لیکن درحقیقت ان کا میدانِ سخن خاص غزل ہی تھا۔ اس لیے موصوف خود فرماتے ہیں:

صہبا سے کم نشاط نہیں نشّۂ سخن
ساقی ہٹا شراب غزل کہہ رہا ہوں میں

چالو ہیں جب کہ نظم معریٰ علی الحساب
پندرہ کی انتخاب غزل کہہ رہا ہوں میں

تائیدِ غزل کے بارے میں دو چار اشارے کیا کم ہیں
نو لمبی لمبی نظموں سے نو شعر ہمارے کیا کم ہیں

بے پناہ صلاحیت اور خداداد ذہانت کے مالک شاؔد عارفی کے کلام کے مطالعہ سے یہ درخشاں حقیقت آشکار ہوتی ہے کہ موصوف خالص طنز نگار شاعر تھے۔ ان کے کلام میں نہ صرف تہہ داری اور معنی خیزی ہے بلکہ اثر خیزی بھی ہے، کیونکہ وہ ترقی پسند تحریک ہو یا سرمایہ دارانہ نظام کی بالادستی، میڈیا کا منافقانہ رویہ ہو یا سماج میں پھیلی گندی سیاست، اپنی یا کسی دوسرے کی حق تلفی کی بات ہو یا جنگِ آزادی اور آزادی کے بعد ظلم و تشدد کو دیکھ کر ان کا حساس دل کراہ اٹھتا تھا۔ اسی لیے وہ طنز کا ہدف راست کرتے تھے، یہی وجہ ہے کہ ان کے کلام میں طنز و ظرافت کے بجائے طنز اور المیہ نظر آتا ہے۔ ڈاکٹر مظفر حنفی اپنی کتاب ۲۸۰

www.urduchannel.in

صفحات پر مبسوط ''شاد عارفی فن اور فنکار'' میں موصوف کے اسی منفرد لہجے کو انکی شاعری کا طرۂ امتیاز قرار دیتے ہیں۔ اس قبیل کے چند اشعار نموتاً پیش کر رہا ہوں ملاحظہ فرمائیں:

یہ فنِ طنز مرے حق میں درحقیقت شاؔد
بہت بڑا المیہ ہے اختصار کے ساتھ

جنابِ شیخ سیاست کے پھیر میں پڑ کر
بُتانِ دیر کو پروردگار کہتے ہیں

شباب وخلوت کی بات اچھی تو ہے مگر آج کل نہ کہیے
غزل برائے حیات لکھیے غزل برائے غزل نہ کہیے

ان کے مداح اس زمانے میں
جیسے کتے قصائی خانے میں

ہمارے ہاں کی سیاست کا حال مت پوچھو[
گھری ہوئی ہے طوائف تماش بینوں میں

کانٹے چنے جو ہم نے سرِ راہ کوئے دوست
جھگڑا یہ ہے ''دکھاؤ ہمیں'' کیا اٹھا لیا

''امارت پر فریب'' قسمت کا اتنا ''پرچار'' کر چکی ہے
غریب بے چارہ آج تک وجہِ بدنصیبی نہیں سمجھتا

بے کسی جب فروغ پا لے گی
ظلم کی بوٹیاں چبا لے گی

www.urduchannel.in

نہ جانے کیوں خادمانِ قوم و وطن ہوئے جا رہے ہیں دبلے
جہاں دوالہ نکالنا ہو وہاں کوئی یونین بنا دیں

ناجائز پیسے کی اجلی تعمیروں کے ماتھے پر
آپ نے لکھا دیکھا ہوگا یہ سب 'فضل باری ہے'

ہمارے رہ نماؤں کی یہ کمزوری نہیں جاتی
متاعِ غیر واجب بھر کے جیبیں پھاڑ لیتے ہیں

شاؔد کی زنبیل میں اس قسم کے بے شمار اشعار دیکھے جا سکتے ہیں۔ اسی پر اکتفا کرتا ہوں۔ القصہ مختصر، دبستانِ رام پور کا نمائندہ شاعر شاؔد عارفی اپنے طرز و اسلوب اور لہجے سے اپنے عہد کے صفِ اول کے شعراء میں شمار کیا جائے گا۔ انشاءاللہ

......☆......

معراج احمد معراج

شاؔد عارفی کی غزلیہ شاعری

غزل مقبول ترین اور لطیف ترین صنفِ شاعری ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ ہماری پوری تہذیب اس میں سانس لیتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ غزل دراصل ایمائیت اور رمزیت کا فن ہے۔ کھلے لفظوں میں گفتگو کرنے میں وہ مزا کہاں جو پردہ داری میں ہے اور پردہ داری ہی غزل کا حسن ہے۔ غزل کم سے کم لفظوں میں گہری سے گہری اور بڑی سے بڑی بات کہہ گزرنے کا سلیقہ خوب جانتی ہے۔ غزل میں سخت سے سخت اور تلخ سے تلخ بات بھی نرم اور شیریں زبان میں بیان کی جاتی ہے۔ شعر موزوں کرنا تو بڑا آسان ہے لیکن اسے غزل کا شعر بنانا ایک کارِ دشوار ہے۔ اس کارِ دشوار کو وہ شعراء ہی بخوبی انجام دے سکتے ہیں جو غزل کی روایت و تہذیب سے پوری واقفیت رکھنے کے ساتھ ساتھ غزل کے مزاج داں ہوں اور جنھیں زبان و بیان پر مکمل قدرت بھی ہو۔ ایسے شاعروں کی تعداد ہر عہد میں کم رہی ہے۔ ان ہی میں سے ایک اہم نام شاؔد عارفی کا ہے۔

شاؔد عارفی بیسویں صدی کے ایک اہم شاعر ہیں۔ ان کی شاعری کی ایک اہم خوبی ان کا اچھوتا اسلوب ہے۔ پروفیسر مسعود حسین (سابق وائس چانسلر، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی) نے معروف شاعر، ناقد، محقق اور معلم ڈاکٹر مظفر حنفی (سابق پروفیسر اقبال چیئر، کلکتہ یونیورسٹی) کی کتاب ''شاد عارفی: فن اور فن کار'' کے پیش لفظ میں بڑی اہم بات تحریر کی ہے جس سے شاؔد عارفی کی ادبی قدر و قیمت اور ان کے اسلوب کی انفرادیت کو سمجھنے میں مدد ملتی

www.urduchannel.in

ہے:

''میں سمجھتا ہوں کہ یہ تصنیف کئی لحاظ سے ڈاکٹر مظفر حنفی کا 'حاصلِ عمر' ہے۔ اسے قلمبند کر کے انھوں نے ایک ایسی ادبی شخصیت کو پھر سے تولا ہے جسے ناقد (رے) پاسنگ سمجھ بیٹھے تھے، اردو شعر و نثر کو ایک ایسے اسلوب سے روشناس کرایا جو اس صدی کے تیسرے اور چوتھے دہے کا سب سے چونکا دینے والا اسلوب ہے......''

(''شاؔد عارفی: فن اور فنکار'' صفحہ ۷۔۸)

شاد عارفی اردو کے ان چند شعراء میں سے ایک ہیں جو اپنے منفرد لہجے کی وجہ سے ہمیشہ یاد کیے جائیں گے۔ بقول شمس الرحمٰن فاروقی:

''یگانہ، فراق اور شاد عارفی نے اپنی اپنی انفرادیت کو زیادہ استقلال بخشا۔ انھوں نے غزل کے سرمائے سے ایسے الفاظ کم کرنے کی کوشش کی جو اردو غزل کی دونوں روایتوں میں مشترک تھے، جنھیں ترقی پسندوں نے بھی مسترد نہیں کیا تھا لیکن جو اپنی معنویت کھو چکے تھے انھوں نے شاعرانہ موضوعات کی کچھ عمارت ڈھا دی اور یہ دکھا دیا کہ خلاقانہ ذہن کے لیے ہر موضوع شعر کا موضوع بن سکتا ہے۔''

(''ہندوستان میں نئی غزل'' شمس الرحمٰن فاروقی ''فنون'' لاہور ''جدید غزل نمبر'' حصہ اول ص ۱۳۶۔۱۳۴)

روایت پرست غزل گو عشق کے تصور کو حقیقی زندگی سے جوڑنے میں ناکام رہے۔ ان کا محبوب خیالی ہوا کرتا تھا۔ شاد عارفی نے عشق کا رشتہ انسانی وجود سے جوڑا۔ ان کا محبوب اسی مادی دنیا کا ہے۔ انھوں نے عشق کا وہ تصور پیش کیا ہے جس کی نوعیت مادی ہے۔ انھوں نے شاعری میں ارضی حسن کو اہمیت دی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی غزلیں دیرینہ روایات کی جگہ نئی روایات قائم کرتی ہیں:

سانولا رنگ ، کشیدہ قامت
نہ پری ہے نہ کوئی حور ہے وہ

مسکرا دیں گے، مرا نام کوئی لے دیکھے
وہ کسی فکر میں بیٹھے ہوں، کسی کام میں ہوں

ابھی انگڑائیاں لی جا رہی ہیں
سمجھتے ہیں ابھی دیکھا نہیں ہے

جذبۂ محبت کو تیر بے خطا پایا
میں نے جب اسے دیکھا، دیکھتا ہوا پایا

دیکھیے معمولی اور سادہ سے واقعات کو کس خوب صورتی سے غزل کا شعر بنایا گیا ہے۔کسی واقعہ یا تجربہ کو شعر بنانا آسان کام نہیں۔اس کے لیے تخلیقی ذہن کی ضرورت پڑتی ہے۔تخلیقیت کے بغیر شعر صرف ایک Statement بن کر رہ جاتا ہے۔

شاد عارفی نے اپنے شعروں میں عشق کی سچی داستان کو قلم بند کیا ہے۔ بقول مظفر حنفی:

’’شاد عارفی کے علاوہ پوری اردو شاعری میں غزل اس حد تک سچ بولتی ہوئی صرف حسرتؔ کے ہاں نظر آتی ہے۔‘‘

(’’شاد عارفی: فن اور فن کار‘‘ مظفر حنفی ص ۶۵)

شاد عارفی نے زندگی میں دو بار عشق کیا۔ پہلا عشق بلوغت سے پہلے ہوا اور دس سال تک جاری رہا۔خاندان کی طرف سے اس لڑکی کے ساتھ شادی کرنے کی اجازت نہ ملی۔اس ناکامی کا اثر ان کے ذہن و دل پر گہرا ہوا۔ دوسرا عشق انھیں تارا نام کی ایک ہندو لڑکی سے ہوا لیکن اس مرتبہ بھی انھیں ناکامی ہاتھ لگی۔ان کے پاس ان دونوں معاشقوں کے حقیقی تجربات ہیں۔شاد نے اپنی غزلوں میں جن عشقیہ واقعات کا ذکر کیا ہے، وہ ان کے ذاتی تجربات کے پروردہ ہیں۔انھوں نے اپنی غزلوں میں زیادہ تر آپ بیتی کو جگہ دی ہے۔یہی وجہ ہے کہ ان کے ہاں روایتی موضوعات پر مبنی اشعار بہت ہی کم ہیں۔انھوں نے خود ایک شعر میں کہا ہے:

www.urduchannel.in

دوسروں کے واقعاتِ عشق اپناتے ہیں وہ
جن سخن سازوں کی اپنی داستاں کوئی نہیں

ضیاء احمد بدایونی ان کی غزلوں کے بارے میں لکھتے ہیں:

’’ایسے شعراء بہت تھوڑے ہیں جن کو سن کر انسان چونک جائے۔جن کی تخلیق، فکر اور جذبے پر ان کی انا کی چھاپ ہو۔شاد عارفی کا شمار بھی اسی آخری گروہ میں ہوتا ہے۔ان کی غزل بڑی حد تک وارداتِ دل کی ترجمان ہے۔یہ اور بات ہے کہ آپ بیتی میں آفاقیت کا وہ انداز آجائے کہ اس پر جگ بیتی کا دھوکا ہونے لگے۔‘‘

(ایک خود شناس شاعر‘‘: ضیا احمد بدایونی۔’’شاد عارفی: ایک مطالعہ‘‘، مرتبہ مظفر حنفی۔ص ۲۴)

معاملاتِ حسن و عشق کو غزل میں بھرپور شاعرانہ کیفیات کے ساتھ پیش کرنے میں شاد کو بڑی مہارت ہے۔اس ضمن میں چند اشعار دیکھیے:

نقاب کی یہ جنبش، حجاب کے یہ زاویے
جو اس سے چاہتا ہوں میں اسے سمجھ رہا ہے وہ

دیکھ کر مجھ کو مسکرا دیں آپ
اس قدر احتیاط کافی ہے

خط غلط تقسیم ہو جاتے ہیں اکثر، تم نے بھی
کہہ دیا ہوتا یہ کس کا خط مرے نام آ گیا

کیا لکھ رہے ہو میری طرف دیکھ دیکھ کر
میں نے دیا جواب غزل کہہ رہا ہوں میں

بہ پاسِ احتیاط آرزو یہ بارہا ہوا
نکل گیا قریب سے وہ حال پوچھتا ہوا

ڈاک سے بھینی بھینی خوشبو والے خط آئے تو ایک دن
پوچھے گا خط لانے والا، بابو جی یہ خط کس کا ہے؟

شادؔ عارفی کسی بات کو اس ڈھنگ سے کہتے ہیں کہ سننے والے کو نئی نئی سی لگتی ہے۔ چند اشعار پیشِ خدمت ہیں:

سوتے ہی اپنے بستر پر
میں ہوتا ہوں اس کے گھر پر

وہ زبانِ بے زبانی سے ابھی واقف نہیں
ہاتھ رکھنا پڑ رہا ہے بارہا دل پر مجھے

تجھ بن مرا مذاق اڑانے کے واسطے
ہر مہہ جبیں نقاب اٹھا کر ٹھہر گئی

بڑھ جاتی ہے اس روز مناظر کی اداسی
جب اس سے ملاقات کا امکاں نہیں ہوتا

ذرا خاموش رہنے دے کہ ذہنی طور پر ہم دم
ابھی واپس نہیں آیا ہوں میں اس کی شبستاں سے

سلیم احمد نے شادؔ عارفی کی عشقیہ غزل کو ایک 'پورے آدمی' کے عشق کی داستان کہا ہے۔ ان کی آواز میں بقول مظفر حنفی جو مردانہ پن ہے، وہ غزل کو ایک نئے زاویے سے روشناس کراتا ہے۔ ان کی غزلوں میں داخلیت اور خارجیت کا حسین امتزاج ہے۔ بقول ڈاکٹر خلیل الرحمٰن اعظمی:

''بعض شعرا کا خیال تھا کہ غزل ضرورت سے زیادہ داخلی ہونے کی وجہ سے انفعالیت کا شکار ہوگئی ہے۔ اس لیے اسے مردانہ لہجہ اور صلابت عطا کرنے کے لیے خارجیت کو بھی ایک حد تک اپنانا چاہیے۔ یگانہ اور

www.urduchannel.in

شاد عارفی نے اس عنصر کو ایک بار پھر اپنی غزل میں جگہ دی۔''

(''جدید غزل''، ڈاکٹر خلیل الرحمٰن اعظمی سہ ماہی 'فنون' لاہور' جدید غزل نمبر حصہ اول ص۲۷)

شادؔ ایک خوددار عاشق ہیں۔ وہ محبوب سے عشق تو کرتے ہیں مگر روایت پسند شاعروں کی طرح اس کے ہاتھ اپنی عزت داؤ پر نہیں لگاتے:

جھٹک کے ہاتھ سے دامن کو جانے والے، بس
ترے خیال کا دامن بھی چھوڑتا ہوں میں

یہ تو مت محسوس ہونے دیجیے
اجنبی ہیں آپ کی محفل میں ہم

بعض حضرات عام بول چال کی زبان کو شاعری کے لیے مناسب نہیں مانتے لیکن میں یہ سمجھتا ہوں کہ شاعر اگر لفظوں کو برتنے کا ہنر جانتا ہو تو وہ بول چال کی زبان کو بھی معتبر بنا سکتا ہے۔ کون جانتا تھا کہ پتھروں سے تاج محل جیسی شاندار عمارت بھی بنائی جا سکتی ہے۔ یہ تو فن کار کے ہاتھوں کا کمال ہے جس کے چھو جانے سے معمولی چیز بھی غزل بن گئی۔ شادؔ عارفی کے کلام کو پڑھنے سے پتہ چلتا ہے کہ انھوں نے بول چال کی زبان میں اس سلیقے سے شعر کہا ہے کہ ایک حیرت انگیز تازگی کا احساس ہوتا ہے۔ آل احمد سرور نے شاد عارفی کی اس شاعرانہ خوبی کا اعتراف اس طرح کیا ہے:

''............ جو لوگ شاعری اور بول چال کی زبان کو ایک دوسرے سے الگ کر کے دیکھتے ہیں انھیں شادؔ کے کلام کا مطالعہ کرنا چاہیے۔ شاد نے بول چال کی زبان کی طاقت اور شعریت کو جس طرح اجاگر کیا اور جس طرح بقول ایذرا پاؤنڈ حقیقی نفسیات کو زبان دی ہے اسے جدید اردو شاعری ہمیشہ یاد رکھے گی۔''

شادؔ عارفی نے اپنے غزلوں میں تشبیہوں کا خوب استعمال کیا ہے۔ انھوں نے روایتی تشبیہوں سے دامن بچاتے ہوئے اپنے لیے نئی تشبیہات تلاش کیں۔ چند اشعار

ملاحظہ کیجیے:

اسے نسیمِ چمن کہہ رہا ہوں میں ، لیکن
کہیں نسیمِ چمن مڑ کے دیکھتی بھی ہے

مقابل قدِ آدم آئینہ ہے
بڑا دلچسپ مطلع لڑ رہا ہے

جاڑے کی وہ بھیگی راتیں، گرمی کے یہ جلتے دن
یادوں کے دانتوں سے ناخن کاٹ رہا ہوں لیکن وہ

جیسے کسی حسین کے ہونٹوں پہ سرد آہ
پھولوں کی پتیوں پہ کرشمے ہوا کے دیکھ

مندرجہ بالا اشعار میں محبوب کو نسیمِ چمن کہنا، قدِ آدم آئینے کے سامنے محبوب کی موجودگی سے دلچسپ مطلع لڑنا، یادوں کے دانتوں سے ناخن کاٹنا، پھول کی پتیوں کے ہوا سے لرزنے کو کسی حسین کے ہونٹوں پر سرد آہ سمجھنا خوبصورت تشبیہات ہیں جنھیں بڑی فنکاری سے برتا گیا ہے۔

شاد کی عشقیہ غزلوں میں کہیں کہیں متصوفانہ اشعار بھی ملتے ہیں:

پکارنے پہ جب آیا تو تیرا دیوانہ
کسی بھی نام سے تجھ کو پکار آئے گا

ہماری بندگی پابندِ کعبہ ہے نہ بت خانہ
جسارت چاہیے، سجدوں پہ قدرت ہو ہی جاتی ہے

رائیگاں کیوں سفرِ دیر و حرم اے ساقی
دیکھنے سے اسے مطلب تھا، کہیں دیکھ آیا

www.urduchannel.in

شاد عارفی کے کلام کا ایک اہم وصف طنز ہے۔ بقول مظفر حنفی:

''شاد عارفی کی ۱۹۴۲ء کے بعد کی تمام تر شاعری طنز کی بنیاد پر کھڑی ہے۔''

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر کیا وجہ ہے کہ ۱۹۴۲ء کے بعد شاد عارفی کو طنز کا سہارا لینا پڑا۔ اس سلسلے میں مظفر حنفی لکھتے ہیں:

''............تابڑ توڑ مشکلات کے پہاڑ شاد عارفی پر ٹوٹے تو غالب کی طرح آبا و اجداد کی سپہ گری پر ناز کرنے والا یہ پٹھان شاعر بھی لچکنے کی جگہ انا کو بلند کرتا چلا گیا اور اپنے قلم، زبان اور طرزِ بیان سے تیغ جوہر دار کا کام لے کر مخالف اور منفی قوتوں پر طنز کے بے محابا وار کرنے لگا.....''

(''شاد عارفی: فن اور فن کار''، مظفر حنفی، ص ۸۴)

شاد عارفی نے خود اس حقیقت کا اعتراف کیا ہے:

بے کسوں پر ظلم ڈھا کر ناز فرمایا گیا
طنز کی جانب میں خود آیا نہیں لایا گیا

ڈاکٹر محمد حسن جیسے قد آور ناقد نے شاد عارفی کے تعلق سے لکھا ہے:

''شاد عارفی نے غزل کی زبان کو روزمرہ کی گفتگو کو طنز، تلخی، زہرخند کی کیفیت اور عصری مسائل کی بازگشت سے قریب کیا۔ یہ ایک نیا لب و لہجہ تھا جوان کا اپنا تھا اور اس کا خاتمہ ان ہی پر ہو گیا۔''

(''نئی غزل کی آہنگ شناسی''، ڈاکٹر محمد حسن، سہ ماہی ''عصری ادب''، دہلی، شمارہ نمبر ۳)

شاد عارفی نے ان تمام واقعات کے خلاف قلم اٹھایا جو ان کے مزاج کے خلاف تھے۔ زندگی کا شاید ہی کوئی پہلو ہو جو ان کی طنز کا نشانہ نہ بنا ہو۔

ڈاکٹر مظفر حنفی اس سلسلے میں رقم طراز ہیں:

''شاد عارفی کی طنز چومکھی ہے۔ ان کی کمان کے چلے سے بیک وقت بہت سے تیر ایک ساتھ پر جوڑ کر نکلتے ہیں اور ایک ایک تیر کئی شکار کرتا

ہے۔ان کے آس پاس پھیلی ہوئی زندگی کا کوئی جھول، کوئی رخنہ اور کوئی ناہمواری ایسی نہیں ہے جس تک ان کی نگاہِ دور بین نہ پہنچی ہو۔سماجی عدم توازن، اقدار کا انتشار، مفلسی، اقربا نوازی، چور بازاری، فقدانِ تربیت، سماج کے تخریب کار عناصر، متوسط طبقے کی بوالعجبی، سرمایہ داروں کا جبر، آرام پسندی و سہل انکاری، صبر و تحمل کا غلط مفہوم، نفسیاتی کمزوریاں، خوشامد، داؤ پیچ، غلامی کے مہلک اثرات، دفتری ذہنیت، مکر و فریب کی فروانی، اہل اقتدار کی ہوسناکی، احباب کی منافقانہ سازشیں، جھوٹ، ناانصافی، ظلم، جہالت، بغض، کینہ پروری، جنسی بے راہ روی، آزادی کا غلط مصرف، سادہ لوح عوام کی تباہ حالی، رشوت خوری، فرقہ پرستی، مذہبی ڈھونگ، ادب کے نام پر بے ادبی، خود غرضی، غرض کہ کسی بھی کج روی کا کوئی بھی پہلو شاد عارفی کی زد سے بچ نہیں سکا۔''

(''شاد عارفی: فن اور فن کار''مظفر حنفی، ص۱۰۰)

چند طنزیہ اشعار ملاحظہ کیجیے:

جب چلی اپنوں کی گردن پر چلی
چوم لوں منہ آپ کی تلوار کا

کہنے والوں نے کہا ظل الٰہی جن کو
ہم انھیں سایۂ دیوار نہیں کہہ سکتے

اس نے جب سو تیر چلائے
میں نے ایک غزل چپکا دی

مختصر یہ کہ شاد عارفی اردو کے ایک اہم شاعر ہیں لیکن ان کو وہ مرتبہ نہیں مل سکا جس کے وہ مستحق ہیں۔اس سلسلے میں اختر انصاری اپنی تصنیف ''ایک ادبی ڈائری'' ۱۹۴۱ء کے

www.urduchannel.in

اندراج میں لکھتے ہیں:

شاد عارفی بھی ان شاعروں میں ہیں جو درجہ اول کے شاعر ہوتے ہوئے بھی نقادوں کی نگاہِ التفات سے محروم ہیں۔صرف اس لیے کہ کسی بڑے نقاد نے اپنے اشاروں پر چلنے والے دوسرے نقادوں کو ان کی طرف متوجہ نہیں کیا۔ان کا قصور صرف اس قدر ہے کہ وہ شاعری کرنے کے ساتھ ساتھ پروپیگنڈا کرنا نہیں جانتے۔انھوں نے اپنے آپ کو کسی باا ثر گروہ کے ساتھ وابستہ نہیں کیا، نہ مشاعروں میں جا جا کر گلے بازی کی۔''

شاد عارفی کے فن کا دائرہ کافی وسیع ہے۔وقت آ گیا ہے کہ ان کے فن کا احاطہ کر کے ان کی ادبی حیثیت متعین کی جائے تاکہ اس جینوئن شاعر کو اس کا حق مل سکے۔

......☆......

ڈاکٹر فوزیہ خانم

شاد عارفی اپنی شاعری کے آئینے میں

شاد عارفی (پ ۱۹۰۰ء۔م ۱۹۶۴ء) ایک منفرد اور صاحبِ طرز شاعر تھے۔ ان کی پوری زندگی غم والم سے عبارت ہے۔ شاد ایک معزز، مذہبی افغانی خانوادے کے چشم و چراغ تھے، ان کے اجداد افغانستان سے رامپور مذہبی تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے آئے اور یہیں پر مستقل سکونت اختیار کر لی۔ شاد کو اپنے افغانی ہونے پر فخر تھا۔ شاد کے والد انھیں مولوی بنانا چاہتے تھے اسی لیے کلام پاک اور عربی، صرف و نحو کی کتابیں انھوں نے خود پڑھائیں اور اردو و فارسی کی ابتدائی تعلیم شاد نے مکتب میں حاصل کی۔ شاد کو انگریزی تعلیم حاصل کرنے کا شوق تھا مگر ان کے والد انگریزی تعلیم کے خلاف تھے۔ ان کے ماموں نے والد صاحب سے سفارش کی اور ہائی اسکول میں ان کا داخلہ کرا دیا۔ بدقسمتی سے اسی سال باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا اور گھر کی ساری ذمہ داری شاد کے کندھوں پر آ گئی، اس طرح ان کی تعلیم کا سلسلہ منقطع ہو گیا، دورانِ ملازمت انھوں نے پرائیویٹ امیدوار کے طور پر اپنی تعلیم مکمل کی۔ شاد کا بچپن خوشحالی اور فارغ البالی میں گزرا۔ والد صاحب تھانیدار تھے شاید اسی ماحول کی وجہ سے ان کے مزاج اور طبیعت میں تھوڑی سی سختی پیدا ہو گئی تھی۔

سولہ سترہ سال کی عمر میں شاد نے مشق سخن کا آغاز کیا یہی زمانہ ان کے عشق کا بھی تھا، معشوقہ خاندان ہی کی تھی، عشق شاد کے شعری ذوق کو پروان چڑھانے میں معاون ثابت ہوا۔ شاد کی پیدائش اور شاعری کے آغاز کا تذکرہ ڈاکٹر مظفر حنفی نے اس انداز

www.urduchannel.in

میں کیا ہے:

> ''............وہ زیادہ بوڑھا ہونا پسند نہیں کرتے تھے لہٰذا اپنا سنہ پیدائش جو حقیقتاً ۱۹۰۰ء تھا، کبھی کبھی ۱۹۰۳ء بیان کرتے تھے، اس لحاظ سے عشق کا اولیں حادثہ انھیں دراصل سولہ سال کی عمر میں پیش آیا ہوگا جو بلوغت کے قریب تر ہونے کی وجہ سے فطری بھی ہے اور اسی عشق نے ان کے ذوق شعری کی آگ پر تیل کا کام کیا تھا۔ قدرتی طور پر اسی زمانے کے آس پاس انھوں نے سنجیدگی کے ساتھ غزل گوئی اختیار کی ہوگی۔''(۱)

شاد عارفی کی غزلوں، نظموں اور قطعات و رباعیات کو ڈاکٹر مظفر حنفی نے بڑی عرق ریزی اور مشقت کے بعد مختلف رسالوں اور مجموعوں سے یکجا کر کے ''کلیات شاد عارفی'' کے نام سے ۱۹۷۴ء میں شائع کرایا ہے۔ اس کلیات کی تحقیق و تدوین میں انھیں دس سال کا طویل عرصہ لگ گیا۔ اس کلیات کی بدولت شاد عارفی کو ادبی حلقوں میں پذیرائی حاصل ہوئی۔

شاد کی بیشتر غزلیں عشقیہ اور طنزیہ موضوعات پر منحصر ہیں۔ شاعری بالعموم حسن و عشق کی راہوں سے جنم لیتی ہے۔ شاد کی شاعری کو جلا بخشنے میں ان کی محبت کا بڑا دخل ہے۔ شاد کی پہلی محبوبہ خاندان ہی کی تھی لیکن دوسری غیر مذہب سے تعلق رکھتی تھی۔ دونوں معاشقوں میں انھیں ناکامی ہوئی، اور جب چالیس پینتالیس سال کی عمر میں شادی ہوئی تو ڈیڑھ سال کی مدت میں ہی بیوی نے بھی داغِ مفارقت دے دیا۔ عمر گزرنے کے ساتھ ساتھ شاد فکری اور ذہنی اعتبار سے سنجیدہ ہوتے گئے، کیونکہ ایک انسان کا اپنی عمر کے لحاظ سے شخصیت اور ذہنیت کا تبدیل ہونا فطری عمل ہے۔ شاد کی شاعری حسن و عشق کی راہوں سے نکل کر فکر و طنز کی راہوں پر آ گئی۔

شاد عارفی کی غزلیں اردو کی غزلیہ روایت سے بالکل مختلف ہیں۔ شاد کی عشقیہ شاعری ان کے اپنے سچے جذبات، احساسات و تجربات کی ترجمان ہے۔ روایتی غزل کی طرح ان کی محبوبہ کوئی حور یا پری پیکر نہیں ہے نہ ہی وہ ان سے بے اعتنائی برتتی ہے، بلکہ وہ

ایک متوسط طبقہ کی ہندوستانی لڑکی ہے،شکل وصورت کے لحاظ سے بھی عام سی لڑکی ہے اور اس میں معصومیت ،شرم و حیا کے ساتھ ساتھ،شوخی اور الھڑ پن بھی موجود ہے۔ عاشق معشوق دونوں ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں، چھپ کر ملتے بھی ہیں اور کبھی آنکھوں سے،کبھی سہیلی کے ذریعے پیغام رسانی کا کام لیتے ہیں، عاشق محبوب کو رسوا کرنے سے بھی ڈرتا ہے۔محبت کی پُر خطر اور سنگلاخ وادی میں پہنچ کر بھی شاؔد نے مشرقی تہذیب اور اقدار وروایات کا ہمیشہ پاس ولحاظ رکھا۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

سانولا رنگ کشیدہ قامت   نہ پری نہ کوئی حور ہے وہ

....

میں تو غزلیں کہہ کر دل بہلا لیتا ہوں لیکن وہ؟
شہرِ سخن میں بدنامی سے بے پروا ہوں لیکن وہ

....

شاد غیر ممکن ہے شکوہ بتاں میں مجھ سے
میں نے جس سے الفت کی اس کو باوفا پایا

....

دیکھ کر مجھ کو مسکرا دیں آپ
اس قدر احتیاط کافی ہے

....

شوق بیحد میں بھی مجھ کو عقل کا توڑا نہیں
آستانِ یار سے ٹکرا کے سر پھوڑا نہیں

....

کل کوئی آفت ہی آجائے تو مجبوری کی بات
آج تک عہد وفا سے ہم نے منہ موڑا نہیں

شاؔد کی عشقیہ غزلوں کا خاص وصف فطری سادگی، سہل ممتنع اور کلاسیکی لب ولہجہ اور آہنگ ہے اور حقیقی زندگی سے تعلق رکھنے والے واقعات، جذبات، احساسات کو محاکاتی انداز میں پیش کیا گیا ہے۔شاؔد کی غزلوں کے متعلق مظفر حنفی لکھتے ہیں:

’’شاد عارفی کی عشقیہ غزلوں میں فطری سادگی،شوخی اور لہجے کا انوکھا پن ہے۔ان میں جوانی کی تازگی،متوسط طبقے کے نوجوان کو پیش آنے والے واقعات کی سرشاری اور زندگی کی حرارت ہے جس میں محاکاتی پہلوؤں کے ساتھ ایک خوشگوار سا کھردرا پن واقعیت،خلوص اور بے جھجک قسم کا مکالماتی طرز، طرفہ کاری، تنوع، واشگاف مخاطبت اور ابلاغ کا براہِ راست انداز ہے۔ ہر چند کہ اس میں حیات و کائنات کے متعلق کوئی خاص نظریہ یا زندگی کے دوسرے پہلوؤں کے گہرے تجربات کا عکس اور فلسفیانہ تفکر نہیں ہے،لیکن اپنے جدید اسلوب اور مخصوص رنگ و آہنگ کے لحاظ سے اس غزل کی ایک جداگانہ اور منفرد اہمیت ہے۔‘‘(۲)

زندگی اور معاشرے نے شاؔد کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا تھا۔ان کی پوری زندگی دردوغم،غربت وافلاس میں گزری۔ان تلخ تجربات نے شاؔد کی شاعری کو طنزیہ لب ولہجہ عطا کر دیا تھا۔شاؔد کے کلام میں آپ بیتی اور جگ بیتی کی حسین آمیزش نظر آتی ہے۔شاؔد حساس طبیعت کے مالک تھے، انسانیت پر ظلم و جبر انھیں برداشت نہ تھا اسی لیے انھوں نے اپنے کلام میں سماجی ناانصافیوں و مظالم کو طنز کا نشانہ بنایا ہے۔ انھوں نے سماجی رسم و رواج، سرمایہ دارانہ ظلم و جبر، چاپلوسی، غلامی، دفتری ذہنیت،مکر وفریب، اقتدار و دولت کی ہوس، احباب کی ریاکاری،فرقہ پرستی، جہالت،مغربی طرز کی تقلید وغیرہ جیسے اہم سماجی و معاشرتی موضوعات کو اپنی شاعری میں جگہ دی ہے۔

کلامِ شاؔد کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ غالب کی شخصیت اور فن کے مداح تھے۔شاؔد نے غالب کے اشعار میں کچھ لفظی ردوبدل کر کے اپنے حالات کو طنزیہ انداز میں پیش کیا ہے۔شاؔد کی طنزیہ شاعری ان کے عہد کی سماجی، سیاسی، معاشرتی ناہمواریوں کی ترجمان ہے۔مثال کے لیے کچھ اشعار پیش کیے جاتے ہیں:

بے کسوں پر ظلم ڈھا کر ناز فرمایا گیا
طنز کی جانب میں خود آیا نہیں لایا گیا

www.urduchannel.in

غالبِ مرحوم کے ہم بے تکے نقال شاؔد
مشکلیں ہم پر پڑی کب تھیں کہ آساں ہوگئیں

....

نہ رہزن نہ رہبر نہ منزل نہ رستہ
نہ جانے کہاں کارواں آگیا ہے

....

بہاروں کی مانگی تھیں ہم نے دعائیں
نتیجے میں دورِ خزاں آ گیا ہے

....

تجوریوں کو 'حکومت شکار' کہتے ہیں
یہ بات ہم نہیں سرمایہ دار کہتے ہیں

....

جنابِ شیخ سیاست کے پھیر میں پڑ کر
بتانِ دیر کو پروردگار کہتے ہیں

....

جلسوں میں گا سکیں جو قصیدے حضور کے
وہ فائدہ اٹھائیں حماقت سے آپ کی

....

'عزت مآب ہونے کے ناتے' جنابِ شاؔد
عزت مجھے عزیز ہے ذلت سے آپ کی

....

جس کی لاٹھی اسی کی بھینس ہے آج
کیا اسی کو کہیں گے جنتا راج

....

دل میں لہو کہاں تھا کہ اک تیر آلگا
فاقہ سے تھا غریب کہ مہمان آگیا

www.urduchannel.in

آج میں جس گھر میں رہتا ہوں میؔر کے گھر سے بڑھا ہوا ہے
باہر بارش بیت چکی ہے اندر ٹپکا لگا ہوا

شاؔد کے اشعار کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے کلام میں ایک طرف زندگی کے مصائب کو بیان کیا گیا ہے تو دوسری طرف سماج میں پھیلی برائیوں کو بھی اجاگر کیا گیا ہے۔ شاؔد ایک خوددار انسان تھے ان کی پوری زندگی نامرادی و محرومی میں بسر ہوئی، لیکن انھوں نے کبھی دنیاوی مفاد کی خاطر سیاہ کو سفید نہیں کہا نہ ہی کبھی عزت کو ذلت پر ترجیح دی، اس لیے ان کے دشمنوں کی تعداد بڑھتی گئی اور وہ ہمیشہ انھیں زک پہنچانے کی کوشش کرتے رہے۔ ظلم انھیں برداشت نہ تھا، انھیں سرمایہ داروں سے نہیں بلکہ ان سے نفرت ہے جو غریبوں کو ذلیل اور رینگنے والا کیڑا سمجھتے ہیں۔ ان کا یہ نظریہ تھا کہ انسانیت سب سے مقدس و مقدم ہے۔ شاؔد نے اپنی پوری زندگی کرائے کے مکان میں گزار دی آخر عمر تک مفلسی نے ان کا ساتھ نہ چھوڑا۔ شاؔد کی شاعری کی عظمت کا اعتراف مظفر حنفی صاحب نے ان الفاظ میں کیا ہے:

> ''ان کا کلام خارجیت اور داخلیت کے دو آتشہ خمار کا حامل ہے۔ شاؔد عارفی نے اپنی غزل کو صرف اپنے دکھوں کی ہی ڈھال نہیں بنایا بلکہ اسے سماجی مقصدیت کے لیے وقف کر دیا جس کی پیروی نے ان کے کلام میں توانائی، برجستگی، آفاقیت اور تابندگی پیدا کی............ اپنی طنزیہ غزلوں میں وہ ایک رومانی شاعر ہیں خارج سے مواد لے کر اسے تجربات و جذبات کی بھٹی میں پکاتے ہیں اور طنزیہ مزاج کے سانچے میں ڈھال کر شعری پیکر عطا کر دیتے ہیں۔ اس طرح ان کا ہر شعر ایک گونہ انفرادیت کا حامل ہو جاتا ہے۔ ان کے سامنے لامحدود زندگی کے ان گنت مسائل ہیں چنانچہ اپنی پُر گوئی کے باوجود انھوں نے دوسرے شاعروں کی طرح اپنے آپ کو دوہرایا نہیں ہے۔ روایت ان کی ڈھال ہے اور بغاوت ان کا ہتھیار۔ ان کی شاعری ذات اور کائنات کے تصادم کا رزم نامہ ہے۔''(۳)

شاد عارفی کی نظموں کو موضوعات کے اعتبار سے تین خانوں میں تقسیم کر سکتے ہیں: عشقیہ نظمیں، منظریہ نظمیں اور طنزیہ نظمیں۔ شاد کی شاعری کو عوامی شاعری سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ نظیر اکبرآبادی کی طرح شاد نے بھی اپنی نظموں کے لیے مواد ہندوستانی فضا و ماحول سے اخذ کیا ہے۔ یہاں کے موسموں، تیوہاروں، عوامی مسائل، سماجی رسم و رواج کو انھوں نے اپنی نظموں میں دلکش انداز میں پیش کیا ہے۔ شاد کی نظموں میں منظر کشی اور محاکات کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ انھوں نے بہار، برسات، گرمی کے موسموں اور انسانی جذبات، غریبی، مایوسی، گاؤں کی دیہی زندگی جیسے اچھوتے موضوعات کو اپنی نظمیہ شاعری میں جگہ دی ہے۔ مثال کے طور پر کچھ نظمیں پیش کی جاتی ہیں۔ نظم 'شہر سے دور' میں گاؤں میں شام ہونے کے منظر کو پیش کیا گیا ہے۔ شام ہوتے ہی گھروں میں چراغ جلنے لگتے ہیں، ہر چیز خاموش ہو جاتی ہے، لوگ اپنے اپنے کاموں سے گھر واپس آجاتے ہیں:

گاؤں کے نزدیک ہم ہیں، شام کا آغاز ہے
جھاڑیوں میں جھینگروں کی صور صد آواز ہے
شام نے سر رکھ دیا لیلائے شب کے پاؤں پر
پھاڑ کر چھپر دھواں گھٹنے لگا کل گاؤں پر
رات کی تقریب میں گھر گھر دیے جلنے لگے
مشعلیں لے لے کے جگنو چارسو چلنے لگے(۴)

نظم 'ہولی' میں انھوں نے ہولی کے تیوہار پر ہونے والے اہتمام اور پکوان سے اٹھنے والی خوشبو، لڑکیوں کے دیا جلانے وغیرہ جیسی رسومات کا تذکرہ کیا ہے:

ہو رہے ہیں رات کے دیوں کے ہر سو اہتمام
صبح سے جلوہ نما ہے آج دیوالی کی شام
ہو چکی گھر گھر سپیدی ڈھل رہی ہیں نالیاں
پھرتی ہیں کوچوں میں مٹی کے کھلونے والیاں

www.urduchannel.in

بھولی بھولی بچیاں چنڈال پا پا کر مگن
اپنی گڑیوں کے گھروندوں میں سجی ہے انجمن
رسم کی ان حکمتوں کو کون کہہ دے گا فضول
رکھ دیے ہیں ٹھیکروں میں خانہ داری کے اصول(۵)

شاد کی منظریہ نظموں کے متعلق ڈاکٹر مظفر حنفی لکھتے ہیں:

''اگر شاد نے اور کچھ نہ کہہ کر صرف یہی منظریہ نظمیں تخلیق کی ہوتیں تب بھی وہ اردو شاعری میں بقائے دوام کے مستحق تھے۔ یہ نظمیں شاد کو نظیر اکبرآبادی، حالی، چکبست، جوش، حفیظ جالندھری اور ایسے ہی دوسرے نظم گو شعرا کی صف میں جو اردو ادب میں خاص اہمیت کے حامل ہیں، نمایاں مقام کا حق دار بناتی ہیں۔''(۶)

شاد کی عشقیہ غزلوں کی طرح ان کی منظریہ نظمیں بھی سادگی، لطیف و حقیقی جذبات اور واقعات کی ترجمان ہیں۔ شاد نے عشقیہ نظمیں ایسے انداز و لہجہ میں کہی ہیں کہ پڑھنے والے کو اپنے دل کی بات لگنے لگتی ہے۔ مکالماتی انداز اور سلاست، پرخلوص آہنگ و طرز ان کی عشقیہ نظموں کی شناخت ہیں۔ شاد کی اس نوع کی نظمیں فکر و فلسفہ، بصیرت و بصارت نہ ہونے کے باوجود اتنی کشش رکھتی ہیں کہ عام قاری کو اپنے احساسات کی ترجمان معلوم ہونے لگتی ہیں۔ اس کا اندازہ ان کی نظموں سے لگایا جا سکتا ہے، جیسے نظم 'واپسی' میں شاد کی محبوبہ ٹرین سے واپس آرہی ہے وہ اس سے ملنے اسٹیشن پر وقت سے پہلے پہنچ جاتے ہیں، وقت گزارنے کے لیے وہ اسٹیشن کا چکر لگاتے ہیں اور پارسل کی ہر دفتی کو پڑھتے ہیں، سگریٹ پر سگریٹ پیتے ہیں۔ اپنی اس بے چینی کو انھوں نے الفاظ کا جامہ پہنا کر شاعری کے پیکر میں ڈھال دیا ہے۔ جب ان کی محبوبہ آتی ہے اسے دیکھتے ہیں لیکن بات نہیں کر پاتے، ان کے اس طرح دیکھنے سے وہ انھیں اشارے سے محتاط رہنے کو کہتی ہے اور قریب سے جاتے ہوئے کہتی ہے کہ ملنے آنا اس منظر کو بڑی خوبصورتی سے پیش کیا گیا ہے۔ نظم سے کچھ اشعار پیش کیے جاتے ہیں:

کچھ تو میل نے میری ضد میں اپنی چال گھٹا لی ہے
کچھ اسٹیشن پر پہلے سے آکر آفت ڈھالی ہے
پھر بھی چہرے پر سرخی ہے دل الجھن سے خالی ہے
آج سفر سے وہ طنازہ واپس آنے والی ہے(۷)

شاد کی نظم ’ وفائے وعدہ‘ میں انھوں نے محبوب سے ملنے کے منظر کو بیان کیا ہے۔اس نظم کو پڑھ کر متوسط طبقہ کی رسم و رواج، تہذیب وتمدن اور مشرقی خواتین کے مزاج، شرم وحیا کے بارے میں معلومات حاصل ہوتی ہیں۔شاد کی محبوبہ چھپ چھپا کر سب سے نظریں بچا کران سے ملنے آتی ہے، اور ڈرتی بھی ہے کہ کوئی دیکھ نہ لے۔اندھیرا ہو جانے پر کل ملنے کا وعدہ کرکے چلی جاتی ہے۔اس نظم سے کچھ اشعار پیش کیے جاتے ہیں:

وہی ہے مسکراتی آرہی ہے
مجھے اپنا بناتی آرہی ہے
وفا سے لو لگاتی آرہی ہے
تڑپتی تلملاتی آرہی ہے
مٹر کی خوش نما بیلیں جہاں ہیں
وہاں چھپتی چھپاتی آرہی ہے
لٹیں ماتھے پہ گرتی جا رہی ہیں
ہٹاتی پر ہٹاتی آ رہی ہے
اندھیرا ہو چلا اب کل ملیں گے(۸)

شاد کی عشقیہ نظموں میں نوروز، ہولی، مندر جانے والی، مفارقت، وہ کافرہ، خط کی چوری، سماج، فسانہ ناتمام وغیرہ اہم ہیں۔شاد کے عشق میں ناکامی کی وجہ مذہب اور سماجی بندھن تھے اور اس کا انھوں نے ہمیشہ خیال رکھا۔انھوں نے اپنی محبوبہ کو پانے کے لیے سماجی بندھن کو کبھی توڑنے کی کوشش نہ کی، بلکہ خاموشی اختیار کرلی۔شاد کی عشقیہ نظموں کے بارے میں مظفر حنفی لکھتے ہیں:

www.urduchannel.in

’’عشقیہ نظمیں بھی شاد عارفی کی شاعری کا ایک اہم جز ہیں...... یہ نظمیں بھی تازگی، ندرت، بیانِ واقعہ، احساسی کیفیت، لمسیت اور لفظی مصوری کے ایسے مرقعے ہیں جو ہمیں ایک نئے ذائقے سے روشناس کراتے ہیں۔ان نظموں میں حقیقت کی رونمائی اور زمینی عشق کی کارفرمائی نے لمسیاتی لطف اور حسی کیفیات پیدا کردی ہیں۔ان کا عشق ایک صحت مند اور توانا مرد کا عشق ہے۔‘‘(۹)

شاد نے طنزیہ نظموں میں اپنے غم والم کے علاوہ سماجی ناہمواریوں و ناآسودگیوں، خانگی وسماجی جبر کو بھی اپنا موضوع سخن بنایا ہے۔نظم ’سماج‘ میں سماج کے اس فرسودہ نظام کو طنز کا نشانہ بنایا گیا ہے کہ والدین بچوں کی شادی کس طرح ان کی مرضی کے خلاف کردیتے ہیں۔اس نظم میں انھوں نے وارننگ دی ہے کہ وہ وقت بہت جلد آئے گا جب بچے صرف اپنی مرضی کی شادی کریں گے مثال کے لیے اس نظم سے کچھ اشعار پیش کیے جاتے ہیں:

دھرا ہوا ہے جہالت کے سر پہ تاج ابھی
نہیں عروس کی آزادیوں کا راج ابھی
دلوں کے بھید سے واقف کہاں سماج ابھی
محبتوں میں تباہی کا ہے رواج ابھی
سماج ہم پہ یہ ظلم کر چکا لیکن
وہ آگیا ہے زمانہ قریب ہیں وہ دن
جہاد کے لیے اٹھیں گے نوجواں ہم سن
بہے گی چاروں طرف سیل جذبہ باطن(۱۰)

شاد کی نظم ’رنگیلے راجہ کی موت‘ ایک عیاش راجہ کی موت پر لکھی گئی ہے جو اپنی ہوس کی خاطر نہ جانے کتنے معصوموں کا قتل کرتا ہے، عوام پر ظلم وستم ڈھاتا ہے۔موت کے وقت سبھی مظلوم اسے للکارتے ہوئے نظر آتے ہیں۔اس نظم میں دولت واقتدار کی طاقت کا ناجائز فائدہ اٹھانے والوں پر گہرا طنز کیا گیا ہے۔اس نظم سے بھی کچھ اشعار ملاحظہ ہوں:

طبیبان شاہی بھی ہیں ڈاکٹر بھی
یہ نرسیں یہ جراح، یہ چارہ گر بھی
نہیں کوئی اتنا جو مجھ کو بچا لے
ہوا جا رہا ہوں قضا کے حوالے
یہ وہ کنوارایاں جو اڑا دی گئی تھیں
اڑا دی، سلا دی چھپا دی گئی تھیں
بھیانک ارادوں سے للکارتی ہیں
مرے حال پر قہقہے مارتی ہیں
وہ سب ظلم کی ٹہنیاں پھل چکی ہیں
بھڑکتی ہوئی آگ میں ڈھل چکی ہیں(۱۱)

شاد کی طنزیہ نظموں کے متعلق ڈاکٹر مظفر حنفی لکھتے ہیں:

''شاد کی طنزیہ نظموں کی تعداد سو تک پہنچتی ہے۔انھوں نے ہمارے سماج کے ہر جھول، ہر رخنے، ہر ناہمواری اور ہر خامی پر طنز کے وار کیے ہیں خواہ وہ گھر میں ہو، دربار میں ہو، بازار میں ہو، یا خانقاہ میں۔'' (۱۲)

شاد کی طنزیہ نظموں میں سماجی برائیوں پر طنز و افسوس کا اظہار کیا گیا ہے۔

نظم 'ہمارے نوجوان' میں انھوں نے ہندوستانی نوجوانوں کی بے عملی، بے حسی پر افسوس اور گریہ وزاری کی ہے۔نظم 'مرید کی بیوی' پیر و مرید سے متعلق ہے جو مذہب کے نام پر لوگوں سے خوب پیسے کھاتے ہیں۔نظم 'ایک بیمار بیوہ' میں ایک بیوہ عورت کے جذبات و احساسات کو بیان کیا گیا ہے کہ کس طرح وہ اپنی پوری زندگی دکھوں اور پریشانیوں میں گزارتی ہے لیکن اپنے جذبات کسی سے کہہ نہیں سکتی، اس طرح کے سماجی رواج پر وہ افسوس ظاہر کرتے ہیں۔'ملازمہ' نظم میں انھوں نے نوکرانی کی مفلسی کو بیان کیا ہے جو پورے گھر کا کام کرتی ہے اور اپنے بچوں کو سوکھی روٹی کھلاتی ہے پھر بھی مالکن سرمایہ داری کے غرور میں اسے ایک حقیر سی چیز سمجھتی ہے، آخر کار اسے خدمت سے بے دخل کر کے گھر سے رسوا کر کے نکال دیا جاتا ہے۔

www.urduchannel.in

شاد کی پوری شاعری انسانی زندگی کا کرب و المیہ ہے۔ان کے کلام میں انسان دوستی، سماجی بصیرت، انسانیت کی فلاح و بقا، ظلم و جبر کی مذمت، مظلوم کی حمایت کا رجحان پورے طور پر نظر آتا ہے۔قوت تخیل اور مشاہدہ کے ذریعے انھوں نے سماجی ناہمواریوں کو ڈرامائی و محاکاتی انداز میں پیش کیا ہے۔شاد کے کلام میں بول چال کی زبان اور روزمرہ کے الفاظ و محاوروں کا استعمال اتنی ہنرمندی سے کیا گیا ہے کہ کلام کے حسن میں اضافہ ہو گیا ہے۔شاد عارفی کا کلام اردو شعر و ادب کی تاریخ میں اضافہ کی حیثیت رکھتا ہے۔انھوں نے اپنے تجربات و مشاہدات کے ذریعے اردو کی شعری روایت کو ایک نئی سمت و جہت سے آشنا کرنے کی کوشش کی ہے۔جس طرح انھوں نے عشق کے جذبوں اور تجربوں کا ذکر بڑے فنکارانہ انداز میں کیا ہے، اسی طرح غم و اندوہ، حزن و یاس، سماجی ناہمواریوں کا تذکرہ کرتے وقت ایک مخصوص طنزیہ لب و لہجہ اختیار کیا ہے۔شاد کے کلام کی فکری و فنی خوبیوں کا ذکر خلیل الرحمٰن اعظمی نے ان الفاظ میں کیا ہے:

''شاد عارفی نے اپنی نظموں میں بیانیہ پیرایہ اختیار کرنے کے بجائے ڈرامائی، مکالماتی اور تمثیلی انداز اختیار کیا ہے، بعض نظمیں مختصر افسانے کی تکنیک میں لکھی گئی ہیں۔ان نظموں میں شاد نے اپنی طرف سے کچھ کہنے کے بجائے کسی نہ کسی کردار کو پیش کر دیا ہے اور اس کی تصویر اس کے عمل اور اس کی گفتگو کے ذریعے ابھارنے کی کوشش کی ہے۔بعض اوقات ایک ہی نظم میں کئی کئی کردار عمل کرتے ہوئے نظر آتے ہیں بلکہ کبھی کبھی تو انھوں نے یہ کمال کیا ہے کہ ایک ہی مصرعے کے اندر دو دو اور تین تین کرداروں کے مکالمے ادا کرنے کی کوشش کی ہے۔'' (۱۳)

کتابیات

(۱) شاد عارفی شخصیت اور فن: ڈاکٹر مظفر حنفی، ص:۷۷
(۲) شاد عارفی شخصیت اور فن: ڈاکٹر مظفر حنفی، ص:۹۹
(۳) شاد عارفی شخصیت اور فن: ڈاکٹر مظفر حنفی، ص:۱۵۳۔۱۵۴
(۴) کلیات شاد عارفی: مرتب ڈاکٹر مظفر حنفی، نظم شہر سے دور، ص:۲۳۶۔۲۳۷

(۵) کلیات شاؔد عارفی: مرتب ڈاکٹر مظفر حنفی، نظم 'دیوالی' ص:۲۴۱
(۶) شاد عارفی شخصیت اور فن: ڈاکٹر مظفر حنفی، ص:۲۱۲
(۷) شاد عارفی شخصیت اور فن: ڈاکٹر مظفر حنفی، ص:۲۱۳
(۸) کلیات شاؔد عارفی: مرتب ڈاکٹر مظفر حنفی، نظم 'واپسی' ص:۲۲۴
(۹) کلیات شاؔد عارفی: مرتب ڈاکٹر مظفر حنفی، نظم 'وفائے وعدہ' ص:۲۳۱
(۱۰) شاد عارفی شخصیت اور فن: ڈاکٹر مظفر حنفی، ص ۲۳۷
(۱۱) کلیات شاؔد عارفی: مرتب ڈاکٹر مظفر حنفی، نظم 'سماج' ص:۳۱۹۔۳۲۰
(۱۲) کلیات شاؔد عارفی: مرتب ڈاکٹر مظفر حنفی، نظم 'رنگیلے راجہ کی موت' ص:۲۹۶۔۲۹۷
(۱۳) اردو میں ترقی پسند تحریک: خلیل الرحمٰن اعظمی، ص:۱۶۳

......☆......

ڈاکٹر ضیا فاطمہ

شاؔد عارفی

شاؔد عارفی عہدِ جدید کے ان چند ممتاز شعرا میں ہیں جنھوں نے ترقی پسند تحریک سے قبل ادبی حلقوں میں اپنے مخصوص طرز گفتار کی بدولت ایک الگ پہچان بنا لی تھی۔ شاؔد کے شعری سفر کا آغاز غزلوں سے ہوا لیکن ترقی پسند تحریک سے وابستگی کے نتیجے میں نظموں کی طرف خاصہ متوجہ ہوئے اور اس دور کے تقریباً تمام رسائل، لاہور کے 'ہمایوں'، 'شاہکار'، 'ادبی دنیا'، 'خیام' اور دہلی کے 'ساقی' میں ان کی نظمیں اور کبھی غزلیں بھی شائع ہوتی رہیں اور قارئین سے داد و تحسین حاصل کرتی رہیں۔

شاؔد کی ابتدائی شاعری پر تبصرہ کرنے کی بجائے بہتر معلوم ہوتا ہے کہ ان اشعار کو پیش کر دیا جائے جن میں وہ خود اپنی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے نظر آتے ہیں:

مجھے بھی شاؔد! ریشمین شاعری کا شوق تھا
مگر وہ عمر سرخوشی کی تھی، یہ آگہی کی ہے

....

شاد وصل و ہجر تک محدود تھی میری نظر، اک زمانہ تھا مگر
آج میری ہر غزل وابستہ حالات ہے، سوچنے کی بات ہے

....

دس پانچ برس حضرتِ حاؔلی کی طرح شاؔد
مجھ کو بھی جنونِ لب و رخسار رہا ہے

وہ رنگیں نوائی، یہ شعلہ بیانی
کئی موڑ آئے مری شاعری میں

www.urduchannel.in

شادؔ نے 'فن برائے فن' کے قدیم رجحان سے انحراف کر کے 'فن برائے زندگی' کے نظریے کو اپنایا ہے۔ وہ اپنے فوری پیش روؤں مثلاً داغؔ، حسرتؔ اور جگرؔ کے پسندیدہ موضوعات شراب وشاہد کے تذکرے، شباب وخلوت کی باتیں نہیں کرتے اور نہ ہی محبوب کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ایک کرتے ہیں بلکہ طنز کرتے ہوئے کہتے ہیں:

ہمارے شاعر غلط بیانی سے آج کام لے رہے ہیں
وہ کون محبوب ہے کہ جس کے دہن نہیں ہے کمر نہیں ہے
شباب وخلوت کی بات اچھی تو ہے مگر آج کل نہ کہیے
غزل برائے حیات لکھیے، غزل برائے غزل نہ کہیے

شادؔ شاعری کو وقت کی آواز بنا کر پیش کرنے کے قائل ہیں لیکن ساتھ ہی لطافتِ بیان کو غزل کی جان قرار دیتے ہیں، اشعار ملاحظہ ہوں:

اس وقت کہ ماحول بھی للکار رہا ہے
کیا موقع رنگینیٔ اشعار رہا ہے
صداقتوں کی تلخیوں کے ساتھ شادؔ عارفی
لطافتِ بیان واقعہ غزل کی جان ہے

مذکورہ بالا اشعار شادؔ کی صاف گوئی اور حقیقت پسندی کی دلیل ہیں۔ ان کے ہم عصر شعرا میں کسی نے بھی اتنی کھری باتیں ان جیسے گہرے انداز میں کہنے کی جرأت نہیں کی۔ شادؔ کی فکر اور اظہار کے تیکھے پن میں خلوص شامل ہے جس سے ان کے اسلوب میں طنز کی شدت اور گہرائی پیدا ہو جاتی ہے۔ ان کے اکثر اشعار کو پڑھ کر محسوس ہوتا ہے کہ شاعر نے اپنا بوجھ ہلکا کرنے کی غرض سے یہ شعر کہا ہے ورنہ شدتِ جذبات سے اس کا دم گھٹ جاتا۔

شادؔ عارفی ایک حساس خود دار اور غیرت مند انسان تھے۔ انھیں اپنے وطن ہندوستان سے بے پناہ محبت تھی جس کا اظہار اس طرح کرتے ہیں:

منتظر ہے پاکستان اور میں نہ جاؤں گا
برہمن کے مصرع پر طبع آزماؤں گا

www.urduchannel.in

شادؔ کی پرورش ریاستی اور جاگیردارانہ ماحول میں ہوئی لہٰذا انھیں اس ماحول کی غلاظتوں اور چیرہ دستیوں کا سامنا کرنا پڑا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی غزلوں میں نہ تو حسن کی خبر ہے اور نہ جوانی کے تذکرے، نہ گل وبلبل کی داستان ہے نہ صیاد کے ظلم وستم، نہ قتل عاشق ہے نہ نازِ محبوب، نہ فراق کا رونا ہے اور نہ وصل کی لذت، نہ عاشق کی مظلومیت کی حکایتیں ہیں اور نہ معشوق کی ستم ظریفی کا گلہ، بلکہ شہر آشوب کی فضا غالب ہے۔ نتیجے میں ان کی غزل غزل نہیں رہ جاتی، نظم ہو جاتی ہے۔ ڈاکٹر خلیل الرحمٰن اعظمی لکھتے ہیں:

''شادؔ عارفی کی غزل ٹھیٹ معنوں میں غزل نہیں ہے۔ غزل کے مخصوص رموز وعلائم کو نہ صرف یہ کہ انھوں نے اپنے ڈھب پر لانے کی کوشش کی ہے بلکہ ان کی غزلوں کی فضا اور اس کا ذائقہ اس دور کی عام غزلیہ شاعری سے مختلف ہوتا ہے۔''

(خلیل الرحمٰن اعظمی: اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک، ص۱۶۲)

شادؔ کی غزلوں کی اہم خصوصیت ان کا تنوع ہے۔ انھوں نے سماج کے تقریباً سبھی طبقوں کو قریب سے دیکھا تھا۔ ان کے مسائل کو سمجھنے کی کوشش کی۔ انھوں نے اپنی زندگی میں جو رنج والم اٹھائے ان کا براہِ راست اظہار کہیں نہیں ملتا بلکہ اس طرح بیان کرتے ہیں کہ اس میں عمومیت اور ہمہ گیری پیدا ہو جاتی ہے۔ شادؔ نے سیاسی مسائل اور سرمایہ دارانہ نظام کے خلاف بھی اشعار کہے جس میں تیکھا طنز موجود ہے۔ مثال کے لیے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

ہم خدا کے ہیں وطن سرکار کا
حکم چلتا ہے مگر زردار کا

....

ہمارے ہاں کی سیاست کا حال مت پوچھو
گھری ہوئی ہے طوائف تماش بینوں میں

....

صرف اپنوں کے تقرر کا ارادہ ہوگا
اور اخبار میں اعلان ضرورت دیں گے

وہ باغباں جو پودوں سے بیر رکھتا ہے
یہ آپ ہی کے زمانے کی بات کرتا ہوں

....

یہاں چراغ تلے لوٹ ہے اندھیرا ہے
کہاں چراغ جلانے کی بات کرتا ہوں

....

یہ نرالی طرزِ استدلال یہ جمہوریت
خون کے دھبے بتاتے ہیں کہ یہ قاتل نہیں

....

''دھنگنا'' دے کر چھوڑ دیا ہے
یوں بھی ملتی ہے آزادی

....

ہم کہ ہیں تازہ واردانِ قفس
اور صیاد کہہ رہا ہے کہ گاؤ

....

کان میں کہنے کی باتوں کا زمانہ لد گیا
نظم محفل جس کو سونپا ہے وہ اس قابل بھی ہے

....

فسانۂ ستم بڑے ہنر سے کہہ رہا ہوں میں
چناں چنیں کے ساتھ اگر مگر سے کہہ رہا ہوں میں

....

کہہ رہے ہیں کہ پڑو پاؤں نگہبانوں کے
آپ ہمدرد ہیں ہم سوختہ سامانوں کے

....

جناب شیخ سیاست کے پھیر میں پڑ کر
بتان دیر کو پروردگار کہتے ہیں

......☆......

www.urduchannel.in

طاہرہ اختر

لڈّن ماموں

اگر آپ اچنبھے میں نہ پڑیں تو عرض کروں کہ یہ نام انھیں پر اسرار شاعر (بقول ماہنامہ ''ادب لطیف'') کا گھریلو عرف ہے جنھیں ادبی حلقے احمد علی خاں شاؔد عارفی کے نام سے پہچانتے ہیں اور یہ سوچ بھی نہیں سکتے کہ ان دو ناموں کے علاوہ موصوف کے دو اور نام بھی ہیں۔ ایک لطیف علی خاں اور دوسرے پاپا! پہلا نام حامد اسکول کے درجہ الف کے ماسٹر کی غلطی کا ممنون ہے جو اسکول کی ساتویں جماعت تک چلتا رہا اور پھر درخواست دے کر حقیقی نام احمد علی خان میں تبدیل کرا دیا گیا، مگر اس زمانے کے ساتھ انھیں آج بھی اس نام سے جانتے ہیں۔ دوسرا نام ''پاپا'' لڈّن ماموں کے بھتیجوں سے معنون ہے جو محلّہ بھر میں قبولِ عام کی سند حاصل کر چکا ہے۔

وہ جو کہا گیا ہے کہ ہر اسم با مسمّیٰ پر اثر پذیر ہوتا ہے اس لیے بالکل ٹھیک ہے کہ محلے بھر کے بچوں اور جوانوں میں لڈن ماموں پاپا کا کردار اس خوبی سے ادا کرتے ہیں جیسے علی گڑھ کے ابّا حلیم طلبا میں بیٹھے ہوں اور بچے یہ نہ محسوس کر رہے ہوں کہ ان کے درمیان کوئی ان سے بڑی عمر کا آدمی بیٹھا ہے۔ نصیحت کرنے کا انداز بھی ان کا اپنا ہے جس میں طنز اس طرح شامل ہوتا ہے کہ صاف نظر آتا ہے اور غیر محسوس بھی۔ مثلاً کوئی لڑکا بغل میں بستہ دبائے ہوئے پتنگ بازی دیکھنے لگے تو یہ اس سے ہنس کر کہیں گے کہ لاؤ بستہ مجھے دے دو اور یہ پتنگ اڑاؤ۔ لڑکا جب اس پر پشیمان ہونے لگے تو یہ کہیں گے۔ پھینکو بھی ان کتابوں کو،

ان میں کیا تفریح ہوسکتی ہے، اس کے علاوہ پڑھنے لکھنے والوں نے ہمیشہ تیل بیچا ہے۔ جب لڑکا شرمندگی کی حد پر آجاتا ہے تو یہ اپنا آخری حربہ استعمال کرتے ہیں۔ کھیلو گے کودو گے ہوگے نواب۔ اور لڑکا اسی میں عافیت سمجھتا ہے کہ سیدھے سیدھے مدرسہ پہنچ جائے۔

بلحاظ تخلص لڈّن ماموں کو تلخ سے تلخ حالات میں بھی مغموم اور اداس نہیں دیکھا گیا ہنسی ہر وقت ان کے ہونٹوں پر کھیلتی رہی۔ ۳۰ء کی ایک طرحی غزل کے مقطع میں انھوں نے اس طرف بہت واضح اشارہ کیا ہے اور یہی ان کا مزاج بھی ہے:

تلخیِ وقت و گردشِ دوراں پہ قہقہے
کچھ شادؔ ہی نے رنج و محن کا دیا جواب

یہی نہیں، رنج و محن کا جواب دینا انھوں نے اپنے عقیدے میں شامل کرلیا۔ چنانچہ جب ان کی جیب میں تھوڑے پیسے رہ جاتے تو وہ انھیں کسی فقیر کو دے کر اپنی جیب خالی کر دیتے اور کہتے ان تھوڑے سے پیسوں کی وجہ سے اللہ میاں کو میری فکر نہیں تھی اب جب کہ گرہ میں مال نہیں رہا ہے ظاہر ہے کہ وہ مسبب الاسباب ہو کر خود کوئی سبب پیدا کردے گا۔ چنانچہ وہ بھی کوئی نہ کوئی سبب پیدا کرتا رہتا ہے اور ان کا کوئی کام اٹکا نہیں رہتا

کوئی غلط بات یا توہین برداشت کرنے کی لڈّن ماموں میں قطعاً تاب نہیں۔ چھ سات ملازمتیں ذرا ذرا سی زیادتیوں کی وجہ سے چھوڑ دیں اگر کوئی پوچھے کہ آپ یہ کیا کرتے ہیں تو مسکرا کر جواب دیں گے کہ اللہ میاں مجھے پریشان کرنے اور اپنے اطمینان کے لیے مجھے ایک آدھ گھٹیا ملازمت دے کر جب بے فکر ہو جاتے ہیں تو میں استعفیٰ دے کر انھیں پریشان کرنے لگتا ہوں کہ لاؤ رزّاقِ مطلق ہو تو میرا انتظام کرو اور جیسا کہ میرا عقیدہ ہے وہ اپنے رزّاق مطلق ہونے کا ثبوت دیتا رہتا ہے۔ تو میں یہ کہہ رہی تھی کہ لڈّن ماموں ضبطِ غم میں اپنا جواب نہ رکھتے تھے اور بڑے بڑے صدمے ہنسی میں اڑا جاتے تھے۔ موصوف کا ایک شعر یاد آرہا ہے جس میں انھوں نے زندگی کی دشواریاں جھیلنے کی تلقین کی ہے:

زرد چہرے نے تبسم کو کیا ہے بدنام
ورنہ ظاہر بھی نہ ہوتا کہ پریشاں ہے کوئی

www.urduchannel.in

یہاں میں لڈّن ماموں کا اسی زمین میں ایک بہت عمدہ شعر سنانا چاہتی ہوں مگر معلوم نہیں آپ اچھے شعروں میں دلچسپی لیتے ہیں یا نہیں۔ فرماتے ہیں:

چاپ سن کر جو ہٹا دی تھی، اٹھا لا ساقی
شیخ صاحب ہیں میں سمجھا تھا مسلماں ہے کوئی

یہ شیخ صاحب کے مسلمان ہونے نہ ہونے کی بحث تو خواہ مخواہ بیچ میں آگئی ورنہ میں کہہ رہی تھی کہ کچھ شادؔ ہی نے رنج و محن کا دیا جواب۔ اور واقعی لڈّن ماموں نے گردشِ دوراں کا ڈٹ کر مقابلہ کیا اور بقول حضرت حالی ان کے لیے یہی فتح و ظفر کی صورت رہ گئی تھی جبھی تو لڈّن ماموں نے اپنے اوپر وہ حملے کیے ہیں کہ باید و شاید۔ ان حملوں کی تفصیل طولانی ہے اس لیے میں مختصر نویسی سے کام لے کر یہ بتانا چاہتی ہوں کہ ابھی آپ انٹرنس کا ششماہی امتحان ہی دینے پائے تھے کہ ان کے والد عارف اللہ خاں کا انتقال ہوگیا اور گھر کی تمام ذمہ داریاں ان پر آپڑیں جنھیں موصوف نے خندہ پیشانی سے برداشت کیا۔ بھتیجا بھتیجی کے پڑھانے لکھانے، شادی کرنے اور والدہ کی خدمت کو اپنا فرض تسلیم کرتے ہوئے شادی کا خیال ترک کردیا مگر ۹۵ برس کی عمر میں ان کی والدہ کی آنکھیں جاتی رہیں، بھتیجی کی شادی کردی، بھتیجے کو بی۔ اے، بی۔ ٹی کرا کے اس کی شادی کردی اور وہ سسرال میں رہنے لگا تو والدہ کی خدمت کے سلسلے میں مجبوراً شادی نہ کرنے کا عہد توڑنا پڑا اور چالیس سال کی عمر میں شادی کرلی، ان کی نظم ''نصف بہتر'' اسی طرف اشارہ کرتی ہے۔ لڈّن ماموں کی زندگی کا سب سے بڑا المیہ یہ رہا ہے کہ ان کی اطاعت شعار بیوی صرف ڈیڑھ سال زندہ رہ کر داغِ مفارقت دے گئیں۔

اگر یہ درست ہے کہ شخصیت کے سلسلے میں کسی شاعر کی جائے پیدائش اور خاندانی حالات مع اپنے حدودِ اربعہ کے درج کیے جاتے ہیں تو مجھے لازم آتا ہے کہ اس بارے میں اختصار سے کام لے کر یہ بتاتی چلوں کہ لڈن ماموں کی ددھیال یاغستان ہے اور آپ ڈوڈال اور منٹ قبائل سے تعلق رکھتے ہیں۔ ننہال رامپور میں ہے اور ان کی نانی رام پور میں پیدا ہوئی تھیں مگر نانی کے والد اور والدہ خالص افغانی تھے اور نسلاً رزڑ۔ لڈن ماموں کے نانا مولوی

سید ولی جن کا ذکر تذکرۂ کاملانِ رام پور میں موجود ہے، نواب علاء الدین خاں والیِ لوہارو کی خواہش پر ضیاء الدین خاں ولی عہد لوہارو کے عربی معلم بن کر لوہارو چلے گئے جن کے ساتھ ان کے داماد مولوی محمد عارف اللہ خاں یعنی لڈن ماموں کے والد بھی لوہارو آ گے اور یہاں تھانے داری کے عہدے پر فائز ہوئے لڈن ماموں ۱۹۰۰ء میں وہیں لوہارو میں پیدا ہوئے ابھی یہ نو سال کے تھے کہ ان کے نانا اور والد کو ریاست سے پنشنیں مل گئیں اور یہ اپنے وطن رامپور واپس آ گئے۔ چنانچہ لڈن ماموں بھی رامپور آ گئے۔عربی اور فارسی کی تعلیم اپنے نانا اور والد سے گھر پر حاصل کی۔ اردو حکیم عمی میاں سے پڑھی۔علم حاصل کرنے کی لگن سے تنگ آ کر خاندانی روایات سے بغاوت کرتے ہوئے اپنے ماموں کرامت علی خاں کے ذریعے جو اس وقت رامپور میں تھانیدار تھے، ۱۲ برس کی عمر میں اسکول میں داخلہ لے لیا۔جس پر لڈن ماموں کے والد عرصہ تک ناراض رہے اور کہتے تھے کہ کرامت علی خان نے میرے لڑکے کو کرسٹان بننے میں مدد دی ہے جسے میں کسی طرح معاف نہیں کر سکتا مگر ایک دن یہ ہوا کہ دہلی سے لڈن ماموں کے بڑے ماموں کا تار آ گیا اور یہ دیکھ کر کہ لڈن ماموں نے وہ تار حرف بحرف پڑھ سنایا، بہت خوش ہوئے اور اپنی ناراضگی کے ردِ عمل میں بڑے پیار سے سر پر ہاتھ پھیرا اور کہا میں غلطی پر تھا۔زمانے کا تقاضا یہی تھا جو تم نے کیا۔اب تم شوق سے انگریزی پڑھ سکتے ہو مگر اچھے بُرے کا امتیاز ہاتھ سے نہ جانے پائے۔ مجھ پر بھروسہ کیجیے۔لڈن ماموں نے جواب دیا اور اس بھروسے کو اخیر دم تک نبھایا۔ چونکہ قدرت نے انھیں علم حاصل کرنے کے لیے تڑپ دی تھی اس لیے ان کے مطالعہ کا یہ عالم رہا کہ رات کے دو دو بجے تک کتاب ہے اور لڈن ماموں ہیں اور آپ تعجب کریں گے کہ یہ شوقِ مطالعہ آخر تک بھی کم نہیں ہوا۔خصوصاً شعر و ادب کی دلچسپی جنون کی حد تک پہنچ گئی تھی۔ سبعہ معلقہ کا ایک شعر مع اپنی تمام خوبیوں کے ان کا موضوعِ سخن تھا یعنی یہ مطالعہ ورق گردانی کے طور پر نہ تھا بلکہ ہمیشہ مفہوم و معانی میں ڈوب کر استفادہ مدِّ نظر رہا یہی وجہ ہے کہ وہ سبعہ معلقہ کے شاعروں میں صرف بسید کو ترجیح دیتے اور کہتے اس میں شاعرانہ خودداری اپنی تمام سنجیدگیوں کے ساتھ موجود ہے۔لڈن ماموں کے صحیح مطالعہ کا

www.urduchannel.in

نتیجہ ہی تو ہے کہ انھوں نے بڑے بڑے دیوانوں کا انتخاب ایک ایک شعر میں مرتب کیا ہے اکثر وہ شاعر ہیں جو انھیں پسند نہیں پھر بھی ان کا گہرا مطالعہ کر کے یہ انتخاب تیار کیا ہے۔

حضرت میرؔ کا وہ شعر جس کا مصرع ہے ''یہ سن کر کلی نے تبسم کیا''

خاقانیِ ہند ذوقؔ کے دیوان کا خلاصہ ملاحظہ فرمائیے:

منعمِ موذی کے گھر کو اہلِ حاجت لوٹ لیں
مانگتا ہے عدل کیا جا کر کوئی زنبور سے

ناسخؔ اور اسی قسم کے دوسرے خشک شعرا کے متعلق کہتے کہ ان لوگوں نے اپنی عمر ضائع کی اور کاغذ بھی! زیادہ سے زیادہ ان لوگوں کے کلام سے ''رسالۂ تذکیر و تانیث'' تیار کیا جا سکتا ہے یا وہ اردو لغت جس میں اشعار کے ذریعے مثالیں پیش کی گئی ہوں۔حضرتِ آتشؔ کا یہ مطلع 'سن تو سہی جہاں میں ہے تیرا فسانہ کیا'، رندؔ کا یہ شعر جس کا آخری مصرع ہے 'وگرنہ دام نہاں ہیں، کہاں کہاں صیاد' حد یہ ہے کہ اپنے استاد فصاحت جنگ حضرت جلیل کو ایک مطلع کا شاعر کہتے ہیں:

نگاہِ برق نہیں، چہرہ آفتاب نہیں
وہ آدمی ہے مگر دیکھنے کی تاب نہیں

اگر آپ حضرتِ غالبؔ کے دیوان کا خلاصہ چاہیں گے تو صاف صاف کہہ دیں گے کہ وہ تو خود انتخاب ہے۔انتخاب کا انتخاب حماقت ہے۔ہاں اگر پوچھیں گے کہ ان کے نزدیک غالبؔ کا سب سے اچھا شعر کون سا ہے تو کہیں گے:

پرتوِ خور سے ہے شبنم کو فنا کی تعلیم
ہم بھی ہیں ایک عنایت کی نظر ہونے تک

چار دن کے بعد آپ اگر پھر یہی سوال کریں گے تو جواب ملے گا:

کتنے شیریں ہیں تیرے لب کہ رقیب
گالیاں کھا کے بے مزہ نہ ہوا

اگر معنوی بحث چھیڑ دیں گے تو ارشاد ہوگا اس شعر میں غالب کی خودی اپنی معراج

پر ہے، محبوب سے کہتے ہیں ہم تو گالیاں برداشت نہیں کر سکتے وہ تیری ہوں یا کسی اور کی مگر رقیب کے گالیاں سہہ جانے سے ہم اندازہ کر سکتے ہیں کہ تیرے لبوں کی شیرینی اپنی کوئی حد نہیں رکھتی۔ اس کے بعد اگر آپ یاد دلائیں گے کہ چار دن پہلے تو آپ نے غالبؔ کا وہ شعر پسند کیا تھا اور آج اس شعر کو سب سے اچھا شعر بتا رہے ہیں تو وہ فوراً مسکرا دیں گے جس کے معنی ہوں گے کہ وہ ظالم تو سب ہی اچھے شعر کہہ گیا ہے۔

حضرتِ حالیؔ کا یہ مقطع بہت پسند ہے:

بڑا جی خوش ہوا حالیؔ سے مل کر
ابھی کچھ لوگ باقی ہیں جہاں میں

ایک دن کہنے لگے جوشؔ کو میں بہت اچھا شاعر سمجھتا تھا مگر اس کا یہ مقطع دیکھ کر ’ابھی اگلی شرافت کے نشاں کچھ پائے جاتے ہیں‘، جوشؔ سے میرا جی بُرا ہو گیا ہے۔ حضرتِ حالیؔ کے اس مقطع کا ایسا مذاق اڑایا ہے جس کا جواب نہیں۔

غرض لڈن ماموں نے اردو کے تمام شعرا کے کلام پر ناقدانہ نظر ڈالی ہے۔ کچھ دن ہوئے لڈن ماموں سے امیرؔ مینائی کے ایک شعر کا مطلب پوچھ رہی تھی، مطلب بتاتے ہوئے کہنے لگے کہ یہ شعر امیرؔ مینائی کا نہیں بلکہ نظام رامپوری کا ہے اور اس سلسلے میں انھوں نے ایسی دلیلیں پیش کیں جن سے ان کی بات کو تقویت پہنچتی تھی۔ ایک دن کہنے لگے نظامؔ کے کلام کا سرقہ ہوا ہے میں پرانے لوگوں سے پوچھ تاچھ کر رہا ہوں اور پھر ثابت کر دوں گا کہ نظامؔ کا بہت سا کلام امیر مینائی کے کلام میں شامل ہو گیا ہے۔

بہر حال لڈن ماموں کی شاعری اپنی جگہ ٹھوس اور پختہ ہے اور انکے فطری شاعر ہونے میں کسی کلام کی گنجائش نہیں۔ شاعر کو الہام ہوتا ہے اس بات کی جانچ میں نے لڈن ماموں کی شاعری سے کی ہے۔ جس گھر میں لڈن ماموں رہتے تھے (بعد میں وہ اپنے بھتیجے ماسٹر فدا احمد خان صاحب کے پاس رہنے لگے اور اپنا ذاتی مکان بیچ دیا تھا) اس کا نقشہ کھینچنا بہت مشکل ہے، سوداؔ کے شہر آشوب سے بڑھ کر ہے۔ کچی کھپریل میں ڈھکی ہوئی کوٹھری جس میں نہ گرمی کا آرام نہ سردی کا۔ نہ بارش سے حفاظت ہو سکتی ہے۔ بغیر پلاسٹر کے نون

www.urduchannel.in

لگی ہوئی دیواریں۔ ایک چھوٹا سا پلنگ، ایک لوٹا، دو تین مٹی کے گھڑے۔ دروازہ بغیر زنجیر کا، جس کو جب جاتے، تار لگا کر بند کر جاتے۔ یہ تھا اردو کے شاعر شادؔ عارفی کا مکان جس میں وہ شعر کہتا تھا۔ لڈن ماموں روز غزلیں لکھا کرتے تھے، نظموں کے روپ میں سماج اور سماج کے زخموں پر نمک چھڑکا کرتے ار آخر تک یہی مشغلہ رہا، جیسا کہ میں نے پہلے لکھا لڈن ماموں انتہائی خوددار، نک چڑھے اور ٹّنی قسم کے آدمی تھے۔ ’’جو کی روٹی کھا مگر آزاد رہ‘‘ ان کی زندگی کا اصول تھا۔ خوشامد کرنا نہیں جانتے تھے۔ صاف دل اور صاف گو، لگی لپٹی کے قائل نہ تھے۔

خدا اور رسول پر ایمان رکھتے تھے، اسی لیے وہ لوگ جو انھیں دور سے دیکھ چکے ہیں، ان کے متعلق مختلف رائیں رکھتے ہیں۔ کوئی کہتا ہے کمیونسٹ تھے، کسی کی رائے میں دہریہ تھے، مگر میری رائے ہے کہ وہ ایک پکے مسلمان تھے اور شاعر کے علاوہ کچھ نہیں۔ کسی کا احسان لینا گوارہ نہ کرتے تھے۔ رام پور کے اکثر رئیسوں نے ان کی امداد کرنی چاہی مگر لڈن ماموں نے انکار کر دیا۔ وہ کہتے رئیسوں سے روپیہ لوں گا تو پھر ان کے خلاف نظمیں کیسے کہوں گا، میری شاعری کا مقصد فوت ہو جائے گا۔

لڈن ماموں کے بیانوں میں بلا کی کشش ہوتی تھی۔ مختلف موضوعات پر بات چیت کرتے جائیں گے مگر درمیان میں لطیفے اور قصے بھی جاری رہیں گے۔ لڈن ماموں کبھی اکیلے نہیں رہتے تھے یار دوستوں اور شاگردوں کا مجمع لگا رہتا تھا اگر شعر و شاعری سے فرصت ہے تو شطرنج، پچیسی جاری ہے۔ اس کام سے فرصت ملی تو پتنگ بازی اور کبوتر بازی۔ ان کے پرانے گھر میں بہت سے کبوتر پلے ہوئے تھے۔ کبوتروں، مرغیوں اور کتوں کے بارے میں کافی معلومات رکھتے تھے۔ ایک دن میں نے پوچھا لڈن ماموں! آپ نے اس قدر کبوتر کیوں پال رکھے ہیں۔ کہنے لگے ان کے دم سے گھر کی تنہائی محسوس نہیں ہوتی، زندگی چلتی پھرتی محسوس ہوتی ہے۔

لڈن ماموں زندگی کی معمولی سے معمولی بات اور ہنگامے میں دلچسپی لیتے تھے اور اس سے اپنی شاعری کا مواد تیار کرتے تھے۔ فرد، سماج، عزیز اور دوست کسی کو شاعری کی

حیثیت سے نہیں بخشتے یا جہاں کوئی چار سو بیس قسم کی بات دیکھتے، اس کی شان میں 'قصیدہ' لکھ مارتے اور بہت تیز لکھ جاتے۔ دسہرہ، گنگا اشنان، مہترانی، نمائش وغیرہ نظمیں اسی سلسلے کی کڑیاں ہیں۔

لڈن ماموں نے کچھ دن ہوئے ایک غزل کہی تھی جس کا مقطع تھا:

میں تو چٹنی سے کھا رہا ہوں شادؔ
دال بٹتی ہے جیل خانے میں

یہ مقطع ان کی زندگی کی ترجمانی کرتا ہے مگر خدا کو رزاق ماننے کی وجہ سے دونوں وقت مزے سے کھاتے رہے، کون دیتا رہا، کہاں سے آتا رہا وہ جانے جو دونوں جہان کا رزاق ہے اور پتھر کے کیڑے کو بھی رزق پہنچاتا ہے۔

......☆......

www.urduchannel.in

بازگشت

(مشاہیرِ ادب کے تاثرات)

رشید احمد صدیقی

"شادؔ عارفی مرحوم فنِ شاعری اور زبان کے کتنے ہی ماہر رہے ہوں، وہ اس پائے کے شاعر یا نثر نگار نہ تھے۔ ان کے کلام میں بڑی نا آسودگی، شکست خوردگی اور بیزاری ملتی ہے۔ شاعروں کے ساتھ زندگی اور معاشرے نے اکثر اچھا سلوک نہیں کیا ہے لیکن جو اچھے اور بڑے شاعر تھے وہ ناموافق حالات سے اونچے ہو گئے اور زندگی و شعر و ادب کو بہت کچھ دے گئے لیکن جو معمولی تھے وہ صیدِ زبوں ہو کر رہ گئے۔ شادؔ طنز کی آڑ پکڑتے تھے، اس کا حوالہ دیتے یا واسطہ دلاتے، بار بار اسے پکارتے تھے لیکن وہ ان سے دور رہی۔ طنز و ظرافت کو اس طرح نہیں اپناتے۔ ساتھیوں میں بڑا ماننے اور پوچھے جانے کی بے پناہ خواہش نے جو پوری نہ ہوئی، ان کو زندگی کی اعلیٰ ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے اور نبرد آزما ہونے کے شرف سے محروم رکھا۔ شادؔ الفاظ و عبارت کی ہزار شیوگی سے واقف نہ تھے، اس لیے برت نہیں سکتے تھے۔ ان کے پاس کوئی ایسی بات کہنے کو نہ تھی جس سے ذوق اور ذہن دونوں حرکت میں آئیں۔ اچھے اور بڑے شاعر کا یہ مخصوص امتیاز ہے۔ شادؔ صرف کہہ دینے کو کافی سمجھتے تھے۔ یہ بھی کوئی معمولی درجہ نہیں ہے لیکن اس پر ہر شاعر کا پہنچنا آسان نہیں ہے۔

حنفی صاحب! محض شاعری اختیار کر لینے سے کوئی شاعر نہیں ہو جاتا۔ شاعر دراصل وہ ہے جس کو خود شاعری اپنے لیے انتخاب کرے جس کی طرف غالبؔ نے ایک جگہ بڑی بلاغت سے اشارہ کیا ہے۔ آپ ہی بتائیں ہمارے کتنے شعرا اس فامولے پر صحیح اترتے

ہیں۔ بہ ایں ہمہ شاعری کے عقبیٰ میں شادؔ کی نجات کے لیے ان کے اس طرح کے شعر کام دے جائیں گے۔ مثلاً:

ہمارے ہاں کی سیاست کا حال مت پوچھو
گھری ہوئی ہے طوائف تماش بینوں میں

....

میرے اٹھوائے جانے سے فرمایئے
کون سی وقعتِ سنگِ در ہو گئی

کاش وہ اس طرح کے شعر پان سات فیصد بھی کہہ سکے ہوتے۔

اردو میں اچھے شعر کہنا آسان نہیں ہے۔ یہ زبان ہونے کے علاوہ ایک اعلیٰ تہذیب طریقِ فکر اور اندازِ گفتگو بھی ہے، اسے کون کہاں سے لائے۔''

(مکتوب بنام: مظفرؔ حنفی)

مسعود حسین

''ہر زبان کی تاریخ ادب میں چند شاعر اور فنکار ایسے بھی ہوتے ہیں جن کی خود ان کے عہد میں دریافت یا بازیافت کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ وہ اپنے عہد کے تنقیدی شعور کو چونکاتے ہیں لیکن بوجوہ، شدت و کثرت سے اپنی جانب متوجہ نہیں کر پاتے تا آنکہ کوئی صاحبِ قلم ان کے شہ پاروں کے بکھرے ہوئے پھولوں کے ڈھیر ناقدین ادب کے سامنے نہ لگا دے۔ اس ''مرقدِ گل'' سے ان کی حیاتِ ثانیہ کا آغاز ہوتا ہے۔ ڈاکٹر مظفرؔ حنفی نے جو شادؔ عارفی کے عقیدت مندوں میں ہیں، اپنی تالیف ''ایک تھا شاعر'' اور تحقیقی مقالے کے ذریعے یہی اہم کام انجام دیا ہے۔

اہل نقد و نظر دیکھیں گے کہ ابھی چند دہے قبل ہمارے درمیان سے جو سخن ور خاموشی سے اٹھ گیا ہے اس کی شخصیت اور فن دونوں کس قدر تہہ دار تھے وہ تمام عمر ''دار السرور'' میں مقیم رہا لیکن اس کے نصیب میں لذتِ خمار بھی نہ آئی۔ وہ ہمیشہ مر مر کے جیا لیکن اپنی فنکارانہ انفرادیت کا سودا نہ کیا۔ نا مساعد حالات کے نیش کو اس نے فن کے ذریعے گوارا بنا

www.urduchannel.in

لیا۔ اس کی غیور و خوددار انفرادیت نے کبھی ان سے پیار کیا کبھی ان پر تلوار بن کر ٹوٹ پڑا لیکن ہار نہ مانی اور مانی تو اس طرح کہ اس کی شکست کی آواز گلبانگِ شعر بن گئی۔

مظفرؔ حنفی نے ایک ایسی ادبی شخصیت کو پھر سے تولا ہے جسے ناقد (رے) پاسنگ سمجھ بیٹھے تھے اور شعر و ادب کے ایک ایسے اسلوب سے روشناس کرایا ہے جو اس صدی کے تیسرے اور چوتھے دہے کا سب سے چونکا دینے والا اسلوب ہے۔ ایک ایسی ادبی شخصیت کے نقوش کو ابھارا ہے جو مجبور ہے لیکن مغلوب نہیں، اس لیے کہ وہ زمانے سے ہمدردی کی طالب نہیں۔''

(شادؔ عارفی: شخصیت اور فن)

نجم آفندی

''شاد عارفی صاحب کے کلام کا مطالعہ کرنے کے بعد مجھے اس امر کے اظہار میں کوئی تکلف نہیں ہے کہ موصوف ایک خوشگو شاعر تھے اور زبان و بیان پر کافی قدرت رکھتے تھے۔ غزل میں ان کا وہ انداز ہے جسے میں پسند کرتا ہوں محض عاشقانہ شاعری نہیں ہے۔ ان کے کلام میں مسائل بھی ہیں اور تمام قابلِ اعتراض سماجی اور سیاسی موشگافیوں پر کڑی تنقید بھی ہے۔ شعر کے لیے موضوع کی تلاش کا بھی بہت اچھا سلیقہ ہے۔ کہیں کہیں حکومت پر بھی تنقید نظر آتی ہے۔ بعض بعض ان کے اشعار مجھے بہت ہی پسند آئے ہیں۔

یقیناً اس دور کے اساتذہ میں ان کا شمار ہو سکتا ہے۔ بہر حال انھوں نے اردو ادب کی بہت خدمت کی ہے اور اردو زبان سے دلچسپی رکھنے والے حضرات کا فرض ہے کہ موصوف کی یاد قائم رکھنے میں حتی الامکان اعانت کریں۔'' (مکتوب بنام مظفرؔ حنفی)

فراق گورکھپوری

''میرے اس شعر پر:

وہ صورتیں الٰہی جو دل میں بس گئی تھیں
اب ان کے دیکھنے کو آنکھیں ترس رہی ہیں

شادؔ عارفی کو جو اعتراض ہے اس سے میں سو فی صدی متفق ہوں میں نے مندرجہ بالا شعر غزل باہر کیا اور اس کی جگہ مندرجہ ذیل شعر غزل میں شامل کر لیا ہے:

میں دیکھتا ہوں ان کو، کھلتا نہیں ہے پھر بھی
کیوں ان کے دیکھنے کو آنکھیں ترس رہی ہیں''

(پندرہ روزہ 'جوہر' رامپور)

سجاد ظہیر

''یقیناً شادؔ عارفی موجودہ دور کے اہم ترین ادیبوں میں سے تھے۔ یہ تم نے بہت اچھا کیا کہ ان کو مجموعہ شائع کیا اور جیسا کہ تم نے دیباچہ میں لکھا ہے، اب ضرورت اس کی ہے کہ ان کا مکمل کلام شائع ہو۔ میں نے شادؔ صاحب کے مجموعے میں سے نثری حصہ پڑھ ڈالا اور بہت لطف آیا، معلوم نہیں یہ کون ترقی پسند تھے جو خواہ مخواہ ان سے الجھ پڑے، میں اس مناقشے سے واقف نہیں تھا، بہر حال استادوں کو چھیڑ دینا عام طور پر مفید ہی ہوتا ہے ورنہ بھلا اتنی بہت سی معلومات (بہت سی چڑ چڑے پن کی باتوں کے ساتھ) کون فراہم کر سکتا تھا۔'' (مکتوب بنام مظفر حنفی)

فیض احمد فیضؔ

''میں شادؔ عارفی مرحوم کے کلام کا معترف ہوں اور ان سے رنجش کا کبھی کوئی قصہ نہیں ہوا۔ شادؔ صاحب کے فن کے بارے میں خوشی سے لکھتا لیکن ان دنوں بالکل سر کھجانے کی فرصت نہیں اور چند رسمی الفاظ میں بات کو ٹال دینے کو جی نہیں چاہتا، جب بھی ذرا فرصت ہوئی کچھ لکھنے کی کوشش کروں گا۔'' (مکتوب بنام مظفر حنفی)

عبد الماجد دریابادی

''میری بدقسمتی کہ میں مرحوم سے ان کی زندگی میں نہ واقف ہو سکا۔ ان کے جوہر تو بعض اہلِ نظر کے تعزیتی مضامین سے کھلے۔''

(مکتوب بنام مظفر حنفی)

www.urduchannel.in

نور الحسن ہاشمی

''شادؔ عارفی مرحوم کے کلام کی تیزی و طراری، شوخی و توانائی سے بہت محظوظ ہوا اور بہت افسوس ہوا کہ پہلے اس تیکھے شاعر کے کلام کی تلاش کیوں نہ کی۔ طنز کے اتنے بھرپور وار مسلسل اور دمادم لگاتے میں نے اور کسی کو نہیں دیکھا۔ قدیم اور جدید دونوں زمانوں کے ہتھیاروں سے مسلح اور پھر کتنی رعنائی اور برنائی کے ساتھ، سبحان اللہ۔ مصروفیتوں اور علالتوں کا چکر مجھے ناکارہ بنائے ہوئے ہے، شادؔ عارفی کا کلام ویسے بھی میرے یا کسی کے تعارف کا محتاج نہیں ہے۔ ہاں بہت خوش ہوں گا اگر آپ جیسے نوجوان اس ناقدری کی تلافی کرتے رہیں جس کے مرحوم شکار رہے۔ آپ ''ایک تھا شاعر'' کا دوسرا حصہ ضرور لکھیے، یہ بڑی ادبی خدمت ہوگی۔'' (مکتوب بنام مظفر حنفی)

وزیر آغا

''ہمارے شعراء مغرب کے مسموم اثرات کو نشانۂ طنز بناتے آئے ہیں تاہم اس طنز کا دائرہ کچھ زیادہ وسیع نہ ہو سکا اور اسی لیے جب دورِ جدید کے شعراء نے زندگی اور سماج کے چھپے ہوئے ناسوروں پر نشتر چلانے کا آغاز کیا تو ان کے طنز کی چبھن کو بڑی سختی سے محسوس کیا گیا۔ اس ضمن میں شادؔ عارفی ...... کی طنزیہ نظمیں قابلِ ذکر ہیں کہ ان میں زندگی اور سماج کی بیشتر مریضانہ کیفیتوں اور پنہاں ناہمواریوں کو ہدفِ طنز بنایا گیا ہے۔ شادؔ عارفی کی بیشتر نظمیں سماج کے مرکز 'گھر' کی بعض ناہمواریوں کو اجاگر کرتی ہیں۔''

(اردو ادب میں طنز و مزاح)

محمد حسن

''اس میں شک نہیں کہ شادؔ عارفی کا طنز گہرا اور مزاح صاف ستھرا ہے جس کی تلخی اور ترشی بھی پڑھنے والے کے دل کو چھوتی ہے اور فکر و احساس کے نئے زاویے بناتی گزر جاتی ہے اور یہ سرمایہ یقیناً مزاحیہ اور طنزیہ ادب میں اضافے کی حیثیت رکھتا ہے۔''

(سہ ماہی 'عصری ادب' دہلی)

ظ۔انصاری

''وہ جو سنجیدہ شاعری کرنے اور اپنا طرز آپ نکالنے کی جوکھم میں عمر بھر پڑے تھے ان میں جوشؔ ملیح آبادی اور شادؔ عارفی ۱۹۴۷ء کے بعد زہرناک طنز نگاری کے کام کے رہ گئے۔طنزیہ ادب کی کوئی تاریخ جوشؔ اور شادؔ عارفی کے نام اور کام کا جائزہ لیے بغیر پوری نہیں ہوسکتی۔جوش نے طنز کو جو طنطنہ عطا کیا وہ شاعری سے نثر میں بھی اتر آیا۔یہ دونوں تقریباً ہم عصر ہیں اور عام معنی میں نظریاتی ہم سفر بھی ہیں لیکن اپروچ میں ، لہجے میں، وسعتِ نظر اور شخصیت کے پھیلاؤ میں دونوں کے درمیان وہی فرق ہے جو دریائے کوسی اور گنگا میّا میں ہے۔

(شگوفہ، حیدرآباد۔طنز ومزاح نمبر)

قمر رئیس

''شادؔ عارفی مزاجاً ظریف نہیں طنز نگار ہیں۔ان کی تیکھی غزلوں میں سماج اور سیاست کے مریضانہ حقائق پر بڑی نازک اور لطیف چوٹیں ملتی ہیں۔گرد و پیش کی عفونت، عیّاری اور کھوکھلے پن سے ان کی برہمی اور بے زاری کا اظہار کبھی عوامی محاورہ اور پھکڑ پن میں ہوتا ہے اور کبھی ان کی شدتِ احساس، خیال انگیز ایمائیت کی قبا پہن لیتی ہے۔''

(’شاعر‘ بمبئی، ہم عصر ادب نمبر)

خلیق انجم

''شادؔ عارفی ایک ایسے شاعر کا نام ہے جس نے اردو شاعری کو نئے تیوروں اور انوکھے بانکپن سے آشنا کیا۔شادؔ صرف حسن و عشق کے شاعر نہیں تھے ان کی تہہ دار شخصیت نے اپنے عہد کے سیاسی، سماجی اور تہذیبی مسائل سے الجھنے کی کامیاب کوشش کی تھی۔''

(ہفت روزہ ’ہماری زبان‘ دہلی)

عرش ملسیانی

''شادعارفی اس عہد کے سب سے بڑے طنز نگار ہوئے ہیں ان کا طنز ادب و سیاست دونوں کو ہدفِ ملامت بناتا ہے۔

www.urduchannel.in

زندگی کی ناکامیوں، تلخیوں، نامرادیوں اور توہم پرستیوں پر اس طنز نگار نے وہ وار کیے ہیں کہ باید و شاید۔اس کا لہجہ اپنا ہے، انداز اپنا ہے، وہ یگانہؔ کی طرح اجتہاد کرتا ہے اور نادرہ کار ہے۔اردو ادب کی تاریخ میں اس شاعر کا نام ہمیشہ زندہ رہے گا۔یہ کم ظرف زمانہ جوہرِ صحیح کی قدر کرنا نہیں جانتا لیکن شہرت شعرم بہ گیتی بعدِ من خواہد شدن، کہنے والے غالبؔ کی صد سالہ برسی منائی ہی گئی۔بہ عرف عام عارفؔی عارفِ کامل تھا۔''

(اردو کی مزاحیہ شاعری)

نازشؔ پرتاب گڑھی

''مجھے یہ اعتراف کرنے میں کوئی حجاب نہیں کہ میں نے مرحوم کے کلام سے کافی استفادہ کیا ہے اور یہی وجہ ہے کہ غیر شعوری طور پر میرے یہاں بھی کبھی کبھی مرحوم کا خصوصی اندازِ بیان آجاتا ہے، اور وہی طنز اور تیکھا پن ملنے لگتا ہے جو مرحوم کے لیے مخصوص تھا۔زندگی نے وفا کی تو آئندہ کسی موقع پر مرحوم سے متعلق اپنے تاثرات اور مشاہدات قلمبند کروں گا۔''

(مکتوب بنام مظفر حنفی)

وارث کرمانی

''آزادی کے بعد ناسخؔ اور غالبؔ کی ڈھالی ہوئی غزل کو جو آواز سب سے پہلے کاٹتی ہوئی ابھرتی ہے وہ شادؔ عارفی کی ہے۔شادؔ کی تلخ نوائی، بے باکی اور نشتریت نے اصغرؔ وغیرہ کی پاک دامن اور مہذب غزلوں کا بھاؤ گرا کر اپنے اثر سے لوگوں کو چونکا دیا اور انھیں سماجی اور سیاسی حقائق کی ناہموار زمین پر کھڑا کر دیا جہاں سے انسان کی فطرت کے تاریک گوشے صاف نظر آتے تھے۔''

(سہ ماہی ’سطور‘ دہلی)

رضا نقوی واہیؔ

''شاد عارفی کے کلام کا میں ہمیشہ قدرداں رہا۔ان کا اچھوتا اسلوب، ان کا بے باک قلم اور دوٹوک باتیں کہنے کا منفرد انداز، ان کی طنازی، سبھی دل و جان سے مجھے پسند ہیں۔لیکن آپ کی یہ فرمائش کہ میں ان کے فن پر کوئی مضمون لکھوں میرے بس سے

باہر کی بات ہے اس لیے شاؔد عارفی کے کلام کو تختۂ مشق بنانا بڑی بے ادبی ہوگی۔ البتہ اختر اور ینوی صاحب سے تقاضہ کرتا رہوں گا۔ (مکتوب بنام مظفؔر حنفی)

قاضی سلیم

شاؔد عارفی کی شاعری کو میں پسند کرتا رہا ہوں خاص طور پر لہجہ کا تیکھا پن ان کے ساتھ ہی ختم ہوگیا۔ آپ نے اس لہجہ کو آگے بڑھایا ہے یہ میں جانتا ہوں۔''

(مکتوب بنام مظفؔر حنفی)

مہدی نظمی

''شاؔد عارفی مرحوم میرے بہت قریبی دوست رہے ہیں اس لیے میں نے انھیں قریب سے دیکھا ہے۔ معلوم ہوا کہ مظفؔر حنفی صاحب ''ایک تھا شاعر'' کا اب دوسرا اڈیشن ''شخصیت نمبر'' نکال رہے ہیں۔ میں بھوپال کے اس جواں سال و جواں فکر شاعر کو خراجِ عقیدت پیش کرتا ہوں کہ انھوں نے اس عظیم شاعر کو پھر سے زندہ کر دیا۔ مجھے کہنے دیجیے کہ مرحوم اپنی زندگی میں بہت سیدھے سادے اور پکے مسلمان تھے۔ بات کے پکے، بڑے وضع دار تھے۔ جذباتی ہونے کے ساتھ ساتھ دل کے بڑے صاف تھے۔ روہیلا تہذیب اور کلچرل روایات Traditions کا جیتا جاگتا نمونہ تھے۔ جن تہذیبی اقدار میں انھوں نے اپنی زندگی گزاری ان اقدار کی عکاسی ان کی شاعری میں بھی ملتی ہے۔ وہ اپنی زندگی میں جتنے رجعت پسند تھے اتنے ہی جدید رجحانات سے متاثر بھی۔ وہ مغرب کے طرزِ فکر اور علوم وفنون کی تحصیل کے خلاف نہیں تھے بلکہ وہ یہ چاہتے تھے کہ ہم اپنی روایات کے ساتھ ان مغربی روایات کی جو ہمارے لیے اچھی ہوں تقلید کریں۔ انھوں نے اپنی شخصیت اور شاعری میں دوسری تہذیبوں کے صالح عنصر کو سمویا۔ ان اخلاقی اقدار پر عمل کرنے کا منطقی نتیجہ تھا کہ ان کے یہاں سماجی طنز پیدا ہوا۔ ان کی شاعری ان کی عملی زندگی کی عکاسی کرتی ہے۔ ان کے آرٹ اور شخصیت میں نقاد کو کہیں تضاد نہیں ملے گا جس کی وجہ سے ان کی

www.urduchannel.in

شاعری تنقیدِ حیات کا درجہ رکھتی ہے۔ افسوس ایسی شخصیتیں جن کا ظاہر و باطن ایک ہو، اب کہاں پیدا ہوتی ہیں۔ (مکتوب بنام مظفؔر حنفی)

خواجہ عبد الغفور

''کہنہ مشق طنز نگار، تیغ و خنجر کی چبھن، شعلہ اور آگ کی لپک و تپش، سماج پر بھرپور وار کیے ہیں انھیں بھی غالؔب کی طرح آبا و اجداد کے پیشۂ سپہ گری پر ناز ہے اسی لیے زبان و اسلوب میں تیغِ جوہر دار کا طنز ملتا ہے۔ مدِ مقابل پر بے حجابانہ وار کرتے ہیں۔ اپنے ماحول اور کج روی، کمزوری، نا اہلی، بے اعتدالی کو طنز کا نشانہ بناتے ہیں۔''

(طنز و مزاح کا تنقیدی جائزہ)

بشیؔر بدر

''شاؔد عارفی نے ہر قسم کی شاعری کی لیکن ۱۹۴۷ء کے بعد ان کے کلام نے متوجہ کیا۔ ان کی غزلوں کے اچھے اشعار ہندوستان میں اقلیت کے احساسات کے اس اجتماعی رویے کا جذباتی اظہار ہیں جو اکثریت کے مظالم، کینہ، سیاست، خود غرضی اور قول و فعل کے تضاد پر شمشیرِ بے نیام ہے۔'' (ہفتہ وار ''مورچہ'' گیا)

احتشام اختر

''یگانہ کے ہاں جو جھلاہٹ اور چڑچڑا پن ہے وہ شاؔد عارفی کے ہاں نہیں ہے لیکن شاؔد کے ہاں کارٹون بنانے کا انداز نمایاں ہے۔ ان کا طنزیہ لہجہ سیاست کو بھی اپنا ہدف بناتا ہے۔ چنانچہ سیاسی ہجو نگاری بھی شاؔد کے ہاں ملتی ہے۔ اس کا اثر جدید غزل پر بھی ہوا ہے۔''

(ہفت روزہ ''مورچہ'' گیا)

بشؔر نواز

شاؔد کے بے ساختہ طرزِ اظہار، غیر رسمی الفاظ کے مناسب استعمال اور طنزیہ انداز نے اپنے مخصوص دائرے میں نئی غزل پر کافی اثرات مرتب کیے...... آج کی غزل پر گزشتہ

ادوار کے مختلف شعرا کا کسی نہ کسی حد تک اثر پڑنا لازمی تھا جو پڑا البتہ ماضی قریب کے شعرا فراقؔ، یگانہؔ اور شادؔ عارفی کی پرچھائیاں زیادہ نمایاں نظر آتی ہیں۔

(ارتکاز)

کرامت علی کرامت

''شادؔ عارفی کو اس امر کا احساس تھا کہ ''حقیقتوں کی تلخیوں کے ساتھ شاد عارفی = لطافتِ بیانِ واقعہ غزل کی جان ہے''۔ لہٰذا محض طنز آمیز جارحیت شاعرانہ طرزِ عمل نہیں ہو سکتی بلکہ جو منتشر جذبات اس جارحیت کے موجب ہوتے ہیں، ضبط و تحمل کے ذریعے ان کی ہم آہنگی اور ہم وزنی ہی صحیح شاعرانہ ردِّ عمل کہلا سکتی ہے۔

(سہ ماہی ''شاخسار'' کٹک)

عبدالمغنی

''جو لوگ شادؔ عارفی مرحوم سے واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ موصوف کی غزلوں میں ایک خاص قسم کا تیکھا پن تھا جس کو انفرادی اکھڑ پن کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا اور موصوف کی شاعری کی خصوصیت ان کا یہی اکھڑ لہجہ تھا۔ اس لہجے کے اوصاف میں بے تکلفی، بے ساختگی، ٹھیٹ پن، بے پروا قسم کی بات چیت، کھرا پن اور کچھ اکھڑی اکھڑی کیفیت کے عناصر تھے۔'' (ماہنامہ ''مریخ'' پٹنہ)

مخمور سعیدی

''شادؔ عارفی اردو کے ان گنتی کے چند شاعروں میں ہیں جو اپنے انفرادی خدوخال کی بدولت ہر ہجوم میں بہ آسانی پہچانے جا سکتے ہیں۔'' (ماہنامہ ''تحریک'' دہلی)

گوپی چند نارنگ

''شاد عارفی کی واقعیت اور خارجیت مظفرؔ حنفی کے یہاں داخلی لَے میں بدل گئی ہے۔ (طلسمِ حرف)

www.urduchannel.in

امتیاز علی عرشی: ''شادؔ صاحب کو قدرداں نہیں ملے اکثر بڑے فن کاروں کے ساتھ یہی پیش آیا ہے، مگر اس محرومی نے ان کے فن کو اور بھی نکھار دیا۔ وہ اپنے لہجے اور موضوعات کے لحاظ سے اگر آج نہیں تو کل اپنے آپ کو منوا کر رہیں گے۔'' (مقدمہ 'ایک تھا شاعر')

گیان چند جین: ''ان کے تیور یاس یگانہ کی یاد دلاتے ہیں لیکن ان کا دامن یگانہؔ سے زیادہ وسیع ہے گو غزل کی پختگی اور رچاؤ میں وہ یاسؔ سے کم رہ جاتے ہیں۔ شادؔ کا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے غزل سے دورِ حاضر پر بھرپور طنز کا کام لیا۔ ان کے بعد یہ نہیں کہا جا سکتا کہ

بقدرِ ذوق نہیں ظرف تنگ نائے غزل
کچھ اور چاہیے وسعت مرے بیاں کے لیے

اور اسی محدود حصار کے اندر وہ ایسی گونا گوں اور نو بہ نو گلکاریاں کرتے ہیں کہ حیرانی چونک کر رہ جاتی ہے۔'' (عہدِ حاضر کا نقاد)

احمد ندیم قاسمی: ''شادؔ عارفی مرحوم اردو غزل اور نظم میں جذبے کی شدت اور طنز کی تیزی کی واحد مثال تھے اور ایک ایسی انفرادیت کے مالک تھے جو مدتوں کے فنی ریاض کے بعد ہی حاصل ہو سکتی ہے۔''

(شادؔ مرحوم، فنون)

سلام مچھلی شہری: ''مجھے جس چیز نے سب سے زیادہ متاثر کیا وہ ان کی نظموں کی ڈرامائی ٹیکنیک تھی۔ کبھی کبھی تو مجھے یہ محسوس ہوا گویا یہ نظمیں ایک طویل ڈرامے کے مختلف مناظر ہوں۔ ان مناظر میں ایک طرح کی داخلی وحدت ہے۔ اپنے چھوٹے سے معاشرے کو انھوں نے جس طرح سمجھا

ہے اور اسے جو عمومیت بخشی ہے وہ انھیں کا حصہ ہے نہ جانے کیوں جب میں شاؔد صاحب کو رامپور کے سیاسی اور تہذیبی پس منظر میں رکھ کر دیکھتا ہوں تو مجھے فرانس کے مشہور طنز نگار والٹیئر کا خیال آتا ہے جس نے فرانس کی انحطاط زدہ شہنشاہی تہذیب پر تازیانے لگائے تھے۔''

(ایسے لوگ کہاں)

راہی معصوم رضا: ''شاد عارفی کی گمنامی جگر کی شہرت سے زیادہ بڑا اور ہولناک ادبی حادثہ ہے۔ آواز پر جان دینے والوں نے یہ بھی نہ دیکھا کہ شاؔد عارفی کی آواز میں کس بلا کا بانکپن ہے۔''

(ایسے لوگ کہاں ملتے ہیں)

صہبا لکھنوی: ''شاؔد عارفی بڑے البیلے خوددار اور نڈر شاعر تھے۔ سماج کے ناسوروں پر طنز و نشتر زنی ان کی شاعری کا سب سے نمایاں اور منفرد پہلو ہے۔ وہ اپنی طرز کے موجد تھے جو ان کے ساتھ ہی ختم ہوگئی۔ اردو شاعری کے کسی بھی انتخاب میں شاد عارفی کو نظر انداز کرنا ممکن نہیں۔''

(صاحبِ طرز شاعر)

ابر احسنی گنوری: ''وہ جب شاعری میں بات کرنے پر آتے تو اس کی پروا کبھی نہ کرتے کہ میرا مقابل کن طاقتوں اور اختیار کا مالک ہے جو کچھ کہنا ہوتا صاف صاف کہتے اور ایسی تیز کہتے کہ اس کے دل میں ناسور ڈال دے جو کبھی اچھا نہیں ہوا کرتا ہے اور پھر اس کے تلخ نتائج کو وہ ہمیشہ خندہ پیشانی سے برداشت کرتے۔ ان کی لغت میں مصلحت و مروت کے الفاظ نہیں تھے۔'' (فنکار)

شفا گوالیاری: ''اساتذہ و مصلحین کے بعد والے اس دور میں حضرتِ شاؔد عارفی کا دم

www.urduchannel.in

بہت غنیمت تھا وہ فطری اور بلند شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ نہایت باشعور و باخبر اور نکتہ سنج و نکتہ رس مصلحِ شعر بھی تھے اور بزرگوں کی امانتِ اصلاح کو بڑی مستعدی سے سنبھالے ہوئے تھے۔ خود تو صحیح تھے ہی لیکن ماہرِ فن ہونے کی وجہ سے اصلاح کے جوہر بھی بہت چمک دار تھے۔'' (اصلاحِ شاؔد)

شفق رام پوری: ''شاؔد مرحوم فطرت سے شاعر پیدا ہوئے تھے۔ مزاج میں شوخی قدرتی تھی وہ جو کہتے تھے مجھے دکھا لیتے تھے۔ میں کہیں کہیں مشورہ دیا کرتا تھا وہ خود کو شاگرد اور مجھے استاد مان کر جنت میں آرام فرما ہیں اور میں شرمندہ ہوں۔ مرحوم جہاں تھے میں اب بھی وہاں نہیں ہوں۔ اب یہ صحیح ہے کہ شاؔد استاد اور میں شاگرد۔'' (شاگرد اور استاد)

کوثر چاند پوری: ''طنز شاد کی نظم و غزل دونوں پر چھایا ہوا ہے۔ یہ ان کی شخصیت کا حصہ بن چکا ہے۔ ان کی تصویر دیکھنے سے ہی معلوم ہوتا ہے کہ وہ خود ایک مجسم طنز ہیں۔ ان کے نقوش سے ظاہر ہے وہ اندر سے باہر تک رستی ہوئی ایک جراحت اور شب و روز جلتی ہوئی ایک شمع ہیں۔ ان کا ہر غم اور ہر زخم چہرے سے عیاں ہے۔'' (ایک منفرد طنز نگار)

مظہر امام: ''مجھے منصبِ پیغمبری کی ہوس نہیں لیکن ادب میں پیشین گوئی کو کچھ اتنا معیوب بھی نہیں سمجھا جاتا۔ مجھے محسوس ہوتا ہے کہ ہماری نئی نسل نے جس طرح راندۂ درگاہِ سخن یگاؔنہ کو پھر سے کرسیِ منزلت پیش کی اسی طرح شاد عارفی کو مسندِ عظمت پر لا بٹھائے گی۔ شاؔد عارفی کا فن جدید نسل کے احساس اور طرزِ احساس سے زیادہ قریب ہے۔''

(شاؔد عارفی کی شاعری کا انفرادی پہلو)

حرمت الاکرام: ''شادؔ نے غزل کی دنیا میں جس طرح اپنے لیے ایک علاحدہ ڈگر بنائی اسی طرح اپنی شاعری کے لیے ایک 'زبان' بھی وضع کی۔ ترکیبوں اور محاوروں کو اپنی مرضی اور ضرورت کے مطابق نیا پیرہن دیا، استعاروں، تلمیحوں اور کنایوں کو نئے معانی دیے۔''

(شادؔ عارفی کی غزل)

شہرت بخاری: ''خصوصاً ان کی وہ شاعری جو انھوں نے آزادی کے بعد کی، بڑی مشکل بات معلوم ہوتی ہے کہ ہندوستان میں مقیم ایک مسلمان اس بیدردی کے ساتھ حکومتِ وقت، اس کی انتظامیہ اور مسلمان اقلیت کی بے بسی پر تنقید کرے......ایک بات کا احساس یقیناً ہوتا ہے کہ شادؔ عارفی اس کرب و بلا کے زمانے میں سب سے نڈر اور جرأت مند شاعر ہے۔''

(شادؔ عارفی)

عمیق حنفی: ''شادؔ عارفی رامپور کی روایت پسند مٹی سے برق غضب ناک بن کر اٹھے اور آسمانِ سخن کے دامن کو بجلیوں سے بھر گئے۔ میں نے جب اردو شاعری کا مطالعہ سنجیدگی اور سوجھ بوجھ کے ساتھ شروع کیا تو یگانؔہ اور شادؔ عارفی ہی نے مجھے اردو شاعری بالخصوص غزل کی شاعری میں جدّت، بغاوت، تجربے اور ندرت کے امکانات کا قائل کیا اور وہ غزل جو کوٹھوں اور خانقاہوں، درباروں اور بازاروں کی رونق تھی۔ پہلی بار ایک گھریلو مگر سوشل، زندہ دل حاضر دماغ، حاضر جواب، ذی فہم، ذی علم، ذہین اور باشعور خاتون نظر آئی۔''

(ایسے لوگ کہاں ہوتے ہیں)

سلیمان اریبؔ: ''شادؔ عارفی بڑے خودسر، خوددار، محبِ وطن، انسانیت دوست، مخلص

www.urduchannel.in

مجتہد اور مجاہد قسم کے شاعر تھے ایک منفرد رنگ اور تیکھے اسٹائل اور دلکش شخصیت کے مالک۔ ان کی طنز نگاری اردو شاعری میں ہمیشہ زندہ رہے گی۔

(حق مغفرت کرے)

نداؔ فاضلی: ''میکسم گورکی کی مانند شادؔ کی سوچ اپنے پیروں سے دھرتی پر چلی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے ماتھے پر سلوٹوں کے ساتھ ہونٹوں پر مسکراہٹ بھی ہے۔ ماتھے کی سلوٹیں تو یگانہ چنگیزی کے یہاں بھی اپنے پورے تیکھے پن کے ساتھ نمایاں ہیں، مگر ان سلوٹوں سے کبھی کبھی چہرے کے خطوط بگڑتے نظر آتے ہیں۔''

(ایک نئی آواز)

احمد جمال پاشاؔ: ''شادؔ عارفی کی موت ایک عہد کی موت ہے اس عہد کی موت جس میں یہ پیر طناز وقتی مصالح سے بے نیاز ہو کر نہ صرف بڑی بے باکی کے ساتھ اپنا مافی الضمیر ادا کرتا رہا بلکہ فکر پر طنز کے تازیانے لگانے کے لیے اکثر جارحانہ تنقید کی حدود سے بھی گزر جاتا تھا۔ اس شاعرِ زہر خند کی شاعری کا عرصہ ہماری معاشرتی زندگی کی نصف صدی کے طول و عرض میں پھیلا ہوا ہے۔''

(شاد عارفی)

فضل تابشؔ: ''شادؔ عارفی نے طنز کے ساتھ مزاح کو شامل نہیں کیا اور یہ بات غالباً ان کے باطن کی پاکیزگی پر مبنی ہے اور باطن کی یہ پاکیزگی ان میں شعوری ہے جسے انھوں نے مستقل مشاہدے سے حاصل کیا ہے وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ ہنسانے والی باتوں سے بُرائی کے اظہار میں شدت باقی نہیں رہتی۔ اسی لیے وہ سیدھے سیدھے بقول نیازؔ فتح پوری کیل کے سر پر کاری چوٹ مارتے تھے۔''

(شادؔ کا نفسیاتی تجزیہ)

شمیم احمد: ''شاؔد عارفی اپنے منفرد لہجے کی وجہ سے قاری کی توجہ کا مرکز بن جاتے ہیں لیکن اس کے ساتھ ہی ان پر اس لیے بھی نظر ٹھہرتی ہے کہ وہ شعر کہنے کے مقاصد سے بھی شعوری طور پر واقف ہیں اور اپنا صالح شاعرانہ مسلک رکھتے ہیں۔ یہ بات کسی شاعر میں اسی وقت آتی ہے جب کہ وہ زندگی کا واضح شعور رکھتا ہو اور سماجی اور تاریخی قدروں سے بخوبی واقف ہو۔ شاؔد عارفی کے کلام میں ان خصوصیات کا عملی ثبوت بھی ملتا ہے۔''

(شاؔد عارفی کا شاعرانہ مسلک)

ظفر ادیبؔ: ''شاؔد عارفی کے یہاں جو جھلاہٹ محسوس ہوتی ہے وہ درحقیقت حق گوئی پر اور زیادہ زور دینے کی ایک صورت ہے وہ کسی قسم کے شکست کے اعتراف کی پرچھائیاں نہیں۔ اسے ناکامیوں کے انتقام کا نام بھی نہیں دینا چاہیے۔''

(ظفر ادیب)

فرقتؔ کاکوروی: ''جہاں تک شاؔد عارفی کی شاعرانہ عظمتوں کا تعلق ہے آپ مجھے معاف کریں اگر میں یہ کہوں کہ انھوں نے اس دور میں پیدا ہو کر خود اپنے پیروں پر آپ کلہاڑی ماری ورنہ کیا حرج تھا اگر وہ کسی ایسے دور میں پیدا ہوئے ہوتے جب شاد عارفی جیسے باکمال شعرا کے ایک ایک مصرع پر ہیرے اور جواہرات سے ان کا منہ بھر دیا جاتا تھا۔''

(شاؔد عارفی کے بارے میں)

مسعود اشعر: ''نواب صاحب نے خاص ''باغ پیلیس'' میں شاعری کی نشست کی۔ شاؔد صاحب اگرچہ وہاں نہیں جاتے تھے لیکن شاید نواب صاحب اس زمانے میں ان کی شہرت کی وجہ سے ان سے خوش تھے یا پھر مصاحبوں نے سفارش کی اور شاد صاحب کو بھی یار لوگ پکڑ لے گئے (غالباً اس

www.urduchannel.in

زمانے میں جوشؔ صاحب بھی رامپور آ گئے تھے اور نواب صاحب کے یہاں مقیم تھے) شاؔد نے وہاں جس قسم کی نظمیں سنائیں اس کے بعد پھر کسی کو یہ جرأت نہیں ہوئی کہ شاؔد صاحب کو شاد باغ لے جاتا!''

(کٹی پتنگ)

شمیم حنفی: ''والٹئیر نے تخلیقی فنکار میں جاہلیت کو ضروری قرار دیا ہے جس سے اپنی انا کے احساس سے سرشار ہو کر منظور شدہ کلیوں کو ٹھکرا سکنے کی ہمت مراد ہے یا پاؤنڈ کے بیان کے مطابق وہ پھکڑ پن جو سنجیدہ مسائل کو پرکاہ کی طرح اُڑا دیتا ہے، ان باتوں کی شاؔد عارفی میں کمی نہیں ہے۔''

شمس الرحمٰن فاروقی: ''شاد کے بارے میں یہ کہنا تو آسان ہے کہ وہ طنز کے بادشاہ تھے اور ان جیسا بیباک، دراک اور روشن طبع طنز نگار ہمارے زمانے میں کوئی نہ ہوا۔ شاؔد صاحب کے بارے میں یہ کہنا بھی آسان ہے کہ وہ جدید غزل کے بنیاد گزاروں میں تھے۔ شاؔد عارفی نہ ہوتے تو ہمارے کئی معتبر غزل گویوں کو اپنے لیے کوئی ایسا نمونہ دستیاب نہ ہوتا جو انھیں جدید زندگی کے تقاضوں اور نئے زمانے کے حالت پر غزل کی زبان میں طنزیہ اظہار کی راہیں دکھاتا۔ لیکن اتنا کہہ دینے سے شاد صاحب کا حق نہیں ادا ہوتا، اور شاد صاحب ہی نہیں، جدید اردو ادب کا بھی حق نہیں ادا ہوتا۔ شاؔد کی تمام زندگی محرومی اور تنگی اور عسرت سے عبارت تھی، لیکن ان کے کلام میں وہ زور ہے جسے 'مردانہ پن' کہیں تو غلط نہ ہوگا۔ ہمارے یہاں زندگی اور شاعری میں تسویہ ڈھونڈنے یا شاعری کو زندگی کا مرقع کہہ دینے کی روایت اب بھی عام ہے۔ اصولی طور پر تو یہ

بات غلط ہے ہی، لیکن عملی طور پر شاد عارفی نے اسے سچ کر دکھایا۔ اور بڑی بات یہ ہے کہ زندگی کی محرومیوں کا ذکر یا زندگی کی ناانصافیوں کا شکوہ ان کے خطوط میں ملتا ہو تو ملتا ہو، لیکن ان کے کلام میں ان باتوں کا کہیں پتہ نہیں۔

غزل ہو یا نظم، شاد عارفی کی پہچان قادر الکلامی اور بے ساختگی تھی۔ نظم میں بیانیہ پر ان کو بے مثال مہارت حاصل تھی۔ نثر میں ان کے انداز ویسے ہی جھگڑیلے اور چڑچڑے تھے جیسے کہ شعر میں تھے، لیکن شعر میں کوئی بات اور تھی، کچھ ایسی بات کہ ان کے چڑچڑے پن میں یگانہ جیسی تلخی نہیں، میر جیسی تجربہ ناکی اور دنیا اور اہلِ دنیا کے لیے ایک درویشانہ تحقیر تھی۔ غزل کو عاشق معشوق کے کلی پھندنوں سے آزاد کرانا اور پھر بھی اسے غزل بنائے رکھنا، نظم میں مکالمہ، بیانیہ، موعظت کو اس بے تکلفی سے برتنا کہ وہ مثنوی معلوم ہو، یہ ان کے بڑے کارنامے تھے۔ کاش کہ آج کے شعرا بھی شاد عارفی سے اسی طرح اکتساب فیض کر سکتے جس طرح گزشتہ نسل کے شعرا نے کیا تھا۔

(کلیاتِ شاد عارفی)

......☆......

ڈاکٹر رؤف خیر

ناشاد......شاد عارفی

شاد عارفی کا معاملہ یہ رہا کہ وہ بہت کم کسی سے خوش تھے جواباً بہت کم لوگ ان سے خوش تھے۔ وہ زندگی سے شکوہ سنج تھے، کئی شعراء کے بارے میں اچھی رائے نہیں رکھتے تھے۔ رام پور کی شخصی حکومت کے خلاف تھے اور سرکاری حکومت سے بھی نالاں تھے۔

شاد عارفی اپنی دردناک زندگی کے بارے میں اپنے ایک خط میں رقم طراز ہیں:

''اس وقت میری عمر باسٹھ سال ہے۔ ۱۹۰۰ء میری پیدائش ہے اس لیے سن کے ساتھ ساتھ چل رہا ہوں۔ بھارت کی حکومت کے دس مہینے کے بعد ملازمت سے مستعفی ہونا پڑا۔ جب سے بے نوکری، بے سہارا ہوں مگر اس مدت میں میرا پراویڈنٹ فنڈ حکومت نے اب تک نہیں دیا ہے بلکہ حال ہی میں اکاؤنٹنٹ جنرل (AG) الٰہ آباد نے بہت غل غپاڑے کے بعد بڑا معقول جواب دیا ہے کہ چونکہ تمھارے حسابات کے رجسٹر کھو گئے اس لیے تمھارا فنڈ بحق سرکار ضبط کیا جاتا ہے۔ اس لیے صبر کرو اور بھارت کی حکومت کو اس کی درازیِ عمر کی دعائیں دو۔ والدہ صاحبہ کی پنشن بھی بھارت سرکار نے بلاسبب بند کر دی۔ یہ پنشن ریاست لوہارو سے تھی۔ متواتر درخواستیں دیں مگر کوئی شنوائی نہ ہوئی اور وہ انتظار کرتے کرتے راہیِ بقا ہو گئیں۔ میں نے گھر بیچ کر مرحومہ کی تجہیز و تکفین کی۔ جس کا نتیجہ

www.urduchannel.in

آج تک بھگت رہا ہوں اور شہر کے اندر کرائے کے مکانوں میں خانہ
بدوش زندگی گزار رہا ہوں''۔ (ایک تھا شاعر)

اوران کرائے کے مکانوں کا حال بھی میؔر و غالب کے مکانوں جیسا ہے کہ مینہ ایک گھنٹہ برستا ہے تو چھت دس گھنٹے ٹپکتی رہتی ہے۔شاؔد عارفی نے اپنے گھر کا نقشہ کھینچا ہے:

باہر برکھا بیت چکی ہے اندر ٹپکا لگا ہوا ہے
آدھے بستر پر لیٹا ہوں، آدھا بستر بھیگ چکا ہے

یہ سارے مسائل کچھ اس لیے تھے کہ قسمت ان پر مہربان نہیں تھی اور کچھ ان کا اپنا مزاج بھی ایسا تھا کہ وہ کسی قسم کی مصلحت یا مصالحت کے قائل ہی نہیں تھے۔ نہ اپنے ہم عصروں کے بارے میں اچھی رائے رکھتے تھے، نہ احباب ہی سے خوش تھے۔ ہم عصر شاعروں کے کلام میں کیڑے نکالتے تھے۔ وہ لکھتے ہیں:

''ماہر القادری...... نیاز فتح پوری کی طرح دوسروں کی آنکھوں میں پھانس دیکھنا پسند نہیں کرتے مگر اپنے بانس بھی نظر انداز کر جاتے ہیں۔ روش صدیقی اور عدم تو ٹھیک ہیں مگر نشور واحدی اور جذبی دونوں کافی غلط ہیں۔ ان کے اندازِ کلام سے بچو! شکیل اچھا ہے مجروؔح بھی اس کو نہیں پہنچتا''......

غالباً اپنی خاطر خواہ پذیرائی نہ پا کر وہ مقبول و معتبر شاعروں اور ادیبوں پر حرف رکھتے ہیں۔ کبھی کبھی تو وہ اس معاملے میں حد سے گزر جاتے ہیں۔ خلیل الرحمٰن اعظمی کی بڑی خواہش تھی کہ شاؔد عارفی کا کلام کتابی صورت اختیار کر جائے۔ اور انھوں نے ان کے کلام کا انتخاب کرنے کی پیش کش بھی کی تھی کیوں کہ شاؔد عارفی کا اپنا انتخاب کردہ مسودہ پبلشر نے رد کر دیا تھا۔ خلیل الرحمٰن اعظمی اس طرح حقِ شاگردی ادا کرنا چاہتے تھے۔ ایسے مخلص شاگرد کی ایک نظم ''ماہ نامہ صبا'' (حیدر آباد) میں شائع ہوئی تھی جس کے ایک بند پر شاؔد عارفی نے سخت تبصرہ کر دیا۔ ملاحظہ فرمائیے:

''خلیل الرحمٰن اعظمی کی شاعری آج کل بڑی تیز ہے۔ بے چارے نے

www.urduchannel.in

تخیلی پرواز پر ''صبا'' حیدر آباد میں ایک نظم سہاگ رات کے عنوان سے لکھی ہے۔ کہتا ہے:

نازکر ناز کر اے جان کہ تیرے آگے
آج اک شاعر خود کام کا سر جھکتا ہے
پیروِ مسلکِ خیام کا سر جھکتا ہے

وہی ذہنی عیاشی اور یہ ''جان'' کا مصرف بھی عجیب مضحکہ ہو کر رہ گیا ہے۔''

(ایک تھا شاعر)

خلیل الرحمٰن اعظمی نے لکھا ہے کہ وہ ان کی اصلاح من و عن قبول نہیں کرتے تھے بلکہ بعض اوقات اصلاح کے غیر ضروری ہونے کو ثابت کر کے نا قابلِ قبول ٹھہراتے ہوئے اپنے الفاظ جوں کے توں رکھ لیا کرتے تھے۔ پتہ نہیں اصلاح کے معاملے میں ڈاکٹر مظفر حنفی کا رویہ کیا تھا۔

شاؔد عارفی کا کوئی قابلِ ذکر مجموعہ کلام ان کی زندگی میں شائع نہ ہو سکا البتہ چند منتخب تخلیقات پر مبنی کچھ کتابچے ضرور شائع ہوئے جیسے انجمن ترقی اردو دہلی کے زیر اہتمام انتخاب شاؔد عارفی (۱۹۵۶ء) اور عابد رضا بیدار کا مرتبہ کتابچہ ''شاؔد'' (۱۹۶۲ء)۔ ان کی وفات کے بعد سلطان اشرف نے ۱۹۶۵ء میں ''سفینہ چاہیے'' کے نام سے اور ان کے شاگرد ڈاکٹر مظفر حنفی نے ''نثر و غزلدستہ'' (۱۹۶۷ء)، ''شوخیِ تحریر'' (۱۹۷۱ء) اور ''کلیات شاد عارفی'' (۱۹۷۵ء) شائع کیں اور ان پر پی ایچ۔ ڈی بھی کی۔

شاؔد عارفی زندگی بھر اپنی قسمت کو کوستے رہے، شکوہ و شکایت میں زندگی کاٹتے رہے وہ حکومت کے بھی شاکی تھے۔ رام پور کے شاعروں کے علاوہ ایک غیر مسلم استاد شاعر ابر حسنی گنوری (بہائی) کے بارے میں بھی وہ اچھی رائے نہیں رکھتے تھے۔ مدیر ''نقوش'' محمد طفیل (لاہور) کے نام اپنے ایک خط مؤرخہ ۲۴ر نومبر ۱۹۶۲ء کو اپنے لیے ایک تفصیلی تعارف کے مضمون کی گزارش کرتے ہوئے مذکورہ شاعروں کی پول کھولنے کا مطالبہ بھی کرتے ہیں لکھتے ہیں:

''امید ہے آپ مجھے مایوس نہیں کریں گے۔ ہو سکے تو اپنے تعارف میں

ان مخالفینِ ادب کی ضرور خبر لیں جو در پردہ ادب کے کاز کو ذاتی رنگ کے پرچار میں نقصان پہنچا رہے ہیں۔ رقیب، عدو، پنجرہ، آشیانہ اور شیخ پر غزلیں تھوپ تھوپ کر ادبی فضا کو مکدر بنائے ہوئے ہیں اور سب سے بڑی خرابی یہ کہ نوجوانوں کو گمراہ ادب بنا رہے ہیں۔ بے ڈھنگی عشقیہ شاعری ان کا اوڑھنا بچھونا ہے۔ ان گرو حضرات کے نام بھی لکھ دوں۔ ابراحسنی گنوری، رشید، مہر، وفا۔ تینوں (چاروں) بوڑھے استاد ہیں اور ان کا مبلغِ علم صفر سے زائد نہیں۔ ان کے پیرو کار یعنی ان کے بگاڑے ہوئے پرداد دینے والے مستزاد۔ ان کے نام ہیں بدر تسلیمی، شوق اثری اور کچھ اور نکمے۔" (خط مورخہ ۲۴ نومبر ۱۹۶۲ء)

وہ تو اچھا ہوا شاد عارفی نے وہ دن زیادہ نہیں دیکھے جب ادب پر "شب خون" مارا جا رہا تھا۔ پتہ نہیں محمد علوی، عادل منصوری، افتخار جالب اور ظفر اقبال وغیرہ کی اینٹی غزلوں اور تجریدی نظموں پر وہ کیا ردِعمل دکھاتے۔

شاد عارفی اپنی کوئی غزل یا نظم کسی رسالے کو بھیجتے تو مدیر کو ہدایت بھی فرماتے کہ اسے پورے صفحے پر شائع کیا جائے۔ ایک رسالے کے مدیر نے ان کی غزل ان کی ہدایت کے ساتھ ہی شائع کر دی تھی۔ شاد عارفی اس قدر سادہ لوح تھے کہ جب اپنے منفرد رسالہ "نقوش" کے لیے محمد طفیل نے ان سے تخلیقات کی فرمائش کی تو وہ حکومت کا رونا روتے ہوئے ان کو لکھتے ہیں:

رام پور۔ کھنڈ سار کہنہ ۱۳ اکتوبر ۱۹۵۱ء

شاد عارفی

مکرم علیکم السلام

ڈاک پر سنسر کے غلط قبضے نے مجھے اس پر مجبور کر دیا کہ پاکستانی فرمائشات کا جواب نہ دوں۔ کیا یہ سراسر ناانصافی نہیں کہ ہمارے ٹکٹ ضائع ہوں اور ہمارے ہی خون پانی ایک کر کے لکھے ہوئے اشعار ضبط کر لیے جائیں..................

www.urduchannel.in

آپ کا نام سمجھ میں نہیں آیا۔ اگر یہ لفافہ پہنچ جائے اور آپ رسید دیں تو اپنا نام صاف صاف لکھیں کہ آپ مدن لعل ہیں یا محمد جلیل؟ باقی خیریت و بریت تو کیا۔ بہر حال ہے کچھ نہ کچھ ضرور..................شاد عارفی

شاد عارفی نے محمد طفیل کے نام بعد میں کھل کر لکھنا شروع کیا اور صاف گوئی سے کام لینے لگے۔ وہ کبھی علی گڑھ چلے جاتے تھے تو وہاں سے بھی "مدیر نقوش" کے نام کچھ خط لکھے:

علی گڑھ۔ وی یم ہال ۴ مارچ ۱۹۵۴ء

محترمی! علیکم السلام

آپ کا کارڈ رام پور ہوتا ہوا آج علی گڑھ پہنچا۔ زیادہ تر رام پور کا ڈاک خانہ یہ سب گڑ بڑ کر لیتا ہے۔ نامعقول سنسر شپ سے اور امید بھی کیا کی جا سکتی ہے۔ بہر حال علی گڑھ سے آپ کی فرمائش کی تعمیل کر رہا ہوں۔ وہ خط کیوں روک لیا گیا تھا اس کی تفصیل یہ ہے کہ انتخاب میں ہندو مسلم سوال پیدا ہو جانے کی وجہ سے رام پور کے وہ مسلمان جو مولانا آزاد کو گالیوں سے یاد کرتے تھے ان کے ورک (الیکشن ورک) پر مجبور ہو گئے چنانچہ میں بھی اپنے نظریے کے اختلاف کے باوجود ان کے ورک میں سر کھپا رہا تھا اور ان کی کامیابی کا صلہ یہ کہ اسی روز جب وہ کامیاب ہوئے میرے ہاں اس طرح چوری ہوئی کہ صرف جسم پر کپڑے باقی رہ گئے اور گھر کا گھر صاف کر دیا گیا کیوں کہ کانگریس حکومت یہ کب برداشت کر سکتی تھی (کہ) کانگریس سے وفاداری برتی جائے۔ اس خط میں اس چوری کے بابت کچھ خیالات تھے اور کچھ قطعات بھی جو آج پھر برائے تفریح آپ کو بھی لکھتا ہوں۔

نمبر۔۱ جنتا کی زباں سلی ہوئی ہے — رشوت پہ دوش پلی ہوئی ہے
واردات و سراغ انشاء اللہ — چوروں سے پولس ملی ہوئی ہے

نمبر۔۲ رشوت کہ متاعِ زائدہ ہے — یک مرغ دامِ مائدہ ہے
دیکھ چلتی نہیں حکومت ورنہ — چوروں سے پولس کو فائدہ ہے

یعنی جہاں تک تحقیق ہوا ہے پولس کی ایما پر چور...... چوری کر رہے ہیں اور کھلے بندوں شہر میں پھر رہے ہیں۔ ادبی خدمات کے تحت میں آپ کے ہم رکاب ہوں۔ ایک نئی

غزل حاضر خدمت ہے۔شاید پسند آئے............ احمد علی شاؔد عارفی علی گڑھ وی یم، ہال

اورغزل تو شاؔد عارفی ایک پوسٹ کارڈ ہی پر بھیج دیا کرتے تھے۔اور کبھی کبھی نظر ثانی کے بعد پوسٹ کارڈ پر وہی غزل دوبارہ بھیجتے تھے۔ایک خط دیکھیے۔

مکرمی طفیل صاحب ۱۱/نومبر ۶۲ء

لفافہ ملا ہوگا۔اس میں یہ غزل بھی ملی ہوگی جو جشن میں پڑھے جانے کے سلسلے میں نظر ثانی کے بعد اس طرح ہوگئی ہے آپ اگر شائع کریں تو اس کارڈ کے اعتبار سے شائع کریں:

غزل

مشکل سے اس بت کی قسمیں — دو سچی ہوتی ہیں دس میں
کاش مرا دل ہوتا بس میں — ورنہ اس محفل کی رسمیں
بے جا ہے انجامِ کشاکش — اے کھینچنے والو آپس میں
کھینچنے ہی سے آجاتی ہے — تلخی انگوروں کے رس میں
خنجر سے شمشیر بنے گا — وہ ظالم دوچار برس میں
اس کافر پہ آئی جوانی — اور جوانی کس کے بس میں
یہ پردہ یہ چلمن کب تک — پھول نہیں کانٹوں کے بس میں
مجبوری میں چند اشارے — کافی ہوتے ہیں آپس میں
دشمن کو تکلیف نہ دیجے — کھا کر میرے سر کی قسمیں
لڑنے کا الزام نہ دیجے — ملتی ہیں نظریں آپس میں

ہم اے شاؔد گھریلو جھگڑے
طے کر سکتے ہیں آپس میں

مدیر ''نقوش'' محمد طفیل اپنے رسالے میں شائع ہونے والی تخلیقات کا معقول معاوضہ دیا کرتے تھے پھر بھی کئی ادیبوں شاعروں نے ان سے باضابطہ ''سودے بازی'' کی ہے۔اس سلسلے میں کرشن چندر، عصمت چغتائی، جذبی، عزیز احمد کے خطوط گواہ ہیں۔ شاد عارفی بھی پیچھے نہیں۔انھوں نے صاف لکھا کہ ان کی گزر بسر ہی نظموں غزلوں کے

www.urduchannel.in

معاوضے پر ہے۔وہ ڈاک کا خرچ بھی اسی سے پورا کرتے ہیں۔

بیوی کے انتقال کے بعد اپنی تخلیقات کا ریٹ Rate بتاتے ہوئے محمد طفیل کے نام ایک خط میں شاؔد عارفی لکھتے ہیں:

محلّہ بیریاں۔رام پور ۲۵/جولائی ۱۹۵۸ء

محترمی علیکم السلام

خدا مرحومہ کو جنت نصیب کرے۔انسان یہی کر سکتا ہے۔اس کی مشیت کے آگے۔نظموں کی قیمت لیتا ہوں۔اسی پر آج کل ڈاک خرچ اور ایک حد تک گزر بسر ہے۔ ایک تازہ نظم ''مرے محلے کے دو گھرانوں سے ہے گناہوں کا فیض جاری'' کے عنوان سے موجود ہے مگر نہ تو وہ آپ چھاپ سکیں گے اور نہ میں مفت کے حق میں۔گھوڑا گھاس سے یارانہ کر کے کس طرح جی سکتا ہے۔میں تو پھر انسان ہوں۔فاقے کہاں تک کر سکتا ہوں۔ بیمار بھی ہوں چاہتا ہوں کہ اسی حالت میں یہیں ہندوستان میں مروں تا کہ ''مرے بت خانے میں تو کعبے میں گاڑو برہمن کو'' کے تحت میں نہ رہوں مگر اردو ادب میں میری ان پریشانیوں کا ذکر موجود رہے کہ عجب فاقہ مست تھا......

مذکورہ نظم کے -/40 روپے، اس سے گھٹیا مگر سنجیدہ کے -/30 روپے اور اس سے زیادہ ادبی -/20 روپے پیشگی آنے پر بھیج سکتا ہوں۔.....شاد عارفی

مذکورہ نظم ساحؔر لدھیانوی کی نظم ''چکلے'' ٹائپ کی ہے جو فلم ''پیاسا'' میں فلمائی گئی تھی۔اس درجہ بندی سے پتہ چلتا ہے کہ شاد عارفی ہر قسم کی نظم لکھنے پر آمادہ رہتے تھے تا کہ چار پیسے حاصل ہو جائیں۔ایسے میں آمد و آورد کی بحث بے کار ہے کیوں کہ جس قلم کار کی گزر بسر ہی قلم پر ہو اس سے کسی شاہ کار کی توقع نہیں کی جا سکتی کہ شاہ کار بے لوثی، بے غرضی اور بے نیازی سے عبارت ہوتا ہے۔

اللہ کا شکر ہے کہ انھیں ڈاکٹر مظفر حنفی جیسا شاگرد نصیب ہوا جس نے انھیں زندہ رکھنے میں دامے، درمے، قدمے، سخنے حصہ لیا۔

......☆......

طنّازِ وقت

www.urduchannel.in

شاد عارفی کی حیات پر مبنی ناولٹ

ڈاکٹر ساجد امجد

''کلمۂ شہادت۔'' ایک آواز بلند ہوئی۔

دس پندرہ آدمیوں کی مختصر سی جماعت نے اس آواز کا جواب دیا اور سر جھکا کر چلنے لگے۔

''ارے بھائی ببّن خاں۔ کس کا انتقال ہوگیا؟'' اس مختصر سے جنازے کو جاتے ہوئے دیکھ کر ایک راہ گیر نے اپنے کسی واقف کار سے پوچھا۔

''شاد عارفی گزر گئے بھائی۔''

''کون شاد عارفی؟''

''شاعر تھے بھئی ایک، احمد علی خاں لڈن نام تھا۔ رزڑ پٹھان تھے یہیں مزارِ شاہ ولی اللہ صاحب کے قریب رہتے تھے۔''

''ابھی آئے ہوں گے۔ قدیمی رہنے والے تو نہیں تھے۔ میں تو ایک ایک کو جانتا ہوں۔''

''ابھی سال بھر پہلے تو اس محلے میں آئے تھے۔ ویسے سنا ہے، دنیا انھیں جانتی تھی۔ بہت بڑے شاعر تھے۔''

''بھائی، کسی مشاعرے میں سنا تو نہیں۔''

''رام پور کے مشاعروں میں وہ جاتے ہی کب تھے۔''

''جبھی تو۔''

اتنی دیر میں جنازہ شاہ ولی اللہ کے مزار کے قریب پہنچ چکا تھا۔ اسی مزار کے احاطے میں اس بدنصیب شاعر کو دفن کرنا تھا۔

O☆O

وہ عمّی میاں کے مکتبِ ''دبستانِ حیدری'' میں داخل ہوگیا تھا جہاں اسمٰعیل میرٹھی کی اردو ریڈروں کے علاوہ فارسی کی ''گلستاں''، ''بوستاں'' اور دستورِ صبیان وغیرہ پڑھ رہا تھا۔

وہ اس دن مکتب سے آکر بیٹھا ہی تھا کہ اپنے بڑے بھائی سید احمد خاں کے ہاتھ میں چھوٹی سی تلوار اور ڈھال دیکھ کر اس کی خوشی کی انتہا نہ رہی۔

''بھائی جان، یہ تلوار کہاں سے آئی؟'' احمد علی نے پوچھا۔

www.urduchannel.in

''تم اس سے کس کی گردن کاٹو گے؟''

''تمھاری۔'' سید احمد نے کہا اور احمد علی بھاگ کر ماں کی گود میں چھپ گیا۔

''کیوں تنگ کرتے ہو، میرے لڈن کو؟'' ماں نے ڈپٹ کر کہا۔

''اماں، بھائی میری گردن کاٹ رہے تھے۔'' لڈن نے کہا۔

''اور تم بھاگ آئے۔ کیسے پٹھان ہو۔ تمھارے پرنانا عثمان علی خاں، پٹھانوں کے سردار تھے اور تم ایسے بھگوڑے۔'' اس کی ماں نے اسے گود سے نیچے اتارتے ہوئے کہا۔

''ایک تلوار میرے ہاتھ میں بھی دے دو۔ پھر دیکھو، بھائی کی گردن رہتی ہے یا میری۔''

''شاباش۔ مگر بھائی، بھائی آپس میں سچ مچ کی لڑائی تھوڑی لڑتے ہیں۔ ایسی ہی ایک تلوار تمھارے لیے بھی آئی ہے۔ تمھارے باوا جان تم بھائیوں کو تلوار کے ہاتھ سکھایا کریں گے تاکہ بھائی کی نہیں، دشمن کی گردن کاٹ سکو۔''

''سچ! مگر وہ تلوار کہاں۔ مجھے میری تلوار دو۔'' وہ مچل گیا۔

''جلدی کا کام شیطان کا ہوتا ہے۔ پہلے منہ، ہاتھ دھولو۔ لقمہ دو لقمہ روٹی کا حلق سے اتارو، پھر ملے گی تلوار۔''

اس نے منہ پر الٹے سیدھے چھپاکے مارے، بھوک اب کس کو رہی تھی مگر ماں کا حکم تھا لہٰذا کھانا بھی کھانا پڑا۔

عارف اللہ خاں گھر میں داخل ہوئے تو ان کے تینوں بیٹے ہتھیاروں سے لیس، چہل قدمی کرتے ہوئے باپ کا انتظار کر رہے تھے۔

''یہ پلٹن کس لام پر جانے کی تیاری کر رہی ہے بھائی۔'' عارف اللہ نے کہا۔

''لام پر تو جب جائیں گے جب جائیں گے، ابھی تو گھر ہی کو پلٹن میدان بنایا ہوا ہے جیسے نواب صاحب معائنے کو آرہے ہیں۔'' ان کی ماں نے کہا۔

''سرکار ان کی قدر کیا کریں گے۔ ان کے نواب تو ہم ہیں۔''

''آپ نے یہ کھلونے انھیں اور لاکر دے دیے۔''

"افغان بچے انھی کھلونوں سے کھیلتے ہیں۔"

عارف اللہ خاں، بچوں سے بھی زیادہ بے صبرے نکلے۔ انھوں نے بیٹھنے کا وقفہ بھی نہیں لیا اور تلوار کے ہاتھ سکھانے میں مصروف ہو گئے۔

احمد علی اپنے دونوں بھائیوں کے مقابلے میں جسمانی طور پر کمزور تھا اور آٹھ سال کی عمر ہی کیا ہوتی ہے۔ تلوار کے چند ہاتھ ہی گھمائے ہوں گے کہ پسینے پسینے ہو گیا۔

"بس لڈن خاں۔ تمھارا دم پھول گیا۔" عارف اللہ خاں نے کہا۔

"مگر میں بے دم نہیں ہوا، آخری دم تک لڑوں گا۔"

عارف اللہ خاں کا بلیوں خون بڑھ گیا۔ انھوں نے دوڑ کر احمد علی کو گود میں اٹھا لیا۔

"تو ہے کھرا پٹھان۔ زندگی میں جس طرف بھی گیا، مخالفوں کی ناک میں نکیل ڈال دے گا۔" عارف اللہ خاں نے کہا اور پھر اس کی ماں کو آواز دی "سنتی ہو! اپنے چھوٹے خاں صاحب کی ہمت دیکھو۔ سانس پھول گئی لیکن ہاتھ پاؤں نہیں پھولے۔ تلوار کے قبضے پر ہاتھ اسی طرح جمے ہوئے ہیں۔"

"کیوں نہ ہو۔ آخر ہے کس نانا کا نواسہ۔"

"بیٹا تو ہمارا ہی ہے۔ ہم بھی آخر تھانے دار ہیں۔"

احمد علی، باپ کی گود سے اترا تو جیت کے نشے سے سرشار تھا۔ اس ہمت افزائی نے اس کی انتہا پسند طبیعت کو جھنجوڑ جھنجوڑ کر جگا دیا تھا۔

اس کا خالہ زاد بھائی عتیق اللہ خاں اس سے ملنے آیا تو وہ اسی نشے میں مست بیٹھا تھا۔ چھوٹی سی وہ تلوار اب بھی اس کے قریب دھری تھی۔

"تم تو اب رام پور کی فوج میں چلے جاؤ گے؟" عتیق اللہ خاں نے کہا۔

"ابھی کہاں۔ فوج میں تو بڑے ہو کر جاتے ہیں۔"

"نرے جاہل ہو کر پہنچو گے۔ سپاہی تو اُجڈ ہوتے ہیں۔"

"میں جاہل نہیں ہوں۔" اس نے جھپٹ کر تلوار اٹھا لی۔

"جاہل نہیں ہو، تو میرے بھائی کی طرح شاعری کر کے دکھاؤ۔" عتیق اللہ نے

www.urduchannel.in

ایسی شرط رکھ دی کہ تلوار پر اس کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔

"تم کیا سمجھتے ہو، میں شاعری نہیں کر سکتا؟"

کہنے کو تو اس نے کہہ دیا لیکن اس کے لیے یہ ٹیڑھی کھیر تھی۔ وہ سوچنے لگا کہ شعر کہتے کیسے ہیں۔ اچانک جیسے کسی نے اس کے کان میں کچھ کہہ دیا ہو۔ یہ تو شعر ہو گیا۔ شیخ سعدی کی بوستاں میں ایسے ہی شعر تو لکھے ہوئے ہیں۔

تلوار کے ہاتھ سیکھ کر بیٹھا تھا۔ تلوار پہلو میں تھی۔ تلوار ہی اس کے ذہن میں تھی۔ تلوار ہی پر شعر ہو گیا:

خیر سے اب ہو گیا ہشیار تو
اپنے دشمن پر اٹھا تلوار تو

عتیق اللہ دیوانوں کی طرح اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس نے شعر کیسے کہہ دیا مگر کہہ تو دیا۔

شاعری اور تلوار کا نشہ یک جا ہوا تو احمد علی ہوا میں اڑنے لگا۔ وہ سوچنے لگا، تلوار چلاتے ہوئے سانس پھول گئی تھی لیکن شعر کہتے ہوئے سانس بھی نہیں پھولی اور شعر بھی ہو گیا۔ رعب صرف تلوار ہی سے نہیں جمایا جاتا، شعر بھی وہی کام کرتا ہے۔

اس دن کے بعد سے وہ باپ کے ڈر سے تلوار بازی سیکھتا تو رہا لیکن اب وہ پہلی سی سرگرمی نہیں رہی تھی۔

کچھ پڑھنے کا شوق ازلی تھا کچھ حافظہ قوی تھا لہٰذا ابتدائی کتابیں ابتدائی دنوں ہی میں ختم کر لیں۔ اب وہ حکیم یوسف علی خاں کے پاس "دیوانِ حافظ" پڑھنے کے لیے جانے لگا۔ عارف اللہ خاں نے اس کے ذوقِ علمی کو دیکھتے ہوئے، رام پور کے مشہور حافظ ریل کے پاس بٹھا دیا جہاں اس نے "سکندر نامہ" اور "شاہ نامہ" ختم کر لیا۔

مکتب و مُلّا کے اس تماشے میں اس نے کچھ لڑکے ایسے بھی دیکھے جو ریاست کے واحد اسکول "اسٹیٹ ہائی اسکول" میں پڑھنے کے لیے جاتے تھے اور انگریزی تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ وہ جو باتیں کرتے تھے، اس کے لیے بالکل نئی تھیں۔ اپنی کتابوں میں لکھے

ہوئے تاریخ کے جو واقعات وہ بیان کرتے تھے، اس کا دامن ذہن ان واقعات سے بالکل خالی تھا۔ یہ جہان ہی دوسرا تھا، اور وہ اس نئے جہان کی سیر کو جانا چاہتا تھا۔

اس نے ڈرتے ڈرتے اپنے شوق کا پٹارا ماں کے سامنے کھول کر رکھ دیا۔ ماں نے تو سر پیٹ لیا کہ لڑکا گیا ہاتھوں سے۔ ایسا نجیب الطرفین خاندان، اس میں موئے کرسٹان کہاں سے گھس آئے۔

سخت گیر باپ نے سنا تو ان کی آنکھوں سے بھی شعلے نکلنے لگے۔ وہ تو اسے مولوی بنانا چاہتے تھے اور اس کے لچھّن یہ!

''جانتے ہو، تمھارا تعلق کس خاندان سے ہے۔'' عارف اللہ خاں نے گرج کر کہا ''میں افغانستان کے پہاڑوں کو چھوڑ کر رام پور آیا تھا۔ کیوں آیا تھا؟'' انھوں نے کچھ دیر توقف کیا، پھر احمد علی سے مخاطب ہوئے ''پوچھو کیوں آیا تھا۔''

احمد علی کی اتنی ہمت کہاں تھی کہ کچھ پوچھتا۔ گردن جھکائے خاموش کھڑا تھا کہ عارف اللہ خاں پھر گرجے۔

''پوچھو، کیوں آیا تھا۔''

''کیوں آئے تھے؟'' احمد علی نے گھبرا کر پوچھا۔

''علم کا شوق ہمیں لایا تھا۔ یہاں کے بے مثال مدرسۃ العالیہ نے ہمیں کھینچا تھا۔ انگریزوں کی گٹ پٹ نہیں، منطق اور فلسفے کا علم، کیا سمجھے برخوردار۔ اسی علم کی بدولت ہم نے لوہارو اسٹیٹ میں تھانے داری کی جہاں تم پیدا ہوئے۔ قسمت نے مجھے مدرسۃ العالیہ سے دور کر دیا۔ ہم چاہتے ہیں، تم پڑھ لکھ کر وہاں درس دو۔ ہمارا خواب پورا کرو اور تم یہ بیچ میں انگریزی لے آئے۔ خبردار!''

وہ تو چپکا ہی ہو گیا تھا لیکن اس کی قسمت اچھی تھی کہ اسی دن اس کے ماموں کرامت علی خاں (کوتوال رام پور) اس کے گھر آ گئے۔ اس کی ماں نے یہ سوچ کر ان کے سامنے ذکر چھیڑ دیا کہ وہ احمد علی کو سمجھائیں گے لیکن انھوں نے تو الٹی حمایت لینی شروع کر دی۔

www.urduchannel.in

''اب ہمارا تمھارا زمانہ نہیں ہے۔ اسے انگریزی پڑھنے دو، انگریزی کے بغیر اب گزارہ نہیں ہے۔''

''اے ہے، تم بھی سینگ کٹا کے بچھڑوں میں شامل ہو گئے۔'' احمد علی کی ماں نے کہا۔

''آپ نہیں سمجھیں گی اس بات کو۔ میں بھائی صاحب سے بات کر کے انھیں قائل کرنے کی کوشش کروں گا۔''

انھوں نے عارف اللہ خاں سے بات کی۔ وہ کسی صورت ماننے کو تیار نہیں تھے لیکن بہت کچھ بحث و مباحثے کے بعد بالآخر انھیں ماننا پڑا اور احمد علی کو اسٹیٹ ہائی اسکول میں داخل کرا دیا گیا۔

اسکول بدلا تو طور طریقے، کھیل کود ہی بدل گئے۔ کہاں مکتب کی زندگی۔ نیچی گردن، جھکی آنکھیں۔ کہاں انگریزی اسکول کی آزاد خیالی۔ بڑی بڑی کلاسیں، وسیع کھلا کھیل کا میدان۔ وہ تو پنجرے سے نکل کر باغ میں آ گیا۔ کچھ دن تو پر سمیٹے رہا لیکن پھر اس کے بھی پر نکل آئے۔

اسکول کے میدان میں فٹ بال کا میچ ہو رہا تھا۔ کچھ دنوں سے اسے بھی فٹ بال کھیلنے کا خبط ہوا تھا۔ لڑکوں نے اسے بھی میدان میں اتار دیا۔ چھریرے بدن کا تھا لہٰذا بھاگتا بہت تیز تھا لیکن بھاگنا ہی تو سب کچھ نہیں ہوتا۔ تنومند فارورڈ سے زوردار ٹکر ہوئی۔ دونوں گر پڑے۔ وہ لڑکا تو کپڑے جھاڑ کر کھڑا ہو گیا لیکن احمد علی کی ہمت جواب دے گئی۔ دو لڑکوں نے مل کر اسے اٹھایا۔ وہ لنگڑا رہا تھا۔ لڑکوں نے اسے مشورہ دیا کہ وہ کچھ دیر گراؤنڈ کے باہر بیٹھ کر ستا لے لیکن اس طرح تو اس کی ناک کٹ جاتی۔ اسے باہر بیٹھے ہوئے اپنی سبکی محسوس ہوئی۔ وہ پھر کھیل میں شریک ہو گیا۔ اس تنومند فارورڈ نے اس کمزور کھلاڑی کو تاڑ لیا تھا یا کیا تھا، ایک مرتبہ پھر ٹکر ہوئی۔ نتیجہ وہی ہوا۔ وہ لڑکا تو کپڑے جھاڑ کر کھڑا ہو گیا، احمد علی کو اٹھانے کے لیے پھر دو لڑکوں کی ضرورت پڑی۔

اسے اٹھانے والوں میں ایک لڑکا راز یزدانی بھی تھا۔ احمد علی کی فطرت میں مروت اور

احسان شناسی کی افراط تھی۔ وہ بہادر آدمی کی طرح اپنے محسن کے احسان کو کبھی نہ بھولتا تھا لہٰذا فٹ بال سے تو اب اسے ہمیشہ کے لیے نفرت ہو گئی لیکن راز یزدانی اس کا دوست بن گیا۔

راز یزدانی اسی کی طرح پانچویں جماعت میں تھا لیکن اسے شاعری سے شغف تھا۔ احمد علی بھی اس کی صحبت میں رہ کر تک بندیاں کرنے لگا۔ اسکول سے باہر کے دوستوں میں ایک لڑکا علی حسن ماہر تھا۔ اسے بھی شاعری کا چسکا تھا۔ ان لوگوں کی دن رات کی صحبت اور رام پور کے شاعرانہ ماحول نے اسے بھی اس راہ پر لگا دیا۔ انتہا پسند طبیعت اور دوسروں سے آگے نکل جانے کے جذبے نے سمندِ شوق پر تازیانے کا کام کیا۔ ساتویں جماعت تک پہنچتے پہنچتے یہ شوقِ شاعری سنجیدگی اختیار کر گیا۔

جذبہ صادق ہو تو راستے خود بخود جگہ دینے لگتے ہیں۔ اس کے پڑوس میں امیر مینائی کا خاندان رہتا تھا۔ دونوں گھرانوں میں قریبی تعلقات تھے۔ اس سے پہلے بھی وہ اس گھر میں آتا جاتا تھا لیکن اب جو شاعری کی طرف مائل ہوا تو اسے اس گھرانے کی ادبی حیثیت کا بھی علم ہوا۔ امیر مینائی کے صاحب زادے محمد احمد صریرؔ مینائی کی ادبی صحبتوں میں باقاعدگی سے شرکت کرنے لگا۔ وہاں آنے والے ادیبوں اور شاعروں کی باتیں سنتا رہا اور گرہ بند کرتا رہا۔ صریر کے صاحب زادے اسمٰعیل کی رائے اس کے لیے بڑا وقیع درجہ رکھتی تھی۔ جب اس طرف سے بھی حوصلے کو داد اور ہمت کو درازی ملی تو وہ مزید سنجیدہ ہو گیا۔ اس نے ایک مرتبہ پھر وہ کاپی نکالی جس پر شعر لکھے ہوئے تھے۔ بہت دیر تک اپنے شعروں کو پڑھتا رہا، سر دھنتا رہا۔

''جب شاعری کرتے ہی ہو تو اسے کسی نتیجے تک کیوں نہیں پہنچاتے۔'' ایک دن اس کے دوست علی حسن ماہر نے کہا۔

''یہ بھی کوئی فٹ بال ہے کہ اسے گول تک پہنچا کر خاموش بیٹھ جاؤں۔ بھئی، شاعری ہے، جب موڈ ہوتا ہے کر لیتا ہوں۔ تم بھی تو یہی کرتے ہو گے۔''

''میری بات اور ہے۔'' ماہر نے کہا ''ہم سب دوستوں کی رائے یہ ہے کہ تمھاری اٹھان بہت اچھی ہے۔ تمھیں اگر کوئی اچھا استاد مل جائے تو تم رام پور کا نام روشن کر سکتے

ہو۔ یہ ہے میرا مطلب۔''

''بھئی یوں تو یہ کوئی مشکل کام نہیں ہے۔ رام پور میں بہت سے استاد ہیں لیکن اب یہ بھی تم ہی بتا دو کہ میرے لیے کون مناسب رہے گا۔''

''مولانا شفق رام پوری بے حد شفیق استاد ہیں۔ میرے ساتھ ان کے پاس چلنا۔''

وہ شفق رام پوری کا شاگرد بن گیا۔ شفق رام پوری نے اس رائے کے ساتھ اس کے کلام پر اصلاح دینی شروع کر دی کہ تم فطرت سے شاعر پیدا ہوئے ہو۔

......☆......

رام پور کا ماحول ہندوستان کی دوسری پسماندہ ریاستوں سے مختلف نہیں تھا۔ اوپر چمکتی ہوئی پالش، اندر لکڑی گھن کھائی ہوئی۔ درباری، منافقت اور خوشامد، مطلق العنان حکمران کے گرد گھومتا ہوا محور۔

یہ ریاستیں نہ صرف اپنی حدود کے اندر سیاسی بیداری اور نئے خیالات کو ابھرنے سے روکتی تھیں بلکہ یہاں تو اتنی آزادی بھی نہیں تھی جو برطانوی ہند کا مقدر تھی۔ رام پور کی ریاست اپنے خیالات میں رجعت پسند و قدامت پسند تھی۔ روایتی معاشرہ، روایتی خیالات۔ درباروں کا سازشی مزاج، درباروں سے نکل کر ادبی گروہ بندیوں تک آ گیا تھا۔ ذہنی نشو و نما کے لیے میدان بہت تنگ تھا۔ سیاسی آزادی کی قطعی اجازت نہیں تھی۔ یہاں تک ہوا کہ مولانا شوکت علی اور محمد علی جوہر جیسے رہنمایانِ وطن کے ریاست میں داخلے پر پابندی تھی۔ شخصی حکومت کا ایسا خوف تھا کہ محمد علی جوہر کے بعض اعزہ، اخبارات کو یہ بیانات دینے پر مجبور ہو گئے کہ مولانا محمد علی سے ہماری قریبی رشتے داری سہی لیکن ان کا سیاسی طرزِ عمل دیکھ کر ہم نے ان سے ترکِ تعلق کر لیا ہے۔

پابندیوں میں جکڑے ہوئے اذہان اور گھٹے ہوئے خیالات کی فضا میں کسی نئی بات کا فروغ بغاوت سے کم نہیں تھا۔

اس صورتِ حال کے اثرات ادبی فضا پر بھی پڑ رہے تھے۔ بڑے بڑے روسا قسم کے اساتذہ کرسی غزل پر جلوہ افروز تھے۔ داغ و امیر کے روایت پسند شاگردوں کی غزلیں

www.urduchannel.in

مشاعروں کی چھتیں اڑا رہی تھیں۔ حالی کے بقول چبے ہوئے نوالوں کو دوبارہ چبایا جا رہا تھا۔ ایک سے خیالات، لباس تبدیل کر کے مختلف مشاعروں میں سامنے آ رہے تھے۔ شعرا تو شعرا، سامعین بھی اسی روایت پسند شاعری کے عادی ہو گئے تھے۔

شاہدانِ بازاری، شاعروں کے محبوب تھے، اور لکھنوی اسکول کا رنگِ تغزل عام تھا۔

گھٹن اور چلتی ہوئی شاعری کا یہی وہ ماحول تھا جب ۱۹۱۷ء کے آس پاس احمد علی نے شاد عارفی کے نام سے مشاعروں میں جانا شروع کیا اور انہی غزلوں کو شعار بنایا جو اس وقت رائج تھیں۔

......☆......

وہ سرخ چُنے ہوئے بڑے عرض کے دوپٹے میں بیر بہوٹی بنی، ماں کے پہلو سے لگی بیٹھی تھی۔ اس کی بڑی بڑی شربتی آنکھیں رہ رہ کر پلکوں کی جھالر سے نکل کر فرش سے اٹھ کر شاد کی طرف جاتی تھیں اور پھر فرش کو تکنے لگتی تھیں۔ شاد اس کی ماں سے باتیں کر رہا تھا لیکن ساتھ ہی ساتھ اس آتش بازای سے بھی لطف اندوز ہو رہا تھا۔ ایک ہرنی تھی جو سہمی ہوئی بیٹھی تھی۔

''لو، بھائی کو پان دو۔'' اس کی ماں نے خاصدان اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

پھولوں کی شاخ میں جنبش ہوئی۔ اب شاد اس کا سراپا دیکھ سکتا تھا۔ متناسب قد، بھرا بھرا بدن، خوب گھیر کا جمپر اور کلی دار پاجامہ۔ وہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی ہوئی اس کے قریب آ کر کھڑی ہو گئی۔ شاد نے گلوری منہ میں رکھی اور آداب کے لیے ہاتھ اٹھا دیا۔ وہ تیز تیز چلتی ہوئی واپس ہوئی اور پھر ماں کے پہلو سے لگ کر بیٹھ گئی۔

''اے میاں، سنا ہے تم شاعری کرنے لگے ہو؟]اس لڑکی کی ماں نے کہا۔

''ابھی تو شروع کی ہے۔'' شاد نے کچھ شرماتے ہوئے کہا۔

''ایک آدھ شعر ہمیں بھی سناؤ۔ ہم بھی تو دیکھیں۔''

''چھوڑیے خالہ۔ میرے شعر ایسے کہاں ہوتے ہیں۔''

www.urduchannel.in

''ایسے ویسے کیا۔ بھیا اِتی شاعری تو ہم بھی سمجھ لیتے ہیں۔''

وہ شاید اس فرمائش کی تکمیل پر تیار تو نہ ہوتا لیکن موقع کی مناسبت سے اسے کچھ شعر یاد آ گئے۔ اس لیے تیار ہو گیا۔

ہلکا سا تبسم ترے لب ہائے حسیں پر
مجبور نہ کر مجھ کو محبت کے یقیں پر
اے تو کہ شرارت سے نہیں پاؤں زمیں پر
تھوڑی سی عنایت بھی کسی خاک نشیں پر
حق ہے کہ ستاؤ مگر اتنا نہ ستاؤ
پڑ جائے مری آنکھ کسی اور حسیں پر
سجدوں میں تکلف ہے مجھے اور بجا ہے
لکھا ہے ترا نام مری لوحِ جبیں پر
وہ میرے لیے موردِ الزامِ محبت
آتا ہے ترس شاد مجھے حسنِ حزیں پر

یہ لڑکی اس کے ننہال کی طرف سے دور کی رشتے دار تھی۔ بچپن میں وہ اور شاد دن بھر ساتھ کھیلا کرتے تھے۔ ادھر کچھ دنوں سے دونوں گھرانوں میں میل ملت کم ہو گئی تھی۔ شاد نے بھی آنا کم کر دیا تھا لیکن اب جو اتنے دنوں بعد اسے دیکھا تو محسوس ہوا، بچپن کی محبت کو وہ بھولا نہیں ہے۔ اس کی آنکھوں کی چمک بھی بتا رہی تھی کہ اسے ایک ایک لمحہ یاد ہے۔

وہ اس کے گھر سے واپس آ رہا تھا لیکن اسے یوں لگ رہا تھا جیسے اس کی طرف واپس جا رہا ہے۔ اسے بار بار کن انکھیوں سے اپنی طرف اس کا دیکھنا یاد آ رہا تھا۔

جذبۂ محبت کو تیرِ بے خطا پایا
میں نے جب اسے دیکھا دیکھتا ہوا پایا

تو کیا وہ مجھے چاہتی ہے؟ تو کیا مجھے اس سے عشق ہو گیا؟ کیوں نہ ہو۔ ساتھ کھیلے

کی محبت ہی تو عشق بن جاتی ہے:

ساتھ کھیلے کی محبت بڑھ کے بن جاتی ہے عشق
اس سے زائد عشق کا اے شاؔد میں قائل نہیں

ساتھ کھیلے کی محبت جب عشق میں داخل ہو ہی گئی تو شاؔد عارفی جیسے جذباتی اور انتہا پسند آدمی کے لیے ممکن نہیں تھا کہ وہ خود پر قابو رکھ سکتا۔ سولہ سترہ سال کی عمر تو یوں بھی اپنے اختیار میں رہنے کی عمر نہیں ہوتی۔ اس نے پابندی سے ’ص‘ بیگم کے گھر جانا شروع کر دیا۔ وہ اگر کسی کام میں الجھ جاتا تو رشتے داری تھی ’’ص‘‘ بیگم کو آنے کے لیے کس نے منع کیا تھا۔ دروازے پر سواری آکر رکتی اور شاؔد کے آنکھیں دیکھتیں کہ وہ اپنی ماں کے ساتھ آئی ہے۔ بڑے تو اپنی باتوں میں مگن ہو جاتے اور وہ گرمی کی دوپہر میں، دھوپ سے آنکھیں چرا کر کسی گوشہ خلوت میں بیٹھ کر گھنٹوں باتیں کرتے رہتے۔ اس روز شاؔد کی خوشی کا عالم دیدنی ہوتا:

شاؔد صاحب جو ہنسے پڑتے ہیں ہر بات میں آپ
آج وہ ہوش رہا آپ کا مہماں تو نہیں

مہمانی اور میزبانی کے یہ دن آتے رہے، جاتے رہے لیکن گزرنے کے لیے نہیں، شہرِ دل میں ٹھہرنے کے لیے۔ ایک ایک لمحہ، نقشِ سنگ ہو کر امر ہوتا رہا۔ ہر ملاقات ایک اور ملاقات کا دروازہ کھولتی چلی گئی۔ نہ ادھر چین تھا نہ اس طرف قرار۔

اس محبت نے اس پر خزانے کا منہ کھول دیا تھا۔ وہ اب تک جس سرشاری سے ناواقف تھا اور شاعری میں جس کی ضرورت ہوتی ہے ’’ص‘‘ بیگم کی محبت نے اسے وہ سرشاری عطا کر دی تھی۔ وہ مٹھیاں بھر بھر کے شعروں کی اشرفیاں سمیٹ رہا تھا اور مشاعروں میں لٹا رہا تھا۔

......☆......

اٹھارہ برس کی عمر میں وہ دسویں جماعت میں پہنچا تھا کہ اس کے والد عارف اللہ خاں کا انتقال ہو گیا۔

وہ اس حادثے کو محض ذہنی صدمہ سمجھ رہا تھا لیکن جب مالی الجھنیں عفریت بن کر سامنے آئیں تو وہ چکرا کر رہ گیا۔ ریاست لوہارو سے عارف اللہ خاں کی جو پنشن آتی تھی وہ گھٹ کر آدھی رہ گئی۔ بڑے بھائی ناکارہ ثابت ہوئے۔ تمام بوجھ اس کے کاندھوں پر آن پڑا۔

وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے بڑے آنگن، چوڑی دیواروں کو تک رہا تھا۔ ماں کا کھچڑی سر، جھریوں بھرا چہرہ دیکھ کر اس کا کلیجا کٹ رہا تھا۔ اس کی ماں، باپ کے مرتے ہی کتنی بوڑھی ہو گئی ہے۔ کیوں نہ ہو۔ پسینے کی جگہ خون بہانے کے دعوے دار رشتے دار اب اس طرف آکر بھی نہیں پھٹکتے۔ بھائیوں کا یہ حال کہ آبائی گھر پر بھی دانت لگائے بیٹھے ہیں۔ اب میری تعلیم کا کیا ہوگا؟

’’تو کیوں سوچ سوچ کر ہلکان ہو رہا ہے۔ تیرے باپ کی پنشن کے روپے ملتے رہیں گے۔ جیسے تیسے گزارہ کر ہی لوں گی۔ تو اپنا دل چھوٹا مت کر۔‘‘

اس کا دل واقعی بہت بڑا تھا مگر حادثے بھی کچھ کم بڑے نہیں تھے۔ وہ لمحوں کی آگ بجھانے میں مصروف تھا کہ ایک شعلہ اور بھڑکا۔ اس کے بڑے بھائی سید احمد خاں نے اپنی بیوی کی وفات کے بعد ایک ایسی عورت سے شادی کر لی جو ساقط النسب تھی۔ وہی رشتے دار جو اب تک دور بیٹھے تماشا دیکھ رہے تھے، خاندان کی دیوار میں ایک غلط اینٹ کے رکھے جانے پر چراغ پا ہو گئے۔ اونچی پگڑیاں نیچی ہو گئیں، کھڑی ناکیں کٹ گئیں۔ پٹھانوں میں غیر پٹھانی عورت کیوں آ گئی؟ قصور اس کا نہیں لیکن سید احمد خاں کو کیا ہو گیا۔ انھوں نے خاندان کا نام خوب اچھالا۔ اب نام اچھال ہی دیا ہے تو جہاں رہیں خوش رہیں، ہم سے کوئی تعلق نہیں۔

ہوا کا رخ دیکھ کر ماں نے بھی دل پر پتھر رکھ لیا۔ بیٹے سے قطع تعلق کر لیا۔ ہماری نسل، غیر عورت کیوں پالے۔ سید احمد خاں کی پہلی بیوی سے جو بچے تھے وہ دادی کے گھر آ گئے۔

دل میں لہو کہاں تھا کہ اِک تیر آلگا
فاقے سے تھا غریب کہ مہمان آگیا

www.urduchannel.in

لشٹم پشٹم گھر کا خرچ تو چل ہی جاتا لیکن بھائی کے بچوں نے اسے بزرگ بنا دیا۔ اس نے اپنی کتابیں سمیٹ کر رکھ دیں۔ اب اسے بھائی کے بچوں کی تعلیم کا بندوبست کرنا تھا۔

اس کی عمر ایسی نہیں تھی کہ اس سے ایسی ذمے داریوں کی توقع کی جاتی لیکن اس نے تو بوڑھی ماں اور بھائی کے بچوں کے لیے کشتیاں جلا دیں۔ ادبی سرگرمیاں منہ دیکھتی رہ گئیں اور وہ نوکری ڈھونڈنے نکل کھڑا ہوا۔

چھوٹا سا شہر تھا، تعلقات بھی تھے لہٰذا اس کے ادبی ذوق کو دیکھتے ہوئے اسے صولت لائبریری، رامپور میں اسسٹنٹ لائبریرین کی اسامی پر رکھ لیا گیا۔

اس کی ادبی پیاس بجھنے کا اہتمام ہو گیا۔ کتابوں کے درمیان رہنے کا بہانہ ہاتھ آ گیا۔ پڑھنے والے تو کم ہی آتے تھے، وہ دن بھر کتابوں کی ورق گردانی کرتا رہتا۔ چند مہینوں میں اس کی رسائی ان کتابوں تک ہو گئی، جو عام حالات میں اسے نہیں مل سکتی تھیں۔

مطالعے کی سہولت تو تھی لیکن تنخواہ اتنی کم تھی کہ یہاں رہنا اس کے لیے دوبھر ہو گیا۔ بالآخر یہ نوکری اس نے چھوڑ دی۔

باپ کی پنشن کے چند روپے آئے اور تنخواہ نہیں آئی تو اسے پھر خیال آ گیا کہ وہ بے روزگار ہو گیا ہے۔

وہ ایک دن اپنے بھتیجے اور بھتیجی کو پڑھا رہا تھا کہ اسے ایک نوکری سوجھ گئی۔ اگر میں دوسرے بچوں کو اس طرح پڑھا رہا ہوتا تو اس کا معاوضہ ملتا۔ اگر میں ٹیوشنیں پڑھانا شروع کر دوں تو نوکری سے زیادہ کما سکتا ہوں۔

وہ گھر گھر جا کر ٹیوشنیں پڑھاتا رہا۔ گھر سے ٹیوشن تک شاعری کی دیوی اس کا ہاتھ پکڑے چلتی رہی۔ غزلوں پر غزلیں ہوتی رہیں۔ وہی روایتی غزلیں جو ان دنوں رائج تھیں۔

اس مدرسی کے بعد جو وقت بچ رہتا وہ دوستوں کی نذر ہو جاتا۔ ایسی ہی ایک محفل میں منہاج الدین مینائی نے عربی شاعری کا تذکرہ چھیڑ دیا۔ وہ ان دنوں عالم (عربی) کی

www.urduchannel.in

درسیات پڑھ رہے تھے۔ معلقات سبع، نقد الشعر، نہایت الایجاز اور دیوانِ حماسہ وغیرہ مطالعے میں تھیں۔

یہ دنیا ہی دوسری تھی۔ شاؔد کی ان کتابوں تک رسائی ہو ہی نہیں سکتی تھی کیونکہ وہ عربی نہیں جانتا تھا۔ اب جو منہاج الدین نے عربی اشعار سنائے اور ان کا ترجمہ کیا تو اسے اپنی شاعری میں گل و بلبل کے سوا کچھ بھی نظر نہ آیا۔ نہ منظر نگاری نہ حقیقت کی عکاسی۔

اس نے گھر آ کر بہت غور کیا اور یہ سوچنے لگا کہ شاید اسے فنِ شاعری پر عبور نہیں اس لیے اس کی شاعری بے وقعت ہے لیکن کچھ ہی دیر بعد اسے اپنے خیال کی تردید خود کرنی پڑ گئی۔ اگر میں نو آموز ہوں تو رام پور کے اساتذۂ سخن تو پختہ کار ہیں۔ ان کی شاعری بھی تو نری تخیلاتی ہے۔ وہ بھی تو زمین پر رہ کر آسمان کے قصے بیان کرتے ہیں۔ لطف یہ ہے کہ سب ایک ہی سی باتیں کرتے ہیں۔ کیا سب ایک ہی محبوبہ کے عاشق ہیں؟ اسے یہ سوچ کر ہی ہنسی آ گئی۔

دھوبی اس وقت کپڑے لایا تھا۔ اس نے کپڑے تبدیل کیے۔ سرخ رومال قمیص کے کالر میں لگایا، جواہر کٹ گلے میں ڈالی، رام پوری ٹوپی قدرے ترچھی کر کے سر پہ رکھی اور گھر سے نکل گیا۔ وہ کئی دن سے ''ص'' بیگم کی طرف نہیں گیا تھا لیکن آج دھلے ہوئے کپڑے دیکھ کر اس کا دل للچا گیا۔

''امی جان کو میری شادی کی فکر ہونے لگی ہے۔'' ''ص'' بیگم نے کہا۔

''یہ تو اچھی بات ہے۔ انھیں فکر نہیں ہو گی تو کسے ہو گی۔'' شاد نے کہا۔

''اللہ مذاق چھوڑیے۔ آپ تو شاعر ہیں۔ آپ کو کسی کے دل کی پروا ہی نہیں۔''

''یہی تو مصیبت ہے کہ میں شاعر ہوں۔ اتنا بے درد نہیں ہو سکتا کہ اپنی خوشی کے لیے دوسروں کو مصیبت میں ڈال دوں۔ کسی معقول آمدنی کا ذریعہ تک نہیں ہے، پھر میں کیسے تمھیں مانگ لوں۔''

''تو آپ کہیں ٹک کر نوکری کیوں نہیں کرتے؟''

''کیا کروں، خوشامد میری عادت نہیں اور زمانہ اسی کا ہے۔''

''ساری دنیا آخر نوکریاں کر ہی رہی ہے۔''

''کوشش کروں گا، صرف تمھارے لیے۔''

''آپ تو ناراض ہو گئے۔'' اس نے شاد کے کندھے پر سر رکھ دیا۔

''تم ٹھیک کہتی ہو، اس میں خفا ہونے کی کیا بات ہے۔''

''میں نے رومال پر اپنے ہاتھ سے آپ کا نام کاڑھا ہے۔'' وہ دوڑ کر گئی اور کہیں سے وہ رومال لے آئی ''یہ دیکھیے۔ اچھا ہے نا؟''

''مجھے بہت چاہتی ہو؟''

''آپ اب بھی پوچھ رہے ہیں۔ اتنا چاہتی ہوں کہ اگر کسی اور کی ہو گئی تو زہر کھالوں گی۔''

شاد نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا ''ایسی بری باتیں منہ سے نہیں نکالتے۔ کیا خبر کل قسمت کیا دکھائے۔''

......☆......

منہاج الدین مینائی کے پاس ''معلقاتِ سبع'' دیکھ کر اس کا جی للچا گیا۔ اس نے وہ نسخہ مستعار لے لیا۔ وقت کی کمی نہیں تھی، اس نے توے کا حقہ جلایا اور مطالعہ کرنے بیٹھ گیا۔ چائے کی کیتلی چولھے پر چڑھتی رہی، اترتی رہی۔ اس نسخے میں رزم کے واقعات بھی تھے، بزم کے بھی۔ مکارمِ اخلاق کا بیان بھی تھا اور عیش و تنعم کی داستان بھی۔

عربی ادب سے واسطہ پڑنے کے بعد اسے معلوم ہوا کہ غالب، میر، سودا، حالی، جرأت، اکبر اور ڈاکٹر اقبال سے ہٹ کر اردو ادب میں دھول اڑتی ہے۔ اردو شاعری میں واقعیت کے فقدان نے اسے پریشان کر دیا۔ وہ سوچنے بیٹھ گیا اور اس نتیجے پر پہنچا کہ خوب صورتی کے ساتھ واقعیت کو مصور کرنا آسان کام نہیں۔ پھر بھی اس نے کوشش جاری رکھی۔ شعرائے جاہلیت کی طرفہ کاری نے اسے دوسروں سے بچ کر اپنی راہ الگ نکالنے کی تلقین کی۔

مثل مشہور ہے۔ ڈھونڈے سے خدا ملتا ہے۔ اس نے شاعرانہ موضوعات کی

www.urduchannel.in

روایتی عمارت ڈھا دی اور یہ دکھایا کہ خلاقانہ ذہن کے لیے ہر موضوع شعر کا موضوع بن سکتا ہے۔ اس نے اپنی اور ''ص'' بیگم کی محبت کے حقیقی واقعات و واردات کو اپنی عشقیہ غزلوں کا موضوع بنایا۔

اس نے برسرِ مشاعرہ اعلان کیا:

دوسروں کے واقعاتِ عشق اپناتے ہیں وہ
جن سخن سازوں کی اپنی داستاں کوئی نہیں

اس کو اپنی محبت پر ناز تھا۔ حقیقی تجربات اور شاد کی قدرت اظہار نے رام پور کی طرزِ شاعری میں ایک نئی طرز کا اضافہ کر دیا۔ اب اس کے اشعار، مواد اور اسلوب ہر دو اعتبار سے منفرد نظر آنے لگے۔

اس نے اب تک کے اشعار پر مبنی دیوان اٹھایا اور نذرِ آتش کر دیا۔ کئی سال کی کمائی نے ایک دن کی چائے بنا دی لیکن اب اسے فکر نہیں تھی۔ اب ایسے ایسے اشعار اس کے پاس تھے۔

بدلی ایسی زلف کی لٹ میں شامل کر کے الجھن کوئی
میری خاطر ناپ رہا ہے، بال سکھانے آنگن کوئی

ابھی انگڑائیاں لی جا رہی ہیں
سمجھتے ہیں ابھی دیکھا نہیں ہے

....

بھرا گھر جس کی شوخی اور طراری کی قائل ہے
مجھے دیکھا کہ اس پر ہو گئی سنجیدگی طاری

....

گدگدائے نہ بنے ہاتھ لگائے نہ بنے
بن کے لیٹی ہو جوانی تو اٹھائے نہ بنے

....

لکھ کر میرا نام اے شآد
اس نے بھیجا ہے رومال

....

وہ چشمِ نیم خواب، وہ زلفیں گری ہوئی
صبحِ بہار ایک ہی انگڑائی کی ہوئی

....

مخاطب ہے وہ ایسے زاویے سے
جسے دیکھو مرا منہ تک رہا ہے

....

بھولی سی ہم مکتب کوئی، کوئی سہیلی خالہ زاد
ان کے ہاتھوں خط بھجواتے میں ڈرتا ہوں لیکن وہ

ان غزلوں میں اس کی محبوبہ متوسط طبقے کی ایک ہندوستانی لڑکی تھی جو ذہین وطرار بھی تھی اور الھڑ اور معصوم بھی۔ یہ لڑکی اس کی خاطر بال سکھانے کے بہانے آنگن ناپتی ہے۔اسے رجھانے کے لیے مسلسل انگڑائیاں لیتی ہے۔رومال پر اس کا نام کاڑھ کر اسے دیتی ہے۔اس کے لیے چھپ چھپ کر دعائیں مانگتی ہے۔

سادہ سے واقعات تھے مگر حسن اور حرارت سے بھرپور۔واقعات کے ساتھ ساتھ محبت اور نفسیات کی سچی تصویریں بھی اس نے پیش کیں۔

شریکِ راہِ محبت ہے طبعِ موزوں شآد
ہر ایک شعر مرا حسب حال ہوتا ہے

داغؔ اور امیرؔ کی نقالی کرنے والے اس کی اس اختراع کو کیسے برداشت کر سکتے تھے۔اساتذہ نے اسے شاعر ماننے ہی سے انکار کر دیا۔اس کے ہم عصر پہنچے بھی تو اس نتیجے پر پہنچے کہ اس کے پاس تخیل کی بلند پروازی نہیں ہے اسی لیے وہ ان چھوٹے چھوٹے واقعات کو بیان کر رہا تھا۔

www.urduchannel.in

وہ اپنی دانست میں ان واقعات کو مصور کرنے کے فرائض انجام دے رہا تھا لیکن ناقدریِ عالم کا برا ہو کہ اب وہ ہر مشاعرے سے ناکام واپس آ رہا تھا۔

اسے یہ فکر تھی:

شآد مجھے یہ دھن رہتی ہے
اپنا نغمہ، اپنی لے ہو

ناقدریِ عالم کا یہ حال۔

ذہنوں سے رعونت کا جنازہ نہیں جاتا
شاعر کو ڈراتے ہیں نوازا نہیں جاتا

وہی اساتذہ جو ابتدائے شاعری میں اس کے مداح تھے،اس تبدیلی پر چراغ پا ہو گئے۔اس کی یہ ایسی جسارت تھی جسے اس کی کم علمی کا شاخسانہ سمجھا گیا۔

''میاں،اساتذہ کا مطالعہ کیا ہو تو معلوم ہو،شعر کیسے کہتے ہیں۔''

''محبوبہ نے رومال کاڑھ کر بھیج دیا اور موصوف نے اسے شعر میں بیان کر دیا۔یہ کوئی شاعری ہوئی۔''

''شاد کو یہ ہو کیا گیا ہے۔وہ شاعری کر رہا ہے یا ڈائری لکھ رہا ہے۔محبوبہ بال سکھانے کے لیے آنگن میں گھوم رہی ہے۔تکیے پر دُلائی ڈال کر اس سے ملنے آ گئی ہے۔حضرت داغ نے بھی یہی کیا تھا لیکن ان کی غزلوں میں طوائف کا کردار ابھرتا تھا۔اس طرح شریف لڑکیوں کو انھوں نے بدنام نہیں کیا تھا۔''

اب اس کے شعروں پر داد ملنے کے بجائے قہقہے لگتے تھے۔اس نے کئی مرتبہ تنہائی میں بیٹھ کر سوچا کہ کہیں وہ غلطی پر تو نہیں لیکن ہر مرتبہ اسے اپنا راستہ درست نظر آیا۔وہ اپنی غزل کا خود عاشق ہو گیا۔جو معاملات دورانِ عشق پیش آتے،انھیں دہرانے میں اسے ایک خاص لطف آنے لگا تھا۔یہ معلوم ہوتا تھا جیسے وہ اپنے کسی ہم راز سے اپنے دل کی باتیں کہہ رہا ہو۔اس نے عرب کے دورِ جاہلیت کے شعرا کو بار بار پڑھا اور ہر مرتبہ اس نتیجے پر پہنچا کہ شاعری حقیقت کو مصور کرنے ہی کا دوسرا نام ہے۔اگر میں اس طرح کسی انفرادیت کا اظہار

کر رہا ہوں تو کیا حرج ہے۔دُنیا مخالف ہوتی ہے تو ہوا کرے۔ وہ اپنی غزلوں میں انفرادیت کے پھول بکھیرتا رہا۔اس نے روایتی غزل کے مروجہ علائم و رموز سے روگردانی کرتے ہوئے غزل کی مخصوص رمزیت اور اشاریت سے دانستہ پہلوتہی کی اور موضوع کی براہِ راست ترجمانی کا فن اختیار کیا۔ نتیجے کے طور پر اس کی غزل کسی حد تک ان لوازمات کی پیدا کردہ پہلوداری اور اس پس منظر کے ایک حصے سے محروم بھی ہوگئی جو غزل کی روایت عام اشعار کو فراہم کرتی ہے۔اس کی غزلوں میں وہ شے بھی نظر نہیں آتی تھی جسے اساتذہ خالص تغزل کا نام دیتے تھے۔یہی وہ فاصلہ تھا جو اس کے اور رام پور کے روایت پسند اور تغزل پسند شاعروں کے درمیان پیدا ہوگیا۔اس کے اندر چھپے ہوئے پٹھان نے اس صورتِ حال میں اسے خم ٹھونک کر میدان میں آنے کی دعوت دی۔وہ مزید تیز رفتاری سے اس راہ پر گامزن ہو گیا۔اس نے مروج تشبیہات کو ترک کر کے اپنی تشبیہات استعمال کیں۔

مقابل قد آدم آئنہ ہے
بڑا دلچسپ مطلع لڑ رہا ہے

....

اسے نسیمِ چمن کہہ رہا ہوں میں ، لیکن
کہیں نسیمِ چمن مڑ کے دیکھتی بھی ہے

....

بن اندھیرے غزالِ یار کہاں
چاندنی رات میں شکار کہاں

اس نے نئی نئی تراکیب اُردو غزل کے سپرد کر دیں۔''محمل گرد باد''،''ترنمِ صبح گلستاں''،''چشم جلوہ جو''،''شجر سکوت فروش''وغیرہ۔

روایتی نامہ بر کی جگہ کسی بھولی سی ہم مکتب یا خالہ زاد سہیلی سے خط بھجوانے، بن کے لیٹی ہوئی جوانی کو گدگدانے، بال سکھانے کے بہانے آنگن ناپنے اور بُتانِ کوئے دوست کے کھڑکیوں سے جھول جانے کی باتیں کرنے کی جسارت کی۔اس جسارت کی سزا شدید مخالفت کی صورت میں اسے ملی۔

www.urduchannel.in

تغزل چشیدہ بزرگوں کی پیشانی،اس کی غزلوں میں ایسے الفاظ کو دیکھ کر شکن آلود ہو جاتی تھی''جوتے جھاڑ لینا''،''بندی''،''سانولا رنگ''،''ڈاک''،''کارن''،''بابو جی''، ''روپ دھارنا''،''کروٹن کے گملے''۔یہ الفاظ وہ غزل جیسی نازک صنف میں اختیار کر رہا تھا لیکن اس خوب صورتی سے۔

ڈاک سے بھینی خوشبو والے خط پر خط آئے تو اک دن
پوچھے گا خط لانے والا، بابو جی! یہ خط کس کا ہے

....

دیکھ پاتے ہیں جو ہم کو درمیانِ کوئے دوست
کھڑکیوں سے جھول جاتے ہیں بُتانِ کوئے دوست

....

کام کی شے ہیں کروٹن کے یہ گملے اے دوست
وہ نہ دیکھے مجھے میں اس کا نظارہ کر لوں

اتنی فرصت کسے تھی کہ کوئی اس انفرادیت کی اہمیت کو سمجھتا۔رام پور کے سخت گیر ماحول میں اس جسارت کو بدعت سمجھا گیا۔اس بدعت کی سزا اسے یہ ملی کہ وہ دوسروں کے معمولی درجے کے شعروں پر شور مچتے ہوئے دیکھتا رہا۔

یہ اس کا ذاتی دکھ تھا لیکن دکھ اور بھی تھے جو اسے اندر ہی اندر کاٹتے جا رہے تھے۔ وہ بڑے چاؤ سے اپنے بھائی کے بچوں کو اپنے گھر لے کر آیا تھا لیکن چند ٹیوشنوں سے ان کی تعلیم کا بہتر بندوبست نہیں ہو سکتا تھا۔اس نے گھبرا کر مقامی شکر فیکٹری میں ملازمت کر لی۔دن بھر کارخانے میں مغز کھپاتا،شام کو ٹیوشنیں پڑھانے نکل جاتا،رات گئے تک فکر سخن میں مشغول رہتا۔اس نے اپنی ہر خوشی کو تج کر اپنے بھتیجے کی تعلیم کا بندوبست کر دیا۔

اس نے اپنی عمر کے ابتدائی اٹھارہ سال تک گھر کا جو نقشہ دیکھا تھا،اس میں نانا لوہارو کے والیِ ریاست کے بچوں کے اتالیق تھے اور باپ تھانے دار۔ ماں کے نانا ریاست کے مشہور سردار تھے اور ماموں شہر رام پور کے کوتوال۔فطری طور پر اس نے اپنے

مستقبل کے بارے میں ابتدا ہی سے خوش آئند خواب دیکھے ہوں گے اور معاشرے میں اپنے لیے نمایاں جگہ کی توقع کی ہوگی لیکن ہوا یہ کہ نوعمری ہی میں اس پر ایک ایسے خاندان کا بوجھ آپڑا جو ضعیف ماں اور بڑے بھائی کے بے سہارا بچوں پر مشتمل تھا۔

نتائج اس کے تصورات کے برخلاف پیش آئے۔ اس نے مسند نشیں ہونے کی خواہش میں شاعری شروع کی تھی لیکن اب وہ ایک گوشے میں بیٹھا خود پر ہونے والی تنقید سن رہا تھا۔ معاشرے میں کسی اعلیٰ مقام کا خواہش مند، شوگر فیکٹری میں معمولی سی ملازمت کرنے پر مجبور تھا اور گھر گھر جا کر ٹیوشنیں پڑھا رہا تھا۔

......☆......

''ص'' بیگم سے اس کی محبت کے چرچے اب خاندان میں عام ہو گئے تھے۔ اب شاد کا اس کے گھر جانا آسان نہیں رہا تھا۔ انگلیاں اٹھتی تھیں، باتیں بنتی تھیں۔ ''ص'' بیگم پر بھی پابندیاں سخت ہو گئی تھیں۔ وہ جس آزادی سے اس کے گھر آجاتی تھی، اب نہیں آسکتی تھی۔ اس نے کئی دن سے اسے دیکھا تک نہیں تھا۔

کئی دن سے اسے دیکھا نہیں ہے
میں کچھ بیمار ہوں ایسا نہیں ہے
بُتانِ دہر سے شکوہ نہیں ہے
اگر ہے بھی تو کچھ بے جا نہیں ہے
کہاں ہیں شاکیِ انجامِ الفت
یہاں آغاز ہی اچھا نہیں ہے
ترے قدموں پہ موزوں ہے مرا سر
جہاں جو چیز ہے بے جا نہیں ہے
تجھے اے شادؔ خودداری مبارک
مگر دنیا کا یہ شیوہ نہیں ہے

اس کی ذمے داریوں نے اسے اتنا موقع ہی نہیں دیا تھا کہ وہ اپنے بارے میں

www.urduchannel.in

سنجیدگی سے سوچتا۔ وہ تو اس وقت چونکا جب ''ص'' بیگم کی نسبت طے ہو جانے کی خبریں اس تک پہنچنے لگیں۔ اس نے ہمت کر کے ماں سے بات کی۔ اس نے کیا بات کی، ماں نے خود اس کی بے کلی بھانپ لی۔

گرمیوں کے دن تھے۔ وہ پلنگ پر لیٹی پنکھا جھل رہی تھیں۔ ان کا پوتا ان کے قریب بیٹھا اسکول کا کام کر رہا تھا۔ شاد بہت دیر سے اس فکر میں ٹہل رہا تھا کہ موقع ملے تو وہ بات چھیڑے۔ موقع نہ ملنے کا تو بہانہ تھا، الفاظ اس کا ساتھ ہی نہیں دے رہے تھے۔

''لڈن، کیا بات ہے۔ تو کچھ پریشان دکھائی دے رہا ہے؟'' اس کی ماں نے پوچھا۔

''کچھ نہیں اماں۔ بس یونہی۔''

''پھر کیا میرا کمرا گاندھی پارک ہے جو ٹہل رہے ہو۔ کوئی بات تو ہے۔ میرے بچے، مجھ سے نہیں کہے گا تو کس سے کہے گا۔ بتا کیا بات ہے؟''

''اماں وہ ''ص'' بیگم۔''

''مجھے معلوم تھا، تم اسی کی بات کرو گے۔ اس کی نسبت طے ہونے والی ہے۔''

''لیکن۔'' وہ اس سے آگے کچھ نہ کہہ سکا۔

''وہ ہمارے نسب کی نہیں ہے۔ تمھارے معیار کی نہیں ہے۔ ہماری رشتے دار ضرور ہے۔ لیکن ذات کے اعتبار سے ہم سے کم تر ہے۔''

''اماں، یہ ذات برادری کے بندھن کب تک چلتے رہیں گے۔''

''بیٹا، تجھے یاد ہے؟ تیرے بڑے بھائی سے میں قطع تعلق کر چکی ہوں۔ اسے دیکھنے کے لیے میری آنکھیں ترس گئی ہیں۔ میں نہیں چاہتی کہ تم بھی کوئی ایسا ہی قدم اٹھاؤ اور میں تمھیں دیکھنے کو ترس جاؤں۔ بس اسے بھول جا، میرے بچے۔'' وہ اسے لپٹا کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔

اب اس کے سوا اس کے سامنے کوئی راستہ نہیں تھا کہ وہ اسے بھول جائے۔ یہ اتنا آسان نہیں تھا کہ ماں نے کہا، بھول جا اور وہ بھول جائے۔ بچپن کی محبت دل کے ایک ایک

کونے میں آباد ہو چکی تھی۔ گھر کا ایک ایک کونا اس کی موجودگی کی خوشبو سے بسا ہوا تھا۔ وہ دیوانوں کی طرح اس کے تصور سے باتیں کرتا اور پھر گھبرا کر گھر سے باہر نکل جاتا۔ اسے اپنی بے قراری کے ساتھ ساتھ یہ غم بھی تھا کہ خود ''ص'' بیگم پر کیا گزر رہی ہوگی۔

میں تو غزلیں کہہ کر دل بہلا لیتا ہوں لیکن وہ؟
شہرِ سخن میں بدنامی سے بے پروا ہوں لیکن وہ؟
گاندھی پارک سے کوسی پل تک جاتا رہتا ہوں لیکن
جس جا چاہا جب تک چاہا میں بیٹھا ہوں لیکن وہ؟
مال، سول لائن، اسٹیشن، ڈگری کالج نہرو باغ
ہر کالے برقع سے دھوکا کھا جاتا ہوں لیکن وہ؟
نسوانی فطرت کو شامل رہتے ہیں الفت کے راز
جس نے پوچھا، اپنا قصہ لے بیٹھا ہوں لیکن وہ

خاندان میں ایک شادی تھی۔ وہ بھی مدعو تھا اور ''ص'' بیگم بھی آئی ہوئی تھی۔ پردے کا دستور تھا لیکن یہ تو خاندان کی بات تھی۔ ''ص'' بیگم کی نسبت کہیں اور طے ہو چکی تھی لیکن شآد کی محبت ابھی تک پھانس کی طرح اس کے دل میں چبھی ہوئی تھی لہٰذا کئی مواقع ایسے آئے کہ دونوں کا آمنا سامنا ہو گیا۔ صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ ''ص'' بیگم یہ مواقع خود نکال رہی ہے لیکن اقربا جمع تھے، بات کرنے کا موقع کہاں مل سکتا تھا۔ اتنا البتہ ہوا کہ جب بھی سامنا ہوا ''ص'' بیگم کی بھیگی آنکھوں نے ہر بات کہہ دی۔ ''کاش! یہ شادی ہماری ہوتی۔ نوشاہ تم ہوتے، عروس میں ہوتی۔ تم برات لے کر آتے، عزیز و احباب دل بچھاتے۔ اسی طرح رسمِ مصحف و آئینہ ہوتی۔ میں آنکھیں بند کیے بیٹھی ہوتی۔'' خود شاد کا حال بھی یہی تھا۔ اسے بھی نصیبِ نوشہ پہ رشک آ رہا تھا۔ وہ بھی اس کی جگہ خود کو بیٹھا ہوا دیکھ رہا تھا۔

امین و نجمہ کی رات شادی تھی، میں بھی مدعو تھا اور وہ بھی
مسرتِ عقد پر مری طرح دل میں کرتی تھی غور وہ بھی
علاج بالضد کے طور پر اس کی اور سے ہو چکی ہے نسبت

www.urduchannel.in

مرے جنونِ الم کے مندر کی بھینٹ ہے 'راشدہ کی قسمت'
گزر چکا ہے ہمارے مستقبلِ محبت کے سر سے پانی
اتھاہ ساگر سمان، حائل ہیں اختلافاتِ خاندانی
سماج، خود سر سماج، دو ہستیاں مٹانے پہ تل چکی ہے
یہ جہالت میں آبروئے مراسمِ کہنہ گھل چکی ہے
وہ اس کے ہوں اقربا کہ میرے دماغ ان سب کے چل چکے ہیں
دوامِ الفت کے پاک جذبے قدامتوں سے کچل چکے ہیں

....

خیال آیا امین کی طرح میں بھی آتا کسی کے گھر پر
عزیز و احباب دل بچھاتے خفیف سی جنبشِ نظر پر
اسی طرح رسمِ مصحف و آئنہ سے حیرت دوچار ہوتی
نہ کھولتی آنکھ کہنے سننے سے وہ مگر بے قرار ہوتی
نویدِ رخصت کے ساتھ عذرائے آرزو میرے ساتھ ہوتی
جو عہدِ الفت میں ہاتھ کٹوا چکی تھی وہ میرے ہاتھ ہوتی

....

یہ خواب تھا یا طلسمِ حیرت، سحر کو اس وقت ہوش آیا
امینِ اذنِ وداع کے بعد جب نظر گل بدوش آیا
جھکی ہوئی شاخِ نارِ دن یا عروسِ نو کو دیے سہارا
مرے برابر سے میری حالت پہ مسکراتا ہوا سدھارا
نظر اٹھائی جو میں نے دیکھا اُسے کہ مایوس ہو رہی ہے
امین و نجمہ کو دیکھ کر مجھ کو دیکھ لیتی ہے رو رہی ہے

....

یہ شادی اس کے زخموں پہ نمک چھڑک گئی۔ وہ اقربا کی ناانصافی پر جھنجلا کر رہ گیا۔ یہ

سماج کیسا ہے؟ یہ بندھن کیوں ہیں؟ ہم ایک دوسرے کے کیوں نہیں ہو سکتے؟ کیا میں بغاوت کر دوں؟ یہ سوچتے ہی اس کی آنکھوں تلے اندھیرا پھیل گیا۔ میری بوڑھی ماں کا کیا ہوگا۔ ان بچوں کا کیا ہوگا جنھیں میں اپنی کفالت میں لایا تھا۔ اگر میں بغاوت کر بھی دوں تو ''ص'' بیگم لڑکی ہونے کے ناتے اپنے پنجرے سے کیسے نکل سکے گی۔ رات بھر وہ چولھے کے سامنے بیٹھا رہا۔ چائے کی کیتلی اس کی آگ سے گرم ہوتی رہی۔ چائے کے گھونٹ، خون کے گھونٹ بن کر اترتے رہے۔ بیڑیاں پیتا رہا، دل جلاتا رہا۔ صبح تک مجبوریوں کی رسی سے اس کے ہاتھ بندھ چکے تھے۔ ''مجھے یہ قربانی دینی ہوگی۔ ''ص'' بیگم میرے مقدر میں نہیں تھی۔''

قسمت نے ایک اور پتھر پھینکا۔ اس کی شادی ہو رہی تھی۔ نسبت طے ہوئی تھی تو شادی بھی ہوتی۔ وہ ذہنی طور پر تیار بھی تھا لیکن اس خبر نے اسے دہکا دیا۔ یہ شادی کچھ دنوں بعد بھی تو ہو سکتی تھی۔ اتنے دن بعد کہ میں اسے بھول تو جاتا۔ چلو، جو ہوا وہ تو ہونا ہی تھا۔ کل کے رونے سے آج کا رونا اچھا۔

وہ ابھی دل پر گھونسے مار مار کر اسے چپ کرانے کی کوشش کر رہا تھا کہ ''ص'' بیگم کی ایک رازدار سہیلی گھبرائی ہوئی آئی۔

''خدا کے لیے اس کی جان بچا لو۔''

''بڑے اس کے ہوں یا میرے، وہ ہماری مجبوریوں کو نہیں سمجھتے۔ میں اس سے کس طرح شادی کر سکتا ہوں؟''

''شادی مت کرو مگر اسے سمجھا تو سکتے ہو۔ اس نے کہہ دیا ہے وہ زہر کھالے گی۔ وہ آخری مرتبہ تمھیں دیکھنا چاہتی ہے۔''

شاد تو اٹھنے کے بجائے گرتی ہوئی دیوار کی طرح بیٹھ گیا ''ص'' بیگم نے ایک مرتبہ کہا تھا، اگر تم مجھے نہیں ملے تو میں زہر کھالوں گی۔ تو کیا وہ وقت آ گیا ہے۔ اگر ایسا ہو گیا تو دونوں خاندانوں کی کیسی رسوائی ہوگی۔ اس نے پاؤں میں سلیپر ڈالے اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

''تم مجھے اس کے پاس لے کر چل سکتی ہو؟''

''ابھی نہیں ذرا رات گہری ہو جائے۔''

www.urduchannel.in

''نہیں، میں وقت ضائع نہیں کر سکتا۔ مجھے ابھی جانا ہوگا۔''

''ابھی تو سب لوگ جاگ رہے ہوں گے۔''

''میں چور نہیں ہوں جو سب کے سونے کا انتظار کروں۔ تم اس کے ارادے، اس کی ماں پر ظاہر کر دو۔ ان سے کہنا میں اسے سمجھانے آیا ہوں۔ اگر یہ رات گزر گئی تو وہ دنیا کو سمجھاتے سمجھاتے خود زہر کھالیں گی۔''

وہ ''ص'' بیگم کے گھر پہنچا تو لڑکیاں گانے بجانے میں مصروف تھیں۔ کسی کے ارمان مر گئے تھے، دنیا کو خبر ہی نہیں تھی۔

''ص'' بیگم کی زندگی کا سوال تھا لہٰذا اس کے بڑوں نے اپنی ضد کے کچھ بند ڈھیلے کر دیے۔

وہ مائیوں کے پیلے جوڑے میں ملبوس، گٹھری بنی بیٹھی تھی۔ قدموں کی چاپ پر اس نے سر اٹھا کر دیکھا اور دوڑ کر شاد سے لپٹ گئی۔

''مجھے اس قید خانے سے رہائی دلا دو۔ مجھے یہاں سے کہیں لے چلو۔ ان سب کی نظروں سے دور۔''

''میں اسی لیے آیا ہوں۔ تم بیٹھو تو۔''

''سچ! تم کتنے اچھے ہو شاد۔'' اس نے بیٹھتے ہوئے کہا۔ شاد کا ہاتھ ابھی تک اس کے ہاتھ میں تھا۔

''میری بات غور سے سننا ''ص'' بیگم!'' شاد نے کہا ''ہم جس دقیانوسی معاشرے میں رہتے ہیں وہاں کسی کو کسی کی خوشی کا خیال نہیں۔ یہ دیمک لگی دیواریں روایات کے سہارے کھڑی ہوئی ہیں۔ اگر ایک مرتبہ ہم اس گھر سے نکل گئے تو نہ تم واپس آ سکو گی نہ میں۔ چوروں کی طرح زندگی گزارنے سے کیا حاصل لہٰذا یہ خیال چھوڑ دو۔ تم نے اگر ایسا کیا تو تمھارے بعد تمھارے خاندان کی کسی لڑکی کی شادی نہیں ہو سکے گی۔ یہ کتنی بڑی خود غرضی ہوگی کہ تم اپنی خوشی کی خاطر سب کا مستقبل تاریک کر دو۔''

''پھر میں کیا کروں، میرے شاد؟''

''میرا دل تو دیکھو کہ میں اپنے منہ سے کہہ رہا ہوں، تم پرائی ہو جاؤ۔ بڑوں کا دل رکھ لو۔ شادی کے بعد کبھی بھول کر بھی مجھے یاد مت کرنا۔''

''میں تمھاری طرح کا دل کہاں سے لاؤں۔'' وہ پھر سسکنے لگی ''میں زہر کھا لوں گی۔ میں نے اس کا انتظام بھی کر لیا ہے۔ میں اب تک خاموش تھی۔ میں سوچتی تھی شاید دل کو قرار آ جائے گا لیکن میں تمھیں بھول نہیں سکی۔''

''زہر کھانے سے کیا فائدہ ہوگا۔ کیا تم مجھے پانے کے لیے زندہ ہوگی؟ کیا لوگوں تک یہ بات پہنچتے دیر لگے گی کہ تم نے کس کی خاطر یہ حرکت کی؟ کیا تمھارا شاد پھر رام پور میں رہ سکے گا؟''

یہ عجیب ملاقات تھی اور عجیب نصیحت۔ وہ جب رخصت ہوا تو آنسوؤں کی بارش میں ''ص'' بیگم نے اس سے وعدہ کیا کہ وہ اس کی خاطر اپنے دل پر پتھر رکھ کر کسی اور کا گھر آباد کر لے گی۔

''کیا ہوا بھیا، وہ مانی؟'' باہر نکلتے ہی ''ص'' بیگم کی ماں نے اس سے پوچھا۔

''آپ مطمئن رہیں، آپ کی عزت برقرار رہے گی۔'' اس نے کہا اور تیزی سے اس گھر سے باہر آ گیا۔

گلی میں اندھیرا پھیلا ہوا تھا۔ اس نے دونوں ہتھیلیوں سے اپنی آنکھوں کے آنسو پونچھے اور ''ص'' بیگم کے گھر سے دور ہوتا چلا گیا۔

''کہاں گیا تھا لڈن؟'' اس کی ماں نے گھر میں گھستے ہی اس سے پوچھا۔

''ص'' بیگم کے گھر گیا تھا۔ وہ زہر کھا رہی تھی۔ اسے روکنے گیا تھا تاکہ ہم پٹھانوں کی ناک نیچی نہ ہو جائے۔''

''اچھا کیا۔ اب ایسا کرو، تھوڑا سا زہر تم کھا لو۔ شرم نہیں آتی ماں سے یہ کہتے ہوئے کہ تم اپنی آشنا سے ملنے گئے تھے۔''

''اچھا اماں۔'' اس نے کہا اور چھت پر چلا گیا۔

یہاں بھی اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔ اندھیرا روز ہی ہوتا تھا لیکن آج تو اس کی آنکھیں

کچھ دیکھ ہی نہیں رہی تھیں۔

دھرا ہوا ہے جہالت کے سر پہ تاج ابھی
نہیں عروس کی آزادیوں کا راج ابھی
دلوں کے بھید سے واقف کہاں سماج ابھی
محبتوں میں تباہی کا ہے رواج ابھی
جو فرق حسنِ اطاعت پہ حسرتیں تج دو
تو والدین کی مرضی پہ زندگی تج دو

....

ہوا ہوں آج میں گستاخ اس کی شادی سے
بدل گئی جو مرادوں کو نامرادی سے
چُرا رہا ہوں نگاہیں خود اعتمادی سے
پرے ادب مری اس نظمِ بے ارادی سے
سماج نقد و نظر کے لیے سنبھل جائے
سناؤں گا وہ حقیقت کہ جی دہل جائے

....

لکھا یہ اس نے کہ اب زہر کھا رہی ہوں میں
غمِ مآل سے پیچھا چھڑا رہی ہوں میں
اب آؤ جلد کہ دنیا سے جا رہی ہوں میں
متاعِ شادیِ بے جا لٹا رہی ہوں میں
سُجھائے جا کے جو میں نے اسے نشیب و فراز
گلے میں ڈال کے بانہیں کیا قبول نیاز

....

سماج ہم پہ تو یہ ظلم کر چکا لیکن
وہ آ گیا ہے زمانہ قریب ہیں وہ دن

www.urduchannel.in

جہاد کے لیے اٹھیں گے نوجواں ہم سن
بہے گی چار طرف سیلِ جذبۂ باطن
نہ ہو سکے گا کہیں اختیارِ نفس پہ جبر
کرے گا اپنی حماقت پہ اذنِ بے جا صبر

آج ایسی بے کلی تھی کہ بیڑیاں بھی اس کا ساتھ چھوڑ گئیں۔ اس نے حقہ تازہ کیا اور ٹھنڈے چولھے کے سامنے جا کر کھڑا ہو گیا۔ حقے کے لیے آگ جلانی تھی۔ وہ کچھ دیر کھڑا سوچتا رہا اور پھر ایک عالمِ وحشت میں اپنا دیوان اٹھا لایا۔ مسودے کو چولھے میں رکھا اور ماچس دکھا دی۔ ایک دیوان کی قیمت ایک حقے کے چند کش۔ یہ اس کا تیسرا دیوان تھا۔ اس سے پہلے دو دیوان اس کی کسی دیوانگی کی نذر ہو چکے تھے۔

اب نہ بُت خانے سے مطلب ہے نہ کعبے سے
لگاؤ
کفر سے بھی ہاتھ دھویا کھو دیا ایمان بھی
آشیاں ، بجلی، قفس، صیاد، بلبل، الغرض
نذرِ آتش کر رہا ہوں تیسرا دیوان بھی

صبح تک اس کی حالت ایسی ہو گئی جیسے کوئی اپنا نام بھول گیا ہو اور اسے یاد کرنے کی کوشش میں لگا ہوا ہو۔ وہ پاگل تو نہیں ہو گیا تھا لیکن ہوش میں بھی نہیں تھا۔

ویران آنکھوں میں کئی راتیں جل بجھ چکیں تو اس کے دوستوں کو فکر ہوئی۔ وہ اسے عمی میاں کے پاس لے گئے جن سے وہ کبھی فارسی پڑھ چکا تھا۔ وہ حکیم بھی تھے اس لیے انھوں نے علاج بھی تجویز کر دیا۔ یہ مکمل دیوانگی تو تھی نہیں جس کا علاج کیا جاتا، ایک مجنونانہ کیفیت تھی جو رہ رہ کر اس پر طاری ہو جاتی تھی۔ حکیم عمی میاں نے یہ علاج تجویز کیا کہ وہ بہت سارے کبوتر پال لے، ان کی دیکھ بھال کرے اور پتنگیں اڑایا کرے۔ مقصد یہ تھا کہ دل لگا رہے، دھیان بٹا رہے۔

رام پور میں پتنگ بازوں کی کمی تھی نہ کبوتر بازوں کی۔ اس نے چھت پر

www.urduchannel.in

کابکیں بنوائیں، کبوتر بازوں کے مشورے سے مختلف النسل کبوتر خریدے اور کبوتر اڑانے لگا۔ ان دنوں اس کی بیٹھک کبوتر بازوں کے ساتھ تھی۔ چند ہی دن میں کبوتروں کے بارے میں اس کی معلومات اتنی ہو گئیں کہ اب لوگ مشورے کے لیے اس کے پاس آتے تھے۔ یہی حال اس کی پتنگ بازی کا تھا۔ دراصل وہ جو کام بھی کرتا تھا اس میں انفرادیت پیدا کر لیتا تھا۔

مستقل آسمان پر نظریں ٹکائے رہنے سے اس کا تعلق زمین سے کٹ سا گیا۔ اس بکھیڑے میں شوگر مل کی نوکری تو ہاتھ سے گئی ہی لیکن اتنا ہوا کہ اس کی دیوانگی میں کمی آ گئی۔ اس کے سامنے کھلا آسمان تھا جس کی کوئی انتہا نہیں تھی۔ آسمان کی بلندیوں پر اڑنے والے کبوتروں کے مقابلے میں زمین پر چلنے والی مخلوق اسے کم ترین نظر آنے لگی۔ وہ زمین سے اڑ کر آسمان پر نہیں جا سکتا تھا لیکن یہ تو کر سکتا تھا کہ زمین پر ہی اپنا ایک آسمان بنا لے۔

رام پور میں غزل کی چالو شاعری چل رہی تھی۔ اس نے اپنی شناخت کے لیے نظموں کی بدعت اختیار کی۔ نظمیں اگر لکھی بھی جاتی تھیں تو مشاعرے میں پڑھنے کی چیز نہیں سمجھی جاتی تھیں۔ اس کی دیوانگی نے ایسی کروٹ لی کہ اس نے نظمیں لکھیں بھی اور انھیں مشاعرے میں لے کر بھی پہنچ گیا۔

اردو شاعری میں انگریزی کے اثر سے نیچرل شاعری کا چرچا ہونے لگا تھا لیکن ابھی یہ صرف چرچا ہی تھا۔ ابھی شعرا غزل کے اثر اور فارسی کی روایت سے آزاد نہیں ہوئے تھے لہٰذا منظر نگاری کرتے ہوئے حقیقی واقعات سے زیادہ مبالغے کا سفر کرتے تھے۔ بیان کردہ مناظر میں اب بھی ایرانی فضا نظر آتی تھی جب کہ ہندوستان کے خوب صورت مناظر منہ تک رہے تھے کہ کب انھیں نظم کیا جاتا ہے۔

عربی شاعری کے اثر سے اسے واقعات کی تصویر کشی آ گئی تھی۔ وہ تو غزلوں میں بھی واقعیت پر زور دے رہا تھا۔ اب جو نظم کی طرف رُجحان ہوا تو اس نے منظر نگاری کے نام پر ہندوستان کے مناظر کی فلمیں بنا ڈالیں۔ ہندوستان کے افلاس زدہ گاؤں کی سچی تصویریں، ہندوستان کی بہار، موسم، پرندے، تیوہار اس ندرت ادا کے ساتھ بیان کر دیے

کہ وہ رام پور میں ایک الگ ہی مخلوق نظر آنے لگا۔

اب کہ سورج آ چکا تھا ٹھیک سمت الراس پر
اور سیدھی ہو کے کرنیں پڑ رہی تھیں گھاس پر
منہ اندھیرے کی طراوت ریزیِ شبنم گئی
نرم و نازک پتیوں پر گرد کی تہہ جم گئی
رنگ ونکہت کے ہوا خواہوں نے اپنی راہ لی
خوش نما پھولوں سے تتلی نے معافی چاہ لی
لو نے باندھی وہ ہوا پہلا ہی چھاپا مار کر
گاؤں کی جانب بڑھے دہقان ہمت ہار کر

....

سحر سرد کہرے میں لپٹی ہوئی
درو بام سے دھوپ چپٹی ہوئی
ہوئی سرد اونی لباسوں کی خو
دو شالوں کی جاتی رہی آبرو
فضا میں ہیں نشتر عجب قسم کے
کھڑے ہو گئے رونگٹے جسم کے
تمول لحافوں میں آرام سے
پڑی اوس مزدور پر شام سے

....

وہ صرصر تھی کہ چہرے پر لپٹ محسوس ہوتی تھی
وہ جھونکے تھے کہ اعضا کو جھپٹ محسوس ہوتی تھی
افق کا پرتوِ سیمیں تھا بے گل کاری و سادہ
شفق کی سرخیوں سے دور تھی کیفیت بادہ

....

www.urduchannel.in

......وہ تو یہ سمجھ رہا تھا کہ غزل کے ٹھیکے دار اس کے اس اقدام سے خوش ہوں گے کہ چلو ان کا میدان تو میں نے خالی کیا لیکن کسی کو اس کی یہ ادا بھی نہیں بھائی۔ اعتراض پھر بھی تھا کہ تخیل کی قوت سے عاری یہ شخص سامنے کی باتوں کو نظم کر رہا ہے۔ یہ ناظم ہے شاعر نہیں۔

رام پور میں تو اس کی ناقدری تھی لیکن اب اتنا ہوا کہ اس کا کلام رام پور سے باہر کے رسائل میں تواتر سے چھپنے لگا۔ اس کی نظمیں رام پور سے باہر ہاتھوں ہاتھ لی جانے لگیں۔ ادبی دنیا میں اس کے کلام کی گرم بازاری نے سکہ بند اساتذہ کے دلوں میں حسد کے جذبات پیدا کر دیے۔ وہ متحد ہو کر اس کی مخالفت کی تیاریاں کرنے لگے۔

......☆......

اب وہ ایک اور مقامی فیکٹری ''مکّا مل'' میں سپروائزر ہو گیا تھا۔ آمدنی بڑھانے کے لیے ایک مرتبہ پھر اس نے ٹیوشنیں سنبھال لیں۔

ص بیگم کی یاد دل سے نکلی تو نہیں تھی لیکن اب اسے یاد کرنے کا کوئی فائدہ بھی نہیں تھا۔ وہ شادی کے بعد رام پور ہی میں رہ رہی تھی لیکن شاد نے کبھی بھول کر بھی اس طرف کا رخ نہیں کیا تھا۔

وہ جہاں ٹیوشن پڑھانے جاتا تھا، سڑک پار کر کے کسی ہندو کا مکان تھا۔ اس میں ایک لڑکی تارا نام کی رہتی تھی۔ شاد کی نظر اکثر اس پر پڑتی تھی لیکن دور دور سے۔ اس نے خیال بھی نہیں کیا تھا، ایک روز کام دیوتا کا داؤ چل گیا۔ وہ ٹیوشن پڑھا کر نکل رہا تھا اور وہ اسکول سے واپس آ رہی تھی اور عالم یہ تھا۔

بکھری آڑی مانگ جبیں سے کان کی لو تک سنبل وش
نیند کے ماتے ابرو کے آغوش میں بندی اف عش عش
ہنستے ہونٹوں کی شیرینی جرأتِ بوسہ کو دل کش
سر کی ہر ہر جنبش اپنے پاس بلانے والی ہے

تارا نے شاد کو دیکھا اور زخمی ہرنی کی طرح دبک کر کھڑی ہو گئی۔ دونوں کی آنکھیں

چار ہوئیں لیکن زبان سے کوئی کچھ نہ کہہ سکا۔ تارا اپنی راہ چل دی، شاد اپنے راستے ہولیا۔ کچھ دور جانے کے بعد اسے محسوس ہوا جیسے اس کے کسی زخم کا منہ کھل گیا ہے، جیسے کوئی دبی ہوئی چوٹ ابھر آئی ہے۔ اس لڑکی کے رک جانے میں اپنائیت تھی۔ وہ کچھ کہنا چاہتی تھی مگر کہہ نہیں سکی۔ وہ ہندو ہے، میں مسلمان۔ تو کیا ہوا۔ انجام کیا ہوگا؟ کچھ بھی ہو۔ وہ انھی خیالوں میں گم گھر تک آ گیا۔ چھت پر چڑھ کر کبوتروں کو دانہ ڈالتے ہوئے بھی تارا اس کی آنکھوں سے اوجھل نہیں ہوئی تھی۔ وہ اب بھی اس کے خیالوں میں ڈوبا ہوا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا، اب دوبارہ اس سے کیسے ملا جائے اور ملاقات ہو تو کہا کیا جائے!

رام پور ویسے ہی متشرع لوگوں کی بستی۔ مزید برآں گھرانا بھی قدامت پسند ملا تھا۔ والد مدرسۃ العالیہ کے فارغ التحصیل مولوی تھے اور اس مولویت کو ان کی تھانے داری نے کٹّر پن میں تبدیل کر دیا تھا۔ ماں ایک عالم وقت کی بیٹی تھیں۔ مختصر یہ کہ جہاں شاد نے آنکھیں کھولی تھیں، وہاں کی فضا مذہبیت اور قدامت پرستی سے آباد تھی۔ وہ مولوی تو نہیں بن سکا تھا لیکن گھریلو ماحول کے زیر اثر مذہب اور کسی حد تک قدامت نے بچپن میں ہی اس کے دل و دماغ میں گھر کر لیا تھا۔ وہ مذہب کی ظاہری پابندیوں کا تو زیادہ قائل نہیں تھا لیکن مذہب کی روح سے اس کا تعلق بہت گہرا تھا۔ تعصب اور تنگ نظری اس کی فطرت میں داخل نہیں تھی لیکن اپنے مسلمان ہونے کا خیال اسے ہر وقت رہتا تھا۔ اب جو تارا سے اس کی سرسری ملاقات ہوئی تو وہ اس بے جوڑ محبت پر غور کرنے بیٹھ گیا۔

دوسرے دن وہ ٹیوشن پڑھانے گیا تو پختہ ارادہ کر چکا تھا کہ اگر تارا مل بھی گئی تو وہ اس کی حوصلہ افزائی قطعی نہیں کرے گا۔ اس نے سوچا ضرور تھا لیکن ٹیوشن والے مکان پر پہنچ کر وہ بہت دیر تک تارا کے گھر کی طرف دیکھتا رہا۔ یونہی غیر ارادی طور پر۔ جب وہاں کچھ نہ پایا تو مکان پر دستک دے دی۔ ٹیوشن پڑھنے والے بچوں نے دروازہ کھولا اور وہ معمول کے مطابق اندر چلا گیا۔

ابھی اسے پڑھاتے کچھ ہی دیر گزری تھی کہ ایک ہندو لڑکی اس کے قریب آ کر بیٹھ گئی۔ آج سے پہلے اس لڑکی کو اس نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔

www.urduchannel.in

’’یہ آشا دیدی ہیں۔ پچھواڑے میں رہتی ہیں۔ کہہ رہی تھیں تمھارے ماسٹر صاحب کو دیکھیں گی کیسا پڑھاتے ہیں۔ اس لیے آئی ہیں۔‘‘ بچوں نے ایک ہی سانس میں ساری باتیں کہہ دیں جیسے یہ سبق انھیں پہلے ہی سے پڑھا دیا گیا ہو۔

’’محترمہ، اس طرح بچوں کا دھیان بٹتا ہے۔ آپ نے مجھے دیکھ لیا، اب آپ جائیں تاکہ میں سکون سے ان بچوں کو پڑھا سکوں۔‘‘ شاد نے کہا۔

’’میں آپ کو دیکھنے نہیں، یہ دینے آئی تھی۔‘‘ اس نے شاد کے ہاتھ پر ایک پرچہ رکھ دیا ’’اسے گھر جا کر پڑھیے گا۔‘‘

شاد کچھ سمجھا، کچھ نہیں سمجھا اور پرچے کو شیروانی کی جیب میں رکھ لیا۔

اس لڑکی کے جانے کے بعد اس سے صبر نہ ہو سکا۔ اس نے بچوں کی موجودگی ہی میں، پرچہ نکالا اور اسے پڑھنے لگا۔ نظر ڈالتے ہی ساری حقیقت اس پر کھل گئی۔ یہ خط اسے تارا نے لکھا تھا اور اپنی سہیلی کے ہاتھ بھجوایا تھا۔ اس نے گھبرا کر بچوں کی طرف دیکھا جیسے انھوں نے بھی یہ خط پڑھ لیا ہو اور خط دوبارہ شیروانی کی جیب میں رکھ لیا۔

گھر آنے کے بعد اس نے کئی مرتبہ اس خط کو پڑھا۔ تارا نے اپنی پسندیدگی ظاہر کی تھی اور شوقِ ملاقات ظاہر کیا تھا۔ وہ اب بھی اپنے دل سے یہی ضد کر رہا تھا کہ میرا اس کا کوئی جوڑ نہیں۔ میں مسلمان ہوں، وہ ہندو ہے۔

دوسرے دن آشا پھر آ گئی۔ اسے خط کا جواب چاہیے تھا۔ خط کا جواب اس نے لکھا ہوتا تو پیش کرتا۔

’’تو اب لکھ دیجیے شاعر صاحب یا پھر زبانی ہی کچھ کہہ دیجیے۔ بے چاری کا برا حال ہے۔‘‘

’’زبانی، آپ میری کیا ترجمانی کریں گی، کبھی فرصت ہوئی تو کچھ لکھ کر دے دوں گا۔‘‘

’’تو پھر میں کل آؤں گی۔‘‘ اس نے کہا اور اٹھ کر چل دی۔ شاد بچوں کو پڑھانے میں مصروف ہو گیا۔

پڑھانے کے بعد وہ گھر سے نکلا تو غیر ارادی طور پر اس کی نظر تارا کے گھر کی طرف اٹھ گئی۔ دروازے پر کوئی تھا۔ یہ تارا کے سوا کون ہو سکتا تھا۔ شاد نے نظریں دوسری طرف پھیر لیں اور گھر کی طرف چل دیا۔

وہ کئی دن تک تارا کی سہیلی کو ٹالتا رہا۔ اس نے یہاں تک ارادہ کر لیا تھا کہ وہ یہ ٹیوشن ہی چھوڑ دے گا لیکن اچانک اس کی نوکری چھوٹ گئی۔ اب ایک تو ٹیوشن چھوڑنے کا سوال پیدا نہیں ہوتا تھا، دوسرے بے کاری کی وجہ سے بہت پریشان رہنے لگا۔ اسے اس بے کاری میں تارا ایک حسین سہارا معلوم ہوئی اور اس نے خط کا جواب لکھ کر آشا کے حوالے کر دیا۔ جواب میں اس کا پھر خط آیا اور یہ سلسلہ چل نکلا۔ بات دو چار خطوں تک ہی پہنچی تھی کہ ملاقات کی سبیل تارا نے خود نکال لی۔ اس کی سہیلی آشا اس وقت بھی کام آئی۔ اس کا گھر اکیلا تھا اور وہ تارا کو وہاں بلا لائی تھی۔ شاد کو ٹیوشن چھوڑ کر اس کے ساتھ جانا پڑا۔ تارا اس کی منتظر بھی تھی اور خفا بھی۔

''کیوں جی، کتنا کتنا بلایا مگر آپ تھے کہ آئے ہی نہیں۔''

''مصروفیات جان بھی تو چھوڑیں۔''

''یہاں ہماری جان پر بیت رہی تھی۔''

''اسی لیے تو میں آ گیا۔''

''وعدہ کیجیے، اب ملاقاتیں رہیں گی۔''

''یہ کس طرح ممکن ہے۔ تم ہندو، میں مسلمان۔''

''پریم میں یہ سب نہیں چلتا۔''

''مگر سب تو یہ نہیں سمجھتے۔''

''میں اس کی ترکیب بھی نکال لوں گی۔ بس آپ وعدہ کیجیے۔''

شاد اپنے آپ سے جنگ کر رہا تھا ورنہ اس کے دل میں تارا اسی دن اتر گئی تھی جس دن اسے پہلی مرتبہ دیکھا تھا۔ اب جو وہ اس کے کندھے پر سر رکھ کر بیٹھی اور ''تمھاری ہو چکی'' کا عہد کیا تو وہ سب کچھ بھول کر اس کی پریم گپھا میں اتر گیا۔

www.urduchannel.in

''ہم آ سکتے ہیں، پریمیو!'' آشا کی آواز آئی۔ تارا نے گھبرا کر اپنا سر اس کے کاندھے سے ہٹا لیا۔

''آ جاؤ، آشا۔'' تارا نے کہا۔

''بس بہت ہو گئی پریم کہانی۔ اب مہاراج سے کہو کچھ شعر سنائیں۔ یہ بہت اچھے شاعر بھی تو ہیں۔''

تارا نے بھی ضد کی لیکن شاد جو کچھ سنانا چاہتا تھا وہ اس وقت اس کے پاس نہیں تھا۔

''اگلی ملاقات میں ضرور شعر سناؤں گا مگر اس وقت نہیں۔''

''واہ جی، ہو تو بڑے گرو۔ باتوں باتوں میں اگلی بھینٹ بھی پکی کر رہے ہو۔'' آشا نے کہا۔

''ٹھیک ہے۔ کل اسی وقت آشا آپ کو یہاں لے آئے گی۔'' تارا نے کہا اور شاد خوش ہو گیا۔

آشا کا گھر کچھ اس طرح بنا ہوا تھا کہ گھر والوں کی نظروں سے چھپ کر، زینہ چڑھ کر اوپر آیا جا سکتا تھا۔ شاد نے اس سہولت کا فائدہ اٹھایا اور آشا کے ساتھ دوسرے دن پھر وہاں پہنچ گیا۔

آج وہ خالی ہاتھ نہیں آیا تھا۔ اس نے کل کی ملاقات کو لفظوں میں بند کر دیا تھا۔ اس نے نظم سنائی اور تارا کو مزید اپنی جانب کھینچ لیا۔

وہاں ہر آرزو اس روز مہماں تھی جہاں میں تھا
بہ طورِ میزباں کل بزمِ امکاں تھی جہاں میں تھا
سناؤں کیا وہ کیا ساعاتِ رنگینِ محبت تھے
مجسم رونقِ بزمِ شبستاں تھی جہاں میں تھا
قدِ بالا پہ باڈی اور پیٹی کوٹ نارنجی
سبک سورج مکھی سروِ خراماں تھی جہاں میں تھا
سماعت کے لیے لب ہائے شیریں نغمہ گستر تھے

بصارت کے لیے شوخیِ گل افشاں تھی جہاں میں تھا
تمھاری ہو چکی یہ کہہ کے سر شانے پہ رکھ دینا
جبینِ آگہی سر در گریباں تھی جہاں میں تھا
اُدھر بھاری قدم رکھتے ہوئے رہ گیر جاتے تھے
اِدھر انگشتِ حیرت زیرِ دنداں تھی جہاں میں تھا
ہر آہٹ پر جھجک کر جھانک لیتی تھی دریچوں سے
وہ میری بلکہ اپنی بھی نگہباں تھی جہاں میں تھا
زباں پر اس کی توصیفِ حرم اسلام کی حد تک
مرے ایمان کی دنیا پشیماں تھی جہاں میں تھا
غرض وہ مجھ سے بہتر جانتی تھی میرے مذہب کو
غرض وہ کافرہ عینِ مسلماں تھی جہاں میں تھا

(وہ کافرہ)

ملاقاتوں کا یہ سلسلہ کبھی نہ ٹوٹتا لیکن آشا کے گھر مہمان آگئے اور اوپر کا کمرا مصروف ہو گیا۔ دونوں طرف آگ بھڑکنے لگی تھی۔ اب ملے بغیر رہا نہیں جا سکتا تھا۔ لہٰذا اب یہ ملاقاتیں گھر سے باہر نکل گئیں۔ اسکول جاتے ہوئے، اسکول سے آتے ہوئے، شہر سے باہر جنگلوں اور باغوں میں ملاقاتیں ہونے لگیں۔ تنہائی کی ملاقاتوں کے لیے شہر سے باہر بہنے والی کوسی ندی بڑی مناسب جگہ تھی۔ تارا اسکول کے لیے نکلتی اور کسی نہ کسی بہانے وہاں پہنچ جاتی۔

پڑتی جاتی ہیں نگاہیں تتلیوں پر بار بار
لطف دیتا ہے نظارے پر نظارا آج کل
آج کل دادِ وفاداری میں دشواری نہیں
اس کی بانہیں شادؔ، کوسی کا کنارا آج تک

اب یہ ملاقاتیں یہیں تک محدود نہیں تھیں۔ عشق کا بان اپنا کام دکھا چکا تھا۔

www.urduchannel.in

کفر و اسلام اکثر جگہوں پر گلے ملتے تھے۔ کبھی وہ مندر جانے والی راہ پر اس کے نظارے کے لیے پہنچ کر اس کی بدحواسی کا تماشا دیکھتا تھا۔

چلی ہے ساتھ وہ ہمجولیوں کو لائے ہوئے
نمودِ صبح کے تاروں کو جھلملائے ہوئے
ہجومِ رنگ میں لیکن الگ الگ سب سے
وہی جو دیکھ رہی ہے نظر بچائے ہوئے
وہی جو طرزِ تعاقب سے خوش تو ہے لیکن
مری نگاہ کی جرأت سے ہچکچائے ہوئے
اٹھائے ہاتھ پہ ہلکی سی پتیلی تھالی
کمر دباؤ سے تھوڑا سا لوچ کھائے ہوئے
تلک سے برہمن ہردوار پیشانی
لرز رہے ہیں مرے ادّعائے ایمانی

کبھی دسہرے کے موقع پر کوسی کے کنارے لگنے والے میلے میں ملاقات کا وقت طے ہو جاتا اور وہ وہاں پہنچ کر اس کا انتظار کرتا۔

جھر بیریوں کی آڑ میں میلے کی حد سے دور
پہنچا ہوں اس امید پہ آئے گی وہ ضرور
کھو جائے گی کہیں مجھ پانے کے واسطے
پلٹے گی جب کہے گی سبھوں سے کہ تھک گئی
میلے کی بھیڑ بھاڑ میں رستہ بھٹک گئی
چہرہ اُداس بات بنانے کے واسطے

ان دنوں اس کے ہاتھ ایک نیا کھیل آ گیا تھا۔ اس کی شاعری نئے گل کھلا رہی تھی۔ اس کی منظریہ نظموں نے عشقیہ نظموں کا روپ دھار لیا تھا۔ وہ جن تجربات سے گزر رہا تھا، ان کی سچی تصویریں بنا رہا تھا۔ اردو شاعری میں یہ بالکل نئی چیزیں تھیں۔ وہ اپنی

داستانِ عشق کسی ایسی غیر حقیقی وادی میں پہنچ کر بیان نہیں کر رہا تھا جہاں اختر شیرانی کی محبوبہ رہتی تھی۔ اس کی محبوبہ سے ملاقات رام پور میں کوسی ندی کے کنارے، دسہرا اشنان کے موقع پر ہوتی تھی جہاں وہ میلے کی بھیڑ بھاڑ سے دور جھر بیریوں کی آڑ میں اس اعتماد کے ساتھ اس کا انتظار کیا کرتا تھا کہ وہ ضرور آئے گی اور یہ بھی پہلے ہی سے طے تھا کہ واپس پلٹ کر بات بنانے کے لیے اداس چہرے کے ساتھ وہ ہمجولیوں سے بہانہ کرے گی۔ اسی طرح مندر سے پلٹتے ہوئے محبوبہ کا نظر بچا بچا کر شاد کو دیکھتے جانا، دل ہی دل میں اس کے طرز تعاقب سے خوش بھی ہونا اور پھر اس کی بے باک نگاہی سے ہچکچاہٹ محسوس کرنا۔ چھوٹی چھوٹی حسرتوں اور محرومیوں کا ذکر جو عنفوانِ شباب میں زندگی کی اہم ترین باتیں نظر آتی ہیں۔ عاشق و محبوب کی معصومانہ چھیڑ چھاڑ، کہیں کہیں تہذیب کے دائرے میں رہتے ہوئے عشق کی دراز دستی اور حسن کی خود سپردگی۔ یہ ایسی باتیں تھیں جنھوں نے اس کی نظموں کو زندہ اور حقیقی پس منظر مہیا کر دیا تھا۔ اس کا لطف کچھ وہی لوگ محسوس کر سکتے تھے جنھیں سچے معاشقے کی توفیق عطا ہوئی تھی۔ ایسے لوگوں کی کمی نہیں تھی اس لیے شاد کے پرستاروں میں مسلسل اضافہ ہو رہا تھا لیکن ایسے حاسدوں کی بھی کمی نہیں تھی جنھیں اس کی شہرت ایک آنکھ نہیں بھاتی تھی۔ وہ روز بہ روز متحد ہو کر اس کی رسوائی کے لیے بہانے ڈھونڈتے جا رہے تھے۔ شاؔد کو خود بھی اس کا احساس تھا۔

جو نہ لکھنا چاہیے تھا مجھ کو وہ لکھتا ہوں میں
میرے سر ہے اپنی بدنامی کا سہرا آج کل

اس نے تارا کی محبت میں نہ صرف عشقیہ داستانیں نظم کیں بلکہ ہندی تیوہاروں کو بھی اپنی شاعری میں جگہ دی۔ ہولی، دیوالی، گنگا اشنان، بسنت جیسی نظموں نے متشرع بزرگوں کے ماتھوں پر بل ڈال دیے۔ انھیں شاد کو بدنام کرنے کا موقع مل گیا۔ یہ کہا جانے لگا کہ وہ کسی کافرہ کی محبت میں نعوذ باللہ خود بھی اسلام سے دور چلا گیا ہے یا اب نہیں تو بس جانے والا ہے۔ بعض سادہ لوح اس پروپیگنڈے سے متاثر ہو کر اس کی مخالفت پر کمر بستہ ہو گئے۔ برسرِ مشاعرہ اس پر پھبتیاں کسی جانے لگیں۔ وہی لوگ جو نظیر اکبر آبادی کی

www.urduchannel.in

شاعری میں ایسی نظمیں پڑھ کر سر دھنتے تھے، شاد دشمنی میں اس کی نظموں پر لاحول پڑھتے نظر آنے لگے۔

شاد پر یہ دن بہت سختی کے تھے۔ اس نے تنگ آ کر مشاعروں میں جانا چھوڑ دیا۔ اس پر بھی اس کا غصہ کم نہیں ہوا تو اس نے نوکری چھوڑ دی اور گھر میں بیٹھ گیا۔

نوکریاں چھوڑنا پکڑنا تو اس کے لیے مشغلہ سا ہو کر رہ گیا تھا جب فاقوں کی نوبت آنے لگی تو وہ پھر گھر سے نکلا۔ مخالفتوں کے باوجود شہر میں اس کے چاہنے والے کم نہیں تھے۔ وہ ایک صاحب کے درِ دولت پر بیٹھا تھا کہ اس کی نوکری کا سوال آ گیا۔

’’شاد صاحب، کب تک کبوتر اُڑاتے رہو گے؟‘‘

’’خاں صاحب، اب کہاں کبوتر، آدھے تو بِک بکا گئے۔‘‘

’’اسی لیے تو کہتا ہوں کہیں نوکری کر لو۔‘‘

’’خاں صاحب، نوکری مجھے راس نہیں آتی۔ نوکری کے لیے جس خوشامدانہ فطرت کی ضرورت ہوتی ہے، وہ مجھ میں ہے ہی نہیں اور اب تو میرے خلاف ریشہ دوانیوں کا بازار بھی گرم ہے۔‘‘

’’آپ کہیں تو میں آپ کے لیے کوئی انتظام کروں۔‘‘

’’ذلیل ہونے کی ہمت تو نہیں لیکن اس کے سوا چارہ بھی نہیں۔ میں حاضر ہوں۔‘‘

اس مرتبہ وہ ایک کنسٹرکشن کمپنی میں سائٹ انچارج بنا دیا گیا۔ حالات کی دھوپ کیا کم تھی کہ آسمان کی دھوپ بھی اسے ستانے کو اُتر آئی۔

کھلے میدان کی دھوپ کاٹ کر وہ ایک دن گھر پہنچا تو تارا کا پیغام ملا۔ اسے گھر بلانے کی ترکیب تارا نے یہ نکالی تھی کہ اپنے گھر ایک مشاعرہ کرا لیا تھا اور شاد کو بطور خاص بلایا تھا۔ اس نے مشاعروں میں جانا چھوڑ دیا تھا لیکن یہ مشاعرہ تو تارا کے گھر تھا۔ وہ انکار کیسے کر سکتا تھا۔ اس نے اچکن گلے میں ڈالی، کتوں سے بچنے کے لیے چھڑی ہاتھ میں لی اور گھر سے نکل گیا۔

تارا کے گھر وہ آج پہلی مرتبہ آیا تھا اور بجا طور پر یہ سمجھ رہا تھا کہ تارا نے صرف

اسے اپنے گھر بلانے کے لیے اتنے شاعروں کو بلایا ہے۔ اس کی پذیرائی بھی دوسرے شاعروں سے مختلف انداز میں ہوئی۔ تارا کی سہیلی آشا اسے دروازے پر ہی مل گئی جو اسے دوسرے شاعروں سے چھپا کر زنان خانے کی طرف لے گئی۔

شاد آج پہلی مرتبہ تارا کی بہنوں اور اس کے والدین سے مل رہا تھا اور حیران بھی ہو رہا تھا کہ تارا نے اتنی ہمت کیسے کر لی۔

''پتا جی، یہ ہیں وہ شاعر'' تارا نے کہا اور شاد ایک مرتبہ پھر حیران ہو گیا کہ ''یہ ہیں وہ شاعر'' سے اس کی کیا مراد ہے۔

''آپ مسلمان ہوتے ہوئے گنگا اشنان اور دسہرے پہ نظمیں لکھتے ہو۔ یہ تو مجھے تارا نے بتایا۔'' تارا کے پتا نے کہا۔

''اس میں ہندو، مسلمان کا سوال کیا ہے۔ یہ تیوہار تو ہمارے دیس کی شوبھا ہیں۔''

''کیسے اعلیٰ خیال ہیں آپ کے۔'' تارا کے باپ نے کہا۔

تارا کی بہنوں کو اس دلچسپی کا کچھ کچھ اندازہ تھا جو تارا کو شاد کی ذات میں تھی۔ اس لیے وہ ضرورت سے زیادہ ہی دلچسپی لے رہی تھیں۔ شاد زود رنج بھی تھا اور کبھی کبھی تلخ بھی ہو جاتا تھا لیکن جب موڈ ہوتا تھا، بڑی پر لطف باتیں کرتا تھا۔ ہر وقت چپ رہنے والا بات بات پر قہقہے لگا کر ہنسنے لگتا تھا۔ اس وقت اس پر ایسا ہی موڈ طاری تھا۔ پہلی ملاقات تھی لیکن جب وہ یہاں سے اٹھا تو اس گھرانے کے لیے برسوں کا ساتھی بن چکا تھا۔

شعرا تشریف لا چکے تھے۔ صدر مشاعرہ بھی مسند نشیں ہو چکے تھے۔ کسی کو یہ گمان بھی نہیں تھا کہ شاد عارفی بھی موجود ہے۔ شعرا مردانے میں فروکش تھے اور وہ ابھی تک زنان خانے میں تھا۔

جن لوگوں کو تارا اور اس کی محبت کا علم تھا، ان کی نگاہیں دروازے پر لگی ہوئی تھیں لیکن وہ گھر سے نکل کر گھر کے آنگن میں طلوع ہو گیا۔ اس نے ان چہروں کو بیٹھے ہوئے دیکھا جن کا شمار اس کے مخالفین میں ہوتا تھا۔ وہ بھی ڈٹ کر بیٹھ گیا۔ یہ تو اس کی تارا کا گھر تھا۔

ابھی دیوالی گزری تھی۔ اس نے اس موقع پر ایک نظم لکھی تھی اور کسی مشاعرے میں

www.urduchannel.in

پڑھ بھی چکا تھا لہٰذا جب اس کا نام پکارا گیا تو ہر طرف سے دیوالی، دیوالی کا شور مچنے لگا۔ اس شور میں اس کے مخالفین پیش پیش تھے۔ اس نے بھی سوچا کہ اس نظم کے لیے موقع تو مناسب ہے۔ اس نے اپنی نظم ''دیوالی'' شروع کر دی۔

ایک نازک انگلیوں سے دیولے دھوتی ہوئی
دوسری دھوئے ہوؤں کو چُن کے خوش ہوتی ہوئی
بتیاں بٹتی ہے کوئی روئی کا گالا لیے
تیل کا کڑوا کوئی آتش کی پرکالا لیے
ایک طاقوں میں دیے ترتیب سے دھرتی چلی
دوسری بتی سجا کر تیل سے بھرتی چلی
یہ جھمکا کر چکا آراستہ جب طاق و در
صحن سے زینے پہ دوڑا اور پہنچا بام پر
مختلف آنچل ہوا کے رخ پہ بل کھانے لگے
روشنی میں ساریوں کے رنگ لہرانے لگے
یہ دوالی کے مناظر یہ نگاہیں کامیاب
یا الٰہی تا قیامت بر نہ آید آفتاب

....

اس نے اپنے ہم عصروں کی فرمائش پر یہ نظم سنانی شروع کی تھی لیکن نظم شروع کرتے ہی طرح طرح کے فقرے اس کے کانوں تک پہنچنے لگے۔

''صاحب خوشامد ہو تو ایسی ہو۔''

''ایسی بھی کیا دنیا سازی۔ دیکھ لیا کہ ہندو کا گھر ہے تو شروع کر دی۔ دیوالی۔''

''وہ تو شکر ہے اپنے ساتھ دیوالی کے دیے لے کر نہیں آئے تھے۔''

''کوئی شاعری بھی ہو۔''

ہر شعر پر اس طرح داد دی جا رہی تھی جیسے مذاق اڑایا جا رہا ہو۔

ایسی نظموں کو سننے کے لیے جس ذہنی تربیت کی ضرورت ہوتی ہے اس سے اس شہر کے لوگوں کو ابھی سابقہ ہی نہیں پڑا تھا۔ کوئی اور جگہ ہوتی تو احساس بھی نہیں ہوتا، اس کی بے عزتی تارا کے گھر میں ہو رہی تھی، اسے دکھ اس بات کا تھا۔ اس نے نظم ادھوری چھوڑی اور مسند سے اٹھ گیا۔

مجھے اے شادؔ ان رجعت پرستوں سے تو کیا لینا
کرے گی یاد مستقبل کی تہذیبِ جواں مجھ کو

وہ دروازے تک پہنچا تھا کہ تارا نے اسے دیکھ لیا مگر اب وہ اس کے روکے رک نہیں سکتا تھا۔

تارا کے گھر سے واپس آتے ہوئے اسے مرزا غالبؔ کی یاد آ گئی قلعہ معلّٰی میں اس کے ساتھ بھی تو یہی سب کچھ ہوا تھا۔ اس کی فنکاری میں کس کو کلام ہے لیکن اس کے کلام کو بھی تو مہمل کہا جاتا تھا۔ حکیم آغا جان عیش جیسے تُک بند اس کی شاعری کا مذاق اڑاتے تھے اور وہ بھی بادشاہ کے روبرو۔ لیکن ہوا کیا؟ آنے والے وقت نے غالب کی عظمت کی گواہی دی۔ یہ مذاق اڑاتے رہ جائیں گے اور مستقبل میرا ہوگا۔

وہ بے عزت ہوا لیکن تارا کے گھر کے دروازے اس پر کھل گئے۔ اب وہ گاہے گاہے اس کے گھر جانے لگا تھا۔

شاد کی بھتیجی کا رشتہ آیا ہوا تھا۔ اس کی کفالت کی ذمے داری اس نے لی تھی تو اب شادی بھی اسی کو کرنی تھی جب کہ حال یہ تھا کہ چیل کے گھونسلے میں ماس کہاں۔ اس نے اپنی خودداریوں کو طاق میں رکھا اور قرض مانگنے کے لیے نکل کھڑا ہوا۔ اسے رشتے داروں سے بڑی امیدیں تھیں لیکن وقت پڑنے پر سب نے آنکھیں پھیر لیں۔ وہ ایک ایک دروازے پر گیا لیکن مایوسی کے کھوٹے سکوں کے سوا کچھ حاصل نہ ہوا۔ پھر اس نے دوستوں کے دامن تھامے۔ کچھ گھر کی چیزیں بیچیں اور اس عالمِ غربت میں اپنی بھتیجی کو رخصت کیا۔

......☆......

www.urduchannel.in

یہ وہ زمانہ تھا جب برطانوی ہندوستان میں سیاسی حالات، سیاسی شعور کی بیداری تک آ گئے تھے۔ عوام میں جذبۂ ایثار بڑھا اور اپنے مطالبات کی تکمیل کے لیے مصائب برداشت کرنے کی سکت پیدا ہوئی۔ ٹریڈ یونین کے قیام اور مزدوروں کی کامیاب ہڑتال کے بعد تو ماحول نے سیاسی بیداری کو عام کر دیا۔

ان حالات کا اثر شاعری پر بھی پڑنے لگا تھا۔ انقلابِ روس کی وجہ سے اشتراکی نظریات بھی معاشرے میں سرایت کرتے جا رہے تھے۔ جو لوگ اشتراکی نظریات کے حامی نہیں تھے وہ بھی اسی ڈھنگ سے سوچنے اور شعر کہنے کی کوشش کرنے لگے تھے۔

اشتراکیت نے اپنے تمام ساز و سامان اردو ادب کے سامنے بکھیر دیے۔ نئے عنوانات بھی ملے، خیالات بھی آئے۔ اشتراکی خیالات کو، ہندوستان کی سب سے بڑی سیاسی پارٹی کانگریس کی حمایت بھی حاصل تھی۔ بعد میں کانگریس نے اپنے زیرِ سایہ ایک شاخ ''کانگریس سوشلسٹ'' کے نام سے قائم کر لی۔ اس طرح برطانوی ہند میں ترقی پسند تحریک کو پروان چڑھنے کے پورے مواقع فراہم ہوئے۔

یہ ولولہ انگیز تبدیلیاں نوجوان تعلیم یافتہ طبقے کو آزادی، مساوات، بغاوت اور انقلاب کے تصور سے سرشار کر رہی تھیں اور قدیم اخلاق و عقائد کے بندھنوں سے چھٹکارا حاصل کرنے کا خیال عام ہو رہا تھا۔ کالجوں میں پڑھنے والے نوجوان اب امریکا کی آزادی، انقلابِ فرانس اور انقلابِ روس پر کتابیں اور پمفلٹ پڑھ رہے تھے۔

برصغیر ہند میں اس تمام عرصے میں اردو ادب حالات و فضا کی مطابقت سے مختلف موضوعات و احساسات کو اپنے دامن میں جگہ دے رہا تھا۔

یہ سب تبدیلیاں دیسی ریاستوں سے باہر رونما ہو رہی تھیں۔ انگریزی نوکر شاہی کی سب سے بڑی پشت پناہ دیسی ریاستوں کے حکمران تھے۔ چونکہ ان کی اپنی ہستی سراسر انگریز کے رحم و کرم پر موقوف تھی اس لیے یہ ہمیشہ اس کے قول و فعل کی تائید کرنا اپنا فرض خیال کرتے تھے۔ انگریز نہ تو کھلے بندوں ریاستوں کے معاملات میں دخل دیتا نہ ان کے حکمرانوں کو آئینی اصلاحات نافذ کرنے کا مشورہ دیتا۔ غرض دونوں ایک دوسرے کے محتاج تھے۔

ہندوستانی ریاستیں براہِ راست انگریزی اقتدار میں نہیں تھیں دیسی حکمراں بڑی حد تک مقامی طور پر خود مختار تھے۔ مقامی خود مختاری حاصل ہونے کی وجہ سے یہاں عوامی تحریکیں زور نہیں پکڑ سکتی تھیں۔ اس طرح سیاسی طور پر ریاستی باشندے اتنے بالغ نظر نہیں ہو سکے جتنے برطانوی ہند کے عوام تھے۔ ریاستوں کا ماحول خالص جاگیردارانہ تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ریاستی ماحول کے پروردہ ذہن، شاد کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں تھے۔ شاد کا یہ حال کہ وہ اس گھٹن سے بیزار۔ مطلق العنان حکمرانوں کی سخت گیری کو تسلیم کرنے کے لیے کسی قیمت پر تیار نہیں۔ ایک ایسے ماحول کی تخلیق کا متمنی جہاں ذہنی نشو ونما ہو سکے، جہاں شخصی حکومت کے ظلم وستم سے چھٹکارا مل سکے۔

سخت گیر حکمرانوں کی بدولت، ریاست میں سیاسی اثرات دبے دبے تھے لیکن نوجوان طبقے میں ہلچل پیدا ہونے لگی تھی۔ ریاست اور نواب کے خلاف باغیانہ جذبات پیدا ہونے لگے تھے۔ کانگریس کے ساتھ مل کر آئینی حکومت بننے کے مطالبے ہونے لگے تھے۔

شاد کے لیے یہ فضا حسبِ منشا تھی۔ وہ خم ٹھونک کر سیاست کے میدان میں اتر آیا۔ سیاست کیا، بس ظلم وستم کے خلاف، حق وانصاف کے حق میں، حکمرانوں کے خلاف، ترقی پسند خیالات کے حق میں۔

مصیبت یہ تھی کہ ریاستوں میں سیاست کا ہر وار براہِ راست حکمرانِ ریاست پر پڑتا تھا۔ شاد نے جونہی ریاست میں موجود روشن خیال ٹولے کا ساتھ دیا، کارپردازانِ ریاست اس کی کردار کشی پر آمادہ ہو گئے۔ رام پور کے صولت علی خاں کے ساتھ مل کر اس نے ''آئین تحریک'' میں بھرپور حصہ لیا۔ بیسیوں نظمیں لکھ کر اس تحریک میں جان ڈال دی۔ جواب میں اسے ففتھ کالومسٹ، اشتراکی، کمیونسٹ، کافر اور نہ جانے کیا کیا کہا جانے لگا۔

کوئی اور ہوتا تو ان حالات سے گھبرا کر اپنے گھر لوٹ آتا مگر شاد کی انتہا پسند طبیعت ان خوشامدیوں سے شکست ماننے والی نہیں تھی۔ وہ نادانستگی میں ریاست سے ٹکرا گیا اور اپنی تباہی کی طرف پہلا قدم رکھ دیا۔ اب اسے آگے ہی آگے بڑھنا تھا۔ پیچھے ہٹ جائے تو پھر پٹھان ہی کیا۔ مطلق العنان حکمرانی کے خلاف لڑائی میں اس کی شاعری ہراول

www.urduchannel.in

دستے کا کام کر رہی تھی۔

اس کے معاشی حالات ٹھیک ہوتے تو کوئی بات ہی نہیں تھی۔ یہاں تو یہ حال تھا کہ ذرا قدم جمتے تھے تو کوئی سازش اسے نوکری سے نکال دیتی تھی۔ کئی کئی وقت کے فاقے اس پر گزر گئے لیکن کوئی پوچھنے والا نہیں تھا بلکہ اس کی سیاسی مصروفیات دیکھتے ہوئے رشتے داروں تک نے ملنا جلنا ترک کر دیا۔ مخبر اس کے پیچھے لگے ہوئے تھے لہٰذا راستے گلی میں بھی کوئی اس سے ملتا تو ڈرتا، جھجکتا ہوا۔ اربابِ حل وعقد کی مکمل کوشش یہ تھی کہ کسی طرح وہ رام پور چھوڑ کر چلا جائے لیکن اس جیسا جری اور بے باک اردو شاعری نے دیکھا نہ ہوگا کہ ریاست کے بارود خانے سے اکیلا ٹکراتا رہا، جس کے خلاف جو کہنا تھا کہتا رہا۔ وہ ہر سزا کے لیے تیار تھا۔

جب رام پور جیسی سخت گیر ریاست میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی شاخ قائم کرنے کا سوال آیا تو سب پر گھبراہٹ طاری تھی۔ چند روشن خیال نوجوان جمع ضرور ہو گئے تھے لیکن سرپرستی کے لیے کسی معتبر شاعر کی ضرورت تھی۔ شاد عارفی کے سوا کون ہو سکتا تھا۔ عبدالحیٔ تاباں کی معرفت اس نے یہ تقریباً ناممکن کام اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ نوجوان اس کے گرد جمع ہو گئے اور یہ شاخ رام پور میں قائم ہو گئی۔ اس کے تحت جلسے ہوئے جن میں سرمایہ داری کی مخالفت اور اشتمالیت کے حق میں تقریریں ہوئیں۔ اس طبقے کی حمایت کی گئی جس کو افلاس نے مزدور، کسان اور غریب کا لقب دیا تھا، جو باوجود کارآمد ہونے کے کسمپرسی کا شکار تھا۔ ملوکیت کی بیخ کنی پر نظمیں پڑھی گئیں۔

ان نظموں، ان تقریروں کی براہِ راست چوٹ نوابانِ رامپور پر پڑتی تھی لہٰذا شاد کو ریاست کا دشمن سمجھا گیا۔ سختیاں ہوتی رہیں مگر وہ کہتا رہا۔

ہے تو احمق، چونکہ عالی شان کاشانے میں ہے
اس لیے جھک مارنا بھی اس کا فرمانے میں ہے
آدمی کو آدمی مصروف بہکانے میں ہے
یہ قباحت ہے جو ذہنی انقلاب آنے میں ہے

اور کتنی دیر جانے گل کھلائے گا چمن
اور کتنی دیر جانے انقلاب آنے میں ہے
قصرِ آزادی تصور کر رہے تھے جس کو ہم
ایک ٹوٹے مقبرے کی طرح ویرانے میں ہے

....

وطن پرست ہی بیٹھے ہیں شہ نشینوں میں
تڑپ رہی ہیں مگر مچھلیاں جبینوں میں
الٹ بھی دیں گے ہوا دارِ ظلِ سبحانی
جو آرہے ہیں نہائے ہوئے پسینوں میں
جفا و جور کو خوبی تو ہم بھی کہتے ہیں
حکومتوں میں نہیں بلکہ مہ جبینوں میں
مخالفت کے علاوہ موافقت کے خلاف
کریں بھی کیا جو ملازم ہیں نکتہ چینوں میں
گزر گیا ہے یہ گاتا ہوا کوئی اے شادؔ
خدا کرے کہ لگے آگ شہ نشینوں میں

......☆......

وہ ان مصروفیات سے الجھا ہوا تھا کہ تارا کا پیغام ملا۔ یہ کوئی اچھی خبر نہیں تھی۔ وہ اپنے گھر والوں کے ساتھ کشمیر جا رہی تھی۔ اس کے والد کا تبادلہ ہو گیا تھا۔ اس نے کہلوایا تھا کہ وہ اس سے آکر مل لے۔ شاد کو اپنی بے پروائی پر غصہ آنے لگا۔ اس پیکرِ وفا سے میں اس حد تک غافل ہو گیا کہ اس کی طرف جانا ہی چھوڑ دیا۔ اسے خط لکھ کر مجھے بلانا پڑا۔ یہی سوچتا ہوا وہ اس کے گھر تک پہنچ گیا۔

چلمن کی تیلیوں سے دلچسپ تھا نظارا
ساری میں سادگی تھی اور سادگی میں تارا

www.urduchannel.in

انداز کر رہے تھے حالات پر اشارا
منہ آئینے کی جانب زلفوں میں برہمی سی
ڈھلکا ہوا سا آنچل اعضا میں کاہلی سی
سنجیدگی کی حد تک شوخی میں بے خودی سی

....

چوروں کی طرح میں نے کرسی کے پاس جا کر
آنکھوں پہ ہاتھ رکھا ہونٹوں میں مسکرا کر
کہنے لگی، خبر ہے؟ آنکھوں سے ہاتھ اٹھا کر
پاپا بدل کے یاں سے کشمیر جا رہے ہیں
اسباب جا چکا ہے موٹر منگا رہے ہیں

''تم مجھ سے ملنے کشمیر ضرور آنا۔'' یہ آخری جملہ تھا جو اس نے وہاں سے لوٹتے ہوئے تارا کی زبانی سنا۔

اس نے یہی سوچا تھا کہ وہ پہلی فرصت میں کشمیر جا کر اس سے ملے گا لیکن کیوں سوچا تھا؟ گردشِ زمانہ اسے شہر میں گھومنے کی اجازت دے رہی تھی یہی بہت تھا۔

وہ مفارقت کے دنوں میں شعر کہتا اور شہر کی سیاست سے دل بہلاتا رہا۔

تارا کے خط آ رہے تھے لیکن اس کے پاس اتنے پیسے نہیں تھے کہ تارا سے ملنے کشمیر چلا جاتا۔ وہ انتظار کرتا رہا۔ یہاں تک کہ اس کی واپسی کا تار آ گیا۔ وہ سٹیشن تک تو جا ہی سکتا تھا۔ تانگے کا کرایہ نہ بھی ہو تو پیدل جایا جا سکتا تھا۔ وہ پیدل ہی چل پڑا۔

اسے وقت سے پہلے پہنچ جانے پر غصہ آ رہا تھا۔ گاڑی کا دور دور تک پتا نہیں تھا۔

کچھ تو میل نے میری ضد میں اپنی چال گھٹا لی ہے
کچھ اسٹیشن پر پہلے سے آکر آفت ڈھالی ہے

بہر حال، اب کیا ہو سکتا تھا۔ گاڑی آنے تک وقت گزاری تو کرنی تھی۔

پوسٹروں میں اردو کی درگت سے جی بہلاتا ہوں

نیم شعوری حال میں سگریٹ پے در پے سلگاتا ہوں
بید کی نوک سے خالی پیکٹ کا سینہ برماتا ہوں
پلیٹ فارم کے اس کونے سے اس کونے تک جاتا ہوں
ریلوے آفس کے گھنٹے کی سوئی کو مردہ پاتا ہوں
بے تابی میں ساعت ساعت مجھ کو ستانے والی ہے

تمام پوسٹر پڑھ چکا، ایک کے بعد ایک کئی سگریٹ پھونک چکا، پلیٹ فارم کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک کئی چکر کاٹ چکا لیکن ریلوے آفس کی سوئی وہیں کی وہیں تھی۔ یا تو گاڑی کی رفتار دھیمی ہوگئی تھی یا وہ بہت پہلے آگیا تھا۔ خدا خدا کر کے سگنل کا بازو جھول گیا۔ دور درختوں میں دھوئیں کا بادل سا اٹھا پلیٹ فارم پر شور سا مچ گیا۔ نقابیں چہروں سے اٹھنے لگیں اور بالآخر ریل کی شکل نظر آنے لگی۔

ہیبت ناک انجن چھک چھک کے ساتھ گرجتا آتا ہے
ہرے بھرے کھیتوں کا ہردے خوف سے دہلا جاتا ہے
پلیٹ فارم کے نیچے کوئی گھوڑے سے دوڑاتا ہے
یا پُل کے گرڈر پر کوئی پیہم ضرب لگاتا ہے
شوقِ نظارہ نے کہا کس دھُن میں وقت گنواتا ہے
چونک پڑا میں اور دیکھا کھڑکی پہ وہ آنے والی ہے

اس کے آنے پر وہ جتنا خوش تھا، ملنے کے بعد اتنا ہی رنجیدہ ہوگیا۔ وہ یہ خبر لے کر آئی تھی کہ اس کی سگائی ہونے والی ہے۔ شاد کے لیے یہ اطلاع قیامت سے کم نہیں تھی لیکن کسی حقیقت کو جھٹلانا اس کے مزاج میں شامل ہی نہیں تھا۔

تارا کے ساتھ گزارے ہوئے پانچ چھ سال اس کی نظروں کے سامنے گھوم گئے۔ یہ بات تو مجھے پہلے سوچنی چاہیے تھی کہ ایک ہندو لڑکی سے میرا عشق کس طرح انجام کو پہنچے گا۔ اب نہ میں اسے اپنا سکتا ہوں نہ بھولنے کی سکت ہے۔

''میں تو کب کی تمھاری ہو چکی۔ اب کسی اور کی بانہہ کیسے تھام لوں۔'' تارا نے

www.urduchannel.in

افسردہ لہجے میں کہا۔

''میں مسلمان ہوں، مجھ سے تمھاری شادی کیسے ہوسکتی ہے؟'' شاد نے کہا۔

''اعلانیہ نہیں ہوسکتی مگر چھپ کر تو ہوسکتی ہے۔ میں اپنا دھرم چھوڑنے کو تیار ہوں۔ تمھارے ساتھ بھاگنے کو تیار ہوں۔ مجھے کہیں لے چلو۔ مجھے مسلمان کر کے مجھ سے شادی کرلو۔''

یہ ایسا تقاضا تھا کہ فرشتوں کے قدم بھی ڈگمگا جاتے لیکن شاد کی گھریلو تربیت نے یہاں بھی اثر دکھایا۔ اسے اپنے مسلمان ہونے کا احساس، اپنے افغانی النسل ہونے کا احساس شدت سے ہونے لگا۔ بات پھر وہیں آگئی تھی کہ خاندان والے اس شادی کو کیسے قبول کریں گے اور اگر وہ تارا کو بھگا لے جاتا ہے تو شہر کے ہندوؤں کا مسلمانوں پر سے اعتماد اٹھ جائے گا۔ اس نے یہ بھی سوچا کہ اس کے مخالفین کو کیسا سنہری موقع ملے گا اس کے خلاف طوفان اٹھانے کا۔ بہتر یہ ہے کہ دوسری مرتبہ بھی اپنی محبت کو سماج پر قربان کر دیا جائے۔

اس نے تارا کا دل توڑ دیا اور وہ بیاہ کر کسی اور کے گھر چلی گئی۔ ص بیگم کی طرح تارا بھی اس کی زندگی سے نکل گئی۔

اکثر مری محرومی، ساقی پہ نہیں کھلتی
اکثر مرے حصے کی پی جاتا ہے پیمانہ

......☆......

دوسرے عشق کی ناکامی نے اس کی رہی سہی سکت بھی چھین لی۔ پہلے عشق نے جنون کے اثرات پیدا کر دیے تھے، دوسرے عشق کی ناکامی نے اسے تلخ اور چڑچڑا بنا دیا۔ الجھنوں اور پریشانیوں نے کچھ ایسا حصار باندھا کہ وہ کہیں جم کر ملازمت بھی نہ کر سکا۔ روایتی مفلسی نے اس کا گھر دیکھ لیا۔ اسی مفلسی میں اپنے بھتیجے فدا احمد کی شادی کا بندوبست کیا۔ خودداری کا یہ عالم کہ زندگی بھر اس کی پرورش کی، اسے تعلیم دلائی اور جب وہ کمانے کے لائق ہوا تو اس سے علیحدگی اختیار کرلی۔

مختلف کارخانوں کے خارزاروں سے گزرنے کے بعد اس نے رام پور میں میونسپل بورڈ میں ٹیکس کلرک کی حیثیت سے ملازمت کر لی لیکن وہاں بھی حسبِ عادت زیادہ عرصے نہ ٹک سکا۔ بے کاری نے پھر اس کا گھر دیکھ لیا۔

کچھ دن بے کار رہنے کے بعد وہ پھر کان پر قلم رکھ کر گھر سے نکلا۔ اس مرتبہ اس نے ناصر مسعود پبلک انفارمیشن آفیسر، رام پور کی فرمائش پر ہفتہ وار اور بعد ازاں سہ روزہ اخبار ''اقبال'' کی ادارت سنبھال لی۔

یہ ملازمت اس کے مزاج سے مطابقت رکھتی تھی۔ یہ ملازمت بھی تھی اور قلم کے جوہر دکھانے کا ذریعہ بھی۔ اس نے اخبار سنبھالتے ہی اپنی تخلیقی صلاحیتوں کو استعمال کرنا شروع کر دیا۔ اس نے ''اپدیش'' کے عنوان سے ہندی قطعات کا سلسلہ شروع کیا جن میں فرقہ وارانہ اختلاف کو دور کرنے کی کاوش، قومی یک جہتی اور پیام عمل وغیرہ کے خیالات آسان ہندی میں نظم کیے جاتے تھے۔ کسی اردو اخبار میں یہ ایک بالکل نئی اختراع تھی۔ اس کا خیر مقدم بھی ہوا اور پرچے کی اشاعت بڑھ گئی۔ یہ اخباری چیزیں تھیں لیکن بہر حال شاد کی ہندی شاعری کے مطالعے کا ایک دروازہ کھولتی تھیں۔

ان پرچوں کے ذریعے اس نے یہ بھی بتایا کہ وہ کمال کی نثر لکھتا ہے۔ جس طرح اس کی شاعری میں انفرادیت ہے اسی طرح وہ تخلیقی جملے لکھ سکتا ہے۔ ایسے جملے کہ انھیں شاد عارفی ہی لکھ سکتا ہے۔ اس اخبار کے ذریعے اس نے افسانے، فکاہیہ کالم اور انشائیے وغیرہ پڑھوائے۔

کانٹے کی چیز وہ تجزیے تھے جو کانگریس کے حق میں اور نوابانِ رام پور کے خلاف اکثر و بیشتر شائع ہوتے تھے۔ اس کا ترقی پسندانہ لب ولہجہ، مطلق العنانیت کو بہا کر لے جانا چاہتا تھا۔ اس کے لفظوں کی دھمک سے اہلِ دول کی جبینوں پر بل پڑتے تھے۔ حکومتِ وقت کے خوشامدیوں کے سینے چھلنی ہوتے تھے۔

حاسدوں نے دوستی کے پردوں میں ایسی چالیں چلیں کہ اس نے گھبرا کر یہ نوکری بھی چھوڑ دی یا چھوڑنی پڑ گئی۔ کچھ دن بعد وہ اسٹیٹ پریس رام پور میں انگلش پروف ریڈر

www.urduchannel.in

کے طور پر ملازم ہو گیا۔

اس ملازمت نے اسے دھوپ میں سائبان مہیا کیا۔ ٹھنڈی ہوا کا ایک جھونکا تھا جو اس ملازمت کے ذریعے اس کی زندگی میں آیا۔

دو معاشقوں کی ناکامی کے بعد شادی کا خیال ہی اس کے دل سے نکل گیا تھا۔ پہلے بھتیجی اور بھتیجے کو پال رہا تھا اب ان کے بچوں پر دل نثار کر رہا تھا۔ مشاعروں کے ذریعے جو ٹوٹی پھوٹی آمدنی ہو جاتی یا ادبی رسائل سے جو رقم آتی ان بچوں پر خرچ ہو جاتی۔ ہمدرد ایسا تھا کہ کسی کو تکلیف میں دیکھ نہیں سکتا تھا۔ صبح کھالی تو شام کا خدا حافظ تھا۔ گھر کا یہ حال تھا کہ در و دیوار پر سبزہ اگتا تھا۔ والدہ بینائی سے محروم ہو کر ایک کونے میں پڑی ہوئی تھیں۔ رشتے داروں کی طوطا چشمی کا وہ پہلے ہی قائل ہو چکا تھا۔ کوئی ویرانی سی ویرانی تھی جو اس کے گھر کا مقدر بنی ہوئی تھی۔ شہر کے کچھ نوجوان اس کے شاگرد ہو گئے تھے، بس انہی کی آمد و رفت سے کچھ دیر کو رونق ہو جاتی تھی۔

ہلکی ہلکی پھوار پڑ رہی تھی۔ کہیں سے آم آئے تھے جو طشت میں پڑے دعوت طعام دے رہے تھے۔ اس کی ماں کو معلوم تھا کہ جب آم گھر میں ہوں تو شاد کی خوشی کا ٹھکانا نہیں ہوتا۔ انھوں نے موقع غنیمت جان کر ہزار دفعہ کی کہی ہوئی بات پھر چھیڑ دی۔

''اے لڈن!''

''جی اماں۔''

''میں کہوں، پٹھان کیا اب اتنے بے مروت ہو گئے کہ آم رکھے ہیں اور اکیلے اکیلے کھا رہے ہو۔''

''نہیں اماں، آپ بھی کھائیں گی۔''

''اے میں کے دن کھاؤں گی۔ آج مری کل دوسرا دن۔ اچھے لگو گے اکیلے کھاتے ہوئے۔ تیری جرو ہوتی تو تیرے ساتھ بیٹھ کر کھاتی۔''

شاد سمجھ گیا کہ اب وہ کیا کہنے والی ہیں، اس لیے سر جھکائے خاموش بیٹھا رہا۔ دونوں طرف خاموشی تھی۔ اس کی ماں نے اس خاموشی کو پھر توڑا۔

''میں کہتی ہوں شادی کر لے۔ کب تک لنڈورا پھرے گا۔ بس بہت ہو چکی موئی شاعری۔''

''اماں، آپ جانتی ہیں۔''

''میں کچھ نہیں جانتی۔ تجھے میری قسم، آج انکار نہ کیجیو۔'' ان کی بے نور آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

شاد کا دل پسیج گیا۔ اس نے سوچا، اماں کو فاقوں کے سوا میں نے دیا ہی کیا ہے۔ اب مجھے نوکری بھی اچھی مل گئی ہے۔ اس نے شادی کے لیے ہامی بھر لی۔ ماں کی ممتا کو تو جیسے آنکھیں مل گئیں۔ دنیا دیکھ کر رشتہ طے کرتی ہے، انھوں نے ٹٹول ٹٹول کر اس کا رشتہ رام پور کی تحصیل شاہ آباد کے منور شیر خاں کی لڑکی پری بیگم سے طے کر دیا۔ نہ وہاں دیر تھی نہ شاد کی عمر اجازت دے رہی تھی۔ وہ چالیس کا ہو چکا تھا اور کب شادی کرتا لہٰذا جلد ہی شادی بھی ہو گئی۔

شاد جیسے اکل کھرے پٹھان کو خوش رکھنا ہر لڑکی کے بس کی بات نہیں تھی لیکن پری بیگم ایسی اطاعت شعار اور نیک ثابت ہوئی کہ جدید دور کی مغرب پسند عورتوں کے مقابلے میں شاد نے اسے ایک مثالی نمونہ بنا کر نظم میں ڈھال دیا۔ اس نظم سے یہ بھی معلوم ہوتا تھا کہ وہ ترقی پسند ہونے کے باوجود مذہب سے کتنا قریب ہے۔ روشن خیال ہے لیکن آزاد خیال نہیں۔

فخر ہے مجھ کو کہ جاہل ہے مری گھر والی
اتنی جاہل ہے کہ پابند نماز و روزہ
شرع کی حد میں کھلا رکھتی ہے ماتھا موزہ
ملکہ گھر کی پہ مجبور سبق آموزہ
ذہن آزادیِ بے باک سے بالکل خالی

......☆......

شاد نے اسے پریا کہہ کر مخاطب کرنا شروع کر دیا تھا۔ وہ اس پیار کا مطلب یہ سمجھی

کہ شاد نے اس کا نام بگاڑ دیا ہے۔

''میری بڑی بہن کے شوہر تو ان کا نام بڑے ادب سے لیتے ہیں لیکن آپ شاعر ہو کر میرا نام اس طرح لیتے ہیں جیسے میں کوئی ملازمہ ہوں۔'' ایک دن اس نے شکایت آمیز لہجے میں کہا۔

شاد نے لاکھ سمجھایا لیکن وہ اتنی سیدھی تھی کہ یہ بات اس کی سمجھ میں آنے والی ہی نہیں۔

''ٹھیک ہے، آج سے میں پری بیگم کہہ کر پکارا کروں گا۔'' وہ خوش ہو گئی لیکن شام تک تنگ بھی آ گئی۔

''محترمہ پری بیگم! اگر آپ کو ناگوار نہ گزرے تو یہاں تشریف لا کر تھوڑا سا پانی پلا دیجیے۔''

اسی طرح جب چھ سات بار کہا تو ہاتھ جوڑ کر کھڑی ہو گئی۔

''میں اس ادب سے باز آئی۔ آپ اسی طرح پکارا کریں۔''

......☆......

ایک دن ''سرخ آنچل'' ایک کتاب پوسٹ مین دے کر گیا۔ شاد اس وقت گھر پر نہیں تھا۔ اس کی بیوی نے اسے کھول کر پڑھا۔ اس میں عورتوں کے فوٹو اور محبت بھرے افسانے موجود تھے۔ ممتاز شیریں نے ایک خط اپنے رسالے کے لیے لکھا تھا، وہ بھی اسی دن پہنچا۔ اس نے اسے بھی کھول کر پڑھا۔ ممتاز شیریں کا نام پڑھ کر تو وہ اچھل گئی۔ دوڑی ہوئی اپنی ساس کے پاس گئی۔

''دیکھیے اماں۔ آپ کے صاحب زادے پرائی عورتوں سے خط و کتابت کرتے ہیں۔''

''مجھے کیا خاک سجھائی دے گا۔ مجھے بتا تو ہے کیا۔''

''غیر عورتوں کے فوٹو ہیں اور ایک خط بھی آیا ہے۔ کوئی لڑکی ہے ممتاز شیریں۔''

انھوں نے تو سر پیٹ لیا۔ ان کے بیٹے کے ایسے چھّن۔ وہ بے چینی سے شاد کا

www.urduchannel.in

انتظار کرنے لگیں۔

''بہو، تو فکر مت کر اس کو آنے تو دے۔''

وہ گھر آیا تو گھر کا نقشہ ہی بدلا ہوا تھا۔ پری بیگم تو اسے دیکھ کر کمرے میں چلی گئیں مگر ماں نے اسے آڑے ہاتھوں لے لیا۔

''یہ کیا نالائقی ہے؟''

''کیا ہوا اماں۔''

''بہو نے مجھے بتایا ہے، تمھارے نام لڑکیوں کے خط اور تصویریں آئی ہیں۔''

''کہاں ہیں وہ خط؟''

''پوچھ اپنی دلہن سے۔''

پری بیگم کو بلایا گیا۔ اس نے وہ خط اور افسانوں کا مجموعہ اس کے آگے رکھ دیا۔ اسے ہنسی آ گئی۔

''اتنی سی بات کو آپ لوگوں نے افسانہ بنا دیا۔''

''یہ اتنی سی بات ہے؟''

''بھئی، شعر و ادب میں یہ چیز بری نہیں۔ یہ سب ادبی خدمت کے سلسلے میں مجھے خط لکھا کرتی ہیں۔ آپ لوگوں کو تو خوش ہونا چاہیے اور الٹا ناراض ہو رہی ہیں۔''

وہ سمجھاتا رہا لیکن کوئی اس کی بات ماننے کو تیار نہیں تھا پری بیگم تو کچھ سمجھ بھی گئی لیکن یہ باتیں اس کی ماں کی سمجھ میں آنے والی نہیں تھیں۔

''اگر آئندہ ایسا کوئی خط آیا تو میں تجھے بھی سید احمد کی طرح عاق کر دوں گی۔''

''اچھا، اماں اب کوئی خط نہیں آئے گا۔''

یہی پیار بھری غلط فہمیاں، روٹھنا اور پھر من جانا زندگی کی حرارت اور گھر کی رونق تھیں۔ گھر سے باہر کا عالم وہی تھا۔ حاسدوں سے شہر پٹا پڑا تھا۔ وہ منہ پھٹ اور زمانہ مصلحت کوش، اس کے حمایتی چند نوجوان اور دوسری طرف زمانہ دیکھے ہوئے اساتذۂ فن اپنی گدی بچانے کے لیے ہر محفل میں اس کی کاٹ کرنے پر تُلے بیٹھے تھے۔ یہ دکھ الگ کہ

www.urduchannel.in

ادبی دنیا میں اسے ہاتھوں ہاتھ لیا جا رہا ہے لیکن خود اپنے شہر میں محض نواب دشمنی کی وجہ سے اسے ذلیل کیا جا رہا ہے۔ اس کی شکل و صورت کا مذاق اڑایا جا رہا ہے۔ گالیوں بھرے خط اس کے نام پوسٹ کروائے جا رہے ہیں، جیل بھجوانے کی دھمکیاں دی جا رہی ہیں۔ اس کے رنگِ سخن پر پھبتیاں کسی جا رہی ہیں۔ اس کی طرف سے بدگمان کرنے کے لیے ادبی رسائل کو خط لکھے جا رہے ہیں۔ ان سب کے باوجود جب وہ کوئی جواب نہیں دیتا تو اسے مغرور اور خود پسند کہا جاتا ہے۔ وہ جتنا کھنچتا ہے، مخالفوں کی ہمتیں بڑھتی چلی جاتی ہیں۔ ہلڑ باز لڑکے اس کے نام آنے والی ڈاک راستے ہی میں ڈاکیے سے چھین لیتے ہیں۔ ان لڑکوں کو یہ سمجھا دیا گیا ہے کہ یہ شخص ترقی پسند ہے اور اللہ رسول کا دشمن ہے۔ نواب صاحب کی مخالفت اور کانگریس کی حمایت کرتا ہی اس لیے ہے کہ یہ یہاں بھی کمیونسٹوں کا راج چاہتا ہے۔ یہ شخص کمیونسٹوں کا مخبر ہے۔ اسے تو رام پور میں رہنا ہی نہیں چاہیے۔ اس کا بائیکاٹ ہونا چاہیے۔

یہ سب تو تھا لیکن پری بیگم سے شادی کے بعد اسے یہ باتیں بہت حقیر معلوم ہونے لگی تھیں۔ گھر میں آتے ہی وہ ہر سلوک کو بھول جاتا تھا۔ حالات سے بے نیاز، اس کے قلم کی جولانیاں عروج پر تھیں۔ ہندوستان سے شائع ہونے والا کوئی رسالہ ایسا نہیں تھا جس میں اس کی تخلیقات شائع نہ ہو رہی ہوں۔

یہ چند دنوں کی چاندنی بھی اس کی قسمت کے قانون کو قبول نہ ہو سکی۔ پری بیگم بیمار رہنے لگی تھی۔ پہلے تو اس نے توجہ نہیں دی لیکن جب بخار مستقل رہنے لگا تو وہ چونکا اور جب معلوم ہوا کہ وہ تپ دق کا شکار ہو گئی ہے تو وہ اپنی مصیبتیں بھول کر اس کی تیمارداری میں لگ گیا۔ دن رات کی تیمارداری اور علاج کے باوجود وہ جاں بر نہ ہو سکی۔ ابھی شادی کو ڈیڑھ سال بھی نہیں گزرا تھا کہ پری بیگم اس کا ساتھ چھوڑ گئی۔

دو معاشقوں کی ناکامی کے بعد دل پر پتھر رکھ کر تو اس نے شادی کی تھی۔ یہ خوشی بھی ڈیڑھ سال سے زیادہ اس کے ساتھ نہ رہ سکی۔

پری بیگم یوں اس کے پاس سے اٹھ گئی جیسے ہمسائے کا مکان خالی ہو جائے اور

چوروں کی عمل داری ہو۔ وہ رات رات بھر جاگ کر اپنی حفاظت کرنے لگا۔ اس نے بہت حفاظت کی لیکن اس کا بہت کچھ لٹ گیا۔

چڑچڑا پن، بہت جلد سیخ پا ہو جانا، خود ترحمی، تشکک مزاجی، اذیت پسندی اور حد سے بڑھی ہوئی انانیت نے اس کی فطرت میں گھر کر لیا۔ ذرا سی بات کا بتنگڑ بنا لینا، اس کا بہت گہرا اثر قبول کرنا اور اتنی ہی شدّت کے ساتھ ردِ عمل کا اظہار کرنا اس کے مزاج میں داخل ہو گیا۔

مسلسل پریشانیوں اور افلاس نے یہ امراض پیدا ضرور کر دیے تھے لیکن پری بیگم کا بچھڑنا بہانہ بن گیا۔ قدرت سے لے کر انسانوں تک سے اس کا اعتماد اٹھ گیا۔ انسانوں سے وہ یوں بھاگنے لگا جیسے سپاہی کو دیکھ کر چور بھاگے۔ ذرا سے کسی کے تیور بدلے ہوئے دیکھے اور اس نے دعا سلام ترک کر دی۔ اپنے اندر چھپے ہوئے احساس کمتری کو احساسِ برتری میں بدلنے کے لیے دوسروں کو اذیت دے کر خوش ہونے لگا۔ معاشرہ اس کے لیے سانپ کا پھن بن گیا کہ اگر ایک ضرب میں نہیں مرا تو اسے پھر کچلو۔ جو کچھ اس کے ساتھ ہوا تھا اس پر ردِ عمل ظاہر کرنے کا وقت آ گیا تھا۔

اس نے سب سے پہلے اپنے ہم عصروں کی خبر لی۔

سینے سے لگائے بیٹھے ہیں جو آج بھی بوڑھی غزلوں کو
اے شآد وہ شعروں کے رسیا وہ عشق کے مارے کیا کم ہیں

....

وہ جو ننگی ناچتی رہتی ہے بزمِ عیش میں
اس غزل کا شآد کیا، ماحول بھی قائل نہیں
مبالغے کی تمام قسمیں جو شآد میں نے گلوں پہ چھڑکیں
پکار اٹھے باغباں کے پھٹو کہ واہ کیا شعر کہہ دیا ہے

....

www.urduchannel.in

جوان شاعر تو اس لغویت سے دامن چھڑا چکے ہیں
مگر ضعیفوں میں اب بھی چرچا ہے چاک دامنِ رفو کا

....

اس زمانے میں جو رنگین غزل کہتے ہیں
مقبرے کو وہ ابھی تاج محل کہتے ہیں

....

شراب و شاہد کے تذکرے ان سے چھین لیجے تو کیا کریں گے
شراب و شاہد کے تذکروں تک ہی جن کی جادو بیانیاں ہیں

اس نے صرف روایتی غزل گویوں کی پول نہیں کھولی، اپنے فن کی تعریف بھی بابانگِ دہل کی۔ یہ بھی دراصل ہم عصروں کو جلانے ہی کا عمل تھا:

جہاں تک ہماری غزل جائے گی
تغزل کے معنیٰ بدل جائے گی

....

ہم غلط رنگ میں اشعار نہیں کہہ سکتے
یعنی بے مقصد و معیار نہیں کہہ سکتے

....

اور پھر کہتے ہیں کس کو ندرتِ طرزِ ادا
میرے شعروں میں مری آواز پہچانی گئی

....

حقیقت یہ ہے شآد کی شاعری سے
اضافہ ہوا آپ کی آگہی میں

ادب میں معرکہ آرائیاں ہوتی آئی ہیں۔ سودا اور میر ضاحک کی جنگ رہی، انشا اور مصحفی کے درمیان معرکے ہوتے رہے لیکن شاد نے کسی ایک شاعر سے نہیں، پورے شہر

سے لڑائی مول لے لی۔ وہ ایسا بد دماغ مشہور ہو گیا کہ لوگ اسے معزز محفلوں میں بلاتے ہوئے ڈرنے لگے کہ منہ پھٹ آدمی ہے نہ جانے کس وقت کیا کہہ دے۔

وہ اگر پٹھان تھا تو دوسری طرف بھی پٹھان ہی تھے۔ وہ اگر دبنا نہیں جانتا تھا تو دوسروں کو لچکنا کب آتا تھا لہٰذا کبھی نہ ختم ہونے والی قبائلی جنگ کا آغاز ہو گیا۔ انجمن بازیاں ہوئیں، گروپ بندیاں کی گئیں اور معاملہ گالم گلوچ تک پہنچ گیا۔

شاد کے احساس برتری نے دوست کم بنائے، دشمن زیادہ پیدا کر لیے۔ وہ ہر اس آدمی سے لڑا جس نے اس کے سامنے گردن اٹھائی۔ ہر اس نظریے سے ٹکرا گیا جو اس کے نظریے سے متصادم ہوا۔

رام پور جیسی کٹّر ریاست میں جہاں محمد علی جوہر جیسے لیڈر کا اپنے وطن میں داخلہ ممنوع تھا، شاد نے انجمن ترقی پسند مصنفین کی بنیاد ڈالی تھی لیکن جب بات اس کے نظریات تک پہنچی تو اس نے الگ ہونے میں بھی دیر نہیں کی۔

وہی ترقی پسندی جس کے لیے وہ پوری ریاست سے لڑ گیا تھا جب اس پر اس انداز میں کھلی کہ بات خدا اور مذہب تک پہنچی تو وہ یہ کہہ کر اس سے ٹکرا گیا۔

''کمیونزم کے اندر بہترین اسلامی تصورات لے کر اس میں کچھ خباثتیں شامل کر لی ہیں مثلاً عبادت، ریاضت اور باطنی پاکیزگی کوئی چیز نہیں۔''

اس موقع پر اس نے ترقی پسندوں سے لڑائی مول لے کر کتنے بڑے خطرے کو دعوت دی تھی!

یہ سہارا بھی چلا گیا مگر اسے پروا کہاں تھی۔ اسے تو اپنے فن پر ناز تھا جس کا توڑ کسی کے پاس نہیں تھا۔ فن کا توڑ کسی کے پاس نہیں تھا لیکن اس کا حوصلہ توڑنے کے اور بھی تو طریقے تھے۔

......☆......

رات اندھیاری تھی۔ شام ہی سے ہوا کے جھکڑ چل رہے تھے۔ لالٹین ابھی ابھی بھڑک کر خاموش ہوئی تھی۔ آسمان پر بادل تھے لیکن کبھی کبھی پارۂ ابر ہٹ جاتا تھا تو چاند نظر

www.urduchannel.in

بھی آ جاتا تھا۔ حبس اور گرمی سے بچنے کے لیے شاد نے اپنا بستر چھت پر کر لیا تھا۔ ایک طرف ماں کی چارپائی پڑی ہوئی تھی۔

''اے لڈن!''

''جی اماں۔''

''کیا سو گیا؟''

''نہیں تو۔ ایک خیال آ گیا تھا اسے نظم کرنے کی فکر میں لگا ہوا ہوں۔''

''کم بخت، مجھے تو ہول آ رہے ہیں۔ چل نیچے چل کے لیٹتے ہیں۔ پورا گھر بھاڑ کیطرح کھلا پڑا ہے۔''

''آج کوئی پہلے دن سو رہے ہیں۔ چھت پر سوتے ہی ہیں۔''

''ہاں وہ تو ہے مگر آج میرا دل گھبرا رہا ہے۔ ابھی کتوں کے رونے کی آوازیں بھی آئی تھیں۔''

''کتوں میں کوئی مر گیا ہو گا۔''

''اب تو بھی مجھ اندھی سے بیلاپن کرنے لگا ہے۔''

''سو جاؤ، اماں۔ ہمارے گھر میں رکھا کیا ہے جو کوئی لے جائے گا۔ اپنا دیوان میں اپنے تکیے کے نیچے رکھتا ہوں۔ وہ یہ رکھا ہوا ہے۔''

''بھیا، جیسی تیری مت۔'' ماں نے کہا اور چپ ہو گئیں۔ شاد بھی کچھ دیر جاگ کر فکرِ سخن کرتا رہا اور وہ بھی سو گیا۔

وہ علی الصباح اٹھنے کا عادی تھا۔ وہ سو کر اٹھا اور اس نے ماں کو آواز دی۔ اس نے ماں کا ہاتھ پکڑا اور انھیں لے کر نیچے آیا۔ نیچے آتے ہی گھر کی حالت نے اسے سب کچھ بتا دیا۔ وہ اوپر سویا رہا اور نیچے چوری ہو گئی۔ چوری بھی ایسی کہ لے جانے والے لحاف بستر تک اٹھا کر لے گئے تھے۔

''اماں، غضب ہو گیا۔ چوری ہو گئی۔''

''یا میرے اللہ۔ یہ کیا کہہ رہا ہے تو۔''

''ہاں اماں۔ایک ایک کیل چلی گئی۔''

'' میرا رات ہی سے دل گھبرا رہا تھا مگر تو کب سنتا ہے میری۔ بہو کی کچھ نشانیاں تھیں،وہ بھی چلی گئیں۔تو دیکھ تو سہی،ناس پیٹوں نے کچھ چھوڑا بھی۔''

شاد نے گھوم پھر کر دیکھ لیا۔پورے گھر میں جھاڑو پھری ہوئی تھی۔

''دل میں لہو کہاں تھا کہ اِک تیر آلگا''

شاد گھر سے نکلا،اپنے ایک شاگرد کو ساتھ لیا اور کوتوالی پہنچ گیا۔پولیس کے سپاہی آئے۔پوچھ گچھ ہوئی۔اشیا کی فہرست بنی۔اس سے آگے کچھ نہیں۔

شاد کو یہ معلوم ہوتے دیر نہیں لگی کہ یہ چوری شاہد حسین کوتوال کی ملی بھگت سے ہوئی ہے۔لو،پھر وہی غالب والا معاملہ۔اس کو ستانے میں بھی کوتوالِ شہر پیش پیش تھا۔مجھ میں اور غالبؔ میں کتنی مماثلت ہے۔

یہ اندھیرا کوتوالی کے قریب
شادؔ صاحب ہم تو لُٹ کر رہ گئے

جب کوتوال خود اس شرارت میں ملوث ہے۔جب چوری کا مقصد چوری نہیں،شہر والوں کے ساتھ مل کر مجھے ستانا مقصود ہے تو اس چوری کا سراغ کیا لگ سکتا ہے۔وہ یہ کہہ کر چپ ہوگیا۔

مجھ سے کافر کے یہاں شادؔ مکمل سرقہ
عسسِ شہر بڑا صاحبِ ایماں ہے کوئی

وہی معززین جو اس چوری میں ملوث تھے،مزاج پُرسی کو بھی آئے۔کوتوال شہر نے ایک ایک چور کو اُلٹا لٹکا کر مارنے کا عہد کیا۔

حیدر آباد میں فانی پہ جو بیتی اے شادؔ
مجھ پہ یوپی میں وہی ظلم ہنر ہے کہ نہیں

اسے اپنی ذات اتنی حقیر نظر آئی کہ تلوار کی طرح پینترا بدل کر کھڑا ہوگیا۔

سب کچھ تو چھن چکا،اب رہا کیا ہے۔ان حالات میں نسلی تفاخر ہی تھا جو اسے

www.urduchannel.in

سہارا دے سکتا تھا۔

''میں خالص افغانی ہوں۔والد و والدہ،نانا،نانی سب افغانی۔آج بھی میرے سات چچا افغانستان میں ہیں۔زمین،بندوقیں اور خان کا حق محفوظ ہے۔''

ان الفاظ کے ادا ہوتے ہی اس کی رگوں کا خون گرم ہوگیا۔یہ معلوم ہوا جیسے اپنے دشمنوں کو اس نے مسل کر رکھ دیا۔اس نے لہجہ بدل بدل کر ان الفاظ کو ادا کیا۔ہر لہجے کے ساتھ نسلی تفوق کا احساس بڑھتا ہی گیا۔

''میں افغانی النسل ہوں۔فولاد لچکتا نہیں،ٹوٹ جاتا ہے۔''

والد بچپن میں تلوار کے ہاتھ سکھایا کرتے تھے۔زود رنج،نجیب الطرفین افغان سپہ گری کو یاد ہی کر سکتا تھا۔حالات نے وہ تلوار بھی چرالی تھی اور جسمانی طاقت بھی۔اس نے قلم اٹھایا اور دشمنوں کی گردنیں شمار کرنے بیٹھ گیا۔اب اس نے سوچ لیا کہ اب تک جتنی اینٹیں مجھ پر برسائی گئی ہیں،اس سے زیادہ پتھر برساؤں گا۔اس نے گھر کو مورچا بنالیا،کاغذ کو میدان اور قلم کو تلوار۔

جب میر کو زندگی کا سامنا ہوا تو اس نے سر جھکا دیا،غالب مسکرا دیا،فانی رو پڑا اور شاد؟ شاد پینترا بدل کر کھڑا ہوگیا اور قلم سے ڈھال اور تلوار کا کام لیا۔

اس نے جب سو تیر چلائے
میں نے ایک غزل چپکا دی

طویل مشقِ سخن میں شاد نے واقعیت کو مصور کرنے،صداقتوں کو شعری پیکر دینے،غزل میں مردانہ لہجہ برقرار رکھنے اور عمومی واقعات کو ندرت ادا کے ساتھ بیان کرنے میں مہارت حاصل کر لی تھی اور اس کی قادر الکلامی عروج پر تھی۔دوسری طرف انتہا پسندی اس کے خمیر میں داخل تھی۔تابڑ توڑ مشکلات کے پہاڑ ٹوٹے تو غالب کی طرح اجداد کی سپہ گری پر ناز کرنے والا یہ پٹھان شاعر کچلنے کی جگہ اپنی انا کو بلند کرتا چلا گیا اور اپنے قلم،زبان اور طرزِ بیان سے تیغ جوہر دار کا کام لے کر مخالف اور منفی قوتوں پر طنز کے بے محابا وار کرنے لگا۔

پھول برسانے والے شاعر کو حالات زمانہ طنزیہ شاعری کی طرف لے آئے۔

بے کسوں پر ظلم ڈھاکر ناز فرمایا گیا
طنز کی جانب میں خود آیا نہیں لایا گیا

اس نے عاشقی کی بیاض لپیٹ کر رکھ دی۔ اس کی نئی بیاض میں ایسے اشعار نظر آنے لگے۔

ہم بے چارے کس گنتی میں نیچی چولی نیچی بات
اونچے شملے والے ہم پر وار کریں اوچھا تو کیا

....

آگ دے کے گلشن کو بھُس میں ڈال کر چنگی
پہلے کیا ہوا، پوچھوں۔ پھر بُرا ہوا کہہ دوں

....

اصلاحاً برے کو بھلا کہہ دیا
یعنی گالی نہ دی رہنما کہہ دیا

....

اٹھا رہے ہیں جو لطف شباب آئینہ
ضمیر اپنے اگر دیکھ لیں تو ڈر جائیں

....

شاد عارفی کی ۱۹۴۲ء کے بعد کی تمام تر شاعری طنز کی بنیاد پر کھڑی ہے۔ وہ ریشمیں شاعری سے شعلہ بیانی کی طرف آ گیا۔ یہ راہ اس نے حالات سے تنگ آ کر شعوری طور پر اختیار کی۔ پٹھانوں کی روایتی خوں ریزی کے اثر سے اس نے مضامین شکار کرنے شروع کر دیے۔ اب کس کی خیر تھی، چہرے لہولہان ہو گئے۔ اس نے ایک اچھے طنز نگار کی طرح دکھتی رگوں پر ہاتھ رکھا تو اچھے اچھے بلبلا اٹھے۔

اس نے اپنے نجی واقعات سے تحریک حاصل کر کے تجربے کو شعر میں اس طرح بیان کیا کہ وہ ذاتی نہیں رہے، عالم گیر ہو گئے اور آپ بیتی، جگ بیتی نظر آنے لگی۔ اس نے

www.urduchannel.in

طنز کی تلوار دوست نما دشمنوں کے لیے اٹھائی تھی لیکن جلد ہی ایک اچھے طنز نگار کی طرح، معاشرے کا ہر جھول اس کی نظروں میں آنے لگا۔ اس کے قلم کا نشتر ہر اس برائی کی طرف متوجہ ہوا جو اس کی نظر میں برائی تھی۔ اس کی کمان کے چلّے سے بیک وقت بہت سے تیر ایک ساتھ پر جوڑ کر نکلنے لگے اور ایک ساتھ کئی کئی شکار کرنے لگے۔ کوئی جھول، کوئی رخنہ، کوئی ناہمواری ایسی نہیں رہی جس تک اس کی نگاہِ دور بیں پہنچی نہ ہو۔ سماجی عدم توازن، اقدار کا انتشار، مفلسی، اقربا نوازی، چور بازاری، غلامی کے مہلک اثرات، مکر و فریب، ناانصافی، ظلم، رشوت خوری، منافقت، مغربی طرز کی بے جا تقلید۔ غرض زندگی کا کوئی پہلو اس کی نظر سے بچ نہیں سکا۔

بے کسی میں سابقہ پڑنے پہ اندازہ ہوا
آپ کو میں دوست سمجھا تھا بڑا دھوکا ہوا

....

کہنے والوں نے کہا ظل الٰہی جن کو
ہم انھیں سایۂ دیوار نہیں کہہ سکتے

....

غرض نہیں ہے نشیب و فراز منزل سے
تو بھیڑ چال ہوئی پیروی اگر ہے یہی

....

لپٹ گئی ہے یہاں بات کچھ دوشالے میں
عدوئے شہر کو ہم شہر یار کہتے ہیں

....

ناجائز پیسے کی اجلی تعمیروں کے ماتھے پر
آپ نے لکھا دیکھا ہوگا یہ سب فضلِ باری ہے

غالب کو مینائے غزل اس لیے تنگ نظر آتی تھی کہ تجمل حسین خاں کی مدح کے لیے اس میں بہ قدرِ ذوق، وسعتِ بیاں کی گنجائش نہیں تھی۔ اس محدود اور مخصوص مزاج رکھنے والی صنفِ سخن میں موضوعات کا ایسا تنوع پیدا کر دینا کچھ شاد عارفی ہی کا حصہ تھا۔ فنی ہیئت کی پابندی کے ساتھ موضوعات کے بے کراں سمندر کے لیے غزل کو سفینہ بنا لینا اور ایسی وسعت عطا کرنا کہ نظم اس کے سامنے ماند پڑ جائے، شاد کا کمال تھا لیکن وہ جوہری کہاں تھے جو اس کی قدر کرتے۔

نقدِ ماحول کو اس نے فن بنایا تھا اور روئے سخن سب کی طرف تھا۔ کمال یہ تھا کہ جو سنتا تھا اسے اپنی کہانی یاد آتی تھی۔ جو چہرے اسے دیکھ کر بگڑ جاتے تھے مزید بگڑنے لگے۔ وہ بھی اب دبنے والا نہیں تھا۔ پہلے اسے یہ ناز تھا کہ وہ اپنے ہم عصروں سے مختلف شاعر ہے، اب اس ناز میں یہ غرور بھی شامل ہو گیا کہ وہ غزل میں اک طرزِ خاص کا موجد ہے۔

طنز اردو ادب میں تھا ہی نہیں
اور تھا بھی اگر تو نام نہاد
جیسے شہدوں میں ساقیِ نو خیز
جیسے کالی گھٹا میں جگنو شادؔ

اردو میں ظریفانہ شاعری کو "طنز" کا ہم معنی سمجھ لیا گیا تھا جب کہ طنز الگ چیز ہے، ظرافت الگ۔ اس غلط فہمی کا شکار اکبر الہ آبادی بھی ہوئے جن کی طنز نگاری کا بڑا شہرہ ہے۔

سرد ہے موسم ہوائیں چل رہی ہیں برف بار
شاہدِ معنیٰ نے اوڑھا ہے ظرافت کا لحاف

یہ حقیقت ہے کہ اکبر کا کلام ظریفانہ زیادہ ہے طنز آمیز کم۔ جبکہ شادؔ کے تیور یہ ہیں:

پئے تحسین وطن طنز ہمارا فن ہے
ہم کسی خانہ بر انداز سے ڈرتے ہی نہیں

یہ پٹھان شاعر مصلحت کا لحاف اوڑھنے کا قائل ہی نہیں تھا۔ یہی طنز کی تعریف

www.urduchannel.in

ہے۔

جب اکبر کا یہ حال ہے تو دوسرے شاعر کس گنتی میں۔ طنزیہ اشعار کے چھینٹے دیگر اچھے شعرا کے کلام میں بھی نظر آ جاتے تھے لیکن شاد کی طرح طنز کو اپنا اسلوب اور اپنی پوری شاعری کو طنز کی بنیاد پر تعمیر کرنے والا شاعر شاد کے سوا کوئی نظر نہیں آتا۔

طنز، ظرافت سے بالکل الگ چیز ہے۔ طنز ایک طرح کی تنقید، ایک قسم کا عملِ جراحی ہے۔ طنز میں چیز کے برے پہلو نمایاں کر کے دکھائے جاتے ہیں۔ طنز میں شدت اور تیزی ضروری ہے۔ اس کے نشتر کسی قدر نکیلے ہوتے ہیں۔ طنز میں جتنی شدت ہوتی ہے، اتنا ہی وہ کامیاب ہوتا ہے لیکن یہ شدت اور تیزی ایک اچھے اور بڑے مقصد کے لیے ہوتی ہے۔

رام پور کے پٹھنولی مردانہ پن، واشگاف طرزِ تخاطب، بے جھپک اسلوبِ گفتار، ابلاغ و ترسیل کے براہِ راست انداز، ڈرامائی کیفیت، عمرانی حقائق کی شناخت، سماجی شعور نے مل جل کر اسے ایک بے مثال شاعر بنا دیا۔

وہ سخت ترین ماحول میں بھی اور مدِ مقابل کے اعلیٰ ترین رتبے کے باوجود مرعوب ہونا جانتا ہی نہیں تھا۔ زمانے اور سماج کے ساتھ ساتھ وہ اربابِ اقتدار کے ایسے رویوں پر بھی جو اس کے نزدیک غلط تھے، دو ٹوک اور بھرپور طنز کرنے میں چوکتا نہیں تھا۔

جو خزانوں کو رعایا کی امانت سمجھے
ان سے تعمیر کبھی تاج محل ہو نہ سکے

....

ہر غلط بات پر بھی ہاتھ اٹھاؤ
یہ نمائندگی نہیں، شرماؤ

....

انصاف بیچتے ہیں بہ آوازۂ دہل
ایسے بھی منسلک ہیں عدالت سے آپ کی

....

اپنی تقدیر کو پیٹے جو پریشاں ہے کوئی
آپ کے بس میں علاجِ غمِ دوراں ہے کوئی

اسے غزل اور نظم پر یکساں قدرت حاصل تھی، ایسا بہت کم ہوتا ہے لیکن شاد کی مہارت دونوں میدانوں میں بے مثال تھی۔ نظموں میں موجود وضاحت کی گنجائش اس کے طنز کو اور بھی ابھارتی تھی۔ سماجی برائی کا کوئی پوشیدہ سے پوشیدہ گوشہ بھی اس کی نظروں سے چھپا نہیں رہ سکتا تھا اور پھر وہ اپنے مخصوص اسلوب میں جب برائیوں کو سطح پر لاتا تھا تو اثر دو چند ہو جاتا تھا۔ موضوعات کی عمومیت اور چھوٹے چھوٹے مسائل کو شعری زبان عطا کرنے سے شاد کی نظم میں ایک انفرادی رنگ پیدا ہو گیا تھا جس میں نکیلی داخلیت اور شگفتہ خارجیت کا ایک بہت ہی دلکش امتزاج پیدا ہو گیا تھا۔ ان نظموں کی مانوس فضا، منفرد طنزیہ دائرہ، کرداروں کے اپنے لہجے، مخصوص زبان، نفسیات کی عکاسی، شاد کا شمار بڑے شاعروں میں کرانے لگی تھیں۔ طنز نگاری میں تو خیر وہ اپنی مثال آپ تھا۔ اردو شاعری میں کوئی دوسرا شاعر ایسا نہیں تھا جس کی پوری شاعری طنز پر مشتمل ہو۔ ترقی پسند بہت دعوے کرتے تھے کہ سماجی زندگی ان کا موضوع ہے لیکن شاد کی نظر زندگی کے جن گوشوں تک پہنچتی تھی اور جس طرح وہ ان کا جائزہ لیتا تھا، اردو شاعری کے لیے یہ بالکل نئی چیز تھی۔

اس کی بدقسمتی اس کے ساتھ ساتھ چل رہی تھی۔ معاصرین تو اسے گھر کی مرغی سمجھ کر بدسلوکی کر ہی رہے تھے بیرونی ناقدین بھی اسے سمجھ نہیں سکے۔

قصور ان ناقدین کا بھی نہیں تھا۔ شاد نے قطعاً نئی صنفِ سخن اُردو میں رائج کی تھی لہٰذا لکھنے والے اس کے بارے میں کوئی حتمی فیصلہ نہیں کر پا رہے تھے۔ وہ الجھن میں گرفتار تھے۔ یہ الجھن ان کی نہیں، ادب کی الجھن تھی۔ الجھن یہ تھی کہ طنز، ظرافت، ہجو، مزاح وغیرہ کو ہم معنی سمجھ لیا گیا تھا اور ان چیزوں کو دوسرے درجے کی چیز سمجھا جاتا رہا تھا۔ طنز و مزاح ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہو کر رہ گئے تھے۔ طنز کی تعریف کرتے ہوئے ہر نقاد اسے ہجو یا ظرافت وغیرہ سے آمیز کر دیا کرتا تھا۔

www.urduchannel.in

اس الجھاؤ کی بنیادی وجہ شاید یہ تھی کہ حالی کے بعد اردو کے ناقدوں نے مغرب کی پیروی کرتے ہوئے تمام اصنافِ سخن کا جائزہ انگریزی ادب کی روشنی میں لیا۔ انگریزی ادب میں غزل کی طرح خالص طنز کی بھی کوئی جان دار روایت نہیں تھی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ نہ شاعروں نے خالص طنز کی طرف توجہ کی اور نہ نقادوں نے اسے سمجھا۔

شاد اپنے تیر کا خود شکار رہا۔ اس نے ایک ایسی صنفِ سخن ایجاد کر دی جس کی کوئی روایت موجود ہی نہیں تھی۔ نقادوں نے ٹامک ٹوئیاں مارنی شروع کر دیں۔ اسے مزاحیہ شاعر سمجھا جانے لگا۔ وہ اپنی اس ناقدری پر بھنّا اٹھا۔ کوئی اور ہوتا تو اس وقت کا انتظار کرتا جب نقاد اس کے فن کا اعتراف کر لیں لیکن وہ تو اپنے مزاج سے مجبور تھا۔ نقادوں نے اسے نظر انداز کیا اور اس نے نام لے لے کر انھیں لتاڑنا شروع کر دیا۔ نیاز فتح پوری، مجنوں گورکھپوری، کلیم الدین احمد، آل احمد سرور جیسے چوٹی کے نقادوں اور جوش، فراؔق و جگر جیسے اپنے وقت کے مقبول ترین شاعروں کے متعلق ایسی ایسی باتیں لکھ دیں کہ اپنی ادبی شہرت اور ساکھ کو داؤ پر لگا دیا۔ اس نے طنز و طعنے کے ایسے تیر برسائے کہ مخالفین کا سنبھلنا مشکل ہو گیا۔

اسے کوئی نظر انداز کرے اور وہ کچھ نہ کہے؟ اس نے ان سب کی خبر لی اور اس طرح کہ اخلاقیات کا دامن بھی ہاتھ سے چھوڑ دیا۔

’’جگر کے ہاں فنی خامیوں کی بھرمار ہے اسی لیے وہ بے چارہ کسی بھی مشاعرے میں مجھ سے آنکھ چار نہ کر سکا بلکہ میری تواضع میں لگا رہا۔‘‘

نیاز فتح پوری کے بارے میں لکھا:

’’اس کم بخت کو براہِ راست جو میں نے لکھا تھا، اس نے بھی کوئی جواب نہیں دیا۔ جواب دے بھی کیا سکتا ہے (جاہل کہیں کا) بنتا ہے قابل۔ مجھے تو اس کی وہ وہ کمزوریاں معلوم ہیں کہ گھوم جائے گا۔ یہاں رام پور میں شاہ صاحب کے مریدوں اور مُلّوں کی طرح زندگی گزار چکا ہے۔ تہہ بند، چٹائی اور محلے کی روٹیوں پر پلا ہے۔‘‘

’’قتیل مراد آبادی نے مجھے مطعون کرنے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا اور

آ کر میں دم دبا گیا۔''

''ڈاکٹر سید عبداللہ کا نام محلِ نظر رہا کیونکہ یہ تو بہت ریزہ چیں بلکہ عبادت بریلوی قسم کا ناقد ہے۔اس کی میں نے اتنی غلطیاں گنائی ہیں کہ گھوم ہی تو جائے گا۔''

مختلف اوقات میں اس نے مختلف نقادوں کی اس طرح خبر لی اور ایسی فضا بنا دی کہ ناقدین اس سے ڈرنے لگے۔کوئی کچھ لکھنا بھی چاہتا ہوگا تو ڈر کے مارے خاموش ہو جاتا ہوگا کہ اگر ایسی ویسی کوئی بات نکل گئی تو اس کی خیر نہیں۔ایک دوسرے پر لکھنے کا عمل تو آپس کے برتاؤ سے ہوتا ہے۔وہ ایسا ماحول برقرار ہی نہیں رکھ سکا پھر یہ بھی ہوا کہ الٹی سیدھی سنا کر دشمنی مول لے لی۔اس کے بعد اگر کسی نے کچھ لکھا بھی تو اس کے خلاف ہی لکھا۔

کسی فنکار پر اظہارِ رائے کے سلسلے میں ناقد کے ذاتی تعلقات و روابط کا بڑا ہاتھ ہوتا ہے۔ذاتیات سے بلند ہو کر تنقید کرنے والے بہت کم ہیں اور جو ہیں بھی، ان کے بھی کچھ نظریات ہوتے ہیں۔جو فنکار ان کے پسندیدہ نظریات کی تبلیغ کرتے ہیں، انھیں اچھا بلکہ عظیم اور جو اس پیمانے پر پورے نہیں اترتے، انھیں ناشاعر یا کم تر درجے کا فنکار قرار دیا جاتا ہے۔شاد کے ذہن پر نہ کسی نظریے کی چھاپ تھی، نہ وہ ناقدین کو خوش کرنے کے لیے ان سے مصلحت کے رشتے اختیار کر سکا۔کسی نے کوشش بھی کی تو شاد کی صاف گوئی نے اس کا راستہ کاٹ دیا۔

ایک ناقد نے اسے خط لکھا کہ میں آپ کی شاعری کا بے حد معترف ہوں۔میں چاہتا ہوں کہ آپ کی شاعری پر ایک تفصیلی مضمون لکھوں تا کہ موجودہ دور کے لوگ آپ سے واقف ہوں۔آپ سے گزارش ہے کہ اپنا مطبوعہ اور غیر مطبوعہ کلام مجھے بھیج دیں۔

شاد کو کسی کی ایسی بے تکلف گزارش کب گوارا تھی، اس نے اپنا قلم طنز کی روشنائی میں ڈبویا اور موصوف کی طبیعت صاف کر دی:

''میاں صاحب زادے!تم نے کتابیں اور رسالے حاصل کرنے کی خوب ترکیب نکالی ہے۔یاد رکھو، میں ان شاعروں میں سے نہیں ہوں جو اپنی تعریف یا خود پر مضمون لکھوا کر خوش ہوتے ہیں۔مجھے اپنے اوپر مضمون وضمون نہیں لکھوانا ہے۔''

www.urduchannel.in

اس ڈانٹ کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس ناقد نے ان پر مضمون تو لکھا لیکن اس مضمون میں اس کی تعریف نہیں تھی، اس کی شاعری کا مذاق اڑایا گیا تھا۔یہی رویہ دوسرے کئی نقادوں نے بھی اختیار کیا۔

نقادوں کی یہ بے اعتنائی اس کے لیے بے حد مضرت رساں ثابت ہوئی اور وہ اس نفسیاتی تسکین سے بھی محروم ہو گیا جو کم از کم اپنی ادبی اہمیت کے چرچے سن کر فنکار کو میسر آتی ہے۔

اس اعتبار سے وہ ہندوستان گیر شہرت کا مالک ہو گیا تھا کہ ادبی رسائل اس کے کلام کے انتظار میں رہتے تھے لیکن ہم عصر مقامی اساتذۂ سخن کی مخالفتوں اور نقادوں کی سرد مہری نے اس میں ایسی نفسیاتی کمزوریاں پیدا کر دیں کہ وہ راہ چلتوں سے لڑنے کے لیے تیار رہتا تھا۔پھر وہ یہ بھی نہیں دیکھتا تھا کہ مدِ مقابل اس کا ہم پلہ بھی ہے؟

ایسے نک چڑھے سے کون خوش رہ سکتا تھا۔وہ سر سے پاؤں تک طنزِ شدید بن کر رہ گیا تھا۔بیرونی دنیا میں شہرت ہونے کے باوجود اسے مشاعروں میں بلاتے ہوئے لوگ ڈرتے تھے۔رام پور کی خاک سے چمٹا بیٹھا تھا۔زندگی میں دو چار مرتبہ ہی رام پور سے باہر نکلنا نصیب ہوا ہوگا۔

یہ اس کی زندگی کا ایک رخ تھا۔صاف گوئی اور تلخ گوئی کی صفات سے متصف ہونے کے باوجود وہ نہایت خوش طبع، ہنس مکھ، بذلہ سنج اور ظریف تھا۔بات بات پر قہقہہ لگا کر ہنسنے والا۔ان نفسیاتی کمزوریوں کے ساتھ ساتھ جو شاد عارفی کو اس کے ماحول اور معاشرے نے بخشی تھیں، اپنی فطرت کے اعتبار سے انتہائی غیّور، خود دار، کشادہ قلب، منصف مزاج، اقربا پرور، انسان دوست اور سادہ لوح تھا۔

موڈ میں ہوتا تو ان صفات کا مظاہرہ بھی کرتا مگر حالات اسے موڈ میں رہنے ہی کب دیتے تھے۔

حالات کے زہر نے اسے بدگمانی کے مرض میں مبتلا کر دیا تھا۔وہ اپنے دوستوں کی معمولی سی لغزش کو بھی اپنی تذلیل سمجھ بیٹھتا تھا۔یہ الگ بات کہ اگر اسے منایا جاتا تو فوراً من

بھی جاتا۔اس میں کوئی رگ ایسی ضرور تھی جو جلتی بجھتی رہتی تھی۔

رام پور میں ایک مشاعرہ ہے۔ وہ آتا کب تھا، اسے بہ ہزار دقت، گھیر گھار کر لایا گیا ہے۔ ایک اور مقامی استاد شاعر محشر عنایتی بھی شریکِ مشاعرہ ہیں۔ محشر عنایتی کی صاحبِ مشاعرہ سے رشتہ داری ہے اس لیے ان کی خوب آؤ بھگت ہو رہی ہے۔ صاحبِ مشاعرہ پانوں کا خاصدان اور سگریٹ کا ڈبا پہلے محشر صاحب کے پاس لے کر گئے ازاں بعد شاد صاحب کے پاس لے کر گئے۔ بس پھر کیا تھا، آ گیا پٹھان کو غصہ۔

''چھوڑیے صاحب ان چونچلوں کو۔ ہٹائیے سگریٹ، میں بیڑی پیتا ہوں اور یہ پان انھیں کھلائیے جو مشاعروں میں آتے ہی پان کھانے کے لیے ہیں۔ میں گھر جا کر خوب پان کھا لوں گا۔''

ایسا غیر متوقع جواب سن کر سناٹا چھا گیا۔ شاد کے مزاج سے واقف تو سب تھے لیکن اس وقت تو ایسی کوئی بات ہی نہیں ہوئی تھی۔

''شاد صاحب، بات کیا ہوئی۔'' صاحبِ خانہ نے پوچھا۔

''میری تذلیل کی گئی ہے۔ محشر مجھ سے بڑا شاعر ہے جو میں اس کی جھوٹن کھاؤں گا۔ آپ کو حفظ مراتب کا خیال نہیں۔ جو بڑے شاعر ہیں اب تو وہی یہاں پڑھیں گے۔ مجھے تو معاف رکھیں۔''

بات اب سمجھ میں آئی کہ وہ اس بات پر ناراض ہوئے ہیں کہ پان اور سگریٹ پہلے محشر کی طرف کیوں کیے گئے۔

موقع کی نزاکت کو بھانپتے ہوئے محشر عنایتی فوراً اپنی جگہ سے اٹھے اور انھوں نے شادؔ کا ہاتھ تھام لیا۔

''آپ چلے گئے تو ان کا مشاعرہ صفر ہو جائے گا۔ ان سے یہ غلطی بر بنائے رشتے داری ہو گئی۔ میں آپ سے معذرت خواہ ہوں۔''

صاحبِ خانہ نے بھی اپنی غلطی تسلیم کی تب جا کر شاد کا غصہ ٹھنڈا ہوا۔ بھڑ کے ضرور تھے لیکن منایا گیا تو جھاگ کی طرح بیٹھ بھی گئے۔

www.urduchannel.in

یہ ایک ایسے ضدّی بچے کی نفسیات تھی جو گھر والوں کی توجہ اپنی طرف مبذول کرنے کے لیے نت نئی شرارتیں کرتا رہتا ہو۔ ہر وہ حرکت کرنے کے لیے تیار رہتا ہو جس سے گھر والے خوش نہ ہوں۔

اسے معلوم تھا کہ روایتی شعرا غزلوں کے رسیا ہیں۔ وہ تو نظموں ہی کو پسند نہیں کرتے کجا یہ کہ آزاد نظمیں۔ اس نے اپنے شاگردوں اور کچھ نوجوان شعرا کی حوصلہ افزائی کی اور ایک ایسا مشاعرہ کرا ڈالا جس میں آزاد نظمیں پڑھی گئیں۔ ایک اور جدت اس نے یہ کی کہ مشاعرے کی صدارت ایک ہندو شاعر کلیان چندر شِشی کو سونپ دی۔

اس مشاعرے میں بعض ایسے نوجوان شاعر بھی شریک ہوئے جو شاد کے مخالف استادوں کے شاگرد تھے۔ اس سے ان اساتذہ کی ناراضگی اور بھی بڑھ گئی۔ ایک تو آزاد نظم کی بدعت دوسرے یہ سمجھا گیا کہ یہ شخص ہمارے شاگردوں کو توڑ رہا ہے۔

رام پور میں اس مشاعرے کی گونج بہت دنوں تک سنائی دی اور شاد کی مخالفتوں میں مزید اضافہ ہو گیا۔

......☆......

اس کا تعلق کسی سیاسی گروپ سے نہیں تھا لیکن ریاست میں اسے خطرناک سیاسی آدمی سمجھا جانے لگا تھا۔ اہلِ اقتدار ہی نہیں، عام لوگوں میں سے بھی بعض یہ سمجھتے تھے کہ اس کا تعلق کسی انقلابی گروپ سے ہے۔

بعض ایسے شہرت پسند بھی تھے جن میں خود تو آگے آنے کی ہمت نہیں تھی، چاہتے تھے اسے آگے رکھ کر اپنے لیے شہرت کا سامان مہیا کریں۔ اسی مزاج کے کچھ لوگ یوم محمد علی جوہرؔ کا انعقاد کر کے اپنا شمار حریت پسندوں میں کرنا چاہتے تھے۔ ریاست کے کرتا دھرتاؤں سے خوف زدہ بھی تھے۔ انھوں نے سوچا اگر شاد ان کے ساتھ مل جائے تو یہ بیل منڈھے چڑھ سکتی ہے۔

وہ معززین جو یہ پوچھنے کے روادار نہیں تھے کہ اس پر بیت کیا رہی ہے، جب وقت پڑا تو اپنا منصوبہ لے کر اس کے پاس پہنچے۔ سوچا تو یہ تھا کہ شادؔ کی طرف سے حوصلہ افزائی

ہو گی لیکن شاد لگی لپٹی رکھنے والا کب تھا۔ ''حضرت، سانپ گزر جانے کے بعد لکیر پیٹنے کا کیا فائدہ۔''

''شاد صاحب، کیا کہہ رہے ہیں آپ؟ جوہر تو فخرِ رام پور تھے۔ ان کا دن منانا تو ہمارا فرض ہے۔''

''بھائی، اب وہ زمانہ نہیں کہ ہم اجداد کو روتے رہیں۔ یہ جرأت نہیں بزدلی ہے۔''

''آپ کے نزدیک کسی کے کارناموں کو یاد رکھنا بزدلی ہے؟''

''بزدلی بھی ہے، مردہ پرستی بھی۔'' شاد نے کہا ''آپ کو یاد ہوگا، علی برادران پر اپنے ہی وطن میں داخلہ ممنوع تھا۔ اس وقت کوئی ان کے حق میں نہیں بولا۔''

نام سے اہلِ سیاست کے لرز جاتا تھا تاج
کروٹیں لیتا تھا کانٹوں پر شہنشاہی مزاج
جب کہاں تھے آپ اور جوہر سے ہمدردی کی دھن
چاٹتا تھا جب وطن کو عافیت کوشی کا گھن
یومِ جوہر جب مناتے آپ تب اک بات تھی
کار فرما جب غلامی کی بھیانک رات تھی

''تو کیا فراموش کر دیں انھیں؟''

''فراموش نہ کریں۔ جو ان کا مشن تھا، اس پر عمل کریں۔ یوم ووم منانے کا میں قائل نہیں۔''

مرثیہ مجھ سے کسی مرحوم کا ممکن نہیں
اب ہے جرأت کا زمانہ بزدلی کے دن نہیں
دن نہیں بیٹھے ہوئے روتے رہیں اجداد کو
جب کہ لازم ہے شجاعت پیش پا افتاد کو

شاد کی اس تنقید پر آنے والوں کو غصہ تو بہت آیا لیکن کر کیا سکتے تھے۔ مونچھوں کو تاؤ دیا، نتھنے پھلائے اور اٹھ کر چلے گئے۔

www.urduchannel.in

ان کے جاتے ہی شاد کے ہاتھ ایک موضوع آ گیا۔ اس نے خامۂ طنز سنبھالا اور نظم لکھنے بیٹھ گیا۔

جوہرِ قابل کے دشمن ہیں ریاست کے اصول
اپنے بل بوتے کوئی پہنچے سرِ عرشِ قبول
جس میں آزادی کے گن دیکھے اسے گہنا دیا
سخت جاں نکلا تو طوقِ آہنی پہنا دیا

بڑے دروبست کے ساتھ ایک طویل نظم ''یومِ محمد علی جوہر'' لکھ ڈالی جس میں کوئی دکھتی رگ ایسی نہ چھوڑی جسے جھنجوڑا نہ گیا ہو۔

ہفتہ وار ''ریاست''، دہلی، اپنی حق پروری کے لیے بڑی شہرت رکھتا تھا۔ اس نے یہ نظم ''ریاست'' کو بھیج دی۔

وہ اس انتظار میں تھا کہ کسی قریبی اشاعت میں اسے شامل کیا جائے گا لیکن وہاں تو معاملہ ہی کچھ اور ہوا۔ ادارے نے یہ نظم ریاست رام پور کے ارباب حل وعقد کو پہنچا کر بطور انعام رقم وصول کر لی۔

یہ پرچہ دیسی ریاستوں کی پولیں کھولنے میں بہت آگے تھا۔ شاد کو اپنے معاملے میں بھی یہی توقع تھی لیکن اسے معلوم ہوا کہ بھونکنے والے کتے کے لیے لقمہ بڑا کارگر نسخہ ہوتا ہے۔

اس طرف سے بددل ہو کر اس نے یہ نظم کئی اور روزناموں کو بھیجی لیکن اس میں کچھ ایسی سخت باتیں تھیں اور یہ سب شاہ کے وظیفہ خوار نکلے کہ نظم کی اشاعت کی نوبت نہ آ سکی۔

اس کا غصہ پھر اسی طرح نکلا کہ نظم چاک کر کے چائے کی کیتلی کے نیچے آگ روشن کر لی۔

میں تعارف بھی کرا دوں گا اگر چاہیں گے آپ
شمر ذی الجوشن، یزیدِ بدچلن باقی بھی ہے

یہ نظم اشاعت پذیر تو نہ ہو سکی لیکن ریاست کے حکمرانوں کے کانوں تک ضرور پہنچ گئی۔

نواب کی کوٹھی پر اکثر مشاعرے منعقد ہوتے رہتے تھے۔ شاد وہاں کبھی نہیں گیا تھا بلکہ جو شعرا ان مشاعروں میں شریک ہوتے تھے، شاد ان سے بھی قطع تعلق کر لیتا تھا۔ نواب اور شاد کے درمیان ایک سرد جنگ چل رہی تھی۔ نواب کے مقابلے میں شاد کا انتقام یہی ہو سکتا تھا کہ وہ ان محفلوں کی رونق نہ بڑھائے۔ یہ انتقام اس لیے کارگر بھی تھا کہ نواب کسی کو بلائے اور وہ نہ جائے، یہ نواب کی توہین تھی۔ شاد یہ توہین کئی مرتبہ کر چکا تھا۔

جوشؔ ملیح آبادی رام پور آئے ہوئے تھے اور نواب کی کوٹھی خاص باغ میں مقیم تھے۔ ان کے اعزاز میں نواب نے شعری نشست منعقد کی۔ مصاحبین نے رائے دی کہ شاد کو بھی بلوایا جائے۔

''وہ بد دماغ کئی مرتبہ ہماری دعوت ٹھکرا چکا ہے۔'' نواب صاحب نے کہا۔

''حضور، اس کا غصہ ٹھنڈا کرنے کا ایک یہی طریقہ ہے۔''

''اس نے اگر اس مرتبہ بھی انکار کیا؟''

''شاید انکار نہ کرے۔''

''اجازت ہے۔''

سرکاری دعوت نامہ اور نذرانہ شاد کے پاس پہنچ گیا۔ ادھر سے وہی عذرِ شرکت تھا لیکن سمجھانے بجھانے پر وہ تیار ہو گیا۔

''آپ کو معلوم ہے، میں مشاعروں میں شرکت کے لیے زادِ سفر یا نذرانہ قبول نہیں کرتا لہٰذا یہ نذرانہ تو آپ نواب صاحب کو واپس کر دیں ان کے کسی کام آ جائے گا۔ رہی شرکت تو میں پیدل چل کر خاص باغ آ جاؤں گا۔''

خاص باغ میں مشاعرہ ہو، نواب بہ نفسِ نفیس موجود ہوں تو خوشامدیوں کے بھاگ کیسے نہ کھلیں۔ جس کو بھی پروانۂ شرکت مل گیا تھا وہ خود کو عرشِ معلیٰ پر محسوس کر رہا تھا۔

شور مچا کہ شاد عارفی آ گئے ہیں۔ نواب صاحب نے ٹیڑھی آنکھوں سے ان کی طرف دیکھا۔ میانہ قد، رنگت سانولی، پچکے ہوئے گال، داڑھی مونچھیں صاف، سیدھے سادے لباس میں ایک شخص داخل ہوا۔ نہ ہونٹوں پر ہنسی، نہ چہرے پر مرعوبیت کے

www.urduchannel.in

اثرات۔ یہ لگتا تھا جیسے معزز محفلوں میں آنے کے آداب ہی اسے نہیں آتے۔ نواب صاحب نے اس سے ہاتھ ضرور ملایا لیکن صاف ظاہر ہوتا تھا کہ ان کا دل صاف نہیں۔

شاد کی نظر جوش پر پڑی جو میر محفل بنے ہوئے تھے۔ انھیں دیکھتے ہی شاد ہتھے سے اکھڑ گیا۔ اس نے اسی وقت سوچ لیا کہ اس مشاعرے میں اسے کیا پڑھنا ہے۔

اس کے منہ سے خوشامد کے پھول کب برستے تھے اور اس وقت تو وہ کوٹھی خاص باغ میں تھا۔ گویا دشمن کے قلعے میں گھس آیا تھا۔ اس کی باری آئی تو سننے والوں کو چکر آ گئے۔ اس نے اپنی نظم ''رنگیلے راجا کی موت'' سنائی جو نوابین کی زندگی پر بڑا بے دردانہ طنز کرتی تھی۔ یہ نوابین رامپور کے بھی ہو سکتے تھے۔

طبیبانِ شاہی بھی ہیں ڈاکٹر بھی
یہ نرسیں یہ جراح یہ چارہ گر بھی
سپہ دار نو عمر و کرنل سمر بھی
کئی دانت چاٹے ہوئے پنشنر بھی
نہیں کوئی اتنا جو مجھ کو بچالے
ہوا جا رہا ہوں قضا کے حوالے

....

میں کہتا تھا دیکھو یہ ڈینگیں نہ ہانکو
خوشامد پہ قابو میں رکھو زباں کو
چھڑا لو مصیبت سے مجھ نیم جاں کو
نمک خوارِ دولت ہو کونے نہ جھانکو
مرے خوانِ یغما کے اے ریزہ چینو
یہی شرطِ حقِ نمک تھی کمینو

....

نکالو، یہ چمپا کا شوہر کھڑا ہے
یہ زینت محل کا منگیتر کھڑا ہے

یہ سردارِ ملت وہ رہبر کھڑا ہے
گروہِ جوانانِ مضطر کھڑا ہے
وہ سب جی اٹھے جو فنا ہو چکے تھے
مرے ہاتھ سے خاکِ پا ہو چکے تھے

....

یہ وہ کنواریاں جو اڑا دی گئی تھیں
اڑا دی، سُلا دی، چھپا دی گئی تھیں
چھپا دی، مٹا دی، جلا دی گئی تھیں
جلا دی، دبا دی، بہا دی گئی تھیں
بھیانک اردوں سے للکارتی ہیں
مرے حال پر قہقہے مارتی ہیں

....

وہ بوڑھا جو آیا تھا بیٹی کے آڑے
وہ گلشن وہ گل بن جو میں نے اجاڑے
وہ بوڑھی جو لوٹی گئی دن دہاڑے
وہ کلیاں کھلی تھیں جو راجا کے باڑے
وہ سب ظلم کی ٹہنیاں پھل چکی ہیں
بھڑکتی ہوئی آگ میں ڈھل چکی ہیں

....

بڑھے آ رہے ہیں وطن کے پجاری
نظر آ رہی ہے، شرارت تمھاری
دھرا رہ گیا غرۂ قلعہ داری
کوئی توپ داغی، کوئی باڑھ ماری؟

www.urduchannel.in

یہ حالات اور تم جہاں تھے وہیں ہو
سمجھتا ہوں، سب دشنۂ آستیں ہو

....

وہ کمرے میں گھس آئے پستول لانا
بٹھا کر مجھے گاؤ تکیہ لگانا
پڑے گا مجھے خود ہی زور آزمانا
کوئی ہے؟ ذرا خود و بکتر اٹھانا
سنبھل جاؤ اے بد معاشو اٹھا میں
گھٹا دم گھٹا، ہائے لینا چلا میں

ابھی اہلِ محفل سنبھلے بھی نہیں تھے کہ اس نے دوسری نظم شروع کر دی۔

بھینٹ میں یاقوتی آویزے، مردار یدی مالا تحفہ
جس میں وہ لپٹے ہوتے ہیں، وہ خوش رنگ دوشالا تحفہ
بربط، مطرب، شاہد، ساقی، بادہ، مینا، پیالا تحفہ
شب بھر احساسات کے گھوڑے بیچ رہا تھا اب سوتا ہے
ان اونچے اونچے محلوں میں اور بتائیں کیا ہوتا ہے

....

بھیگی رات، سیاسی کھوسٹ غداروں نے تانتا باندھا
غم خوارانِ قوم و وطن کی ہر کوشش کو فتنہ باندھا
اس بے کس پر تہمت باندھی، اس ذرے کو صحرا باندھا
لیکن چغلی خور سدا قطرہ پاتا دریا کھوتا ہے
ان اونچے اونچے محلوں میں اور بتائیں کیا ہوتا ہے

....

کھاتا ہے پیراک بھی پائیں باغ کی موتی جھیل میں غوطے

الفت کی تکمیل میں اُچھو، لذت کی تحصیل میں غوطے
خواہش کے ارشاد میں ڈبکی، حکموں کی تعمیل میں غوطے

چہرے پر کالک ملتا ہے دامن کے دھبے دھوتا ہے
ان اونچے اونچے محلوں میں اور بتائیں کیا ہوتا ہے

جذبے کی شدت اور حقیقی غم وغصے کے لاوے کا وہ ابال تھا کہ لگتا تھا سب کچھ جل کر بھسم ہو جائے گا، مصاحب کھڑے تھر تھر کانپ رہے تھے کہ اب ان کی خیر نہیں۔

اس نشست کا اختتام بدمزگی پر ہوا۔ شاد اٹھ کر اپنے گھر آ گیا۔ اس کی جسارت کو جس نے بھی سنا، دانتوں میں انگلی دبا کر رہ گیا۔

دوسروں کو کیا، خود شاد کو شک تھا کہ ریاست کے فولادی پنجے بس اب اس کی جانب بڑھنے ہی والے ہوں گے لیکن ان دنوں ہندوستان کی سیاست میں اونچے درجے کا سیلاب تھا۔ ہر طرف انقلاب اور آزادی کی آوازیں گونج رہی تھیں۔ یہ آوازیں اب بہت نزدیک سے آ رہی تھی۔ دیسی ریاستیں بھی خوف زدہ تھیں کہ اب کیا ہونے والا ہے۔ شاید اسی لیے شاد پر ہاتھ نہیں ڈالا گیا۔

شاد ان حالات سے بے خبر نہیں تھا۔

اک انقلاب دیکھ رہا ہوں چمن چمن
میری نظر جہاں ہے تمھاری نظر نہیں

....

یقیں کیجیے انقلاباتِ ہستی
محلات کے سائے سائے کھڑے ہیں

انقلاب آتے دیر نہیں لگی اور ملک تقسیم ہو گیا۔ شاد ایسے وطن پرست کے لیے یہ صورتِ حال خوش آئند نہیں تھی۔ وہ آزادی کا طلب گار تھا، تقسیم کا نہیں۔

آئی نا، مغرب کے قدموں میں سیاست گھوم کے
ہو گئے آخر کو دو ٹکڑے وطن مرحوم کے

www.urduchannel.in

آزادی کے فوراً بعد ہجرت کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہو گیا۔ اس البیلے طنز نگار کے لیے یہ تصور ہی عجیب تھا کہ وہ فاقوں سے تنگ آ کر وطن چھوڑ دے۔ وہ ظلمِ ہنر کا شکار تھا لیکن زمین پکڑے بیٹھا تھا۔

اگر چمن سے نکال دو گے چمن سے باہر گزر لیں گے
چمن کہا، یہ نہیں کہا ہے وطن سے باہر گزار لیں گے

وہ خوش تو تھا کہ آزادی کے ساتھ ہی تاجدارانِ جفا پیشہ کو موت آئی:

تاجدارانِ جفا پیشہ ہیں چپ سادھے ہوئے
مقبرے سونے پڑے ہیں عشرتِ مرحوم کے

لیکن وہ اس آزادی کی طرف سے کسی خوش فہمی میں مبتلا بھی نہیں تھا:

جس قدر جمہور میں آئے گی تابِ جستجو
عیب کھلتے جائیں گے آزادیِ موہوم کے

ملک کو آزادی تو مل گئی تھی لیکن ریاستیں اب بھی ''تاجدارانِ جفا پیشہ'' کے قبضے میں تھیں۔

شادؔ، اب بھی آخری ضربیں لگانے میں مصروف تھا کہ اس کا تبادلہ رام پور کی تحصیل 'سوار' میں کر دیا گیا۔ اس علاقے میں سخت سردی پڑتی تھی اسی لیے اسے رام پور کا سائبیریا کہا جاتا تھا۔

اس سرد خانے میں آ کر اسے اپنی بے لباسی کا خیال آیا۔ اس کے پاس تو اتنے کپڑے بھی نہیں تھے کہ سردی سے لڑ سکتا۔ اس کا نحیف جسم اس موسم کو برداشت کرنے کے لائق نہیں تھا۔ اس نے یہاں آتے ہی اپنے تبادلے کے لیے کوششیں شروع کر دیں لیکن ہر تدبیر بے سود ہوتی رہی۔

وہ ان برفیلی ہواؤں کے سامنے نزار جسم کا کمزور چراغ لیے کھڑا تھا کہ ایک مشاعرے میں جانا پڑ گیا۔ وہ کئی دن سے زکام میں مبتلا تھا۔ اسے اندازہ نہیں تھا کہ مشاعرہ اتنی دیر چلے گا یا سردی اتنی بڑھ جائے گی۔ جب وہاں بیٹھنا اس کے لیے ناممکن ہو گیا، کرم

خوردہ سوئٹر اور جواہر کٹ نے سردی روکنے سے انکار کر دیا تو اس نے معذرت کی:

''میرے پاس نہ کمبل ہے نہ بڑا کوٹ، میں کس طرح بیٹھ سکتا ہوں؟''

''یہ انتظام ابھی ہوا جاتا ہے۔''

اس کے لیے کوٹ اور کمبل کا انتظام کر دیا گیا۔ غضب یہ ہوا کہ اسی وقت اس کی حمیت نے اسے للکارا۔ اس کی غیرت نے اس سامان کو قبول نہیں کیا۔ اس نے بغلوں سے ہاتھ تاپتے ہوئے رات کاٹ دی۔

وہ گھر تو پہنچ گیا لیکن سردی ہڈیوں میں اتر گئی تھی۔ قسمت تھی کہ رگوں میں لہو پھر سے دوڑنے لگا ورنہ وہ تو زندگی سے مایوس ہو گیا تھا۔

بیماری سے فرصت ملی تو اس نے تبادلے کے لیے پھر کوشش شروع کر دی۔

ایک دن وہ مایوسی کے عالم میں گھر سے نکلا اور دفتر پہنچ کر استعفیٰ پیش کر دیا اور یہ قسم بھی کھالی کہ اب وہ ملازمت نہیں کرے گا۔

اسے یہ امید تھی کہ پراویڈنٹ فنڈ مل جائے گا، اس سے کچھ دال روٹی چل جائے گی لیکن ریاست دشمنی کا نتیجہ یہ نکلا کہ اس کی رقم ضبط کر لی گئی۔ والدہ کی پینشن آتی تھی، وہ بھی بند ہو گئی۔ اب صرف اس مدد پر گزارہ تھا جو اس کے شاگرد حقِ اصلاح کے طور پر کر دیا کرتے تھے۔ اس کی غیرت دستِ سوال دراز کر نہیں سکتی تھی۔ ہندوستان اس کے حال سے بے خبر آزادی کا سفر طے کرتا جا رہا تھا۔ یہ طنز نگار اب بھی اپنا حال بھلا کر مسائلِ حالات میں الجھا ہوا تھا:

کم سے کم گجرے، گلے کا ہار زنجیریں بہت
جشنِ آزادی کی ہو سکتی ہیں تفسیریں بہت
آپ کی منصوبہ بندی کی طرح سرکار کو
ہم بھی کاغذ پر دکھا سکتے ہیں تعمیریں بہت
شوخیِ تحریر سے انکار کر دیجے مگر
کاغذی ہیں پیرہن جن کے وہ تصویریں بہت

آپ اس منزل پہ جا پہنچے دوا کے باب میں
میر صاحب کی جہاں الٹی ہیں تدبیریں بہت
کوئی بے جا بھی نہیں ہے اب ہماری بدظنی
ہو چکی ہیں آپ کے وعدوں کو تاخیریں بہت
واعظوں کا راز پوشیدہ ہے اس مصرع میں شادؔ
کام کم کرتے ہیں یہ لوگ اور تقریریں بہت

یہ اس کی شاعری کے عروج کا زمانہ تھا۔ ہندوستان سے لے کر پاکستان تک کوئی ادبی رسالہ ایسا نہیں تھا جو اس کی نگارشات کا منتظر نہ رہتا ہو۔ وہ ایک چھوٹے سے شہر میں رہ کر بہت بڑی دنیا کو اپنے فن پارے تقسیم کر رہا تھا۔ جیل میں دال تو مل جاتی ہے لیکن اسے چٹنی بھی بڑی مشکل سے میسر تھی:

میں تو چٹنی سے کھا رہا ہوں شادؔ
دال بٹتی ہے جیل خانے میں

اس کے پاؤں برہنہ تھے مگر سر پر بڑے شاعر ہونے کا تاج سجا ہوا تھا۔

برتے جا خودداری شادؔ
پاؤں برہنہ سر پر تاج

......☆......

ماں سے اس کی یہ بے بسی دیکھی نہیں گئی۔ سو سال سے زیادہ عمر پا کر وہ اس کا ساتھ چھوڑ گئیں۔

وہ مردہ ماں کے سرہانے بیٹھا سوچ رہا تھا، اب ان کے کفن دفن کا انتظام کہاں سے ہوگا۔ دسواں، چہلم کہاں سے کروں گا۔ اس نے آنکھوں کے آنسو دل میں اتارے اور ایک شاگرد کے دروازے پر پہنچ گیا۔

''سنا ہے مرزا غالبؔ اپنی رکی ہوئی پنشن کے عوض قرض لیتے رہتے تھے۔'' شادؔ نے کہا۔

www.urduchannel.in

''سنا تو ہے بلکہ پڑھا بھی ہے۔''

''تو کیا میرے مکان کے عوض کوئی مجھے قرض نہیں دے سکتا؟''

''خیریت ہے شاد صاحب، ایسی کیا ضرورت آن پڑی۔''

''ضرورت بعد میں بتاؤں گا، پہلے تم مجھے کسی ایسے آدمی کے پاس لے چلو جو مکان گروی رکھ کر مجھے قرض دے سکے۔''

''وہ شاگرد اسے مہاجن کے پاس لے گیا۔ شاؔد نے مکان کے کاغذات اس کے پاس رکھوائے اور روپے وصول کر لیے۔

''شاد صاحب، اب تو بتا دیجیے ایسی کیا ضرورت آ گئی۔''

''اماں کا انتقال ہو گیا ہے۔ ان کی تجہیز و تکفین کے لیے مجھے رقم درکار تھی۔''

یہ خبر اور اس انداز میں سن کر شاگرد کا تو رنگ پیلا پڑ گیا ''استاد، یہ فرض تو ہم شاگردوں کا تھا۔ آپ یہ رقم واپس کر دیں۔ ہم مل جل کر یہ خرچ اٹھا لیں گے۔''

''میاں، والدہ تمھاری تھیں یا میری؟ دکھ میرا ہے، میں ہی اسے اٹھاؤں گا بھی۔''

شاگرد اور احباب اتنا تو کر سکتے تھے کہ اس کے ساتھ قبرستان تک جا سکتے۔ جب تک وہ گھر پہنچتا، لوگ جمع ہو چکے تھے۔ اس نے شکر ادا کیا کہ اس کی ماں فاقوں سے بچ گئی۔

جب کاوش الم سبب زندگی ہوئی
جس آرزو کی روح بجھا دی خوشی ہوئی

وہ قبرستان سے گھر پہنچا تو گھر کا اندھیرا اور بڑھ گیا تھا۔ ماں نابینا تھیں۔ ایک کونے میں پڑی رہتی تھیں لیکن ایک سہارا تو تھا۔ اب یہ سہارا بھی چھن گیا۔ اب کوئی نہیں تھا جو گھر میں اسے لڈن کہہ کر پکارے۔

وہ کچھ دن تو تنہائی میں باؤلا بنا بیٹھا رہا پھر شاگردوں کی بھیڑ جمنے لگی۔ اب تک وہ شاگرد بنانے میں بڑا سخت گیر واقع ہوا تھا لیکن اب تو اس نے دروازہ چوپٹ کھول دیا۔ یہ شاگرد ہی اب اس کا مالی سہارا بھی تھے اور اس کی طرف سے دندان شکن جواب دینے کا

www.urduchannel.in

ذریعہ بھی۔

جب اس کے پاس ہر قسم کے لوگ آنے لگے تو گنے چنے ذہین شاگردوں نے اس کے پاس آنا چھوڑ دیا۔

مسلسل بیماریوں اور متواتر فاقوں نے اس کے اعصاب پر بہت بُرا اثر ڈالا تھا۔ اب وہ پہلا جیسا شاد نہیں رہا تھا۔ جلی ہوئی رسی کے بل کی طرح ٹیڑھا ضرور تھا لیکن قوتِ فیصلہ سے عاری بھی ہو گیا تھا۔ نادان شاگرد اسے جس طرف لے جاتے، وہ جانے کو تیار ہو جاتا۔ فرمائشیں کر کر کے لوگوں کے خلاف نظمیں لکھواتے اور جب ہنگامہ کھڑا ہوتا تو بدنام شاد ہوتا۔ اس کا حال کسی کے اس شعر کی طرح ہو گیا تھا۔

کچھ تو ہوتے ہیں محبت میں جنوں کے آثار
اور کچھ لوگ بھی دیوانہ بنا دیتے ہیں

رام پور کی نمائش میں ہر سال کُل ہند مشاعرہ ہوتا تھا۔ یہ مشاعرہ آمدنی اور شہرت دونوں کا ذریعہ تھا۔ شاگردوں کی فرمائش تھی کہ اس نمائش کو ہدفِ طنز بنایا جائے۔ اس نے یہاں ہونے والے مشاعروں کو بھی گھسیٹ لیا۔

ذرا غور کیجے، یہ بزمِ سخن ہے
ادب سے یہاں فائدے کی لگن ہے
جو لونڈا ہے وہ ماہرِ علم و فن ہے
نہ جانے حکومت کا یہ کیا چلن ہے
نہ پوچھے کسی سے نہ خود جانتی ہے
خوشامد کو روحِ سخن مانتی ہے
کرائے پہ آئے ہیں بھاڑے کے ٹٹو
نکمے، نگوڑے، نمونے، نکھٹو
یہ روڑے ادب کے، دو راہے کے لٹو
لکھائی ہوئی چند غزلوں کے رٹو

صدارت کا مضغہ بٹورے برابر
کہن سال ہتھنی کا اسقاطِ اصغر

رقم ان کے ناموں پہ بھر دی گئی ہے
نہیں دی گئی ہے مگر دی گئی ہے
خبر کس کو شاعر کے گھر دی گئی ہے
مصارف کی تکمیل کر دی گئی ہے

بجٹ بھی نہ توڑا رقم بھی بچا لی
جبھی تو نظامت پہ لڑتے ہیں پالی

نمائش سے باہر یہ خیمے یہ ڈیرے
یہاں دیو آتے ہیں پریوں کو گھیرے
مچاتے ہیں اودھم مہذب لٹیرے
مرے ساتھ چلیے سویرے سویرے

ہوا سچ تو ایمان لانا پڑے گا
خباثت کو نیکی بتانا پڑے گا

بات سچی بھی ہو تو ایسی چوٹ کون برداشت کرسکتا ہے۔ یہ خیالات دیکھے تو ناظمِ مشاعرہ سے بھی ان بَن ہوگئی۔ یہ مشاعرہ بھی گیا ہاتھ سے۔

معززین سے اسے چڑ تھی، عوام سے لگاؤ تھا۔ مصیبت یہ تھی کہ مشاعروں میں ''شرفا'' ضرور شریک ہوتے تھے۔ شاد کے موڈ کی کچھ خبر نہیں ہوتی تھی کہ کس وقت کس کے خلاف نظم پڑھ دے۔ اس لیے اس کے ہمدردوں نے بھی اسے مشاعروں میں بلانا چھوڑ دیا تھا۔ اب وہ تھا، اس کے شاگرد اور اکیلے گھر کی تنہائی۔ یہ شاگرد شہر بھر کی خبریں اسے پہنچا دیتے تھے اور وہ انھیں طنز کی خراد پر چڑھا کر نظم کی شکل میں ڈھال دیتا تھا۔

اک دکھاوا، اک بھلاوا ہے یہ کھدر کا لباس
آدمیت کے علاوہ کیا نہیں ہے تیرے پاس

سرخ ہیرے کی انگوٹھی پارکر نامی قلم
سادہ پرکاری کا تیری، کھول دیتے ہیں بھرم
دھان کی کھیلوں سے بھر سکتا ہے جس دوزخ کو تو
چوستا ہے اس کی خاطر قومِ بے کس کا لہو
(غدار)

بلبلِ فردوس کے سالے ہیں یہ
بات اتنی ہے ذرا کالے ہیں یہ
چھن چکی جاگیر آمد بند ہے
اب فقط افیون میں آنند ہے
پھل پھلاری بیچتے ہیں آج کل
بھوگتا ہے آدمی کرنی کے پھل
ہیں پریشاں حال، دیوانے نہیں
کیا انھیں بھی آپ پہچانے نہیں
(آپ کی تعریف)

پوجتے ہیں پیروں کو، بھیجتے ہیں کالا مال، چاٹگام اور بنگال
راستے بتاتے ہیں مکر و فن دکھاتے ہیں
پٹ نہ پائے اس رخ پر کھیلتے ہیں گہری چال
کھیپ کی بر آمد سے چادریں چڑھاتے ہیں، منقبت گواتے ہیں
شہر کے مزاروں پر عرس کے سہاروں پر
شاعرانِ مہمل کو روٹیاں کھلاتے ہیں
(ٹکڑ گدے)

مشاہدہ ہے کہ پیتے ہیں سب بگاڑ کے منہ
سعید حلق پکڑ کر مہیش پھاڑ کے منہ

www.urduchannel.in

یہاں لیتڑ کے کیچڑ وہاں لتاڑ کے منہ
کرے جو عقل کی مٹی خراب، بکتی ہے
مرے پڑوس میں کچی شراب بکتی ہے

....

یہ گھس کھدے تھے مگر اب تو لاریاں چل رہی ہیں ان کی
وہ لڑکیاں پل چکی ہیں ان کی، یہ لڑکیاں پل رہی ہیں ان کی
بغیر ٹکسال کے زمانے میں گِنیاں ڈھل رہی ہیں ان کی

(مرے محلے کے دو گھرانے)

اسے تو یہ ناز تھا کہ وہ طنز کے پردے میں سماج کے عیب بیان کر کے اصلاحِ احوال کے لیے اقدام کر رہا ہے۔

وطن کے جہلِ خرد نما کے خلاف اقدام کر رہا ہوں
سماج کے عیب گن رہا ہوں رواج پر کام کر رہا ہوں

''میں ایکتا کا قائل ہوں۔ سب اپنے اپنے مذہب پر قائم رہتے ہوئے ایک دوسرے کی تقریبات میں شریک ہوں، یہ ہے میرا مذہب۔ ہندوستان میں کئی بڑے بڑے مذاہب ہیں۔ اگر سب ایک دوسرے کی طرف سے منہ پھیر کر کھڑے ہو جائیں تو ملک کیسے ترقی کرے گا۔''

ایکے سے کترانے والا ایشور شکتی کیسے پائے
تھم تھم کر آکاش سے برسے، بوند بوند دھرتی پی جائے

اور سنو:

شودر، ویش اور کھتری رکھتے کیوں ہیں بیر
بن میں تو لڑتے نہیں پیپل، سرس، ببول

رات ہوئی تو تاروں کی چھاؤں میں اس نے بیاضِ سخن پھیلا دی۔ آج اس پر عجیب موڈ طاری تھا۔ آج اس پر عجیب رخ سے حملہ کیا گیا تھا۔ اس کا مذاق اڑایا گیا تھا۔ زندگی بھر

www.urduchannel.in

کی پونجی لوٹنے کی کوشش کی گئی تھی۔ میں نے مذہب کی خاطر ترقی پسندوں سے لڑائی مول لی۔ میں نے مذہب کی خاطر اپنی محبت کو قربان کر دیا اور یہ مجھے اسلام دشمنی کا طعنہ دے رہے ہیں۔ کیا میرے طنز نے بھی انھیں سیدھی راہ نہیں دکھائی۔ اختلافات ہمیں کہاں لے جائیں گے۔ ہم ٹکڑیوں میں بٹ کر کتنی دیر رہ سکتے ہیں؟

جہاں گنگا سے کٹ جاتی ہیں شاخیں
جہاں شاخوں میں بٹ جاتی ہیں شاخیں
جہاں رستے سے ہٹ جاتی ہیں شاخیں
جہاں ریتی سے پٹ جاتی ہیں شاخیں
وہاں رہتی نہیں گنگا کی دھارا
یہی اے شاؔد ہے عالم ہمارا

مکان کی ضمانت پر جو قرض لیا تھا، اسے اتارنے کے لیے رقم کی ضرورت تھی۔ وقت کے ساتھ ساتھ سود بڑھتا جا رہا تھا۔ اس نے یہی مناسب سمجھا کہ مکان فروخت کر کے قرض اتار دے۔

اس نے ارادہ ظاہر کیا تھا کہ گاہک آنا شروع ہو گئے۔

انھی میں اس کے ایک رشتے دار اشفاق احمد خان بھی آئے۔

''بھائی صاحب، حق ہمارا ہے۔ ہمارے ہوتے یہ مکان آپ کسی اور کو فروخت نہیں کر سکتے۔''

''تمھیں ضرورت ہے تو تم لے لو۔ مجھے تو بیچنا ہے۔''

''ٹھیک ہے، میرے پاس چھ سو روپے ہیں۔''

''مجھے تو اس سے زیادہ مل رہے ہیں۔''

''کیا رشتے داری کا آپ اتنا پاس بھی نہیں کریں گے۔ باپ دادا کی نشانی اگر خاندان ہی میں رہے تو ذرا سا نقصان اٹھا لیجیے۔''

وہ رشتے داروں سے قطعی خوش نہیں تھا لیکن مارے مروت کے ان سے کچھ بھی نہ

کہہ سکا۔ اسے یہ مکان صرف چھ سو روپے میں بیچنا پڑ گیا۔

اس نے کرائے کا مکان لیا اور اس میں جا پڑا۔ کچھ دن رسالوں کے مدیروں کو خط لکھ کر نئے پتے سے آگاہ کرنے میں لگ گئے جب ذرا ہوش آیا تو یہ ہوش بھی آیا کہ کھانے کو پورا نہیں پڑتا، کرایہ کہاں سے دے گا۔ اس نے ڈرتے جھجکتے کہیں سے قرض لیا اور کرایہ ادا کر دیا۔ اگلے مہینے کا اللہ حافظ ہے۔ اگلے مہینے کرایہ بھی دینا تھا اور قرض بھی چڑھ گیا تھا۔

جس بھتیجی کا بیاہ اس نے بڑے چاؤ سے کیا تھا، وہ بیوہ ہوگئی تو اس کی اور اس کے بچوں کی کفالت کا بار بھی اس پر آن پڑا۔

وہ چکرا کر رہ گیا۔ شاگرد کتنی مدد کر سکتے تھے۔ ادبی رسائل اسے کتنا معاوضہ دے سکتے تھے۔ خرچ اس سے کہیں زیادہ تھا۔ وہ قرض، ادھار کر کے کام چلاتا رہا۔

رنگ لائے گی ہماری تنگ دستی ایک دن
مثلِ غالب، شادؔ گر سب کچھ ادھار آتا گیا

یہ قرض بھی وہ اپنی ہمت سے نہیں، قلم کی نوک سے حاصل کر رہا تھا۔ روبرو مانگنے کا حوصلہ کہاں سے لاتا، خط کے ذریعے مانگ رہا تھا۔ اس کے ممدوح کہاں تھے، اپنے جیسے ہمدردوں ہی کو زحمت دیتا رہتا تھا۔

کبھی اپنی رشتے کی بھانجی طاہرہ اختر کو لکھتا ہے:

''آج کل شکر نے جس قدر پریشان کر رکھا ہے، وہ ظاہر ہے اور حالت یہ ہے کہ میرے پاس۔ مطلب یہ کہ۔ چیل کے گھونسلے میں ماس کہاں۔ صابر خاں باہر گئے ہوئے ہیں اس لیے تمھیں زحمت دے رہا ہوں کہ سید بھائی کو مبلغ دو روپے دے دو جن کو میں جلد ہی ادا کر دوں گا۔ یا تو ہمدرد دواخانے سے معاوضہ آ جائے گا یا صابر خاں آنے والے ہوں گے۔ بہر حال یہ قرض ہے اور ایسا قرض جو مقراض المحبت نہیں بلکہ محبتوں میں اضافہ کرنے والا ہوتا ہے۔''

کبھی طاہرہ کے شوہر، قیصر خان کو خط لکھتا ہے:

''اتنا کچھ لکھنے کے بعد مطلب سے رجوع کرتا ہوں۔ اور۔ وہ یہ کہ۔ اگر پیشگی کا

www.urduchannel.in

امکان ہو تو۔ مجھے ضرورت ہے۔''

دو روپے جیسی حقیر رقم اس کے لیے کتنی بڑی چیز تھی اور قرض مانگتے ہوئے جو جھجک محسوس کی جا رہی ہے، وہ بھی ظاہر ہے۔

تنگ دستی کا نتیجہ یہی نکلنا تھا کہ اسے اس مکان سے نکلنا پڑا۔ محلّہ بیریاں سے نکل کر حلقے والی زیارت کے ایک مکان میں منتقل ہو گیا۔ یہاں کون سا نیا آسمان تھا۔ وہی شہر تھا وہی قرض خواہ۔ اسے یہاں تک بے مروّتی برتنی پڑی کی ایک بیرونی شاگرد (مظفر حنفی) کے خط کے جواب میں یہ خط تحریر کیا:

''تمھارے رام پور آنے کا سوال اچھا نہیں ہے اس لیے کہ میرے سر چھپانے کا ٹھکانا نہیں ہے، تمھیں کہاں ٹھہرا سکوں گا (کھانا پینا تو درکنار) اس لیے تمھارا میرے پاس آنا بھی میرے مزاج کے خلاف ہوگا۔ ہاں اگر میری غربت کی ہنسی اڑانا چاہتے ہو تو ضرور چلے آؤ۔''

اس نے یہ خط تحریر تو کر دیا، پوسٹ بھی کر دیا لیکن ماتم کو ہاتھ اٹھ گئے۔ میں کہاں پہنچ گیا ہوں؟ وہاں جہاں غربت کی آگ، ایمان کو جلا دیتی ہے۔ اس نے بڑی مشکل سے اپنے آنسو ضبط کیے اور ایک اور دوست کو خط لکھنے بیٹھ گیا:

''مجھے اپنے بارے میں شدت سے محسوس ہو رہا ہے کہ اپنی روایات، خود اعتمادی اور خودی سے بیزار ہو کر ذلیل ہونے کی حد تک پست ہو چکا ہوں۔''

رمضان آ گئے تھے بھتیجی اور نواسی تین دن سے بغیر سحری کا روزہ رکھ رہی تھیں۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھا، وہ چند رسالے اٹھائے جو اس کے پاس اعزازی طور پر آتے تھے اور ملا بھائی مرچنٹ کے پاس پہنچ گیا۔

''آؤ شاد بھائی، آج کیسے ادھر کا رخ کر لیا۔''

''بس بھائی، ایک ضرورت کھینچ لائی۔ ایک سودا کرنے آیا ہوں۔''

''میرے لائق کوئی خدمت ہو تو بتائیے۔''

''میرے پاس ادبی رسائل آتے ہیں۔ میں چاہتا ہوں آپ مجھ سے آدھی قیمت پر

خرید کر پوری قیمت پر بیچ دیا کریں۔ آدھی رقم آپ کو مل جائے گی، آدھی مجھے۔''

''تجویز تو مناسب ہے لیکن پیسے میں آپ کو فروخت کے بعد دیا کروں گا۔''

''مجھے منظور ہے لیکن اس مرتبہ اگر پیشگی مل جائے تو اچھا تھا۔ میری کچھ ضرورتیں ہیں۔''

ملا بھائی نے اس کی صورت دیکھ کر پیشگی پیسے ادا کر دیے۔

شاد نے ان پیسوں سے گھر کا راشن خریدا اور مطمئن ہو کر شعر گوئی کی طرف متوجہ ہو گیا کہ مہینے بھر کو تو فرصت ہوئی۔ آئندہ کی آئندہ دیکھی جائے گی۔

اس گھر میں رین بسیرے کے دن پورے ہوئے تو کھیر میر باز خاں نامی محلے میں چلا آیا۔

وہ اتنی جلدی جلدی گھر تبدیل کر رہا تھا کہ رسائل کے مدیر تنگ آ گئے تھے۔ محمد طفیل مدیر نقوش، لاہور نے اس کے اس طرح جلد جلد پتے کی تبدیلی سے تنگ آ کر لکھا:

''شاد صاحب! خدا کے لیے آپ میرے اوپر رحم کھائیے۔ اس قدر جلد مکان مت تبدیل کیجیے۔ آپ کی اس قدر تبدیلیِ مکان سے تو یہ پتا چلتا ہے کہ شاید آپ خانہ بدوش شاعر ہیں۔''

وہ یہ خط پڑھ کر دیر تک ہنستا رہا کیونکہ آج ہی اسے یہ مکان بھی تبدیل کرنا تھا۔

ملا بھائی کتنے رسائل فروخت کر سکتے تھے۔ اس نے یہی سودا بزم اربابِ ادب سے کر لیا۔ یہ بزم فروغ اردو کے نام سے ایک لائبریری چلا رہی تھی جس کی فائلوں کے لیے رسائل اور خاص طور پر پاکستانی رسائل کی ضرورت تھی۔

اب وہ مطمئن ہو گیا تھا۔ جیسے تیسے گزارا ہو ہی جاتا تھا کہ ایک ذمے داری اور آ گئی۔ اس کے ایک بھائی سعید اللہ خان مخبوط الحواس ہو کر اس کے ساتھ رہنے لگے۔ ایک بار اور بڑھ گیا۔ یہ سب کچھ وہ فراخ دلی کے ساتھ برداشت کرتا رہا۔ ہاں اتنا ہوا کہ ان ذمّے داریوں کے بعد اتنا بچتا ہی نہیں تھا کہ وہ اپنے علاج کی طرف توجہ دیتا۔ وہ عرصے سے بیمار چلا آ رہا تھا لیکن ڈاکٹر تک جانے کی توفیق ہی نہیں ہوتی تھی۔

www.urduchannel.in

کمال کی بات یہ تھی کہ ان حوصلہ شکن حالات میں بھی وہ اپنی سطح سے نیچے نہیں اترا۔ کسی امیر کبیر آدمی کے آگے ہاتھ نہیں پھیلائے۔ رسائل کے مدیروں کے نام خوشامدانہ خط نہیں لکھے بلکہ ہمیشہ رام پوری ٹوپی ترچھی کر کے بات کی۔

ہفت روزہ ''نصرت'' کے مدیر حنیف رامے نے اس کی غزل غیر نمایاں انداز میں چھاپ دی۔ شاد نے خط تحریر کیا۔

''فہرس میں صرف شاد پڑھ کر یہ بھول گیا کہ تڑپ کیا بولا تھا (اس وقت تاش ہو رہا تھا) چال چلنے کے بعد غزل دیکھی تو پتا چلا وہ نریش کمار شاد کی نہیں بلکہ میری غزل ہے اور اس طرح درج ہے جس طرح انگریز کے زمانے میں بہت سے سکھ جب کسی ڈبے میں جمع ہوتے تھے تو اکلے دکلے مسلمان مسافر کو دھکیل کر سیٹ کے کونے میں پہنچا دیتے تھے۔ قصہ مختصر اگر نصرت میں غزلوں کی ایسی ہی کثرت ہے کہ ان کا ''ہزار گلہ'' کھینچا جائے تو میں اپنی معذوری میں ہی اپنی عافیت سمجھتا ہوں۔''

یہی حال اس کے اور ناقدوں کے مراسم کا تھا۔ قلمی جنگ اس حال میں بھی جاری تھی۔

سعید اللہ خان اسے تکلیف دینے کے کچھ عرصے بعد ہر تکلیف سے آزاد ہو گئے۔ شاؔد نے ان کے کفن دفن کا انتظام کیا لیکن خود گھر سے غائب ہو گیا۔ تین دن بعد گھر پہنچا تو احباب سخت پریشان تھے۔

''بھائی، میں میت کے گھر کا کھانا نہیں کھاتا اسی لیے غائب ہو گیا تھا۔ بہر حال، جہاں بھی تھا مزے میں تھا۔ تین دن میں دو بھرپور غزلیں کہہ لیں۔ لو سنو۔'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا اور غزلیں سنانے بیٹھ گیا۔

وہ کئی توہمات میں گھرا ہوا تھا۔ انجکشن سے بہت ڈرتا تھا کہ اگر انجکشن لگوایا تو مر جاؤں گا۔ اسی طرح میت والے گھر کا کھانا کبھی نہیں کھاتا تھا۔

بھائی کی موت کے بعد اسے اس مکان سے بھی خوف آنے لگا۔ اس نے پھر سامانِ خانہ دوش پر رکھا اور ایک دوسرے مکان میں منتقل ہو گیا۔ اس چھوٹے سے شہر میں یہ اس کا

چودھواں مکان تھا۔

''اشعر! تعجب کرو گے کہ شہر کے اندر چودہ مکان کرائے کے لے کر ٹھوکریں کھا رہا ہوں۔ اس وقت ایسے مکان میں ہوں جس کی چھت آسمان ہے۔ ایسا ٹین پڑا ہوا ہے جس میں ہزاروں سوراخ ہیں جو رات کو ستاروں کی طرح چمکتے ہیں اور ان سے اوس ٹپکتی رہتی ہے۔ باہر بارش آدھ گھنٹا تو اندر ٹپکا دو گھنٹے لگا رہتا ہے۔ مقطع کا دوسرا مصرع سنو جو اسی کیفیت کا حامل ہے۔

ع آدھے بستر پر لیٹا ہوں، آدھا بستر بھیگ چکا ہے

غزل کا مطلع بھی سن لو!

آج میں جس گھر میں رہتا ہوں میرؔ کے گھر سے بڑھا ہوا ہے
باہر بارش بیت چکی ہے اندر ٹپکا لگا ہوا ہے

کوئی اور ہوتا تو ان چک پھیریوں میں چکرا کر رہ جاتا۔ یہ شاد ہی تھا جس نے معاش کے اندھیرے میں فن کا چراغ جلائے رکھا اور اس شان سے کہ تندی بادِ مخالف کے بازو اکھڑ گئے۔ وہ یگانہ چنگیزی کی طرح کسی مرحلے پر بھی صلح پر مائل نہیں ہوا۔ جن عوارض سے جھگڑا تھا، جھگڑتا رہا۔ آزادی سے پہلے ریاست کے اصول اور غلامانہ ذہنیت اس کا ہدف تھے، آزادی کے بعد مسائلِ حیات اور ان مسائل کے ذمے دار معزز افراد اس کا نشانہ بنے۔ نہ آزادی سے پہلے اس نے صلح کی نہ آزادی کے بعد۔ پہلے اگر ظلِ الٰہی سے اس کی جنگ تھی تو اب جنتا اور نیتا اس کے مضمون خاص تھے۔ وطن کے دوست اور دشمن، کھرے اور کھوٹے الگ کر کے دکھانے تھے۔ نہ ظلِ الٰہی اس سے خوش رہے نہ جمہوریت کے نام نہاد دوست۔

میں غزل خوانِ وطن ہوں یہ خطا کافی ہے
شاملِ بزمِ سخن ہوں یہ خطا کافی ہے
شاکیِ نظمِ چمن ہوں یہ خطا کافی ہے
حاملِ عظمتِ فن ہوں یہ خطا کافی ہے
گردشِ چرخ ہے اک چال زمیں داروں کی

www.urduchannel.in

ناقدِ چرخِ کہن ہوں یہ خطا کافی ہے
شادؔ انبوہ لئیمانِ چمن کے نزدیک
میں بہی خواہِ چمن ہوں یہ خطا کافی ہے

اس کا کوئی دوست نہیں تھا۔ اس کا دوست اس کا فن تھا۔ اس نے طنز کو اپنا فن بنایا تھا۔ طنز کا بنیادی مقصد یہی ہوتا ہے کہ بہ غرضِ اصلاح، چیز کے برے پہلو نمایاں کر کے دکھائے جائیں۔ طنز میں تنقید کا سا اعتدال قائم رکھنا اس لیے دشوار ہوتا ہے کہ یا تو چیز کے اچھے پہلو خود بخود نظر انداز ہو جاتے ہیں یا برے پہلو اس قدر چمکا کر پیش کیے جاتے ہیں کہ اچھے پہلو ماند پڑ جاتے ہیں۔

وہ جب چیزوں کو اس انداز سے دیکھتا تھا تو لوگ چیخ پڑتے تھے کہ عجیب چڑچڑا آدمی ہے۔ اس کو ہر چیز میں کیڑے نظر آتے ہیں۔ یہ وہ جرم تھا جس کی سزا اسے مل رہی تھی۔

اس نے ایک سچے فنکار کی طرح نجی زندگی کی عطا کردہ تلخی کا ارتفاع کر کے اپنے جذبے کو حالاتِ زمانہ کی عکاسی اور ترجمانی کے لیے وقف کر دیا۔

حالاتِ زمانہ جب آزادی کے بعد بھی نہیں بدلے تو وہ اپنی بے گھری کو بھول گیا۔ عالمگیر دکھی زندگی نے اس کے طنزیہ فن میں پناہ پائی۔ قدم قدم پر رہبروں کو ٹوک کر اپنا فرض پورا کرنے لگا۔

مسائل کا رونا ختم ہی کب ہوا تھا کہ وہ اپنے آنسو شمار کرنے بیٹھتا۔ وہ گھر پر گھر بدل کر بھی اپنی تلوار نیام میں نہ کر سکا۔

پوچھو تو رہ نما سے یہ کون مرحلہ ہے
منزل سے قافلے کا اتنا ہی فاصلہ ہے

....

آزادیوں کے بعد وطن کی ترقیاں
آنسو جلا کے دیکھ، ستارے بجھا کے دیکھ

....

آپ طاقت ور بھی، ساری مملکت بھی آپ کی
ہے تو گستاخی پہ عالی جاہ اس قابل نہیں

....

جناب شاؔد باغبانِ منتخب کے بھیس میں
نظامِ نو کا جرمِ انتخاب دیکھتا ہوں میں

کبھی کبھی وہ نفرت سے ایسا مغلوب ہو جاتا ہے کہ طنز کی نزاکتوں کو چھوڑ کر براہِ راست خطاب پر مجبور ہو جاتا لیکن یہاں بھی اس کی مقصدیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

جب غریب جنتا نے بر بنائے آزادیِ دل پہ تیر کھا کھا کر سعیِ سرخروئی ہے
کیا بتائیں ان داتا، اب رہا نہیں جاتا، آپ عیش کرتے ہیں اور قوم بھوکی ہے

....

وہ موضوعات کے انبار ہی نہیں لگا رہا تھا، اردو شاعری کو ایک نیا اسلوب دے رہا تھا۔ ہزاروں نئے الفاظ سے اس کا دامن بھر رہا تھا۔ ندرتِ ادا کی مثالیں فراہم کر رہا تھا۔ ڈرامائی اسلوب پیش کر رہا تھا۔ شوخی اور دلیری عطا کر رہا تھا۔ الفاظ کو برتنے کے سلیقے سکھا رہا تھا۔ تجربات کرنے کا حوصلہ دے رہا تھا۔ کج کلاہی، بانکپن، بے باکی اور نثر کے نزدیک پہنچا ہوا سہلِ ممتنع بخش رہا تھا لیکن اس کی قدر نہیں کی جا رہی تھی۔ وہ میر، غالب اور یگانہ کی صف کا شاعر تھا لیکن رام پور میں اس کے ہمسائے کو بھی خبر نہیں تھی کہ وہ کس عظیم شاعر کے سائے میں رہتا ہے اسی لیے وہ یہ کہنے پر مجبور تھا۔

تغافلِ کمالِ فن مزاج رام پور ہے
تو مجھ سے بے رخی میں دوستوں کا کیا قصور ہے

بات اتنی سادہ نہیں تھی لیکن اس کی حد تک حقیقت ضرور تھی۔ قصور اس کا بھی تھا مگر اس کا فن تو بے قصور تھا۔ اب ایسا بھی نہیں تھا کہ اس کی کوئی تعریف کرتا اور وہ خوش نہ ہوتا۔

......☆......

www.urduchannel.in

وقت کے ساتھ ساتھ شاگردوں کی بھیڑ بھی چھٹنے لگی۔ چند مخلص شاگردوں کے سوا سب ساتھ چھوڑ گئے۔ بیماری نے اسے ادھ موا کر دیا۔ کھانے کو روٹی نہیں تھی علاج کہاں سے ہوتا۔ لکھنے کے لیے قلم، روشنائی اور کاغذ تک تو فروغِ اردو لائبریری کی طرف سے بطور امداد آتا تھا۔

جب حالات بہت ہی بگڑ گئے اور وہ چودھویں مکان سے پندرھویں میں منتقل ہو گیا، آئندہ بھی یہ سلسلہ رکتا ہوا نظر نہیں آتا تھا تو چند مخلص دوستوں اور شاگردوں کو تشویش ہوئی۔ وہ سلوک کرنا چاہتے تھے لیکن شاد کی غیرت سب کے منہ بند کر دیتی تھی۔ وہ کسی کا احسان اٹھانے پر کسی طرح تیار نہ ہوتا تھا۔ حالات ایسے تھے کہ فرشتے کے قدم بھی ڈگمگا جائیں لیکن وہ اپنی جگہ پر ڈٹا ہوا تھا۔ اس مرتبہ ان دوستوں نے ایک نئے انداز سے اسے زیر کرنا چاہا۔

’’شاد صاحب، آپ کی ادبی خدمات اتنی عظیم الشان ہیں کہ آپ کو اس کا صلہ ملنا چاہیے۔ ہم چاہتے ہیں یہ خدمات حکومت کے علم میں لائی جائیں اور آپ کے لیے مالی امداد کی درخواست کی جائے۔‘‘ دوستوں نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

’’بھائی، وہ خدمات ہی کیا جن کو علم میں لانے کی ضرورت پیش آئے۔ اس لیے اس قضیے کو یہیں چھوڑو۔‘‘

’’ہمارا مطلب ہے توجہ دلائیں۔‘‘

’’جب کسی کو خود خیال نہیں تو توجہ دلانے کا فائدہ؟‘‘

’’یہ آپ کا حق ہے شاد صاحب۔‘‘

’’حق کی اچھی کہی۔ ایک میں ہی تو رہ گیا ہوں حق دار۔ اس ملک میں کتنے ہیں جن کی حالت مجھ سے بھی زیادہ خراب ہے۔ کس کس کو دلاؤ گے ان کا حق؟ تمھیں معلوم ہے، کانگریس کی حمایت کرتے ہوئے میں نے ریاست سے ٹکر لی۔ اس کے نتیجے میں مجھے پریشان کیا گیا، ٹیوشنیں چھڑوا دی گئیں، ففتھ کالومسٹ کہا گیا، در مرتبہ کوتوالِ شہر کے مشورے سے چوری کروائی گئی۔ سب تمھیں معلوم ہے۔ یہ بھی معلوم ہے کہ میں جھکا نہیں تو

اب یہ غربت مجھے کیا جھکائے گی۔ اس لیے امداد کا خیال چھوڑ دو۔ اس حکومت کو بھی میں نے نہیں بخشا ہے اس لیے مجھے کچھ نہیں ملنے والا۔''

''یہ آپ ہمارے اوپر چھوڑ دیں۔''

''کیسے چھوڑ دوں آپ پر۔ بات میری خودداری کی ہے۔ آپ پر کیسے چھوڑ دوں۔ میں اس تجویز کی مخالفت کرتا ہوں۔ اگر آپ نے کوئی رقم دلوائی بھی تو میں اسے قبول نہیں کروں گا۔ سمجھے آپ؟''

اس کی غیرت نے گوارا نہیں کیا کہ امداد کا طالب ہو ورنہ شاید کچھ دن آرام سے کٹ جاتے۔ گاڑی اسی طرح رینگتی رہی جس طرح چل رہی تھی۔

......☆......

وہ محلّہ گھیر حسن خاں کے ایک گھر میں اٹھ آیا تھا۔ یہ اس کی سترہویں ہجرت تھی۔ سولہ مکان تبدیل کر کے رام پور کے چاروں کھونٹ گھوم چکا تھا۔ یہاں تک پہنچتے پہنچتے وہ نڈھال ہو چکا تھا۔ گھر سے نکلنا بالکل موقوف ہو گیا تھا۔ جسے ملنا ہوتا خود چلا آتا۔ بے تکلف احباب آ جاتے تو شطرنج اور تاش کھیلنے میں وقت گزارتا۔ اکیلا ہوتا تو چڑیوں کو دانہ کھلا کر، دوستوں اور شاگردوں کو خطوط لکھ کر جی بہلاتا۔ مطالعے میں مصروف رہتا یا فکرِ سخن کرتا۔ اس زمانے میں معمے حل کرنے کی بھی لت پڑ گئی تھی۔

جادو وہ جو سر چڑھ کر بولے۔ شاد کی حد سے بڑھی ہوئی خودداری اور خود پرستی نے ہمیشہ اسے متنازع فیہ بنائے رکھا۔ جھگڑوں، ٹنٹوں ہی میں عمر گزری لیکن اس کے فن کا لوہا اس کے دشمن بھی مانتے تھے۔ رام پور کے کچھ لوگوں نے جشنِ شاد منانے کا اہتمام کیا تاکہ اس کی خدمات کو خراجِ تحسین پیش کیا جا سکے۔

وہ اتنی جلد قابو میں آنے والا کب تھا۔ رسیاں تڑاتا رہا لیکن درمیان میں کچھ لوگ ایسے تھے کہ ''ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا'' کہہ کر اسے تیار ہونا پڑا۔

''میں تیار ہوں لیکن لگے ہاتھوں میرے کفن دفن کا انتظام بھی کر دو۔''

اب انھیں احساس ہوا کہ جس کا وہ جشن منا کر ادب دوستوں میں اپنا نام لکھوانا

www.urduchannel.in

چاہتے ہیں، وہ تو بیمار ہے۔ اس کے لیے ایک ڈاکٹر کا انتظام کر دیا گیا جو گھر آ کر اسے دیکھ جایا کرتا تھا۔

اس نے تو گھر سے نہ نکلنے کی ایسی قسم کھائی تھی کہ اس کا جشن بھی اس کی غیر موجودگی میں ہوا۔

وہ چند قدم کے فاصلے پر اپنے گھر میں بیٹھا تھا اور صولت پبلک لائبریری، رام پور میں اس کا جشن منایا جا رہا تھا۔ (۱۹۶۲ء)

اس جشن میں رام پور کے ایک رئیس حامد علی خاں آف ریواڑی نے شاد عارفی کی کلیات کی اشاعت کے تمام اخراجات برداشت کرنے کا اعلان کیا۔

ڈاکٹر عابد رضا خاں بیدارؔ بھی اس جشن کا ڈول ڈالنے والوں میں سے ایک تھے۔ جشن میں شریک تھے اور یہ تجویز ان کے سامنے ہی پیش ہوئی تھی۔ ایک اچھی تجویز تھی۔ اس طرح شاد کا بکھرا ہوا کلام یک جا ہو سکتا تھا۔ شاد بہ قیدِ حیات تھا، کلام کی فراہمی اور ترتیب میں اس کے مشورے شامل ہو سکتے تھے لیکن عابد رضا خاں بیدار نے نہ جانے کس مصلحت کے تحت حامد علی خاں کو کلیات شائع کرنے کی جگہ تیس روپے ماہوار امداد کے طور پر ادا کرنے کے لیے آمادہ کر لیا۔

حامد علی خاں نے بھی سوچا ہوگا کہ شاد صاحب ان دنوں مالی طور پر پریشان ہیں، یہ رقم ان کی ضرورتوں کو پوری کرتی رہے گی۔ کلیات کا کیا ہوگا؟ ہمدردوں کو یہ سوچنے کی کب فرصت تھی۔ جس شاعر نے پوری عمر پریشانیوں میں بتا دی، تیس روپے مہینہ سے اس کا بڑھاپا کاٹنے کی فکر ہو رہی تھی۔ زندگی بھر کی متاع، اس کا کلام ضائع ہوتا ہے تو ہو۔

شاد تک جب یہ تجویز اس حال میں پہنچی تو اس کا برافروختہ ہونا لازمی تھا۔

''میری امداد کر کے میری غیرت پر تازیانے کیوں لگائے جائیں۔ کلام کی اشاعت کی بات اور تھی۔ میرے کلام پر میرے پڑھنے والوں کا بھی حق ہے لیکن امداد؟ یہ مجھے قبول نہیں۔''

''شاد صاحب، یہ امداد نہیں آپ کا حق ہے۔''

''میں ہمیشہ دوسروں کے حق کے لیے لڑا ہوں۔''

''بہر حال، میری خاطر آپ اس پیش کش کو قبول کریں۔ کلیات بھی چھپ ہی جائے گی۔''

''نفس راحت خور مجھے بہکا ضرور رہا ہے لیکن میں اسے قبول نہیں کروں گا۔''

حامد علی خاں نے اس کی طرف سے مایوس ہو کر اس کے لواحقین سے بات کی اور تیس روپے ماہوار ان کے لواحقین کو بصد اصرار پہنچاتے رہے۔

ڈاکٹر عابد رضا بیدار نے اپنی شادی کے سلسلے میں حامد علی خان سے کچھ رقم ادھار لی ہوئی تھی۔ حامد علی خاں نے ان سے کہا کہ وہ اس رقم میں سے تیس روپے ماہوار، شاد صاحب کے لواحقین کو ادا کرتے رہیں۔ اس طرح تم پر سے قرض کا بوجھ بھی اتر جائے گا اور شاد صاحب کی مدد بھی ہو جائے گی۔

عابد رضا بیدار نے شادی کر لی۔ نہ کلیات چھپی نہ شاد کو تیس روپے ماہوار مل سکے۔ صرف وہی تین چار قسطیں مل سکیں جو حامد علی خاں نے اپنے ہاتھ سے پہنچا دی تھیں۔

شاد نے کچھ دن انتظار کیا پھر سلطان اشرف، بزم اربابِ ادب کے ایک عہدے دار کو خط لکھا ''عابد رضا بیدار نے شادی کر لی اور میرا مجموعہ گھپلے میں ڈال دیا۔ آخر ان کے دل میں کیا ہے، کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔''

''جانے والا چلا گیا اور میرے توسط سے اپنی خودداری کی شکست کا آخری بوجھ چھوڑ گیا۔ فنکار کی قیمت ایک سو بیس روپے ایک، ایک سو بیس روپے دو۔ ایک سو بیس روپے تین۔ عظیم ہندوستان کدھر جا رہا ہے۔''

(عابد رضا خاں بیدار)

......☆......

شادؔ خوش فہمیِ اربابِ ادب کے باعث
میرؔ صاحب کی طرح میرا گزارا ہوگا

اٹھارواں مکان تبدیل کر کے وہ شاہ ولی اللہ کے مزار کے نزدیک ایک مکان میں

www.urduchannel.in

قیام پذیر ہو گیا۔

اب وہ اپنی عمر سے زیادہ ضعیف ہو گیا تھا۔ دھان پان تو ہمیشہ کا تھا، مسلسل پریشانیوں اور فاقوں کی مار نے اسے بالکل ہی بے حال کر دیا۔ جسم میں ہڈیوں اور کھال کے سوا کچھ باقی نہیں بچا تھا۔ بال خورے کا مرض پرانا تھا لیکن اب تو سر کے بال بھی جگہ جگہ سے اڑ گئے تھے۔

دمے کا مرض اسے جوانی کے دنوں ہی سے لاحق تھا جو برابر بڑھتا چلا گیا تھا۔ جب تک سینے میں جان تھی، وہ سانس کھینچتا رہا لیکن اب تو کچھ دنوں سے ہر سانس آخری سانس معلوم ہونے لگی تھی۔ ایک روز اس کا دم الٹا تو اس نے سلطان اشرف کو بلا لیا۔

''میرے بعد نہ جانے کون سخی، حاتم کی قبر پر لات مارے۔ میری تجہیز و تکفین پر خرچ کر کے میری غیرت کو نیلام کرے۔ میں نے زندگی بھر کسی کا احسان نہیں اٹھایا، مرنے کے بعد بھی نہیں چاہتا۔''

اس نے کچھ رقم سلطان اشرف کے پاس جمع کرا دی کہ اس رقم سے اس کا کفن دفن کیا جائے۔

۸/ ویں فروری ۱۹۶۴ء کو دمے کا شدید دورہ پڑا۔ سانس نے ساتھ چھوڑ دیا۔ اس نے بھی جان دے کر زندگی کا احسان اتار دیا۔

''کس کا انتقال ہو گیا بھائی؟''

''شاد عارفی کا۔''

''کون شاد عارفی؟''

''شاعر تھے بھئی ایک۔''

اے شاد مجھ کو حبِ وطن کے لحاظ سے
کہنا یہی پڑے گا کہ اچھی گزر گئی

(بحوالہ ''شاد عارفی: شخصیت اور فن: پروفیسر مظفر حنفی'')

☆☆☆

فیروز مظفر انجینیئر

شاد عارفی: سوانحی اشاریہ

نام : احمد علی خاں

عرفیت : لڈن خاں

تخلص : شاد، والد کی رعایت سے عارفی لکھتے تھے۔

والد : عارف اللہ خاں

والدہ : خورشید بیگم

وطن : رام پور (اسٹیٹ)

جائے پیدائش : لوہارو

سالِ ولادت : ۱۹۰۰ء

ذریعۂ معاش : مختلف فیکٹریوں میں چھوٹی چھوٹی ملازمتیں، ایڈیٹری، ٹیوشن، پروف ریڈر، لائبریرین صولت لائبریری، بجٹ اکاونٹنٹ، نائب ناظم تحصیل سوار اور شاگردوں کی اصلاح کا معاوضہ وغیرہ

تعلیم : دسویں جماعت

تلمذ : شفق رام پوری، جلیل مانک پوری

شادی : ۱۹۳۹ء

اہلیہ : پری بیگم

اولاد : کوئی نہیں

پہلا شعر : نو برس کی عمر میں کہا

پہلی غزل : ۱۹۱۷ء

آخری غزل : ''آجکل''، دہلی، بابت مارچ ۱۹۶۴ء میں شائع ہوئی۔ اس کے تین چار شعر ۱۳/اکتوبر ۱۹۶۳ء کو کہے گئے۔ اس کا مطلع ہے:

فن پر قدرت رکھنے والا جب محوِ شعریت ہوگا
جو رجحان تاثر دے گا مطلع اس کی بابت ہوگا

www.urduchannel.in

پہلی نظم : اضطرار (مطبوعہ ''ہمایوں'' لاہور، ستمبر ۱۹۳۰ء

اولین مطبوعہ : ہلالِ عید (خاتونِ مشرق، میرٹھ، ۳۰/مارچ ۱۹۳۰ء)

آخری نظم : وصی اقبال کا سہرا (نومبر ۱۹۶۳ء)

پہلا مجموعۂ کلام : ''سماج'' کے نام سے ۱۹۴۶ء میں رشید احمد خاں مخمور نے چھاپا لیکن باقاعدہ اشاعت کی نوبت نہیں آئی۔

دیگر مطبوعات : انتخاب شاد عارفی (انجمن ترقی اردو، ۱۹۵۶ء)، شاد (عابد رضا بیدار کا مرتب کردہ کتابچہ، ۱۹۶۲ء)، سفینہ چاہیے (مرتبہ سلطان اشرف: ۱۹۶۵ء)، نثر و غزلدستہ (مرتبہ مظفر حنفی: ۱۹۶۷ء)، اندھیر نگری (نیا ادارہ، لاہور: ۱۹۶۷ء)، شوخیِ تحریر (مرتبہ مظفر حنفی: ۱۹۷۱ء)، شاد عارفی کی غزلیں (مرتبہ مظفر حنفی: ۱۹۷۴ء)، کلیات شاد عارفی (مرتبہ مظفر حنفی: ۱۹۷۵ء)، دکھتی رگیں (مرتبہ سلطان اشرف: ۱۹۸۲ء)، شاد عارفی: ایک مطالعہ: مرتب: مظفر حنفی (۱۹۹۱ء)، منتخبات شاد عارفی (مرتبہ مظفر حنفی: ۲۰۱۵ء)، مکاتیب و مضامین شاد عارفی (مرتبہ مظفر حنفی: ۲۰۱۶ء)، کلیات شاد عارفی: ترتیب نو (مرتبہ مظفر حنفی: ۲۰۱۷ء)

وفات : ۸/فروری ۱۹۶۴ء

تدفین : احاطہ مزار شاہ ولی اللہ صاحب، رام پور

کتابیات : ☆ایک تھا شاعر (مرتب: مظفر حنفی، ۱۹۶۷ء)

☆شاد عارفی شخصیت اور فن: مظفر حنفی (۱۹۷۷ء اس تحقیقی مقالے پر مصنف کو ۱۹۷۴ء میں بھوپال یونیورسٹی نے پی ای۔ ڈی کی ڈگری تفویض کی) اس کا دوسرا ایڈیشن ۲۰۰۱ میں شاد عارفی: فن اور فنکار

☆شاد عارفی کے خطوط تاریخی اعتبار سے: ڈاکٹر یاسمین اختر مقالہ برائے پی ایچ۔ ڈی (کلکتہ یونیورسٹی)

☆شاد عارفی: حیات و جہات (مرتبہ فیروز مظفر، ۲۰۱۴ء)

☆شاد عارفی کی شاعرانہ عظمت (مرتب: عثمان انجم، ۲۰۱۵ء)

☆شاد عارفی (مونوگراف) مظفر حنفی، ۲۰۱۶ء (این سی پی یو ایل)

☆☆☆